کی گئی ہے۔ مدرسہ محمود گاوان (بیدر) کی عمارت کی ایک قدیم ترین اور نادر پینٹنگ حاصل ہوئی ہے جو عہد اورنگ زیب کی ہے اس کے علاوہ میوزیم میں (۲۵۰) قدیم سکوں کا اضافہ ہوا ہے جو راجگان تلنگانہ، بہمنی، قطب شاہی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں بعض نہایت ہی نایاب ہیں۔

شعبۂ تصنیف و تالیف کی جانب سے اب تک (۳۰۹) کتابیں اردو، فارسی، انگریزی اور تلگو میں دکنی ادب، لسانیات، صوتیات، تاریخ و ثقافت دکن وغیرہ جیسے موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں۔ اور ادارے کے آیندہ کے لائحہ عمل میں کئی نادر مخطوطات اور مفید تاریخی و ادبی کتابوں کی اشاعت داخل ہے۔

شعبۂ مطبوعات کشمیر کے نام سے بھی ایک شعبۂ قائم ہے جس کی جانب سے کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے کی کتاب "برف میں آگ" جو ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے منتخب افسانوں پر مشتمل ہے حال میں شائع ہوئی ہے۔

ادارے کا ایک اہم شعبہ شعبۂ امتحانات ہے جس کا قیام ۱۹۴۳ء میں عمل میں آیا۔ اس شعبے کی جانب سے سال میں دو مرتبہ اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات منعقد ہوتے ہیں جس میں سالانہ تقریباً (۵۰۰۰) طلبا و طالبات شریک ہوتی ہیں۔ اس وقت شہر، اضلاع اور بیرون حیدرآباد میں ان امتحانات کے گیارہ مراکز قائم ہیں۔

ادارے کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" جنوری ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا اور تاریخ اجرا سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کو باہر کی دنیا سے روشناس کروانے اور ان کی ہمت افزائی کرنے کا اہم فریضہ ادا کر رہا ہے۔ اس میں ہندوستان کے مشاہیر اہل قلم کے معلومات آفریں مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اسکے بلندئ معیار کی ضامن ہے۔

شعبۂ دارالمطالعہ میں ہند اور بیرون ہند کے تقریباً (۲۰۰) رسائل اور اخبارات وصول ہوتے ہیں جو مختلف زبانوں اردو، فارسی، عربی، انگریزی، ہندی اور تلگو سے تعلق رکھتے ہیں۔

ادارے کی جانب سے ہر سال یوم زور اور یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب عظیم پیمانے پر منائی جاتی ہیں یوم محمد قلی قطب شاہ کو اس قدر مقبولیت حاصل ہو گئی ہے کہ یہ اب حیدرآباد کا قومی تہوار تصور کیا جا رہا ہے جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت شہر کے باشندے شریک ہوتے ہیں۔ اور بانی شہر حیدرآباد محمد قلی قطب شاہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو ڈاکٹر زور مرحوم کا لافانی کارنامہ ہے۔ ادارہ ہندوستان میں لسانی تحقیقات کا اہم مرکز اور اردو ادب کی ترقی اور دکنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت میں سرگرم عمل ہے اور بیشمار طالبان علم اس چشمۂ علم و ادب سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ کارکنان ادارہ ان مقاصد کی تکمیل میں پورے انہماک اور خلوص کے ساتھ منزل مقصود کی طرف گامزن ہیں جن کا بیڑا محترم ڈاکٹر زور نے اٹھایا تھا۔

یہ بات باعث طمانیت ہے کہ ملک اور بیرون ملک کے مشاہیر نے ادارے کی کارکردگی سے متعلق خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ ۹ ستمبر ۱۹۶۷ء کو معزز صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے ادارے کے تفصیلی معائنہ کے بعد کتاب الرائے میں حسب ذیل تحریر درج فرمائی ہے۔

"ادارۂ ادبیات اردو میں آج حاضری کا موقع ملا یہاں کا کام اور اہتمام دیکھ کر جی خوش ہو گیا اور اس خوشی کے ساتھ ساتھ زور مرحوم کی یاد بھی بار بار آئی وہ بڑا کام کر گئے ہیں لیکن ہر بڑے کام کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں آنے والے اور بھی بڑا بنائیں۔ حال پر ماضی کا یہ حق ہے، مجھے یقین ہے کہ حق پوری طرح ادا کیا جائے گا"

علمی، ادبی اور کلچرل تعاون

(۱۹۶۷ء، ادارے کی ڈائری سے)

جناب وسیم اختر ایڈیٹر ماہنامہ "مکاتیب ڈائجسٹ" عثمان آباد (دکن) کو رسالے کی اجرائی کے سلسلے میں علمی و ادبی معاونت کی گئی۔

محترمہ سلطانہ شرف الدین صدر معلمہ مدرسہ فوقانیہ نسواں نامپلی حیدرآباد کو تلوک چند محروم کے بارے میں ادارہ کی طرف سے ضروری مواد فراہم کیا گیا۔

جناب مولانا سید معز الدین قادری ملتانی کو علمی وظیفہ کی کارروائی کے سلسلے میں ادارہ کی جانب سے صداقت نامہ قابلیت دیا گیا۔

عطاء الرحمن صاحب ارشاد مدیر ماہنامہ "شاہکار" الہ آباد کو قیام حیدرآباد کے زمانے میں علمی و ادبی خدمات کے بارے میں ادارہ کی طرف سے مناسب رہبری کی گئی۔

ساہتیہ اکیڈیمی دہلی کی خواہش پر ادارہ کی طرف سے اردو ڈرامہ کمیٹی کے بارے میں مطلوبہ مواد فراہم کیا گیا۔

ادبی ٹرسٹ بک ڈپو کے قیام کے سلسلے میں ادارہ کی طرف سے حیدرآبادی مصنفوں کی مطبوعات کے بارے میں تفصیلات معتمد صاحب ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے حوالے کی گئیں۔

تاثرات

دوران سال ۱۹۶۷ء میں "ادارۂ ادبیات اردو" کے بارے میں جن اصحاب یا اداروں نے اپنے تاثرات تحریر یا تقریر کے ذریعہ ظاہر فرمائے یا شائع کئے۔ ان کے چند ایک اقتباسات درج ذیل ہیں — (ادارہ)

---

(۱) جناب قاضی متین الدین لیکچرار گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ سائنس اورنگ آباد (مہاراشٹرا)

"ایوانِ اردو" دیکھا، اور دیکھتا رہ گیا۔ اردو زبان و ادب کی خدمت اور فروغ کے لئے ایسی شاندار اور پرشوکت عمارت شاید ہی کہیں اور ہو۔ "ایوان اردو" دیکھنے کے بعد عاشقِ دکھنی زبان و ادب ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی روح کو بے اختیار خراجِ تحسین ادا کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے مرحوم نے یہاں جس "لگن" محنت اور خلوص سے مخطوطات، رقعات کے نمونے اور نادر تاریخی چیزیں جمع کی ہیں، وہ زورؔ مرحوم ہی کا حصہ ہیں۔ حیدرآباد میں یوں تو کئی "تاریخی آثار، عمارتیں ہیں۔ "ایوان اردو" ان میں ایک بیش بہا، ہے، سالار جنگ میوزیم دیکھنے کے بعد آنکھوں کو ٹھنڈک اور زبان و ادب کی خدمت کرنے کا ولولہ و جوش کہیں پیدا ہو سکتا ہے تو وہ ہے ایوان اردو اسے دیکھنے اور یہاں کے علمی سرمایہ سے استفادہ کرنے کے بعد بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیدرآباد کی "تمام تاریخی عمارتیں و آثار وغیرہ دیکھ چکے ہیں" ایوان اردو" میں آنے کے بعد بار بار آنے کی ہوس ہوتی ہے۔

(۴- جنوری ۱۹۶۷ء)

(۲) جناب ڈاکٹر جلال عبدہ

سفیر کبیر ایران متعینہ ہند

"ایوان اردو" کا دوبارہ معائنہ میری معلومات میں اضافہ کا موجب ہوا۔ اس بار مجھے یہ احساس ہوا کہ ایران اور ہندوستان میں لسانی نقطۂ نظر سے گہرے اور عمیق تعلقات ہیں۔ اور یہ "ادارہ" ان تعلقات کا آئینہ دار ہے جس سے میں بیحد متاثر ہوا ہوں (فارسی)

(۹- جنوری ۱۹۶۷ء)

(۳) جناب جے، ایف، رچرڈز

ریسرچ اسکالر کیلی فورنیا یونیورسٹی مقیم سکندرآباد (اے پی)

یہ بہت اچھا کتاب خانہ ہوتا ہے۔ اس کو دیکھ کر
مجھے بہت خوشی ہوئی۔ یہاں کے مخطوطات کے کام اور
ان کی فہرست حاصل کرکے مجھے مسرت ہوئی۔

(۵، فروری ۱۹۶۷ء)

○

(۴) جناب آفتاب لکھنوی

لکھنؤ (یو، پی)

"ایوان اردو" دیکھنے کا آج اتفاق ہوا مجھے حیرت
ہے کہ میں اب تک کیوں اسقدر بدقسمت رہا کہ اس ادارہ
تک میری پہنچ ممکن نہ ہو سکی۔ اب تک کہیں بھی ایسا ادارہ
نہیں دیکھا۔ خدا برکت دے۔

(۲۲ - مئی - ۱۹۶۷ء)

○

(۵) جناب ہلال رضوی

(رام پور)

مجھے "زندہ دلانِ حیدرآباد" نے بلا کر مشاعرہ میں
شرکت کا موقع دیا۔ مگر میں خوشی اس سے زیادہ محسوس
کر رہا ہوں، اس لئے کہ مجھے ایوان اردو دیکھنے کا موقع
ملا۔ حقیقت میں یہ ادارہ اپنی شان کا واحد ادارہ ہے
میں نے اس کو دیکھ کر بے حد خوشی محسوس کی۔ خدا اس کی
عمر دراز کرے اور اسے پھلنے پھولنے کے اچھے مواقع فراہم
ہوں۔

(۲۲ - مئی - ۱۹۶۷ء)

(۶) ڈاکٹر محمد اسلام

ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی

آج ایوان اردو دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں کے
نادر کتابیں، مخطوطات اور مراقعات ریسرچ اسکالرس
کے لئے انتہائی اہم ہیں، یہاں کی نوادرات اور پینٹنگس
دونوں لائقِ ستائش ہیں۔ ریسرچ اسکالرس کے قیام
کا جو انتظام حیدرآباد ایسے شہر میں کیا گیا ہے، وہ بھی ایک
طرح کی ادبی خدمت ہے کیونکہ یہاں قیام کرکے تحقیقی
کام میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ خدا کرے کہ ایوان
اردو خوب ترقی کرے اور اپنی مثال آپ بن جائے

(۲، جولائی ۱۹۶۷ء)

○

(۷) جناب حبیب الرحمان چغتائی

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ)

کئی روز سے حیدرآباد میں تھا اور ادارہ کی لا
دیکھنے کا اشتیاق روز افزوں بڑھ رہا تھا۔ اور آ
میں سب کام چھوڑ کر یہاں آ ہی گیا۔ لائبریری دیکھ
بڑی خوشی ہوئی، یہ کتب خانہ نہ صرف اردو کی ترو
کا سبب ہے بلکہ عوام کو مفت میں استفادہ کا مو
فراہم کرتا ہے اور دوسری، اس کی خصوصیت یہ کہ محقق
کے لئے یہاں کا ذخیرہ (خصوصاً مخطوطات) یقیناً
مفید ہے، یہاں اسٹاف نے جس خلوص کا ثبوت
قابل ستائش ہے، جس کے لئے میں انتہائی شکر
ہوں

(۴ - جولائی ۱۹۶۷ء)

(۸) جناب پروفیسر ظلّ حسنین

لکچرار شعبہ اردو الہ آباد یونی ورسٹی

یہاں میں نے فن و ادب اور تہذیب کے بہتر سے بہتر نمونے دیکھے۔ ایک بڑی تہذیب اپنے مشکل زمانے میں بھی اپنے دامن میں فن اور ادب کے اچھے سے اچھے جواہر پارے رکھتی ہے۔ یہی حال حیدرآباد اور ادارہ ادبیات اردو کا بھی ہے یہ شہر اور یہاں کے ادارے اردو کی بقا اور ایک نہایت خوش آیند تہذیب کی آمد کا احساس دلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

(۱۲ - جولائی ۱۹۶۷ء)

○

(۹) جناب ولی اللہ سلفی جونیر ریسرچ فیلو (شعبہ فارسی)

(پٹنہ یونی ورسٹی پٹنہ (پٹنہ)

میں میرحا کیرانوی پر تحقیقی کام کر رہا ہوں اسی سلسلہ میں حیدرآباد آیا ہوا ہوں اور آج ایوان اردو میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ یہاں اخبارات و رسائل سے لیکر عمدہ اور نادر کتابیں بھی موجود ہیں۔ مطبوعات کا خزانہ زیادہ ہے اور مخطوطات کا کم لیکن مفید پرانے اخبار کافی ہیں یہاں لکچر کا بھی انتظام ہے۔ میں منتظمین ایوان اردو کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے پوری لائبریری دکھلائی۔

(۲۹ / اگست ۱۹۶۷ء)

○

۱۰ - بھارت رتن عالیجناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب

صدر جمہوریۂ ہند (دہلی)

ادارۂ ادبیات اردو میں آج حاضری کا موقع ملا۔ یہاں کا کام اور اہتمام دیکھ کر جی خوش ہو گیا اور اس خوشی کے ساتھ ساتھ زور مرحوم کی یاد بھی برابر آتی رہی۔ وہ بڑا کام کر گئے ہیں۔ لیکن ہر بڑے کام کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں آنے والے اسے اور بڑا بنائیں، حال پر ماضی کا یہ حق ہے مجھے یقین ہے کہ یہ حق پوری طرح ادا کیا جائے گا۔

(۲ - ستمبر ۱۹۶۷ء)

○

(۱۱) پدم شری حکیم عبد الحمید صاحب دہلوی

متولی ہمدرد دواخانہ دہلی

ادارۂ ادبیات اردو جس کے متعلق میں اکثر سنتا رہتا تھا اور جسے میں کئی بار حیدرآباد آنے کے باوجود نہیں دیکھ سکا۔ آج دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ مرحوم ڈاکٹر زور صاحب نے اس ادارہ میں اتنی نادر اور قابل قدر تاریخی چیزیں اردو اور اردو والوں کے لئے جمع کر رکھی ہیں۔ مجھے یہ سن کر بھی اطمینان ہوا کہ اس ادارہ کو مرحوم بانی کے بعد مناسب طور پر چلاتے رہنے کے لئے چند مخلصین کوشاں ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی کوششیں بار آور ہوں گی اور یہ ادارہ ترقی کرتا رہے گا۔

(۵ / ستمبر ۱۹۶۷ء)

○

(۱۲) جناب اے۔ ایف۔ انتیا

کنسلٹنگ انجینئر، بمبئی

"ادارۂ ادبیات اردو" کا ذخیرہ نہایت نایاب
اور قابل قدر ہے، اس کے دیکھنے سے مجھے بڑی مسرت
ہوئی۔ میری دلی تمنا ہے کہ یہ ادارہ اسی طرح ترقی کی
منزلیں طے کرتا رہے۔

(۱۰- ستمبر ۱۹۶۷ء)

○

(۱۳) محترمہ تارا کشوری سنہا

ممبر پارلیمنٹ دہلی

مجھے (ادارۂ ادبیات اردو) کے معائنہ کی عزت
ملی۔ یہاں علمی و ادبی اور تمدنی ذخیرہ کو دیکھ کر میں
حد درجہ متاثر ہوئی۔ مخطوطات اور قدیم اشیاء کا
گراں قدر ذخیرہ میری دلچسپی کا باعث بنا اور مجھے
بڑی ہی مسرت حاصل ہوئی۔

(۱۴- ستمبر ۱۹۶۷ء)

○

(۱۴) جناب محمد عبدالباری صاحب

مقیم ممالک متحدہ امریکہ

آج قیام حیدرآباد کے مختصر عرصہ میں ادارۂ
ادبیات اردو کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مخطوطات اور
دکھنی تہذیب کے نادر اور قابل قدر ذخیرہ سے میں
انتہا درجہ متاثر ہوا۔ افسوس ہے کہ کمیٔ وقت کے
باعث میں اس ذخیرہ سے استفادہ نہ کر سکا۔
اس ادارہ کے وجود سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو
کے ساتھ خواہ کتنی ہی مخالفت اور ناانصافی کی جائے
وہ زبان بہرحال زندہ رہے گی۔

(۱۴- ستمبر ۱۹۶۷ء)

○

(۱۵) جناب حفیظ میرٹھی

فیض عام انٹر کالج میرٹھ

—— اور ——

(۱۶) جناب م. نسیم صاحب

کاشانۂ بخشی گنج، لکھنؤ۔

لکھنؤ اور اس کے اطراف سے چند اردو پسند
اردو کے لئے کامیابی کے خواہاں اور اردو میں کچھ
لکھنا ایک اعزاز سمجھنے والے آئے اور یہ تصور لیکر گئے کہ
شمال میں اردو جو کچھ کھو رہی ہے، جنوب اُسے
پاتا جا رہا ہے۔

(۱۴- نومبر ۱۹۶۷ء)

○

(۱۷) جناب مختار احمد مظاہری

صدر ادارۂ ادب اسلامی ہند ناظرہ، فیض آباد (یوپی)

ادارہ ادبیات اردو کی زیارت کا موقع ملا
یہ ادارہ ایک ایسا مینارہ نور ہے جس سے ملک کے تمام
محبان اردو ہمیشہ روشنی حاصل کرتے رہیں گے۔ یہ ادارہ
عزم و حوصلہ کا ایک ایسا نشان ہے، جو زندۂ جاوید ہے
میں ارکان کی محنت، ان کی کاوش و کوشش کو ادارہ
کی ترقی اور استحکام کا ضامن سمجھتا ہوں۔

(۱۴- نومبر ۱۹۶۷ء)

○

۱) جناب عباد انصاری

ٹانڈہ فیض آباد

ایوان اردو کا دیدار ہم محبان اردو کے لئے اس اردو
نی کے دور میں باعث تقویت اور مشعل راہ ہے۔ اللہ اسے
طر بد سے دور رکھے اس کی سلامتی کے لئے خواہشمند ہوں

(۱۴- نومبر ۱۹۶۷ء)

○

جناب سہیل احمد انصاری

(الہ آباد (یو، پی)

" ایوان اردو " دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا "

(۱۴- نومبر ۱۹۶۷ء)

○

جناب شبنم سبحانی شریک مدیر " دوام "

(معتمد عمومی ادارہ ادب اسلامی ہند)

فیض آباد (یو، پی)

انسان کی قوت ارادی کیا کرشمے دکھا سکتی ہے
" ایوان اردو " اس کا ایک زندہ ثبوت ہے زور مرحوم کی
یادگار زندۂ جاوید ہے۔ اسے دیکھ کر ہم نے یہ محسوس
کیا ہے کہ اردو ہمارے ماضی کی بہترین عکاس اور ترجمان
ہے جس زبان کے دامن میں ایسے نادر جواہر ریزے ہوں
وہ مر نہیں سکتی اور جس شہر میں اس زبان کی عظمت
کے ایسے نقوش ہوں، وہ شہر اپنی تاریخی اہمیت
نہیں کھو سکتا خاص بات یہ ہے کہ اردو اس تاج محل
کو اس کے پاسبانوں نے اپنے دل کا ایک ٹکڑا سمجھ کر
اس کی حفاظت و نگرانی کی ہے ۔ خدا ان کے خلوص
اور جذبے کو سلامت رکھے ۔

(۱۴- نومبر ۱۹۶۷ء)

○

(۲۱) ڈاکٹر محمد عبدالمطلب

پروفیسر صدر شعبہ پبلک اڈمنسٹریشن جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

ادارہ ادبیات اردو قائم کر کے ڈاکٹر زورؔ نے
اردو ادب کی شاندار خدمت انجام دی ہے جس کا
ذکر الفاظ میں کیا جانا مشکل ہے ۔

(۱۹- نومبر ۱۹۶۷ء)

○

(۲۲) جناب صباح الدین عبدالرحمٰن

<u>ہندوستان میں اردو کے تحقیقی ادارے ادارہ ادبیات اردو</u>

ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن میں
۱۹۳۱ء میں سراکبر حیدری کی سرپرستی، نواب مہدی یار جنگ
کی صدارت اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی
نظامت میں قائم ہوا، اس ادارہ کے اصل روح
رواں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اپنی وفات تک
رہے اس کی تاسیس کے وقت وہ جامعہ عثمانیہ میں
اردو کے استاد تھے۔ جب کہ انھوں نے ہندوستانی
لسانیات اور اردو کے اسالیب بیان لکھ کر کافی
شہرت حاصل کر لی تھی۔ اور جب انہوں نے ۱۹۲۹ء
میں اپنی کتاب اردو شہ پارے شائع کی، تو اہل نظر
کو ان کے تحقیقی رجحانات کا اندازہ ہوا۔ اس میں اردو
ادب کے آغاز سے ولی کے زمانے تک کے شاعروں اور
نثر نگاروں کے شہ کاروں سے اہم انتخابات پیش کئے گئے ہیں

اقتباسات دینے سے پہلے مرتب نے بیجاپور کے یوسف عادل شاہ (۸۹۵ھ - ۹۱۶ھ) شاہ میراں جی (۹۰۲ھ) اسمٰعیل عادل شاہ (۹۴۱ھ) شاہ برہان الدین جانم (۹۹۰ھ) ابراہیم عادل شاہ (۹۶۷ - ۱۰۳۰ھ) علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ - ۱۰۸۳ھ) شاہ ملک (۱۰۷۷ھ) سکندر عادل (۱۰۹۷ - ۱۱۰۳ھ) گولکنڈہ کے سلطان قطب شاہ (۹۰۲ - ۹۶۱ھ) ابراہیم قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ (۱۰۲۵ھ - ۱۰۲۰ھ) غواصی، وجہی، سالکی، طبعی، ابوالحسن تانا شاہ (۱۰۹۳ - ۱۰۸۳ھ) لطیف، نوری، شاہی، جیون، عاجز، ذوقی، بحری، عشرتی، ولی ویلوری، اشرف، ولی اورنگ آبادی، امانی، رضا، قادری، رائے چوری وغیرہ کے جو سروع میں مختصر حالات کے ساتھ ان کی علم نوازی، علم دوستی، سخن پروری اور دوسرے علمی کارناموں کا ذکر ہے، اور یہ ادب و تاریخ کا بڑا مستند کارنامہ ہے، ۱۹۲۹ء سے اب تک ان پر بہت کچھ معلومات فراہم ہو چکے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی یہ کتاب جب شائع ہوئی تھی، تو اس وقت کے لئے یہ بالکل ہی نئی چیز تھی، ان کو اس کتاب کی ترتیب میں لندن، آکسفورڈ، کیمبرج، پیرس اور اڈنبرا کے کتب خانوں کی قلمی کتابوں کی چھان بین کرنی پڑی تھی، ان میں بعض ایسی کتابوں کا انتخاب ہے جس کا اب صرف ایک نسخہ ہی موجود ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی اصل بنیادی کوشش یہ رہی کہ دکنی ادبیات کا جو سرمایہ اس خطے کے ادب کا جواہر ہے، اس کی شرح سمجھ کر رکھے، اسی مخلصانہ جذبہ سے انہوں نے ادارۂ ادبیات اردو قائم کیا جس نے دکن میں ادب و تاریخ و اشاعت کے لئے تمام ممکن وسائل اختیار کئے مختلف مرکز قائم کرکے اردو کے امتحانات کا انتظام کیا۔ نوجوانوں میں تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا کیا۔ بچوں اور عورتوں کے لئے مفید کتابیں شائع کیں، ایک بڑا کتب خانہ جمع کیا جس میں ہر گوشہ دکنی ادبیات کو چن چن کر اکٹھا کیا۔ دکن کی پرانی تاریخ لکھوائی۔ اور دکنی ادبیات پر محققانہ کتابیں شائع کیں۔

دکن کی تاریخ کے سلسلہ میں اس کی طرف سے پروفیسر عبدالمجید صدیقی کی ایک مستند کتاب تاریخ گولکنڈہ شائع ہوئی ہے، جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کے سلطنتوں کے تعلقات کے ساتھ اس عہد کے تمدن، علم و فضل کی تفصیلات بڑی محنت سے جمع کی گئی ہیں، پروفیسر عبدالمجید کی ایک دوسری کتاب مقدمۂ تاریخ دکن بھی اس ادارہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ گو یہ مختصر ہے لیکن اس میں انہوں نے سرزمین دکن کے پچیس حکمران خاندانوں کے عروج و زوال کے متعلق مفید معلومات فراہم کر دیے ہیں، اس سلسلہ میں نظام الملک آصف جاہ از شیخ چاند، اعظم الامراء ارسطو جاہ از پروفیسر عبدالمجید صدیقی، سر سالار جنگ اعظم از رفیق محمد ناصر جنگ شہید، از معین الدین رہبر، عماد الملک از فیض محمد، مرقع دکن جیسی چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں جو مختصر ہیں اور تحقیقی بھی نہیں ہیں، لیکن ان میں مفید تاریخی معلومات ملتی ہیں،

دکنی ادب پر ایک بہت ہی قیمتی سرمایہ کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ ہے جو ادارہ ادبیات کی مطبوعات میں تو داخل نہیں، لیکن اس کے ناظم ڈاکٹر محی الدین قادری زور

لمی شاہکار ہے۔ اس میں گولکنڈہ کے پانچویں تاجدار
لی قطب شاہ (۱۰۲۰ھ - ۹۸۳ھ) کے اردو کلام کو
ی محنت سے جمع کر دیا گیا ہے۔ اس میں سلطان کے حالات
اس کے کلام پر ۱۵۲ صفحے پر تبصرہ ہے۔ جو ڈاکٹر
الدین قادری زور کی علمی کاوش اور تحقیقی محنت کی
ی مثال ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے دیباچہ اور اپنی
ری تحریروں سے یہ واضح کر دیا کہ عام طور سے
سمجھا جاتا تھا کہ ولی اورنگ آبادی اردو زبان کا
شاعر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دکن کی بہمنی سلطنت
خر زمانے اور اس کے بعد قطب شاہی اور عادل شاہی
رانوں کے عہد میں اس زبان نے اس قدر ترقی کر لی
کہ اس میں نظم و نثر کی اچھی کتابیں لکھی گئیں۔
صوصاً قطب شاہی اور عادل شاہی خاندان کے علم
دوست اور سخن گستر حکمرانوں نے اپنی سرپرستی سے اس کی
ویج و ترقی کی رفتار بہت تیز کر دی تھی۔ ان میں
قلی قطب شاہ بانی شہر حیدرآباد بہت اچھا شاعر
۔ اس کے زمانے میں اردو کے بہت سے شعرا اور
نف پیدا ہوئے اور اس کو اردو کا پہلا صاحب دیوان
کہنا صحیح ہوگا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر محی الدین
ی زور نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حالات
ف پہلوؤں کی تفصیلات درج کی ہیں۔ ان سے
ن مؤرخانہ بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن وہ
تحقیقی کاموں میں ڈوب کر لکھنے کے بجائے فرد کی
کیا کر دینے کے قائل رہے۔

ڈاکٹر زور کا ایک دوسرا تحقیقی کارنامہ
ان کی کتاب میر محمد مومن ہے اس میں سلطان محمد
قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم میر محمد مومن کے حالات
زندگی اس کے علمی، ادبی اور سیاسی کارناموں کا مفصل
ذکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک اور تحقیقی کارنامہ
ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانے کے مخطوطات
کی فہرست ہے جو انھوں نے پانچ جلدوں میں ۱۹۴۳ء
سے ۱۹۵۹ء تک برابر شائع کیں۔ پہلے لکھا جا چکا
ہے کہ ان کو دکھنی ادبیات سے عشق تھا۔ اس لئے
انھوں نے اس کے علمی دفینے کو ہر جگہ سے نکالا۔ اور ان
پر توضیحی نوٹ لکھ کر اس کی اہمیت بتائی۔ پھر داستان
ادب حیدرآباد اور دکھنی اردو ادب لکھ کر اور معانی سخن،
مرقع سخن، فیض سخن، متاع سخن، اور کیفیت سخن میں
دکن کے شعرا کو روشناس کرا کے شمالی ہند کے ارباب
نظر کو دکن کی ادبیات کی طرف نظر اٹھانے اور ان کو
قابل قدر سمجھنے پر مجبور کر دیا ان کا خیال تھا کہ اردو
نے دکن کے گہوارے ہی میں پروان چڑھ کر جوانی میں قدم
رکھا، اس خیال کو پھیلا کر انہوں نے دکن کے [illegible]
سے احساس کمتری کو دور کیا اور خود اعتمادی اور خود [illegible]
کا جذبہ بھی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کو دکن کی ہر چیز
سے شیفتگی رہی۔ اسی دکھنی زمین کا دبدبہ گولکنڈہ کے
قلعہ اور قطب شاہی تاریخ سے متعلق ان کو بہت سے
معلومات حاصل تھے اور لوگ ان کو گولکنڈہ کے قلعہ اور
قطب شاہی خاندان کا انسائیکلوپیڈیا سمجھتے تھے افسوس
کہ وہ ۵۷ سال کی عمر میں ۱۹۶۲ء میں اس دنیا سے
رخصت ہو گئے۔ اگر ان کی زندگی نے اور وفا کی ہوتی تو

وہ ادارہ ادبیات اردو کی نئی عمارت ایوان اردو
تو کسی اور ریاست کا لال قلعہ ضرور بنا دیتے اس ایوان
میں ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے بہت سے اسناد
نوادر مخطوطات کتبات اور تصاویر جمع ہیں، جن
سے دکن کی سیاسی، علمی اور ادبی تاریخ کے بہت سے
روشن پہلو سامنے آ سکتے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کے علمی پروگرام
میں ایک اردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب بھی تھی،
ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کی نگرانی میں اس کا خاکہ
بھی بن چکا تھا۔ لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے
اُن کو علمی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ اس ادارہ کا
ترجمان سب رس ہے۔ جس کو ڈاکٹر محی الدین قادری
ہی کی علمی و ادبی یادگار سمجھنا چاہئے۔ ۱۹۶۷ء

اقتباس "آجکل" دہلی تحقیق نمبر اگست

قطعہ

چہ خوش تعمیر کرد "ایوان اردو"
دو بالا گشت از وے شانِ اردو
ز چشم بد خدا محفوظ دارد
جناب زورؔ، ہمہ ارکانِ اردو

عرشی حیدرآبادی

ادارے کا مہمان خانہ

ادارے کی اپنی تعمیر شدہ عمارت "ایوان اردو" میں دو کمروں اور ایک ورانڈے پر مشتمل ایک مہمان خانہ ہے جس میں دستورِ ہند کی مسلّمہ چودہ زبانوں میں تحقیقاتی کام کرنے والے ریسرچ اسکالر ادیب، شاعر اور صحافی ایک ہفتہ قبل معتمد ادارہ کو مطلع کر کے اور اجازت لینے پر مقررہ تاریخ اور وقت سے قیام کر سکتے ہیں۔

ریسرچ اسکالروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شعبے کے صدر کی توثیقی تحریر کے ساتھ قیام کے لئے درخواست بھجوائیں ادیبوں شاعروں اور صحافیوں کے لئے تعارفی مکتوب کا درخواست کے ساتھ لگانا ضروری ہے۔ مہمان خانے میں صرف چار یوم قیام کیا جا سکتا ہے۔ مزید ضرورت ہو تو صرف تین روز کی اجازت دی جائیگی، مہمانوں سے یومیہ مقررہ شرح پر کرایہ لیا جاتا ہے جس کے بارے میں مراسلت ضروری ہے۔ ایوان اردو کا مہمان خانہ ہند و پاک کی ادبی اور تہذیبی اداروں کی تاریخ میں اپنے وجود کے صحت مند پس منظر کے تعلق سے اولیت اور اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں قیام کی سہولتیں مہیا ہیں۔ مہمان خانہ "ایوان اردو" سے ملحقہ عقبی حصے میں واقع ہے۔

اس سال الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر ظل حسنین صاحب لکچرار شعبہ اردو نے یکم جولائی ۱۹۶۷ء سے ۵ جولائی ۱۹۶۷ء تک (۵) یوم ادارے کے مہمان خانہ میں قیام کیا۔

مصروفیاتِ ادارہ

علمی ـــــ ادبی اور ـــــ ثقافتی

ادارے کی ۱۹۶۷ء کی ڈائری سے

جنوری ۱۹۶۷ء

چہارشنبہ ۴ر جنوری، جناب قاضی متین الدین احمد صاحب لیکچرار شعبۂ اردو گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج اورنگ آباد نے ایوان اردو کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا۔ وقار خلیل نے موصوف کو ادارے کے بارے میں تفصیلات سے واقف کرایا۔

پیر ۹ر جنوری: ۱۱ بجے صبح، ڈاکٹر جلال مجدہ، سفیر کبیر ایران متعینہ دہلی نے جناب حسین ضابطہ اور دیگر ایرانی باشندوں کے ہمراہ ادارۂ ادبیات اردو میں حاضری دی اور ایوان اردو، ادبی اور تہذیبی ذخیرہ کا معائنہ کیا۔ جناب میر سراج الدین علیخان اعزازی آفس سکریٹری نے موصوف کا خیر مقدم کیا۔

پیر ۱۶ر جنوری: روزنامہ سیاست حیدرآباد میں ادارہ کی مطبوعہ کتاب سانولی پر تبصرہ شائع ہوا، اردو کے جوان سال ادیب اور ڈرامہ نویس جناب اظہر افسر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے ریڈیائی فیچر اور ڈراموں کا یہ مجموعہ ادارے نے شائع کیا تھا۔

شنبہ ۱۸ر جنوری ۵½ بجے شام۔ جناب پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر نشین ادارۂ ادبیات اردو کی صدارت میں مشاورتی کمیٹی یوم محمد قلی قطب شاہ کا اجلاس ایوان اردو میں منعقد ہوا۔ اور طے پایا کہ ۲۵ر تا ۲۸ر فبروری کو شایانِ شان طریقے پر یوم محمد قلی کی سہ روزہ تقاریب اور بسنت میلہ منایا جائے اس سلسلے میں مختلف کمیٹیاں تشکیل دی گئیں، اور جناب راج بہادر راج صاحب سکسینہ کو حسب سابق معتمد یوم محمد قلی اور الحاج سید تقی الدین قادری صاحب کو شریک معتمد و خازن چنا گیا نواب میر حسین علیخاں صاحب (معتمد میلہ کمیٹی)، جناب میر حسن صاحب (معتمد ادبی اجلاس) ڈاکٹر غلام عمر خاں (معتمد بین کلیاتی تحریری مقابلے) محترمہ عائشہ رشاد صاحبہ (معتمد مشاعرہ) میر سراج الدین علیخاں صاحب (معتمد نمائش) جناب مولوی سید دلدار حسین صاحب (معتمد سواونیر کمیٹی) وقار خلیل (معتمد نشر و اشاعت) منتخب ہوئے، مشاورتی اجلاس یوم قلی میں پروفیسر ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ جنرل سکریٹری ادارہ، مولوی دلدار حسین صاحب رکن مجلس انتظامی ادارہ، ڈاکٹر غلام عمر خاں، جناب میر حسن، نواب میر حسین علیخاں، محترمہ عائشہ رشاد،

سید قطب الدین قادری صاحب، میر سراج علی خاں صاحب، وقار خلیل، اور محمد جمال الدین صاحب مہتمم ادارہ نے شرکت کی۔

جمعہ ۲۰ جنوری: مقامی اخبارات میں ادارہ کے زیر اہتمام منائے جانے والے یوم محمد قلی قطب شاہ اور بسنت میلے کی تفصیلات اور کمیٹی کی روئداد شائع ہوئی۔

جمعرات ۲۶ جنوری: ½۴ بجے شام ایوان اردو میں بسنت میلہ کمیٹی یوم محمد قلی قطب شاہ کا اجلاس جناب میر لیئق علیخاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں، جناب میر حسن، جناب رمن راج سکسینہ، جناب میر سراج الدین علیخاں، اور وقار خلیل نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں مزید کمیٹیوں کے قیام اور کام کے پھیلاؤ کے سبب اور افراد کو شامل کر لینے کے بارے میں غور کیا گیا۔

فروری ۱۹۶۷ء

چہارشنبہ یکم فروری: ایوان اردو کے اردو میوزیم کی تنظیم جدید کے سلسلہ میں نواب عنایت جنگ بہادر رکن مجلس انتظامی نے صبح ۱۱ بجے سے ½۴ بجے شام تک اپنا گراں قدر وقت ایوان اردو میں گزارا۔ اور اپنی نگرانی میں نوادر کی ترتیب کا کام انجام دیا۔

۲ فروری: — یوم محمد قلی کے سلسلہ میں بین کلیاتی تحریری مقابلے کے انعقاد اور یوم محمد قلی کی تفصیلات پر مشتمل خبریں مقامی اخبارات میں شائع ہوئیں۔

اتوار ۵ فروری: ۴ بجے سہ پہر ایوان اردو میں نواب عنایت جنگ بہادر کی صدارت میں مجلس مشاورت یوم محمد قلی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں نواب میر لیئق علیخاں، جناب میر حسن، ڈاکٹر غلام عمر خاں، مسٹر و مسز عائشہ رشاد، جناب رمن راج سکسینہ، میر سراج الدین علیخاں، سید شاہ نقی الدین قادری اور وقار خلیل نے شرکت کی۔

½۴ بجے شام کیلیفورنیا یونیورسٹی (امریکہ) کے مستشرق جناب جے۔ اف۔ رچیڈ نے ایوان اردو کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ جناب محمد جمال الدین مہتمم ادارہ اور جناب ترصیص الدین انصاری نے علی الترتیب اردو میوزیم اور کتب خانہ کا معائنہ کیا۔

منگل ۷ فروری: کمیٹی اردو امتحانات ادارہ ادبیات اردو کا اجلاس ۱۰ بجے صبح صدر اردو پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں بمقام انوار العلوم کالج منعقد ہوا۔ اور دسمبر ۱۹۶۶ء میں منعقدہ امتحانات کے نتائج کی منظوری دی گئی اور جون ۱۹۶۷ء میں منعقد ہونے والے امتحانات کی تاریخوں کا تعین کیا گیا۔ کمیٹی میں معتمد اعزازی اردو امتحانات جناب عارف الدین حسن کے علاوہ اراکین پروفیسر سید محمد، مولوی غلام رسول اور جناب اکبر الدین صدیقی صاحبان نے شرکت کی۔

- ادارے کے اردو امتحانات کے نتائج بغرض اشاعت اخبارات کو جاری کیے گئے۔
- نواب مہدی نواز جنگ سابق گورنر گجرات ایوان اردو میں تشریف لائے۔ اور دارالمطالعہ میں کچھ وقت گزارا۔ وقار خلیل سے نواب صاحب نے ہند و پاک کے ادبی رسائل کے بارے میں گفتگو کی۔

منگل ۱۴ فروری: ۵ بجے شام: مشاورتی کمیٹی یوم محمد قلی کا اجلاس نواب عنایت جنگ کی صدارت میں بمقام "ایوان اردو" منعقد ہوا، اور طے کیا گیا کہ چند در چند وجوہ کے سبب یوم محمد قلی قطب شاہ کی سہ روزہ تقاریب مارچ

کے پہلے ہفتے میں منعقد ہوں۔

اتوار ۱۹ر فروری:- صبح ۱۱ بجے ایوان اردو میں مشاورتی کمیٹی یوم محمد قلی کا اجلاس نواب عنایت جنگ کی صدارت میں ہوا۔ اور ۴ تا ۶ مارچ کو یوم محمد قلی منائے جانے کا تصفیہ پایا گیا۔ نواب میر یٰسین علیخاں، جناب میر حسن، جناب مِن راج سکسینہ، جناب میر سراج الدین علیخان اور دو قابل صاحبان نے شرکت کی۔

۲۱ر فروری:- دہلی سے نکلنے والے "اردو ڈائجسٹ" جمالستان، بابتہ فروری، مارچ ۶۷ء میں جناب برقی آشیانوی کا طنزیہ "ایک کتاب کی رسم اجرا مطبوعہ سب رس" ڈائجسٹ ہوا۔

جمعہ ۲۴ر فروری: سابق فرمانروائے ریاست حیدرآباد نواب میر عثمان علیخاں حضور نظام ہفتم کی وفات حسرت آیات پر صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب اور معتمد ادارہ ڈاکٹر میڈراج سکسینہ صاحب نے نظام مرحوم کی علمی و ادبی اور فلاحی کاموں کو مشترکہ تعزیتی بیان میں بھرپور خراج عقیدت ادا کیا۔

ہفتہ ۲۵ر فروری: حضور نظام آصف جاہ سابع کی وفات پر ایوان اردو کے دفاتر ایک دن احتراماً بند رہے۔

اتوار ۲۶ر فروری: ۱۱ بجے ایوان اردو میں پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ کی صدارت میں جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔ اور کرسی صدارت سے اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع کی وفات حسرت آیات پر قرار داد تعزیت منظور کی گئی اور دو منٹ کی خاموشی کے بعد مرحوم کو فاتحہ گزرانی گئی۔ محمد جمال الدین صاحب منتظم ادارہ نے قرآن کی تلاوت کی۔

پیر ۲۷ر فروری ½ ۱۲ بجے۔ جناب ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی لکچرار شعبۂ اردو و عربی ماسری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی (آندھرا) نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

مارچ ۱۹۶۷ء

ہفتہ ۴ر مارچ۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ½ ۹ بجے شب نیرنگ پروگرام میں ادارہ کی "مطبوعہ کتاب" "سانولی" (اظہر افسر صاحب) ریڈیائی فیچر کا مجموعہ پر تبصرہ نشر ہوا۔

جمعہ ۱۰ر مارچ۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلہ میں جناب میر اکبر علی ناصری صاحب میئر بلدیہ عظیم تر حیدرآباد، علمی و ادبی اداروں کے سربراہوں اور مجلس مشاورت یوم محمد قلی، وارکین کی اپیل اخبارات میں شائع ہوئی۔

● روزنامہ سیاست حیدرآباد نے یوم محمد قلی کے موقع پر اپنے مخصوص کالم فکر و نظر میں یوم محمد قلی اور ادارہ کی علمی و ادبی خدمات کے بارے میں نوٹ شائع کیا۔

● روزنامہ ملاپ اور نگار سے میں بھی یوم محمد قلی کے سلسلے میں ادارہ کی طرف سے فرستادہ مضامین نظم و نثر شائع ہوئے۔

ہفتہ ۱۱ر مارچ: یوم محمد قلی قطب شاہ کا افتتاحی اجلاس ۵ بجے شام محمد قلی قطب شاہ کے گنبد پر منعقد ہوا جس میں ہزارہا افراد نے شرکت کی، بانی ادارہ ڈاکٹر زور صاحب نے ایوان شاعر کو خراج عقیدت ادا کیا۔

اتوار ۱۲ر مارچ ½ ۱۰ بجے صبح یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں نمائش آثار قطب شاہیہ اور ادبی اجلاس کا انعقاد عمل میں آیا۔

● اسی رات ½ ۹ بجے ایوان اردو میں غیر طرحی مشاعرہ کنج بہاری لال صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔

• مشاعرہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی ریڈیائی رپورٹ، آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے ایوان اردو میں نشر کے لئے ریکارڈ کی۔

دوشنبہ، ۱۳ر مارچ: ۵ ½ بجے شام ایوان اردو میں یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں تلنگو اجلاس منعقد ہوا۔

اپریل ۱۹۶۷ء

ہفتہ، ۱ر اپریل:۔ مشہور ہفتہ وار جریدہ بلٹنز اردو بمبئی کی اشاعت ۱۰ر اپریل میں یوم محمد قلی قطب شاہ کی مختصر رپورٹ مرتبہ جناب قادر جاوید صاحب شائع ہوئی۔

۱۰ر اپریل۔ اردو ادبی ڈائجسٹ ماہنامہ "شہکار" الہ آباد شمارہ ۵/ ۱۹۶۷ء میں سب رس میں مطبوعہ جناب اقبال مہناس کی غزل بحوالہ ڈائجسٹ شائع ہوئی۔

مئی ۱۹۶۷ء

جمعرات، ۱۱ر مئی۔ ۱۱ بجے صبح۔ جنوبی ہند کے مشہور شاعر جناب دانش فرازی اور آذر بیابانی نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۱۵ر مئی، ہفتہ وار "پرجا" نظام آباد کی اشاعت ۱۵ر اور ۲۵ر مئی میں دو قسطوں پر یوم محمد قلی قطب شاہ کی تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی۔

۱۶ر مئی:۔ ماہنامہ "جانثار" امرتسر بابتہ مئی ۱۹۶۷ء میں یوم محمد قلی کی تفصیلی رپورٹ مرتبہ دفار خلیل شائع ہوئی

۲۰ر مئی۔ جناب اقبال منیب ایڈیٹر ماہنامہ "شجر" برہانپور اور جاوید صاحب حیدرآبادی نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۲۷ر مئی۔ ماہنامہ "ماہ نو" دہلی بابتہ مئی ۱۹۶۷ء میں جناب مبارز الدین رفعت کا سب رس میں مطبوعہ مضمون بعنوان "سمرسٹ مام اور حیدرآباد" ڈائجسٹ ہوا۔

جون ۱۹۶۷ء

۳ر جون۔ ادارہ کے اردو امتحانات اردو فاضل، اردو عالم، اردو دانی، اور اردو زباندانی بابتہ جون ۱۹۶۷ء ۳ر جون سے ۸ر جون تک مراکز حیدرآباد اور اضلاع پر ایک ساتھ منعقد ہوئے۔ مرکز انوار العلوم کالج حیدرآباد جناب محمد اکبر الدین صدیقی نے صدر نگران کار اور حبیب عمر صاحب، ابو الفیض سحر صاحب، بشیر احمد خان اور حیدر علی صاحب نے معاون نگران کے فرائض انجام دئے۔ شعبۂ اناث کی صدر نگراں ڈاکٹر خالدہ بیگم صاحب اور مس افسری محبوب اور مس آمنہ الرشید نے معاون کی حیثیت سے تعاون دیا۔

مرکزی سنٹرل جیل پر محمد منظور احمد صاحب صدر نگراں رہے اور مسٹر ڈی وسنت راؤ، حبلر، الف خاں، اگرشنا وینکٹ نرسیا، محمد بشیر اور رائے گنیش پرشاد ماجیار نے تعاون عمل کیا۔ مرکز جونیر مرثیقا ہیڈ اسکول چمپا پیٹھ عبدالقدوس صاحب نے صدر نگراں کار کے فرائض دئیے۔ صدر مدرس صاحب اور جناب قطب الدین نے تعاون کیا۔

• مرکز بانسواڑہ ضلع نظام آباد پر شریف الدین شاکر نے ادارہ کی نمائندگی کی، ڈپٹی انسپکٹر اسکول اور نائب صدر پنچایت سمیتی اور ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول نے دوران امتحان معائنہ کیا۔

• مرکز بودھن ضلع نظام آباد پر عثمان بلیغ ... نے

[illegible] ورنگار کار کے فرائض انجام دیئے۔
مرکز بودھن ضلع عادل آباد پر ادارے کے امتحانات عارف احمد صاحب کی نگرانی میں منعقد ہوئے۔
مرکز محبوب نگر پر ادارے کی طرف سے جناب طیب انصاری نگران متعین کئے گئے تھے مسز ناظمی مس سونسارلوی [illegible] ب علی دارثی، غلام محمود اور محمود علی صاحبان نے مخلصانہ [illegible] ت کی۔

[illegible] مرکز نظام آباد پر ظہیر الدین صاحب صدر نگراں بلدیہ [illegible] قطب منظم علی صاحب معتمد مرکز نے تعاون عمل کیا۔
[illegible] آرمور ضلع نظام آباد پر عبد الوارث صاحب نے ادارہ کی نمائندگی کی، عبد المقتدر صدیقی صاحب کا تعاون حاصل ہوا۔

[illegible] جون، ماہنامہ تحریک دہلی (اقبال نمبر جون ۱۹۶۷ء)
[illegible] ادارہ کی مطبوعہ ڈاکٹر غلام عمر خاں کی دو کتابوں [illegible] کا تصور عشق اور اقبال کا تصور خودی) پر ڈاکٹر [illegible] یوسف الدین صاحب کے تبصرے شائع ہوئے۔
[illegible] نامہ جہان دہلی ۱۶ جون ۱۹۶۷ء کے سب رس میں [illegible] شاہد صدیقی لکھنوی کی نظم "گواہی" اور پروفیسر [illegible] احمد فخر کی غزل ڈائجسٹ کی۔

[illegible] جون ۹½ بجے شام ایوان اردو میں پروفیسر [illegible] اکبر صاحب کی صدارت میں "یادگار شام افسانہ" کی [illegible] منعقد ہوئی۔ جس میں محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ اور [illegible] مہدی صاحبہ دہلوی کا خیر مقدم کیا گیا اور ان [illegible] افسانہ نگاروں کے علاوہ محترمہ جیلانی بانو [illegible] زینت ساجدہ، محترمہ آمنہ ابو الحسن، محترمہ [illegible] وانی اور محترمہ لکشمی دیوی راج نے اپنی تازہ اور دلچسپ کہانیاں سنائیں۔ شام افسانہ سے قبل کرسیٔ صدارت سے حضرت آثر لکھنوی اور جناب شاہد احمد دہلوی کی علمی و ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے قرار داد تعزیت منظور کی گئی۔ شام افسانہ کی تقریب میں حیدرآباد کی ممتاز خواتین کے علاوہ ادیبوں، شاعروں اور مشاہیر کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ محترمہ بانو طاہرہ سعید کنوینر شام افسانہ نے شکریہ ادا کیا۔

۱۹؍ جون۔ جناب ہادی بلگرامی صاحب سابق ناظم اسٹیٹ آرکائیوز آندھرا پردیش نے ایوان اردو کے آڈیٹوریم، دار المطالعہ اور میوزیم کا معائنہ کیا۔

۲۸؍ جون، نواب مہدی نواز جنگ پرو چانسلر جامعہ عثمانیہ کی وفات حسرت آیات پر ایوان اردو کے دفاتر ایک دن کے لئے اظہار غم بند رہے۔ ادارہ کی طرف سے جلوس جنازہ میں شرکت کی گئی۔ صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر نے تعزیتی بیان جاری کیا۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ، جناب حامد علی عباسی صاحب رکن مجلس انتظامی ادارہ اور جناب میر سراج الدین علیخان آفس سکریٹری ادارہ نے بیگم مہدی نواز جنگ کو ان کے گھر پر تعزیت دی۔

جولائی ۱۹۶۷ء

یکم جولائی۔ ڈاکٹر فتح حسین لکچرر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے ایوان اردو کے مہمان خانے میں قیام کیا اور ادارہ کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔

۲؍ جولائی۔ ۱۰ بجے صبح ادارہ ادبیات اردو [illegible] آزاد [illegible] ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے جناب [illegible] گپتا صاحب کی صدارت میں نواب مہدی نواز جنگ کی تعزیت [illegible]

کو خراج عقیدت ادا کرنے کی غرض سے جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔
پروفیسر سید علی اکبر، ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ، سابق گورنر یوپی
بیرسٹر میر اکبر علی خاں ایم پی، پروفیسر منیر سراج سکینہ، راجہ
سیاہ ورنیا لال ایم پی، محترمہ رُوداستری ایم ایل اے، مولوی
خواجہ محمد احمد نے تقریریں کیں، ڈاکٹر غیاث صدیقی، قاری جلیل
اور صلاح الدین نیر صاحبان نے منظوم خراجِ عقیدت ادا
کیا۔ قاری وارث محمد خاں کی قراءت ہوئی۔ اور کرسی صدارت
سے قرارداد تعزیت پیش اور منظور کی گئی۔

۲ر جولائی۔ ڈاکٹر محمد اسلام صاحب ریسرچ اسکالر لکھنؤ
یونیورسٹی نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۴ر جولائی۔ جناب حبیب الرحمان چغتائی (آزاد لائبریری
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے ادارہ کے تمام شعبوں بالخصوص کتب خانہ
کا تفصیلی معائنہ کیا۔

• ادبی ڈائجسٹ ماہنامہ "جمالستان" دہلی بابتہ جولائی
میں سب رس میں مطبوعہ باقر منظور صاحب کی غزل
ڈائجسٹ ہوئی۔

۵ر جولائی :- کمیٹی اردو امتحانات ادارہ ادبیات
اردو کا اجلاس پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی زیر صدارت
منعقد ہوا۔ اور امتحانات منعقدہ جون ۶۷ء کی منظوری
دی گئی اور اخبارات اور مراکز پر نتائج جاری کئے گئے۔
پروفیسر سید محمد، مولوی غلام رسول، جناب محمد اکبر الدین صدیقی
اور معتمد اردو امتحانات مولوی عارف الدین حسن صاحبان
نے کمیٹی میں شرکت کی۔

۲۳ر جولائی :- دن کے ۱۰ بجے ریاستی محکمہ اطلاعات و تعلقات
عامہ کے ناظم نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

اگست ۱۹۶۷ء

۲ر اگست۔ جناب نسیم اختر ایڈیٹر ماہنامہ "شب" ڈائجسٹ
سکندرآباد (دکن) نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

پیر ۷ر اگست صبح ٹھیک ۹ بجے۔ مرکزی وزیر پیشتی تر[illegible]
و مسلم اوقاف جناب فخر الدین علی احمد صاحب [illegible]
اردو کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ صدر و معتمد ادارہ [illegible]
نے موصوف کا خیر مقدم کیا اور گلپوشی کی گئی۔ و[illegible]
فی البدیہہ تہنیتی قطعہ سنایا۔ مرکزی وزیر نے دوران [illegible]
کی کارکردگی پر اظہار خوشنودی فرمایا اور غالب
تقاریب کے سلسلے میں جس کے موصوف مرکزی کمیٹی
بھی ہیں، ادارہ سے تعاون عمل کی خواہش کی۔ ڈاکٹر
سکینہ معتمد ادارہ نے موصوف کی خدمت میں تما[م]
مطبوعہ ادارہ کی مطبوعات کا سٹ تحفتہً پیش [کیا]
خیر مقدمی محفل میں مولوی ذوالفقار حسین، مولوی [illegible]
مولوی خواجہ محمد احمد، مولوی محمد اکبر الدین صد[یقی]
عارف الدین حسن، مولوی سید شاہ نقی الدین
مولوی میر سراج الدین علی خاں اور مولوی محمد جا[illegible]
جناب ترصیص الدین انصاری صاحبان شر[یک]

۹ر اگست :- ۳ بجے۔ محترمہ سلطانہ شرف ا[illegible]
مدرسہ فوقانیہ نسوان نامپلی نے ایوان ا[ردو کا تفصیلی معائنہ]
کیا۔

• ۴ بجے۔ مسٹر رچرڈ، امریکن ریسرچ ا[سکالر نے]
میوزیم اور آثار قطب شاہیہ و مغلیہ کا[...]
میں تفصیلی معائنہ کیا۔

۱۲ر اگست، ماہنامہ "کتاب نما" دہلی [illegible]

[اد]ارہ کی طرف سے مطبوعہ جناب اطہر افسر صاحب
[کے ڈ]راموں کا مجموعہ "سانولی سے ایک پیچر" زوہی
والہ [illegible] ہوا۔

۲۴ اگست ۔ ۶½ بجے۔ اردو کے مشہور شاعر
جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (دہلی) کی آمد اور
خیر مقدم میں ایک مخصوص محفل شعر ایوان اردو میں
منعقد ہوئی ۔ علامہ حیرت بدایونی نے صدارت کی اور
[illegible]کار خلیل نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔
جناب سحر اور مہمان شاعر شمسی مینائی کے علاوہ حضرت
[illegible]ج قریشی، مرزا شکور بیگ صاحب، ڈاکٹر غیاث صدیقی،
[س]لیمان خطیب، عظمت عبدالقیوم، جرات ندیم،
[illegible]تار خلیل، عشرت کرتپوری، ناز حیدر، صلاح الدین نیر
[illegible]سراج الدین علیخان، گیان سنگھ شاطر اور نسیم نصرتی
صاحبان نے کلام سنایا۔

[illegible] اگست :۔ مولانا سید عزالدین قادری ملتانی نے
[ای]وان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

[illegible] اگست :۔ عطاءالرحمٰن صاحب ارشاد مدیر ماہنامہ
[illegible] نگار، الہ آباد نے ایوان اردو کے تمام شعبوں کو ملاحظہ
فرمایا۔

[illegible] اگست : ماہنامہ "آجکل" دہلی کے اردو تحقیق
نمبر بابت اگست ۱۹۶۷ء میں جناب سید صلاح الدین
[illegible] کا ایک طویل مقالہ "اردو کے تحقیقی ادارے
اور محققین" شائع ہوا جس میں ادارہ کی علمی ادبی خدمات
اور بانی ادارہ ڈاکٹر زور پر سیر حاصل تبصرہ شامل ہے
[illegible] اقتباس "تاثرات" کے کالم میں افادیت کے
سبب شائع کیا جا رہا ہے)

۲۹ اگست ۔ جناب ولی اللہ سلفی جونیر
شعبہ فارسی پٹنہ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کے سلسلے میں
ایوان اردو کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا۔

۳۰ اگست، ماہنامہ "کتابی دنیا" کراچی بابتہ جون،
جولائی ۱۹۶۷ء میں یوم محمد قلی کی رپورٹ شائع ہوئی۔

ستمبر ۱۹۶۷ء

پیر ۴ ستمبر صبح ۹ بجکر ۴۰ منٹ پر عزت مآب عالیجناب
صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ادارہ ادبیات اردو
کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ ادارہ کی مجلس انتظامی کے تمام اراکین
اور مشاہیر نے صدر جمہوریہ کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس
موقع پر پدم شری حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی متولی ہمدرد
دواخانہ دہلی نے بھی ایوان اردو کا معائنہ فرمایا۔

۵ ستمبر ۶ بجے شام، مجلس انتظامی ادارہ کا اجلاس
ایوان اردو میں پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی زیر صدارت
منعقد ہوا۔ پروفیسر مہندر راج سکسینہ معتمد اعزازی ادارہ
نے موازنہ برائے منظوری پیش کیا۔ اس کے علاوہ کمیٹی نے
"یوم زور" کے انعقاد کی منظوری دی اور غالب صدسالہ
تقاریب کے لئے مولوی سید [illegible] احسن صاحب کو مجاز گردانا
کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں۔ اس اجلاس میں رائے جانکی
پرشاد صاحب، نواب عنایت جنگ بہادر، مولوی محامد
علی عباسی، مولوی سید [illegible]، سید شاہ تقی الدین صاحب
قادری اور آنریری سکریٹری میر سراج الدین علی خاں صاحب
نے شرکت کی۔

سید دلدار حسین صاحب نے سابق چیف انجینئر دکن ادارہ
کے ہمراہ ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۳۱ ستمبر: ادارہ کی سالانہ رپورٹ" ادارہ سن ۱۹۶۶ء
میں مرتبہ وقار خلیل اور سب رس کا ادارت نمبر ایک ساتھ
شائع ہوئے۔

۱۴ ستمبر: ۴ بجے شام۔ محترمہ تارکشوری سنہا رکن پارلیمان
دہلی نے نامور شاعر مخدوم محی الدین صاحب اور جناب میر حسن
صاحب معتمد اردو مجلس کے ہمراہ ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ
کیا۔ اس موقع پر صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر بھی ادارہ
میں موجود تھے۔

۱۲ ستمبر: پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ نے سابق
ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ کی
وفات پر تعزیتی بیان جاری کرتے ہوئے آنجہانی کی ادارہ
سے وابستگی اور ۱۹۵۵ء میں آنجہانی کا ایوان اردو کا سنگ بنیاد
رکھے جانے کا ذکر کیا اور ان کی علمی و ادبی خدمات کو خراج عقیدت
ادا کیا۔

۲۴ ستمبر: یوم زور کے سلسلے میں بعد نماز عصر مسجد افضل گنج
میں ختم قرآن اور فاتحہ خوانی ہوئی اور بعد مغرب ڈاکٹر زور
کے والد حضرت زور کے مزار واقع خانقاہ عنایت اللہی پر
چادر گل چڑھائی گئی۔

۲۵ ستمبر: یوم زور منایا گیا۔ صبح ½۹ بجے ایوان اردو
میں نمائش مطبوعات و آثار و تحریرات زور کا افتتاح
نواب عنایت جنگ نے فرمایا۔ ڈاکٹر زور کی پانچویں برسی
کے موقع پر ½۱۰ بجے ایوان اردو میں ادبی اجلاس راجہ
جانکی پرشاد صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اسی روز
۹ بجے شب مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔

• یوم زور کے سلسلے میں روزنامہ سیاست
" ڈاکٹر زور " حافظ محی الدین حبیبی صاحب کا مضـ

۳۰ ستمبر: ماہنامہ محفل لاہور ستمبر ۱۹۶۷ء اور رتن
دت امرتسری کا سب رس میں مطبوعہ مضمون تحریر
بحوالہ " ڈائجسٹ ہوا۔

اکتوبر ۱۹۶۷ء

۵ اکتوبر: ماہنامہ حیاتستان دہلی اکتوبر ۶۷ء
سب رس میں مطبوعہ محترمہ جمیلہ بانو حسین کی کہانی بہ
"دوہرا کشادہ" ڈائجسٹ ہوئی۔

۲۴ اکتوبر: مشاعرہ یوم زور کا ریڈیو رپورٹ
ریڈیو حیدرآباد سے نشر ہوئی۔ جناب مرزا اظہر
نے مرتب کیا۔

۲۹ اکتوبر: ڈاکٹر عبدالعلیم نامی صاحب بمبئی
کا تفصیلی معائنہ کیا اور ادارہ میں اردو تحریر
مرزا شکور بیگ صاحب، میر حسن صاحب، مـ
ضیاء الدین احمد شکیب صاحب، میر سراج
اور وقار خلیل سے بات چیت کی اور دکن کی ا
سلسلے میں مطبوعہ مواد حاصل کیا۔

نومبر ۱۹۶۷ء

۲ نومبر: ماہنامہ "سنگم" بمبئی نومبر
میں سب رس کے ادارہ نمبر ۱۹۶۷ء پر تبصرہ

۳ نومبر: ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ
کی طرف سے حیدرآباد کے علمی و ادبی ادارہ
کی ایک میٹنگ منعقد کی گئی جس میں غالب صد

بارے میں غور کیا گیا۔ صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صدر
غالب کمیٹی ادارہ، مولوی سید دلدار حسین اور کنوینر غالب
کمیٹی۔۔۔ اور جناب میر سراج الدین علیخاں نے اس میں
شرکت کی اور اس کمیٹی نے بھی جناب دلدار حسین صاحب کو
مرکزی غالب کمیٹی حیدرآباد کا چیرمن اور پروفیسر سید علی اکبر صاحب
اور جناب میر سراج الدین علیخاں کو مرکزی کمیٹی کے اراکین منتخب ہوئے

۱۲ر نومبر:- جناب نذیر الدین احمد صاحب (مصنف رموز
طبابت) رکن بلدیہ چیلہ پورہ، حیدرآباد نے اپنے چند احباب کے
ہمراہ ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۱۷ر نومبر:- ڈاکٹر محمد باری مقیم امریکہ اور ادارۂ ادب اسلامیہ
ہند کے چھ اراکین جناب م۔ نسیم (لکھنو) جناب حفیظ پرتھی
جناب مختار احمد پرتھی، ڈاکٹر عباد احمد انصاری، جناب
سہیل احمد زیدی اور جناب شمیم سبحانی صاحبان نے ایوان
اردو کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۱۹ر نومبر:- ڈاکٹر محمد عبدالمطلب پروفیسر و صدر شعبہ پبلک
ایڈمنسٹریشن عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنی بیگم صاحبہ کے ہمراہ
ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۵ بجے شام۔ ایوان اردو میں مشاورتی کمیٹی یوم محمد قلی
قطب شاہ کا اجلاس پروفیسر سید علی اکبر کی صدارت میں منعقد
ہوا اور طے کیا گیا کہ ۱۲ر تا ۱۴ر جنوری ۱۹۶۸ء کو سہ روزہ
یوم محمد قلی قطب شاہ منایا جائے۔ اس کمیٹی میں نواب
عنایت جنگ بہادر، ڈاکٹر ہیندر راج سکسینہ، جناب
حامد علی عباسی، جناب رمن راج سکسینہ (معتمد یوم قلی)
جناب سید شاہ تقی الدین صاحب قادری، جناب میر حسن،
جناب ضامن علی فاری، جناب نذیر الدین احمد، جناب
ضیاء الدین احمد شکیب، جناب میر سراج الدین علیخاں، جناب
محمد اکبر الدین صدیقی، جناب وقار خلیل نے اور سید شاہ
صفی الدین قادری صاحب نے شرکت کی۔

دسمبر ۱۹۶۷ء

۵ر دسمبر:- ماہنامہ جالتان دہلی بابتہ دسمبر ۱۹۶۷ء
میں سب رس میں مطبوعہ محترمہ صغرا مہدی کی کہانی "ایک کہانی"
بحوالہ ڈائجسٹ ہوئی۔

۶ر دسمبر:- ادارہ کی مجلس انتظامی کا اجلاس ایوان اردو میں
صبح ۱۰ بجے پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا
جس میں ادارے کے دستور کے بارے میں غور کیا گیا۔ جناب بل،
بی، گپتا، نواب عنایت جنگ، مولوی سید دلدار حسین، مولوی
حامد علی عباسی، جناب سید شاہ تقی الدین قادری اور جناب
سراج الدین علیخاں صاحب نے شرکت کی۔

۱۴ر دسمبر:- ایوان اردو میں صبح ۱۰ بجے ادارہ کے انتظامی مسائل
پر غور کرنے کے لئے مجلس انتظامی کا اجلاس پروفیسر سید علی اکبر صاحب
صدر ادارہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔

جناب حامد علی عباسی، جناب بل، بی، گپتا، جناب
اکبر الدین صدیقی، جناب سید شاہ تقی الدین قادری اور
جناب میر سراج الدین علیخاں نے شرکت کی۔

۲۴ر دسمبر:- ادارہ کے اردو امتحانات حیدرآباد اور اضلاع
کے علاوہ میسور میں ۲۴ر تا ۲۶ر دسمبر ۱۹۶۷ء تین روز کے لئے ایک
ساتھ شروع ہوئے۔ مرکز اردو امتحانات میسور کے لئے بحیثیت
صدر نگران کار ادارہ کے مہتمم جناب محمد جمال الدین صاحب
مقرر ہوئے تھے۔ حیدرآباد کے مرکز انوار العلوم کالج پر امتحانات
پروفیسر محمد اکبر الدین صاحب صدیقی صدر نگران کار کی نگرانی میں باحسن انجام

اسی مرکز پر شعبۂ اناث کی صدر نگران ڈاکٹر خالدہ بیگم زیب دیگر معاونین مرکز انوار العلوم کالج میں بشیر احمد صاحب، حیدر علی صاحب، مہدی حسین صاحب اور امتہ الرشید صاحبہ قابل ذکر ہیں۔

اس مرکز پر دوران امتحان جناب محمد علی خاں صاحب پرنسپل انوار العلوم کالج پروفیسر سید محمد صاحب، مولوی عارف الدین حسن صاحب معتمد اردو امتحانات ادارہ اور جناب میر سراج الدین علی خاں آفس سکریٹری ادارہ نے معائنہ کیا۔

جناب محمد منظور احمد صاحب لکچرار کریم نگر کالج نے جے سی اسکول چھپا پیٹھ کے مرکز پر امتحانات کی نگرانی فرمائی۔ مرکز کرنول کے صدر نگران ظہیر الدین صاحب تھے۔ اور مرکز کرنول میں ادارے کے امتحانات شریف الدین صاحب کی نگرانی میں انجام پائے۔ مراکز محبوب نگر، بانسواڑہ اور آرمور پر علی الترتیب عبدالقدوس صاحب مدرس، عارف احمد صاحب اور مصباح الدین صاحب نے صدر نگران کار کی خدمات انجام دیں۔

اعداد و شمار

استفادہ کتب خانہ و دارالمطالعہ عام ایوان اردو

جنوری تا دسمبر ۱۹۶۷ء

O

جنوری:	(۴۷۲)	افراد	جولائی:	(۴۷۰)	افراد
فروری:	(۲۳۰)	"	اگست:	(۴۴۰)	"
مارچ:	(۳۴۰)	"	ستمبر:	(۳۵۵)	"
اپریل:	(۳۶۸)	"	اکتوبر:	(۴۰۳)	"
مئی:	(۴۷۰)	"	نومبر:	(۴۵۱)	"
جون:	(۲۶۲)	"	دسمبر:	(۴۹۳)	"

کتب خانہ اور دارالمطالعہ

ایوان اردو

اوقات: ۱۰½ ساعت صبح تا ۴½ ساعت شام

اپنے علمی و ادبی ذوق کی تکمیل کیلئے اردو کی قدیم و جدید مطبوعات اور رسائل سے استفادہ فرمائیے۔

امتحانات ادارۂ ادبیات اردو

اردو فاضل، اردو عالم، اردو دانی، زبان دانی میں شریک ہو کر گریجویٹ ہو جائیے۔ (۴۰) پیسے کے ٹکٹ بھیج کر طلب کیجئے۔ شعبۂ اردو امتحانات، ایوان اردو

ایوان اردو

دکھنی تہذیب کا مرقع ہے، اس کا مشاہدہ اگر آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا ہے تو اولین فرصت میں تشریف لائیے۔ اور اپنی تہذیبی سرمایہ کی باقیات کا اندازہ کیجئے

یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۶۷ء

ایک جائزہ

مرتبہ وقار خلیل

اردو زبان کے پہلے صاحب دیوان شاعر اور فرخندہ بنیاد ہر حیدرآباد کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی ۔ ۱۵۶۵ء تا ۱۶۱۱ء) کی ادبی تہذیبی اور تمدنی خدمات اور رناموں کو ادارۂ ادبیاتِ اردو" حیدرآباد کی جانب سے سہ روزہ دم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب کے ذریعہ بھرپور خراج عقیدت داکیا گیا۔

محمد قلی کی (۳۵۵) ویں برسی کے موقع پر سہ روزہ تقاریب !آغاز ۷ مارچ ۱۹۶۷ء کی سہ پہر گورستان شاہی (گولکنڈہ) یں محمد قلی کے وسیع و عریض چبوترے پر دوپہر ہی سے چہل پہل شروع ہوئی۔ یوم محمد قلی کے معتمد جناب رحمن راج سکینہ ایڈوکیٹ نے جلسے کے آغاز کا اعلان کیا۔ دکن کے علم دوست، معارف نواز اور بزرگ پیرانہ سال نواب مہدی نواز جنگ سابق گورنر گجرات) [illegible] افتتاحی اجلاس کی صدارت فرمائی۔

مقبول موسیقار عابد علیخاں نے محمد قلی کی مناجات ساز [illegible]ی اور پھر ادارۂ ادبیات اردو کے معتمد ڈاکٹر مہندر راج [illegible] سکینہ نے خیر مقدمی تقریر ارشاد فرمائی اور کہا کہ "تاریخ [illegible]یں قطب شاہی سلاطین" بالخصوص محمد قلی نے عدل و انصاف [illegible]نسانیت کی جو مثالیں قائم کی ہیں، ان کی نظیر ملنا مشکل ہے" [illegible] حضرت آصف سابع نواب میر عثمان علیخاں مرحوم کے زرین دور حکومت، علمی ادبی سرپرستی کو بھرپور خراج عقیدت ادا کیا، اور کہا کہ حضرت آصف سابع جدید حیدرآباد کے معمار تھے۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ہم یہاں دکن کی دو عظیم المرتبت شخصیتوں کی یاد تازہ کر رہے ہیں، محمد قلی نے اس شہر کی بنا ڈالی اور آصف سابع نے اس شہر کو ترقی دی اور اس کے حسن کو دوبارہ کیا۔"

نواب مہدی نواز جنگ نے افتتاحی تقریر ارشاد فرمائی اور کہا کہ اس گنبد کے اندر جو جسم دفن ہے، اس کی روح کے پیام کو سمجھنے اور مل جل کر رہنے کا سبق سیکھنا ہے۔ محمد قلی کی یاد کو منانا اچھا کارنامہ ہے مرحوم دوست ڈاکٹر زور نے اپنی فراست، دانشمندی اور تدبر سے اس تقریب کا آغاز کیا جو دکن کی تاریخ میں یادگاری حیثیت کی حامل بن گئی ہے

ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر سید محمد اکبر صاحب صدر ادارۂ ادبیات اردو نے اس موقع پر ملنے والے پیامات سنائے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ ہند، محترمہ اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند اور جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ جناب غلام محمد صادق، ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے اپنے پیامات میں محمد قلی کی روایتوں، عہد حکومت، شعر و ادب کی ترقی اور ہم آہنگی کو سراہتے ہوئے "یوم محمد قلی" کی تقاریب کی کامیابی کی تمنائیں ظاہر کیں۔

گیا۔ اس کے بعد عظیم تر حیدرآباد کے میئر جناب میر اکبر علی خاں نے شہر حیدرآباد کے بانی کو خراج عقیدت ادا کیا اور کہا کہ "آج ہندوستان محمد قلی کی روایات کا خطرہ ہے اس زوال رو ا کی تہذیب اس کا طرز جہاں بانی ہندوستانی کلچر کے فروغ کی کوشش یقینی ہے، آندھرا ویسی ہی نہیں پورے ہندوستان میں برقرار رہیں گی اور محمد قلی بھی زندہ جاوید رہے گا"۔ ارمان فاروقی نے ممتاز شاعر مخدوم محی الدین کی نظم "چاند تاروں کا بن" ترنم سے سنائی اور پھر صلاح الدین نیر نے "دنیا کا شہر" کے عنوان سے محمد قلی کو خراج عقیدت ادا کیا۔

جناب عابد علی خان ایڈیٹر روزنامہ سیاست حیدرآباد نے اپنی پُر اثر تقریر میں کہا کہ شہر حیدرآباد کے بانی محمد قلی نے ہمیں صرف ایک خوبصورت شہر ہی نہیں دیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک عظیم اور تاریخی روایات کا ورثہ بھی دیا ہے جس کی وجہ سے ہمارا یہ پیارا شہر تمدن و تہذیب، معیشت اور خوشحالی کا ایک قابل فخر سرمایہ اور قیمتی ورثہ ہے۔ گولکنڈہ کے شاہی خاندان نے عوام سے ربط ضبط، قریبی تعلق اور مقامی حالات و مسائل سے واقفیت کا وہ سلسلہ شروع کیا تھا وہ خانوادۂ آصفی کو بھی ورثہ رہا ہے۔ حضرت آصف سابع کا ذکر کرتے ہوئے جناب عابد علی خان نے بتایا کہ محمد قلی نے تہذیبی اتحاد اور فرقہ وارانہ دوستی اور رفاقت کی جو شمع جلائی تھی اس کی روشنی دکن میں آج بھی پھیلی ہوئی ہے اس روشنی کا جیتا جاگتا ثبوت ہمیں ابھی گزشتہ ماہ حضور نظام آصف سابع کے جلوس جنازہ میں ملا ہے۔

نواب مہدی نواز جنگ نے اس موقع پر ادارہ کی طرف سے مطبوعہ کتابوں کی رسم اجرائی انجام دی۔ "اقبال کا تصور خودی" (ڈاکٹر غلام عمر خاں)، "تاریخ ادا" (مرتبہ ادارہ کا ساتواں ایڈیشن)، "سا نولی" کے ڈراموں کا مجموعہ) کو اس کے مصنفوں نے قبول کے بعد میں کلیاتی تقریری اور تحریری مقابلوں اول و دوم پانے والوں نے ادارہ کی طرف سے نواب صاحب کے ہاتھوں خوشی اور مسرت کے تالیوں کی گونج میں حاصل کئے۔

جوان سال موسیقار عابد علی خاں نے محمد قلی دلکش ترنم میں سنا کر داد حاصل کی اور پھر اغزر ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے نواب مہدی پروفیسر سید علی اکبر میر بلند ناصری صاحب اور ا کی موجودگی میں مزار محمد قلی پر چادر گل چڑھائی گئی قاری کلیم اللہ حسینی کی قراءت اور فاتحہ خوا عباس عابدی صاحب نے محمد قلی کا دکنی مرثیہ سنا قوالی بھی ہوئی اور ۹ بجے شب مشیر سن را تقاریب یوم محمد قلی کے سلسلہ پر افتتاحی اجلا کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

اتوار ۱۲ مارچ کی صبح ½ ۱۰ بجے ایوان ا کے ایک حصے میں علم و ادب کے شیدائیوں نے نما "قطب شاہیہ" ملاحظہ فرمائی۔ جناب میر کنوینر نمائش تھے۔

پروفیسر سید علی اکبر کی صدارت میں ا منعقد ہوا۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں نے "قطب کی بازیافت" کے زیر عنوان علمی مضمون سنایا قطب شاہی عہد کے گم گشتہ ادب پاروں کا

کا آغاز اب سے ۳۵ برس پہلے ہوا۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، پروفیسر سید محمد، محمد بن عمر اور دیگر محققوں نے مختلف شعری و نثری مخطوطات و مسودات کو تحقیق اور لگن کے ساتھ مرتب کرکے شائع کرنا شروع کیا۔"

ڈاکٹر سروجنی ریگانی نے انگریزی میں تاریخی حقائق پر مشتمل تقریر کرتے ہوئے "قطب شاہی عہد کی تہذیبی یک جہتی" پر روشنی ڈالی اور کہا کہ "اکبر کے بعد محمد قلی ہی وہ فرماں روا گذرا جس کا دور حکومت قومی اور تہذیبی ایک جہتی کے لئے درخشاں رہا ہے۔

جناب ضیاءالدین احمد شکیب نے محمد قلی کی شاعری کی خصوصیات کے بارے میں پر مغز مقالہ سنایا اور کہا کہ "محمد قلی بنیادی طور پر جذبہ اور نغمہ کا شاعر ہے اس کے کلام سے اس زمانہ کی معاشرت اور کلچر کا تصور قائم کیا جا سکتا ہے"

جناب سرینواس لاہوٹی نے طویل اور معلوماتی مقالہ میں حیدرآباد میں قطب شاہی آثار" کا جائزہ لیا اور بتایا کہ "فن تعمیر سو دلی پذیر اور عظیم نمونہ قطب شاہوں کا دور حکومت رہا ہے"

مولوی خواجہ محمد احمد صاحب نے "دکنی آثار اور تمدن پر قطب شاہوں کا اثر" کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ محمد قلی صرف حق پرست ہی نہیں تھا بلکہ وہ حسن آفرین بھی تھا،

جناب میر یسین علیخان محترمہ خورشید نذیر اور جناب سراج حیدرآبادی نے محمد قلی کی شخصیت، عہد، فکر و فن اور آثار قطب شاہیہ کے تعلق سے نظمیں سنائیں۔

پروفیسر سید علی اکبر نے صدارتی تقریر فرمائی اور کہا تو اس تقریب کے بانی ڈاکٹر زور مرحوم نے دکنی ادب، تہذیب

کی بازیافت اور اس کی نشاۃ ثانیہ میں گرانقدر حصہ لیا ہے، دکن میں محمد قلی اور حضرت سلطان العلوم آصف سابع مرحوم کے دور حکومت میں علم و ادب کی ترقیوں کے ساتھ محبت، شرافت اور رواداری کی قدریں بھی پروان چڑھیں اور اب ان اقدار کی حفاظت ہم سبھوں کا فرض ہونا چاہیئے۔ جناب بیر حسن معتمد ادبی اجلاس کے شکریہ پر ادبی اجلاس برخواست ہوا۔

اسی رات ۹½ بجے "ایوان اردو" کے حسین و جمیل آڈیٹوریم میں ایک یادگار غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ صدر مشاعرہ راجہ کنج بہاری لال معتمد صحت عامہ و حکومت مقامی آندھرا پردیش کی آمد کے فوری بعد دو مرغی شمعیں روشن کی گئیں محمد قلی کی غزل ارمان فاروقی نے ترنم میں سنا کر سامعین کو مسحور کر دیا۔ علامہ حیرت بدایونی، حضرت تاج قریشی، ضیاءالدین احمد شکیب، مظہر کامل، وقار خلیل، محترمہ کرتی، خورشید نذیر، اسد انصاری، صلاح الدین نیر، سراج تیر، سراج حیدرآبادی، فیض الحسن خیال، عباس عابدی، علی الدین نوید، ستار عشقی، ارمان فاروقی اور راجے کرشن پرشاد کرتی نے کلام سنایا۔ معتمد مشاعرہ محترمہ عائشہ رشاد نقش۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے یوم قلی کے افتتاحی اجلاس اور مشاعرہ کی رپورٹ نشر کی گئی۔

دوشنبہ ۱۳ مارچ کی شام "ایوان اردو" یوم محمد قلی قطب شاہ کی سہ روزہ تقاریب کا اختتام "تلگو ادبی اجلاس" پر ہوا۔ تلگو، اردو اور دوسری بولنے والوں کی کثیر تعداد نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ ڈاکٹر وینکٹ اودھانی صدر شعبۂ تلگو جامعہ عثمانیہ نے اس جلسہ کی صدارت کی۔

رپورٹ یوم زور

منعقدہ ۲۴/ستمبر ۱۹۶۷ء

ادارۂ ادبیات اردو کے بانی ملک کے ممتاز محقق، مایہ ناز انشاء پرداز ادیب اور دلستانِ دکن کے معلم ڈاکٹر سید
ی الدین قادری زور مرحوم کی پانچویں برسی کے موقع پر "یوم زور" ۲۴ ستمبر ۱۹۶۷ء کو ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام
ایوان اردو میں منایا گیا۔ ہفتہ ۲۳ ستمبر کو بعد نماز عصر مسجد فضل گنج میں قرآن خوانی اور فاتحہ ہوئی بعد مغرب ڈاکٹر زور
کے والد محترم حضرت زعم کے مزار واقع خانقاہ عنایت الٰہی پر چادر گل چڑھائی گئی۔

اتوار ۲۴ ستمبر کو صبح ۹ بجے ایوان اردو کے شعبہ دار المطالعہ میں نمائش مطبوعات و آثار ڈاکٹر زور کا نواب عنایت جنگ بہادر
کے ہاتھوں افتتاح عمل میں آیا۔ میر سراج الدین سلیمان صاحب نے یہ نمائش بڑی محنت اور سلیقہ سے ترتیب دی تھی،
علم دوست احباب کی خاصی تعداد نے اس نمائش کو دیکھا۔

اسی روز صبح ۱۰½ بجے ایوان اردو کے خوبصورت آڈیٹوریم میں جناب رائے جانکی پرشاد صاحب کی صدارت
میں ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے اس تقریب کے مہمان
خصوصی جناب جے، وی، نرسنگ راؤ صاحب وزیر تعمیرات و مواصلات آندھرا پردیش کی سماجی اور علمی و قومی خدمات
کی ستائش کی اور ڈاکٹر زور کی یاد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ "مرحوم نے اردو ادب کی ترقی اور دکنی
کلچر کی بقا کے لئے جو عظیم الشان کام کیا ہے۔ آج کے جلسے میں ممتاز مقررین اُن پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔ پروفیسر سید علی اکبر
نے سرسری طور پر ادارے کے علمی و ادبی کاموں کا ذکر کیا۔

ریاستی وزیر جناب جے، وی، نرسنگ راؤ صاحب نے یوم زور کے ادبی اجلاس میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور
کی خدمات کی ستائش کی اور بتایا کہ "ڈاکٹر زور کا شمار عالموں میں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ملی جلی ہندوستانی تہذیب کی
بنیادوں کو دکن میں مستحکم کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے ادارہ قائم کر کے دکنی زبان اور ادب کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔
دکنیات پر نہ صرف خود انہوں نے تحقیقی کارنامے انجام دیئے بلکہ وہ اپنے ساتھ پروفیسروں، ادیبوں اور شاگردوں
کے ایک بڑے گروہ کو لے کر آگے بڑھے اور اس کاروان کی رہنمائی کی۔ ڈاکٹر زور بجائے خود ایک انجمن تھے۔" جناب نرسنگ راؤ صاحب
نے آخر میں فرمایا کہ "بقول ... ڈاکٹر زور کی وفات سے نہ صرف اردو زبان کے تحقیقی کاموں کو
نقصان پہنچا ہے بلکہ ہندوستان کی ثقافت کا بھی نقصان ہوا ہے۔ اب ہم سب کا فرض ہے کہ انہوں نے جو چراغ جلا

اور روشن کریں اور اُن کے نقش قدم پر چلکر دکنی ادب اور دکن کے تمدن کو آگے بڑھائیں "۔

جناب رحمن راز صاحب سکریٹری نے یوم زورؔ کے سلسلے میں آئے ہوئے پیامات سنائے جن میں ایچ ای ایچ نظام ہفتم نواب میر برکت علیخاں بہادر، پروفیسر ہمایون کبیر، جناب جی یم صادق چیف منسٹر کشمیر، ڈاکٹر تارا چند، نواب علی یاور جنگ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر محمد مجیب جامعہ ملیہ دہلی اور نثار احمد فاروقی صاحب نے اپنے پیامات میں ڈاکٹر زورؔ کی علمی و ادبی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا تھا۔

ممتاز اور صف اول کے شاعر جناب مخدوم محی الدین صاحب نے ڈاکٹر زورؔ کو بہ حیثیت استاد محقق، عالم اور ماہر صوتیات یاد کرتے ہوئے کہا کہ ادارہ ان کی بڑی یادگار ہے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے ڈاکٹر زورؔ کی پہلی اور قابل قدر تصنیف "روح تنقید" کے پیش نظر اردو تنقید میں ڈاکٹر زورؔ کا مقام " کے زیر عنوان علمی اور تحقیقی مقالہ سنایا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے ڈاکٹر زورؔ کے لسانیاتی شعور" پر اپنا مقالہ پڑھا اور کہا کہ "جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا لوگ زورؔ صاحب کے لسانیاتی شعور کا لوہا ماننے لگیں گے اور اس مسلم ادیب کی کوششوں کو بھلایا نہ جا سکے گا"۔

پروفیسر حسینی شاہد پرنسپل اردو کالج نے ڈاکٹر زورؔ کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی اور کہا کہ ڈاکٹر زورؔ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دکن میں شمال والوں کی مرعوبیت پر ان کی ٹھیکیداری کا قلع قمع کیا "۔

پروفیسر عالم خوندمیری نے کہا کہ "ڈاکٹر زورؔ نے دکنی تہذیب کو نئی زندگی بخشی" ڈاکٹر غیاث صدیقی، جناب خیرات ندیم اور شارہ چشتی صاحب نے منظوم خراج عقیدت ادا کیا۔ جناب میر حسن کے شکریہ پر ادبی اجلاس برخواست ہوا۔

اسی رات ½9 بجے ایوان اردو میں غیر طرحی محفل شعر جناب ہاشم علی صاحب ڈپٹی سکریٹری، حکومت آندھرا پردیش کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مشاعرہ کا آغاز ڈاکٹر زورؔ کے کلام کے ٹیپ ریکارڈ سے ہوا۔ مرزا شکور بیگ۔ بانو طاہرہ سعید، ڈاکٹر اختر احمد، ڈاکٹر غیاث صدیقی، خیرات ندیم، طالب رزاقی، ضیاء الدین احمد شکیب، وقار خلیل، خورشید مدبر، صلاح الدین نیر، فیض الحسن خیال، داؤد نصیب، گیان سنگھ شاطر، شارہ چشتی، شمیم نصرتی، صمصام شیرازی، سراج حیدرآبادی، علی الدین نوید، فاضل ادیب، یعقوب ابوالعلائی اور نعیم راہی نے کلام سنایا۔ محترمہ عائشہ رشاد ختم مشاعرہ کے شکریہ پر محفل شعر اختتام کو پہنچی۔

ادارے کا ترجمان ماہنامہ سب رس

"ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" جنوری ۱۹۳۸ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جنوری
سے یہ اپنی عمر کے اکتیسویں (۳۱) سال میں داخل ہو چکا ہے۔ اس طرح سب رس نے علم و ادب، تاریخ و تنقید، شعر، زبان کی تین دہائیوں
عبور کر لی ہے۔ ادارہ کے بانی اور معتمد اول "سب رس" کے موسس اور نگراں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کی ادبی یادگار ہونے
بھی سب رس کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر زور کے بعد یہ رسالہ ملک کے نامور اور بزرگ ماہر تعلیم صدر ادارہ جناب پروفیسر سید محمد اکبر صاحب کی ادا
میں ادارے کے قابل اعتماد اعزازی پروفیسر مہندر راج صاحب سکسینہ صدر شعبہ نباتیات جامعہ عثمانیہ کے تعاون اور جناب محمد اکبر الدین م
لیکچرار اردو ویمنس کالج کی معتمدی اور مجلس مشاورت کے محترم اراکین جناب میر حسن ایم اے سابق اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو
جناب ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ریڈر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی محترما
جناب رمن راج سکسینہ ایڈوکیٹ اور جناب محمد منظور احمد صاحب ایم اے لیکچرار اردو ویمنس کالج کریم نگر کے تعاون عمل اور دو قا
انتظامی کے اشتراک سے "سب رس" ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

۱۹۶۸ء میں سب رس نے اپنے پڑھنے والوں کو پورے بارہ (۱۲) شمارے دیئے، جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۰۹۵ ہوتی ہے
سب رس کو کسی ادبستہ تعلق۔ مضامین اور تحقیقی مقالوں کی اشاعت میں شروع ہی سے امتیاز حاصل رہا ہے۔ ہند و پاک کی جامعات میں جو
دیکھا جا رہا ہے، وہاں وہاں سب رس سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں ادارہ نمبر کے علاوہ دیگر پابندی سے شائع
شماروں میں ادب، تحقیق، تنقید، شعر اور افسانے کے باب میں بہت سی معیاری تحریریں شائع ہوئیں، جنھیں دیگر معاصرین نے افادہ
جن میں نظر اپنے اخبارات و رسائل میں حوالے کے ساتھ ڈائجسٹ کیا ہے۔

ایک سال میں سب رس نے مختلف تحقیقی، تنقیدی، علمی اور شعری تحریریں شائع کیں، جن میں (۶۲) مضامین (۱
۱)، غزلیں (۴۲)، افسانے (۱)، ایک طنزیہ۔ ڈرامہ، ایک مضمون اور ایک ڈرامہ کے علاوہ (۶۳) نئی کتابوں اور (۲۲) رسالوں پر تبصرے و
[illegible]
[illegible]

[illegible] (ادارہ)

فہرست مضامین مطبوعۂ "سب رس" حیدرآباد دکن

جلد ۳۰ شمارہ ۱ تا ۱۲ — جنوری تا دسمبر ۱۹۶۷ء

عنوان	مضمون نگار	صراحت مہینہ
وجہی کا نظریۂ ادب	سید خواجہ حسینی	جنوری
میٹھے بچن سناؤں (نفرتی)	محمد اکبر الدین صدیقی	"
صفی اور محاورے	رائے محبوب نرائن کرگو	"
حضرت صفی مرحوم کی بدیہہ گوئی	محی الدین احمد	"
غم فانی	وحید النساء	"
رابرٹ فراسٹ	پروفیسر حسرت سہروردی	"
پروفیسر حیدر علیخاں سے ایک انٹرویو	آذر بیابانی	"
سمرسٹ مام اور حیدرآباد	سید مبارز الدین رفعت	فروری
فوق البشر	ڈاکٹر صفدر علی بیگ	"
لکھنؤ، اردو شاعروں کے آئینے میں	سید احتشام احمد ندوی	"
اردو ناول اور ترقی پسند تحریک	حسرت کاسگنجوی	"
…عہد متوسط میں ہندوستان کی …مسلمانوں کی دین	ابو عمران عبدالاحد	"
…کی شخصیت اور شاعری	مصطفیٰ کمال احمد	"
…ہ زندگان، چرخ شعبدہ باز	اندرجیت دتا امرتسری	مارچ

نمبر	عنوان	مضمون نگار	صراحت مہینہ
۱۵	اردو سے قبل ہندوستان کا تہذیبی اور لسانی جائزہ	عبدالاحد	مارچ
۱۶	مسائل ادب	ملک زادہ طیب انشائی	"
۱۷	شہر کلکتہ، ادبی آئینہ میں	ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی	اپریل
۱۸	حقیقت انسانی	ڈاکٹر صفدر علی بیگ	"
۱۹	لکھنؤ کی لسانی تحریک اور تاریخ	رام آسرا جھنجھی	"
۲۰	ویدک عہد میں علوم و فنون اور صنعت و تجارت کی پیش رفت	جلال شاہجہانپوری	"
۲۱	میر عثمان علیخاں	احمد علیخان	"
	ہماری زبان کا اداریہ دیکھیے	ادیب	"
۲۲	عارف رستم آبادی	پروفیسر میر محمود حسین	مئی
۲۳	محمد قلی قطب شاہ سے آصف سابع تک	عابد علیخان	"
۲۴	حیدرآباد میں قطب شاہی آثار	سری نیواس لاہوٹی	"
۲۵	رام پور آئینۂ شاعری میں	ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی	"
۲۶	اکبر کی شاعری میں ہندو تہذیب	پروفیسر عنوان چشتی	"

نمبر	عنوان	مضمون نگار	اشاعت مہینہ	نمبر	عنوان	مضمون نگار
۲۷	ذوقِ جمال (ایک مطالعہ)	پروفیسر سلطان احمد صدیقی	مئی	۴۶	تذکرہ زندگان۔ فسانہ آزاد	اندرجیت
۲۸	براہمی رسم الخط	ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی	جون	۴۷	شاہانِ آصفیہ اور فرقہ وارانہ	محی الدین حبیبی
۲۹	دیوناگری رسم الخط	ڈاکٹر وی بی اگروال	″		ہم آہنگی	
۳۰	آصفجاہ اول و ثانی کی شعر	محمد اکبر الدین صدیقی	″	۴۸	مہدی نواز جنگ مرحوم	سید دلدار
	و ادب کی سرپرستی		″	۴۹	معاصر شعراء اقبال کی	محمد عبداللہ قر
۳۱	فن تذکرہ نویسی آغاز سے اختتام تک	زاہدہ ابو الحسن	″		نظر میں	
۳۲	امراؤ جان ادا	مصطفیٰ کمال احمد	″	۵۰	ذوقی کی قصیدہ نگاری	فرزانہ حمید
۳۳	کلیم الدین احمد بحیثیت نقاد	طیب انصاری	″	۵۱	عبدل ابراہیم نامہ کا مصنف	محمد جمال شر
۳۴	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی بحیثیت ناول نگار	حسرت کاسگنجوی	″	۵۲	سرسید کے ادبی افکار	حاجی شمیم اللہ
۳۵	عظیم آباد کی عظمت ادبی آئینہ میں	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	جولائی	۵۳	ادب کے زاویے سے تعمیر اخلاق	خواجہ غلام السید
۳۶	اردو کا ایک قدیم لغت	سید خواجہ حسینی	″	۵۴	ادبی تنقید میں نظریہ اظہاریت	ڈاکٹر شاہ
۳۷	اردو ناول نگاری پر ایک	طیب انصاری	″	۵۵	دنیا کی بے ثباتی شعرائے	
	تنقیدی نظر				اردو کی نظر میں	ڈاکٹر صفیہ
۳۸	شمالی ہند کے ابتدائی زمانے کی نثر	فرزانہ حمید	″	۵۶	آہ شاہد احمد دہلوی	حسرت کا
۳۹	پشکن روس کا عظیم تر شاعر	مخمور جالندھری	″	۵۷	اردو نظم میں حالی کا مقام	سلیمان
۴۰	مخدوم کی شاعری کا ابتدائی دور	داؤد اشرف	″	۵۸	یگانہ فن غالب	طیب
۴۱	بہ دیارِ دکن (تاثرات)	علی جواد زیدی	اگست	۵۹	فیروز شاہ بہمنی	ڈاکٹر محمد
۴۲	مصروفیات (کلچرل ڈیرا)	وقار خلیل	″	۶۰	اردو شاعری کے مجدد حالی	ڈاکٹر مح
۴۳	ڈاکٹر اقبال اور سید سلیمان ندوی	ڈاکٹر سید یحییٰ احمد ہاشمی	ستمبر	۶۱	فارسی قصیدہ نگاری کے بنیادی پہلو	محمد شکیل
۴۴	ناقد کے فرائض	ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی	″	۶۲	عراقی تغزل میں رمز نگاری	ڈاکٹر جعف
۴۵	ترقی پسند تحریک اور اس کا پس منظر	حسرت کاسگنجوی	″	۶۳	غبار خاطر ادبی آئینہ میں	ڈاکٹر سید
				۶۴	چند دکھنی مرثیہ گو شعراء	وحید الد

نظمیں

"سب رس" جنوری تا دسمبر ۱۹۶۷ء
میں جملہ انتیس ۲۹ نظمیں شائع ہوئیں۔
ذیل میں نظموں کے عنوانات اور
شعرا صاحبان کے نام مندرج ہیں۔
(۱) تصویر از رشید انجم (۲) عزم از معظم کھٹکلی
(۳) بھیگے خواب از قمر تابش (۴) نغمۂ عشق از شمس انیس
(...) از رجیت لال (۵) نزول شب از ... حسینی نائیدو
... علی خاں (۶) خوابوں کی رہگزر از یوسف خراماں
(...) بھوک از روشن کمپنی سہابی (۸) فکر و آگہی از وفا ملک پوری
اندیشہ از محمد عمر کیفیت (۱۰) پیاس از مغرم کلکتوی
... کھوٹ از حسن فیاض (۱۱) گواہی از رشید حمد ...
(...) بیگ ؟ از دلیپ بادل (۱۳) قطعات و رباعیات
... حضور نظام تخت نشینی ... شاہی
... از عبد القادر رضوان خمسہ (۱۵) گرلکشمی کے سائے میں (رباعی)
... خورشید احمد جامی (۱۶) ... از صلاح الدین ...
... بجا گے ستی ... بہ ... (۱۸) بھوگ ستی
... خورشید تدبیر (۱۹) ترب نما از ... (۲۰) ... جاوداں
... رشید (۲۱) قطعات از ملاق فتح پوری (۲۲)
... از انیس (۲۳) ... و ... نول
... (۲۴) تماشا از شوکت ... (۲۵) ...
... از میر محمد علی قادری (۲۶) آرزو کلاسیک
... (۲۷) تاریخ ... از حیدر تابانیاب
... از شہاب ... (۲۹) ...
... افسر

غزلیں

اس سال جملہ (...) شعرا صاحبان
کی غزلیں شائع ہوئیں اور بعض شعرا
صاحبان کی ایک سے زیادہ غزلیں بھی اشاعت پذیر
ہوئیں۔ ذیل میں شعرا کے نام نامی درج کئے جارہے ہیں۔
ڈاکٹر سید اختر احمد۔ واحد پریمی، باقر متھوری، محی الدین عمی
شاہجہانپوری، ... اختر، عظیم آمبوری، الیعقوب ...
مظفر حنفی، سید حرمت الاکرام، گورو ... رشک، ساحل ...
سلیمان اطہر جاوید، شارق ... پوری، عبد المتین نیاز
راگھویند ... عالمپوری عنوان چشتی، آسیم ...
شاکر ... دلی، آذر سیابانی، ذہانت حسین عاصمی، نیصر
پرواز، ... شیخ فرید، اختر حمیدی
... رضوانی ...
فیض محمد خیال، اقبال سہامی، ... اختر انصاری ...
... محمد ضیاء الدین شکیب ... وحید اختر ...
... حسن ... خراماں ...
... رشید ... صلاح الدین ...
... ...
... ...
تلوک چند ...
... محمد علی ...
... پھپھوری،

افسانے

"... ۱۹۶۷ء ... میں"
... افسانے شائع ہوئے
(۱) ... از حلیم عرفان (۲) ... از ...

۷۔ ماہنامہ "نقوش" کراچی (افسانہ نمبر)
۸۔ سالنامہ "صناع" نواب بہادر خاں ٹیکنیکل کالج حیدرآباد
۹۔ ماہنامہ "پیام تعلیم" دلی (ذاکر حسین نمبر)
۱۰۔ " "گگن" بمبئی (اشاعت خاص)
۱۱۔ " "ادب لطیف" لاہور (سالنامہ)
۱۲۔ " "شب رنگ" الہ آباد
۱۳۔ سالنامہ "انوار" انوار العلوم کالج حیدرآباد
۱۴۔ سہ ماہی "اوراق" لاہور (سالنامہ)
۱۵۔ "شیراز" سری نگر (ثقافت نمبر)
۱۶۔ ماہنامہ "صبا" حیدرآباد (مخدوم نمبر)
۱۷۔ " "پونم" حیدرآباد (طنز و مزاح کانفرنس نمبر)
۱۸۔ " "کتاب" لکھنؤ (سالنامہ)
۱۹۔ " "محفل" لاہور (")
۲۰۔ سہ ماہی "تحریر" دہلی
۲۱۔ سہ ماہی "سیپ" کراچی
۲۲۔ ماہنامہ "جائزہ" کراچی (افسانہ نمبر)
۲۳۔ مجلہ عثمانیہ حیدرآباد (مقالہ نمبر)
۲۴۔ سالنامہ "نوخیز" فوقانیہ نسواں معظم پورہ حیدرآباد

سب رس میں تبصرے کیلئے

دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

بعد تبصرہ یہ کتابیں

ادارہ کے کتب خانہ میں اردو والوں کے استفادہ کیلئے محفوظ کیجاتی ہیں۔

(بقیہ ۲۸ سے آگے) جو پہلے ریڈیو کے لئے لکھے گئے۔ سننے والوں کی فرمائش پر بار بار ریلے کئے گئے اور جن میں سے اکثر اسٹیج بھی کئے جا چکے ہیں۔

آج جبکہ اچھے ڈراموں کا اردو زبان میں فقدان ہے، ادارہ ادبیات اردو قابل مبارکباد ہے کہ اس نے ڈراموں کا یہ خوبصورت اور دلکش مجموعہ شائع کیا۔

جناب میر حسن نے اس کتاب کا تعارف لکھا ہے بقول جناب میر حسن "اظہر افسر کل ہند معیاری زبان لکھتے ہیں صحیح قومی جذبہ رکھتے ہیں، مفید مطلب معلومات کی کارگر اشاعت کے گر سے یہ خوب واقف ہیں۔ اسلئے ریڈیو کے لئے لکھنے والوں کی صف اول میں نظر آتے ہیں۔

غرض "سانولی" ہمارے ڈرامائی ادب میں ایک اچھا اور قابل قدر اضافہ ہے، ناشر ادارہ ادبیات اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد ۴ سے طلب کیجا سکتی ہے

بشکریہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد

(۴ مارچ ۱۹۶۷ء)

سب رس (ادارہ نمبر)

حیدرآباد کے ادارۂ ادبیات اردو کی کارگزاری پر نظر پڑتی ہے تو طبیعت خوش ہوتی ہے اور دل کو راحت ملتی ہے ادارۂ ادبیات اردو یا ادارۂ اردو نے زبان اور ادب کے سلسلے میں بڑی خدمات انجام دی ہیں سب رس کے ادارہ نمبر کے ذریعہ ان تمام کاموں کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے جو ادارے نے ۱۹۶۶ء انجام دیئے ہیں کہ اس ادارہ کا کتب خانہ اور دارالمطالعہ علمی ادبی اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے کافی مددگار ثابت ہوتا ہے (مطبوعہ ماہنامہ گگن بمبئی بابتہ نومبر ۱۹۶۶ء)

سب رس کے تبادلے میں آنے والے رسائل و جرائد کی تفصیلات

مندرجہ ذیل رسائل و جرائد ایوانِ اردو کے دارالمطالعہ عام میں قارئین کے مطالعہ کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک رسائل و جرائد کو چھوڑ کر باقی "سب رس" کے تبادلے میں آتے ہیں جن کی مجموعی تعداد (۱۰۱) ہے اور بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڑھ) ہندوستان کے کسی دارالمطالعہ میں میں نے اس قدر تعداد میں معیاری رسائل و جرائد یکجا نہیں دیکھے اس طرح "ایوانِ اردو" کا دارالمطالعہ اردو دنیا کا پہلا معیاری اور وسیع مطالعہ خانہ ہے:

ہم ان تمام ہند و پاک اور بیرونِ ہند کے مدیرانِ جرائد کے ممنون ہیں جو پابندی کے ساتھ "سب رس" کے تبادلے میں اپنے رسائل و جرائد روانہ فرماتے ہیں، امید ہے کہ یہ تعاون مستقلاً برقرار رہے گا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ختم سال پر ایسے تمام رسائل و جرائد کی جلدیں اور پائیدار جلدیں بنوائی جاتی ہیں اور انہیں ادارے کے کتب خانہ میں درج رجسٹر کر کے استفادہ کے لئے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اور ہر دوسرے یا تیسرے سال ادارے کے کتب خانے کی کتابوں اور رسالوں کی ایک باضابطہ ضخیم فن وار فہرست اشاریہ کے ساتھ شائع کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک فہرست کتب خانہ ادارہ کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور اب چوتھی جلد زیرِ ترتیب ہے، ادارے کے کتب خانے میں بے شمار اہم اور تاریخی کتب اور مطبوعہ کتابوں کے علاوہ کئی اہم رسائل و جرائد کی فائلیں بھی محفوظ ہیں۔

۱۸۵۷ء سے پہلے اور اب تک کے نادر علمی اور ادبی وغیرہ کے حامل اس کتب خانے سے آئے دن ادیب، دوست احباب اور ریسرچ اسکالرس صاحبان ہر روز ۱۱ تا ۵ ساعت استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ جمعہ کو ایوانِ اردو کے دفاتر بند رہتے ہیں۔

اس افادی پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے قارئین اور اردو دوستوں کے ساتھ ساتھ مدیرانِ رسائل و جرائد سے خواہش مند ہیں کہ وہ اس قسم کے ریکارڈ کی فراہمی اور یکجائی میں ہم سے بھرپور تعاون فرمائیں، اور جب کبھی اپنا ادبی ذخیرہ، قدیم و جدید کتب و رسائل چھانٹنا یا نکالنا چاہیں تو براہ کرم تحفۃً مرحمت فرمائیں جو معطی کے شکریہ کے ساتھ کتب خانے میں داخل کئے جائیں گے اور فہرست کتب خانہ میں معطی کے اسمِ گرامی کے ساتھ درج بھی ہوگا۔

امید ہے کہ معاصرین اور دیگر ادب دوست احباب اور مختلف علمی و ادبی انجمنوں کے سربراہ ہم سے تعاونِ عمل فرما کر ہمیں شکریہ کا موقع دیں گے۔

(ادارہ)

نمبر	نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	صفحات	زر
		(سالانہ)			
۱	ادبیات	شعبۂ اردو، جموں و کشمیر یونی ورسٹی، سری نگر (کشمیر)	عبدالقادر سروری	۲۰۰	،
۲	انوار	انوار العلوم کالج، لے پلی، حیدرآباد دکن	ڈاکٹر خالدہ بیگم	۶۴	
۳	جرنل آف ریسرچ (انگریزی)	پنجاب اگریکلچرل یونیورسٹی (لدھیانہ)	ہرکرت سنگھ	۱۰۰	،
۴	جیوتسنا (رسالہ)	شعبۂ اردو ایس آر آر گورنمنٹ کالج کریمنگر (اے۔پی)	محمد منظور احمد ایم اے	۸۰	۰
۴	شب تاب (سالانہ)	شعبۂ اردو، ایوننگ کالج، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد	....	۱۲۶	۰
۵	صریر خامہ	سندھ یونی ورسٹی، حیدرآباد سندھ (پاکستان)	سید یحییٰ احمد ہاشمی	۲۷۰	۰
۶	صناع	نظام اینڈ علاء الدین ٹکنیکل کالج، تلک روڈ، حیدرآباد	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن	۱۴۰	۰
۷	قدیم اردو	شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد	پروفیسر مسعود حسین خاں	۳۰۰	۰۰
۸	مجلہ عثمانیہ (مقالات)	〃	زاہدہ ابوالحسن	۳۰۸	۰۰
۹		〃	—	۸۰	۰
۱۰	مشعل (دولسانی)	حیدرآباد سائنس کالج حیدرآباد	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	۱۰۰	۰
۱۱	نظام ادب	شعبۂ اردو، نظام کالج، توپ کا سانچہ حیدرآباد	رکن الدین ارشد	۱۵۰	۰۰
۱۲	نفیس (چہار لسانی)	ملٹی پرپز ہائی اسکول، نامپلی، حیدرآباد	رضی الدین معظم	۸۰	۰۰
۱۳	نوخیز	مدرسہ فوقانیہ نسواں، نلگنڈہ، حیدرآباد	محمد عبدالغفار ربانی	۸۰	۰۰
۱۴	کالج میگزین (لسانی)	ایس۔ آر۔ آر گورنمنٹ آرٹس کالج، کریمنگر (اے، پی)			
		سہ ماہی			
۱۵	اردو	انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱	جمیل الدین عالی	۲۰۰	۰۰۰
۱۶	اردو نامہ	ترقی اردو بورڈ، اردو منزل، جمشید روڈ کراچی ۵	شان الحق حقی	۱۴۰	۰۰۰
۱۷	اوراق	چوک، اردو بازار، لاہور (پاکستان)	وزیر آغا	۳۲۰	۰۰
۱۸	اقبال ریویو (اردو)	اقبال اکیڈمی ۳۴/۶ D بلاک ۶، پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹	پی، اے، ڈار	۱۴۸	〃
۱۹	〃 〃 (انگریزی)	〃	〃	۱۶۶	〃
۲۰	امریکن ریویو (انگریزی)	بہاول پبلہاؤس۔ سکندر روڈ نئی دہلی ۱	آر۔ آر۔ بروکس	۹۲	۱-۵۰

	سہ ماہی			
امریکن ریویو (انگریزی)	بہاول پور ہاؤس سکندر روڈ نئی دہلی	آر۔ آر۔ بروکس	١١٦	٦٠٠٠
بصائر	٣٠۔ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۵	ڈاکٹر معین الحق	١٩٢	١٠٠٠
پرابلم آف کمیونزم (انگریزی)	یو۔ ایس۔ انفارمیشن ایجنسی، واشنگٹن ڈی۔ سی۔	ابرام برم برگ	٧٦	—
جسم و ذہن	مرادپور، پٹنہ۔ ۴ (بہار)	ڈاکٹر نذیر امام	٩٦	۴--
سیپ	حلقۂ فکرِ نو، گارڈن آفیسرس، مراد خاں روڈ، کراچی ۵	نسیم دُرانی	٢٥٠	٨٠٠
شاخسار	بخشی بازار۔ کٹک (اڑیسہ)	امجد نجمی	١۴٠	٣٠٠
پیام دلی	محکمۂ تعلقاتِ عامہ۔ اولڈ سکریٹریٹ دہلی ۶	گوپی ناتھ امن	٨٠	٣٠٠٠
صحیفہ	مجلس ترقیِ ادب ۲، نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور	ڈاکٹر وحید قریشی	١١٠	٦-٠
نوائے ادب	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٩٢ نیفر ڈرو ڈ۔ بمبئی	نجیب اشرف ندوی	٩۴	٦٠٠
محب ہند	ریمن بازار، حیدرآباد ٦٣	عبدالغفار رفیق	١٦	٢٠٠
یونسکو نیوز لیٹر	یونسکو ریجنل سنٹر A ۲۱ پی، ای، سی، ایچ، ایس کراچی ٢٩	—	٢٨	٠٠
یونسکو کوریئر (انگریزی)	یونسکو ہاؤس پیرس	ناظم یونسکو		
	دو ماہی			
ادبی تبصرے	انجم لاج۔ سلان محل۔ دہلی	ڈاکٹر خلیق انجم	۴٨	٣-٠٠
تحریر	علمی مجلس۔ ١٣٢٩۔ چھتہ نواب صاحب فراش خانہ دہلی	مالک رام	٢٥٠	١٢٠٠
شیرازہ	جموں، کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر	محمد یوسف ٹینگ	١۴٠	١٠٠٠
	(ماہنامے)			
آندھرا پردیش	جن سمبندھ شاکھا۔ کرم جاہی روڈ حیدرآباد	کنول پرشاد کنول	۴٨	۴٠٠٠
آئندہ	روڈ ١٣۔ آزاد نگر۔ انگو، جمشید پور (بھارت)	سہیل واسطی	٨٠	١٠٠٠
آئینہ	شاہ عالم گیٹ۔ لاہور ٧ (پاکستان)	محمد امین شرقپوری	٦٦	٧٠٠٠
ادب لطیف	سرکلر روڈ لاہور (")	ناصر زیدی	٨٠	٦٠٠٠
ادبی دنیا	مال روڈ۔ لاہور	محمد عبداللہ قریشی	٨٠	٦--
ارشاد	دارالارشاد۔ مغلپورہ حیدرآباد ٢ (اے۔ پی)	پیرزادہ جاوید قادری	۴٨	٥٠٠٠

۴۲	اسپان (انگریزی)	بہاولپور ہاؤس سکندرا روڈ نئی دہلی	ڈین۔ کے۔ براون	۵۸	۰۰
۴۳	اسرار حکمت	۱۰/A پیر مکی شریف۔ لاہور (پاکستان)	حکیم نور محمد چوہان	۳۲	۰۰
۴۴	اشارہ	صادق پور سرائے، پٹنہ (بہار)	قیوم خضر	۴۸	۰۰۰
۴۵	افکار	مکتبۂ افکار، رابسن روڈ۔ کراچی	صہبا لکھنوی	۱۰۴	۱۲۰۰
۴۶	البلاغ	دار العلوم۔ کراچی ۱۴ (پاکستان)	محمد تقی عثمانی	۶۴	۶۰۰
۴۷	الحق	۳۹۰-۱-۱۴ رد بر گیان باغ ستیانارائن باغ۔ حیدرآباد دکن	محمد انور حسن نعمانی	۴۸	حسب استطاعت
۴۸	الشجاع	ٹائمز پریس۔ صدر، کراچی (پاکستان)	سلمان الارشد	۷۴	۶۰۰۰
۴۹	القدیر	دار منظر، چھاؤنی نادعلی بیگ۔ حیدرآباد۔ ۲۴ (بھارت)	احمد اللہ قدیری	۴	۶۰۰۰
۵۰	النور	۵۱۷-۱۱-۲ جورا ہاجنسی۔ حیدرآباد ۲ (اے۔ پی)	محمد ابراہیم مدنی	۱۶	۵۰۰۰
۵۱	المعرفتہ	منزل طیب، حیدرآباد سندھ پاکستان	حشمت علی حماد	۶۴	۶۰۰
۵۲	امریکن ریویو (انگریزی)	چانکیہ پوری۔ شانتی پتھ، نئی دہلی ۲۱	پی۔ ایچ۔ ہیلین	۲۲	۱۱۰۰۰
۵۳	انڈین لیڈر (انگریزی)	۲/۸ رام نگر نئی دہلی ۱	گلشن شاستری	۳۲	۱۶۰۰۰
۵۴	انجمن اسلامیہ میگزین	۵۰ الف۔ کوچین والا مارکٹ کراچی ۲	انعام اللہ شہابی	۶۴	۱۵۰۰
۵۵	بانو	آصف علی روڈ، اجمیری گیٹ۔ نئی دہلی	بیگم زینت کوثر دہلوی	۶۴	۱۱۰۰۰
۵۶	بچوں کی دنیا	شاہ عالم گیٹ۔ لاہور ۲۷ (پاکستان)	محمد امین شرقپوری	۴۸	۰۰
۵۷	برہان	جامع مسجد، اردو بازار، دہلی	سعید احمد اکبرآبادی	۶۰	۶۰۰
۵۸	بلٹن (انگریزی)	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈی (راشٹر پتی نواس) شملہ	کے۔ وینکٹ رامن	۲۰	۰۰۰
۵۹	بیسویں صدی	انصاری مارکٹ دریا گنج، دہلی	خوشتر گرامی	۱۲۰	۸۰۰
۶۰	پگڈنڈی	ادبستان اردو مال بازار، امرت سر پنجاب	کیتو آنند	۴۰	۶۰۰
۶۱	پونم	۳۰۱-۷-۶ اعظم پورہ۔ حیدرآباد (اے، پی)	ناصر کرنولی	۶۴	۱۰۰۸
۶۲	دنیائے تعلیم	جامعہ نگر نئی دہلی۔ ۲۵	محمد حسین حسان	۷۲	۵۰۰
۶۳	تجلی	دیوبند۔ ضلع سہارنپور (اترپردیش)	عامر عثمانی	۶۴	۷۰۰۸
۶۴	تحریک	۹۔ انصاری مارکٹ۔ دریا گنج دہلی۔ ۶	گوپال متل	۶۰	۸۰۰۸

تیسرا انسانیت…	موچی دروازہ، لاہور۔ (پاکستان)	عبدالحمید	۴۸	۵-۸
ثاقی…	۱۱۰، گوتم بدھ مارگ۔ لکھنؤ (اترپردیش)	نفیس علی نوشہ	۴۸	۴،۵۰
ثقافت	ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور	شاہد حسین رزاقی	۷۲	۲ //
جاسوسی پنجہ	پنجابی پبلیکیشن جھنڈے دار دریبہ کلاں دہلی ۶	ڈی۔ دہلوی	۱۴۰	۸،۰۰
تبصرہ	بیرون دہلی دروازہ - لاہور	جانباز مرزا	۳۸	۶،۰۰
جامعہ	جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۲۵	ضیاء الحسن فاروقی	۴۸	۶ ،،
جاں نثار	۸۹، سبھاش نگر۔ کٹھڑہ شیر سنگھ، امرتسر پنجاب	میلا رام وفا	۵۶	۱۰،
جائزہ	۶، حجاز ہوٹل، گرانٹ روڈ کراچی	وسیم فاضلی	۱۴۴	۱۲،۰۰
جدوجہد	ریلوے روڈ، لاہور	حامد امرتسری	۳۴	۱۰،۰۰
جستجو	اندرون، پنج محلہ- حیدرآباد ۲	سید عبداللہ	۲۲	۴،۰۰
جمالستان	۳۹۲ - بازار، مٹیا محل - دہلی ۶	نجم صدیقی	۶۴	۶،۰۰
جھرنا	پنجیری، شیش محل لین - سری نگر - (کشمیر)	نذیر فرخ	۸۰	۶،۰۰
…نازی کا نظرک (انگریزی)	عوامی جمہوریہ چین، پیکن	-	۸۴	۴،۰۰
حریم	نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ (یو-پی)	نسیم انہونوی	۴۸	۷،۰۰
حسامی	حسامیہ منزل- پنجہ شاہ حیدرآباد ۲ (اے-پی)	حمیدالدین عاقل	۶۴	۸،۰۰
حنفی	کوچہ نیزہ گراں، موچی دروازہ، لاہور	صوفی غلام غوث خان	۳۲	۳،۰۰
خاتون دکن	۲۲-۳-۷۰۹ گھر کی باؤلی، حیدرآباد ۲	صالحہ الطاف	۴۸	۶-//
خالقیہ	انجمن خالقیہ، بلاک نمبر ۱ سرگودھا (پاکستان)	تاثیر مرزا	۴۸	۵ ،،
دوام	ملانڈہ ضلع فیض آباد (اترپردیش)	مختار احمد مظاہری	۶۴	۷،۰۰
انڈین مارکیٹ (انگریزی)	لیس / ۱۹۷ گریٹر کیلاش نئی دہلی	چھاجو رام	۴۸	۵،۰۰
" (ہندی)	"	"	"	" "
…ادب	۱۳- رفیع احمد قدوائی روڈ، کلکتہ ۱۳	نظام الحسینی	۱۳۲	۱۴،۰۰
…ویئے	کہکشاں - پکھا پیر- حیدرآباد سندھ (پاکستان)	حسن ظہیر	۸۰	۸،۰۰

۸۸	ساقی	پی آئی بی کالونی - کراچی نمبر ۵	عاصمہ بیگم شاہد احمد	۶۴	..
۸۹	ساہتیہ اکیڈمی کی تحقلی منزل	رابندر بھون نئی دہلی	پی ماچوے	۴	...
۹۰	سٹی اسپورٹس میگزین	نزد کریم ہوٹل، جامع مسجد دہلی ۶	علیم الدین	۴۸	...
۹۱	سروج	صدر بازار - دہلی نمبر ۶	سیفی پریمی	۴۸	...
۹۲	سوز	۲۸ - مدن موہن برمن اسٹریٹ کلکتہ نمبر ۷	سوز سکندرپوری	۳۲	...
۹۳	سوویت لٹریچر (انگریزی)	۱۱/۹ ربرووسووا اسٹریٹ ماسکو (یو ایس ایس آر)	ورسلیوا رزیلو	۲۰۴	...
۹۴	سلسبیل	ادارۂ تصوف، اردو بازار - لاہور	محمد اقبال	۶۴	...
۹۵	سہیل	باری روڈ گیا (بہار)	ادریس شہبا ردوی	۳۲	...
۹۶	سیارہ	مکتبۂ سیارہ - ۶ پی، ذیلدار پارک اچھرہ لاہور	نعیم صدیقی	۸۶	...
۹۷	شاعر	مکتبۂ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶۴ بمبئی ۸ - (بی - آر)	اعجاز صدیقی	۸۰	...
۹۸	شان ہند	۸ - انصاری مارکٹ - دریا گنج دہلی ۶	سرور تونسوی	۴۰	...
۹۹	شاہکار	۱۳۴ - بخشی بازار - الہ آباد ۳۰ (یو - پی)	محمود احمد ہنر	۲۲۰	...
۱۰۰	شب خون	۳۱۳ - رانی منڈی - الہ آباد ۳۰ (یو - پی)	ڈاکٹر اعجاز حسین	۸۰	...
۱۰۱	شب رنگ	۶۳ - نرپدر روڈ - الہ آباد (یو - پی)	ڈاکٹر سید محمد عقیل	۸۰	...
۱۰۲	شجر	جنتا لائبریری - چوک - برہان پور (ایم، پی)	اندر سین اثر	۴۸	...
۱۰۳	شمع	آصف علی روڈ - اجمیری گیٹ - نئی دہلی ۱	یوسف دہلوی	۱۲۶	...
۱۰۴	شہپر	۸۹۸ - دریاباد - الہ آباد - ۳ (یو - پی)	اطہر علی فاروقی	۸۰	...
۱۰۵	صبا	۱۷، مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد	سلیمان اریب	۹۶	...
۱۰۶	صبح	انجمن ترقی اردو، علی منزل کوچہ پنڈت - دہلی	عبداللطیف اعظمی	۸۰	..
۱۰۷	صبح امید	بلاسیس روڈ - بمبئی ۸	عبدالحمید بوبیرے	۴۸	...
۱۰۸	صبح نو	قطب الدین لین - پٹنہ - ۴ (بہار)	وفا ملکپوری	۴۰	...
۱۰۹	طلبہ کالج میگزین	۱۱۹ - ملتان روڈ - لاہور (پاکستان)	عبدالباسط چشتی	۳۲	...
۱۱۰	عارضہ	بل روڈ - لاہور - ۲ (پاکستان)	عبدالرحمن شوق	۴۸	...

[..]ان	کیمبل اسٹریٹ - کراچی (پاکستان)	ماہرالقادری	۶۴	۷-۰۰
[..]ن افیرس ریکارڈ (انگریزی)	وزارت خارجہ حکومت ہند (شعبۂ تشہیر) دہلی	-	۹۴	-
فروغ اردو	۳۷ - امین آباد پارک لکھنو (یو، پی)	پروفیسر احتشام حسین	۴۸	۳-۰۰
فکر و خیال	پی۔آر۔ٹی، بی۔سی، ایچ، کراچی ۲۹ پاکستان	شمیم جاوید	۸۸	۶-۰۰
[..]ن الاسلام	اقبال روڈ - راول پنڈی (پاکستان)	غلام قادر غبار	۶۴	۵-۰۰
قومی زبان	انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ کراچی ۱	مشفق خواجہ	۹۶	۱۰=۰۰
کتاب	چوک - لکھنو ۳ (اترپردیش)	عابد سہیل	۸۰	۱۰=۰۰
کتاب نما	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵	ریحان احمد عباسی	۳۲	۲=۰۰
کتابی دنیا	گیدول لیکھراج روڈ - کراچی ۱ (پاکستان)	ضیاءالدین احمد برنی	۳۲	۲=۰۰
کشاف	اسٹیٹ ہیڈکوارٹرس - دول گڑھ - حیدرآباد ۲	دستگیر عزمی	۲۲	۵=۰۰
[..]لیان	نسیم بکڈپو - لاٹوش روڈ - لکھنو (یو، پی)	شمیم انہونوی	۵۰	۴-۰۰
[..]کھلونا	آصف علی روڈ نئی دہلی ۱	الیاس دہلوی	۵۸	۸=۰۰
[..]کن	۴- الانا مینشن A/۱۹ ڈاکٹر آنندراؤ نائر روڈ بمبئی ۱۱ بی سی	شمس کنول	۶۲	۸=۰۰
[..]ل خندان	کشمیری بازار - لاہور ۸ (پاکستان)	عبدالرؤف ملک	۴۸	۴-۰۰
[..]ریلو علاج	سدی عنبر بازار، حیدرآباد ۱۳ (اے۔پی)	ڈاکٹر جگجیانند	۳۲	۳-۰۰
[..]و	۲- روہتک روڈ - نئی دہلی ۵	نریندر سیٹھی	۶۴	۱۲=۰۰
[..]نو	ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی	شان الحق حقی	۸۰	۶=۰۰
[..]م	آصف علی روڈ - نئی دہلی ۱	الیاس دہلوی	۱۶۰	۱۵=۰۰
[..]سل	رائل پارک - لاہور (پاکستان)	طفیل ہوشیارپوری	۶۰	۹-۰۰
[..]ح	۱- ابراہیم پورہ اسٹریٹ، بھوپال ۱ (ایم، پی)	عیسیٰ صدیقی	۸۰	۱۰=۰۰
[..]ف	دارالمصنفین - اعظم گڈھ (یو۔پی)	معین الدین احمد ندوی	۶۴	۸=۰۰
[..]س	کاشانۂ اردو - پوسٹ بکس ۳۰۲ کراچی ۱	شمس زبیری	۱۶۰	۱۵=۰۰
[..]ی	درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء - نئی دہلی ۱۳	حسن ثانی نظامی	۴۸	۴=۰۰

۱۳۵	نیرنگ خیال	۱۳-B لیاقت روڈ - راولپنڈی (پاکستان)	حکیم یوسف حسن	۸۰	..
۱۳۶	ہمایوں	۲۴/E کلانگر - دہلی نمبر ۷	تاجور سامری	۸۰	...
		پندرہ روزہ			
۱۳۷	امریکن ریویو (انگریزی)	یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس - سکندرہ روڈ نئی دہلی ۱	موریس ڈائمبر	۲۸	..
۱۳۸	العرب (انگریزی)	۲۴- سردار پٹیل روڈ - نئی دہلی ۱	محمد وہبی	۱۶	..
۱۳۹	ترقی اردو	انجمن ترقی اردو - اردو ہال - ہمایت نگر حیدرآباد	ڈاکٹر حسینی شاہد	۱۰	..
۱۴۰	خون ناب	۱۱- پولیس کوارٹرس شانتی نگر - حیدرآباد دکن ۲۸ اے پی	عالیہ خروج	۱۲	..
۱۴۱	سرپنچ	نسیم بکڈپو - لاٹوش روڈ - لکھنؤ	نسیم انہونوی	۸	..
۱۴۲	سواد اعظم	موچی دروازہ - لال کھوہ - لاہور	حکیم غلام محی الدین	۸	..
۱۴۳	سوویت دیس (اردو)	۲۵- بارہ کھمبا روڈ - نئی دہلی	جمیل اختر	۴۸	..
۱۴۴	صراط (انگریزی)	۲۰۴ ۱۸ - کلاں محل - دہلی ۶	محمد غالب فدائی	۸	.۵۰
۱۴۵	کاکل	۱۰۸-A - معظم پورہ - حیدرآباد (اے-پی)	احمد جلیس	۸	..
۱۴۶	نغمۂ حیات	کالاڈبیرہ، حیدرآباد - ۲۲ (اے، پی)	انور کمال خوندمیری	۴	..
۱۴۷	فلمی دنیا	نامپلی روڈ - حیدرآباد (اے، پی)	عثمان شیدا	۱۲	..
۱۴۸	ہمدرد	ہمدرد منزل - لال کنواں - دہلی	حکیم عبدالحمید دہلوی	۸	.۵۰
		ہفت روزہ			
۱۴۹	آندھرا پنچ	ادپل کلاں - حیدرآباد - ۱۳ (اے-پی)	ملک محمد علیخان	۸	..
۱۵۰	انتخاب	۲۱۹۸/۳ لیاقت آباد کراچی (پاکستان)	حافظ بشیر احمد	۲۰	۱..
۱۵۱	امریکن رپورٹر (انگریزی)	بہاولپور ہاؤس سکندرہ روڈ نئی دہلی ۱	ڈونالڈ برومن	۸	..
۱۵۲	" " تلگو	"	"	"	
۱۵۳	الشیاء	اردو بازار - دہلی			
۱۵۴	پرجا	اعظم روڈ - نظام آباد (آندھرا پردیش)	ہزارائن	۱۲	..
۱۵۵	ترجمان حیات		نابد انصاری	۸	..
		۲/۵۴۳-۲-۲۲ فور بلڈنگ سری منزل - دبیرپورہ روڈ حیدرآباد ۲۴	محمد وحیدالدین سلیم	۸	..

ترجمان سرحد	پشاور (مشرقی پاکستان)	امیر عالم اعوانی	۸	۶-۰۰
تعمیر	کالج روڈ۔ محبوب نگر (آندھرا پردیش)	محمد عبد العزیز	۸	۱۲-۰۰
خبرنامہ اردو	پریس بیورو عرب ری پبلک سفارت خانہ دہلی	—	۸	—
رضائے مصطفیٰ	چوک، دارالسلام۔ گوجرانوالہ (پاکستان)	حفیظ بنارسی	۱۲	۶-۰۰
ذوالقرنین	نظامی پریس۔ بدایوں (اترپردیش)	وحید الدین نظامی	۸	۶-۰۰
سوویت جائزہ	"تاس" ۲۵ بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی	احمد معظم	۳۲	۳-۰۰
شعور	"رہنمائے نقش" نارائن گوڑہ، حیدرآباد - ۲۹ (اے، پی)	رحیم قریشی	۱۲	۸-۰۰
عکاسں	۵۔ لور جیت پور روڈ۔ کلکتہ ۱	شہزادہ سلیم	۸	۸-۰۰
فارم نیوز لیٹر انگریزی	وزارت اغذیہ وزارت حکومت ہند - دہلی	—	۸	برائے صحافت
قومی محاذ	جونابازار۔ اورنگ آباد۔ (مہاراشٹرا)	اثر فاروقی	۸	۱-۰۰
نیوز فرام رومانیہ	سفارت خانہ عوامی جمہوریہ رومانیہ ۲۸ گالف لنک روڈ نئی دہلی	—	۱۲	برائے صحافت
نیا آدم	۱۰۳۔ جامباغ روڈ۔ حیدرآباد (۱) آندھرا پردیش	امجد باغی	۱۲	۶-۰۰
مورچہ	جہیراگی۔ گیا (بہار)	پروفیسر کلام حیدری	۱۲	۶-۰۰
مکت دھارا (ہندی)	E 126 بھگت سنگھ مارکٹ نئی دہلی ۱	نریندر شرما	۲۲	۱۲-۰۰
نیا آپ	۲۰۔ بازار لین۔ راجندر نگر۔ نئی دہلی ۵	سودیشی کمار	۱۲	۶-۵۰
ہماری زبان	انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ یو پی	پروفیسر آل احمد سرور	۱۲	۵-۰۰
	دو روزہ			
آج کا امریکہ	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس۔ دہلی	...	۸	برائے صحافت
خبریں اور رائیں	پریس انفارمیشن بیورو حکومت ہند۔ دہلی		۱۲	"
پریس ریلیز (اردو)	"تاس" - ۲۵ بارہ کھمبا روڈ۔ پوسٹ بکس (۲۴) دہلی	—	۱۲	"
سوویت یونین کی خبریں	"تاس" ۲۵، بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی	...	۱۲	"
سوویت فیچر	" " "	...	۱۲	"
فنکار و جانکارے	" " "	...	۱۲	"

۱۷۸	میڈیکل نیوز (اردو)	یونانی میڈیکل انفارمیشن سروس دہلی	...	۱۲	[illegible]

روزنامے

۱۷۹	خدمت	دی بنڈ - سری نگر - کشمیر	ٹی - این - ہزل	۴	..
۱۸۰	رہنمائے دکن	افضل گنج، حیدرآباد دکن اے - پی	محمد منظور حسن	۸	..
۱۸۱	سیاست	جواہر لال نہرو روڈ حیدرآباد (اے، پی	عابد علیخان	۸	...

۱۹۶۷ء میں ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات

نمبر	نام کتاب	مرتب مصنف	موضوع	صفحات	سائز	قیمت
۱	ادارہ سن ۱۹۶۶ء میں	وقار خلیل	تذکرہ	۹۴	½ کراؤن	..
۲	برف میں آگ	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	افسانے	۱۶۰	۱/۱۶ کراؤن	..
۳	سب رس (ادارہ نمبر)	مجلس ادارت سب رس	"	۹۴	"	..

زیر طبع و منظورہ کتابیں

نمبر	نام کتاب	مرتب مصنف	موضوع	صفحات	سائز	قیمت
۱	سراج سخن (طبع دوم)	پروفیسر عبدالقادر سروری	انتخاب کلام	-	۱/۱۶ کراؤن	
۲	بلاغت (")	ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی	ادب	.	"	
۳	غزال رعنا (انتخاب کلام)					
۴	محمد قلی مع مقدمہ	پروفیسر جاوید وشسشٹ	دکنی ادب	.	.	
۵	مآثر نظامی (ذاکر منالام)	سید محی الدین (ایم، اے)	تاریخ	.	.	
۶	تذکرہ نوادر ایوان اردو (جلد دوم)	میر سراج الدین عاشقان	تذکرہ			
۷	فہرست کتب خانہ مطبوعات (جلد چہارم)	محمد اکبر الدین صدیقی	"			
۸	.... انتخاب کلام	کنول پرشاد کنول	شعر			
۹	غزل در غزل	اوج یعقوبی	"			
۱۰	برق و شرر	...بہ رشیدی	"			

ادارہ کی مطبوعات

معاصرین کی نظر میں

۱۹۶۶ء میں ادارہ کی شائع شدہ مطبوعات اور رسالہ "سب رس" کے خصوصی شماروں پر ہند و پاک کے مختلف ل وجرائد میں جو تبصرے شائع ہوئے ان میں سے چند کے اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ اب تک ادارہ ادبیات ... علمی و ادبی، تحقیقی، تہذیبی اور تاریخی موضوعات پر جن میں ادب الاطفال بھی شامل ہے (۳۱۰) کتابیں شائع کر چکا ہے ...عات کو علمی و ادبی حلقوں میں کافی قدر و منزلت سے دیکھا جا رہا ہے بالخصوص دکنیات کو دنیائے ادب سے روشناس ...یں ادارہ کی مطبوعات کا ملک بھر میں شہرہ رہا ہے۔ نیز ادارہ کی کئی ایک کتابیں ایسی بھی ہیں جو ہندوستان کی ...ف جامعات اور امتحانات اور فوقانی مدرسوں کے نصاب میں شامل ہیں ——— ادارہ

"سانولی" (ڈراموں کا مجموعہ) از مرزا اظہر افسر

ڈرامہ ایک ایسا آرٹ ہے جس کا عوام ...نہایت گہرا رشتہ ہے۔ فن ڈرامہ قدیم ترین انسانی ...یب سے ہزاروں سال بعد تک اسلئے زندہ رہا کہ اس ...ج کے افراد کے لئے تفریح طبع کا سامان مہیا کیا۔ ...جمہوری اور عوامی دور میں ڈرامہ تیزی سے مقبولیت ...کرتا جا رہا ہے، ادبی ڈرامے، ریڈیائی ڈرامے، اور اسٹیج ...کا فن پوری قوت سے عوام کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ ...ے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن پچھلے چند برسوں میں ہندوستان ...نیک کام ہوئے ہیں ان میں سے ایک ڈرامہ ...ف توجہ کی تجدید بھی ہے۔ ابھی ڈرامہ کا ... نیا ...ہے اور اس کی طرف توجہ کا ... اہم ہے ...اردو نے جدید ہندوستانی ڈرامے کی جو خدمت ...ہے وہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں چار یا پانچ زبانوں ہی نے کی ہوگی۔

اردو میں اسٹیج ڈراموں کے علاوہ ریڈیو کے وجود سے ڈرامہ نگاری کے فن کو زندگی ملی۔ ریڈیو کے نشر ہونے والے ڈراموں نے عوام کو پوری قوت سے اپنی طرف کھینچا اور حکومت نے بھی "قومی تحریک" کی تکمیل اور اس فن کی حوصلہ افزائی کی خاطر مقابلوں کا انعقاد کر کے کئی سہولتیں فراہم کی ہیں۔

جناب اظہر افسر کے موجودہ منتخب ڈراموں کا مجموعہ "سانولی" اس فن کی عظمت اور اس کی ترقی و مقبولیت کی سمت ایک خوش آیند مقام ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت سے فن ڈرامہ کو ایک دلپذیر اور اہم تحفہ ہاتھ آیا ہے۔ سانولی کے بیشتر ڈرامے اسٹیج بھی ہو چکے ہیں اور پسند ناظر بھی ہوئے ہیں، ویسے یہ تمام ڈرامے ریڈیائی تکنیک کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے۔ مناسب ترمیم دوران ... بعد مصنف ... سے خوش ... ادارہ ادبیات

اردو کی طرف سے شائع کردیا ہے اور بقول جناب میر حسن ڈاکٹر زور کا ادارہ قابلِ مبارکباد ہے کہ اس نے اس مجموعے کی اشاعت کا انتظام کیا ہے۔ آج سے کوئی دس سال پہلے صاحبزادہ میکش مرحوم کے نشری ڈراموں کا مجموعہ "کاغذ کی ناؤ" بھی اسی ادارہ سے شائع ہو کر مقبول ہوا تھا۔

اظہر افسر کا شمار ملک کے ان چند ڈرامہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے مختصر عرصہ میں اپنی ذکاوت و ذہانت کے سبب اس فن میں مہارتِ تامہ حاصل کی ہے۔ ایک طویل عرصہ سے اظہر صاحب آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ناٹک ہیں اور ڈرامے، خاکے اور فیچر وغیرہ لکھنے کے فن سے خوب آشنا ہیں۔ ہندوستان کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے ان کے ڈرامے نشر ہوتے رہے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں ڈرامائی روایات کا التزام ملتا ہے۔ وحدتِ زماں، وحدتِ مکاں، وحدتِ عمل اور وحدتِ تاثر کے ساتھ ساتھ ایجاز و اختصار اور کردارو میں انفرادیت اور ہمہ گیری ملتی ہے۔ انداز بیان کافی حد تک موثر ہوتا ہے جس سے مصنف کی اچھی تخلیقی صلاحیتوں اور فکر کی گہرائی و گیرائی کا سامع و قاری پر اچھا اثر مرتب ہوتا ہے ان ڈراموں میں جہاں ادبیت کی چاشنی ملتی ہے وہیں عام دلچسپی کے عناصر بھی جھلکتے ہیں

سانولی کے چودہ ڈراموں کا موضوع قومی تعمیر اور یکجہتی سماج سدھار، ادبیات اور ادبی شخصیتیں ہیں۔ جناب میر حسن نے ڈراموں کا تعارف کراتے ہوئے "سانولی" میں لکھا ہے کہ اظہر افسر صحیح قومی جذبہ رکھتے ہیں اور مفید مطلب موضوعات کی کارگر اشاعت کے گُر سے ان کو اچھی خاصی واقفیت ہے۔ انھوں نے خالص ریڈیائی ڈراموں میں آوازوں کی مدد سے کام لیا ہے بیان کی ہیں۔ قومی ڈراموں کی زبان فصیح اور م[illegible] اور ان ڈراموں کے بیشتر موضوعات کا تعلق [illegible] سماجی معاشی اور سیاسی میلانات و رجحانا[illegible]

"سانولی" اظہر افسر کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ [illegible] قبل بچوں کے لئے ان کے فیچر، ڈراموں اور کہانیوں [illegible] شگفتہ مجموعے چھپ چکے ہیں، امید ہے کہ مستقبل میں ان کی خلاقانہ صلاحیتیں اور مشاہدے کی گہرائی انہیں اعلیٰ ڈرامہ نگار بنا سکتی ہے

روزنامہ سیاست حیدرآباد (مورخہ ۱۶ر جنو[illegible]

○

۲ - ڈرامہ یونانی لفظ ہے ڈرامہ کا مطلب [illegible] اور ما کا مطلب ہے دکھانا، فن ڈرامہ ایک ایسا آر[illegible] جس کا عوام کے رہن سہن اور جذبات کے اظہار [illegible] رشتہ ہے۔ فن ڈرامہ کے قدیم ترین انسانی تہذیب [illegible] سال بعد تک دائم و قائم رہنے کی یہی وجہ ہے کہ [illegible] سماج کے تقریباً سبھی افراد کی ذہنی ترجمانی کی [illegible] تفریح طبع کا سامان فراہم کیا ہے، آج کے جمہوری فن ڈرامہ بڑی تیزی سے مقبولیت کے مدارج [illegible] ہے ناطق، فلموں کے وجود میں آنے کے بعد اردو [illegible] ڈرامہ ختم ہوگیا ہوتا اگر ریڈیو ڈرامے نے اسے سہار[illegible] ہوتا۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسٹیج ڈرامے پہلے ریڈیو کے لئے لکھے جاتے ہیں مناسب تبدیلیوں کے بعد منظر عام پر پیش کیا جاتا

سانولی اور دوسرے ڈرامے بھی اظہر افسر کے [illegible] ڈراموں کا مجموعہ ہے (بقیہ صفحہ ۴۶ پر)

شاعت تاریخ وتمدن دکن

شاعت تاریخ وتمدن دکن ادارے کا ایک
و دکن کے تاریخی وثقافتی ذخیرے کے فراہم کرنے
شائع کرنے میں سرگرم عمل ہے، چنانچہ اس شعبہ
ے حدیقۃ السلاطین (فارسی) مولفہ نظام الدین
مرتبہ علامہ سید علی اصغر بلگرامی، قطب شاہی سلاطین
دن (تلگو) مرتبہ ڈاکٹر رام راجو، مکتوبات قطب شاہیہ
و ایران (فارسی) مرتبہ نواب علی حسین خاں اور تاریخ
دو) طبع ثانی مولفہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی
عمل میں آچکی ہے، آصف جاہ اول کے عہد کی
مآثر نظامی (فارسی) مولفہ لالہ منسا رام،
ی الدین صاحب ایم۔ اے نے مرتب فرمایا
ہند کی امداد سے شائع ہوگی، اس کے علاوہ
لنت آصفیہ" کی تالیف کا کام بھی صاحب
ام دے رہے ہیں۔

اس شعبے کے لائحہ عمل میں کئی نادر مخطوطات
داخل ہے۔

میر سراج الدین علیخان
معتمد مجلس اشاعت تاریخ وتمدن دکن

میوزیم ایوان اردو

ایوان اردو کے میوزیم میں دکن کے تاریخی وثقافتی آثار کا بیش بہا ذخیرہ محفوظ ہے۔ میوزیم کی نادر اشیاء میں قطب شاہی، عادل شاہی اور آصفیہ فرامین واسناد ی کاغذات، دکنی خطاطی، (مصوری) کے نمونے، مشاہیر کے مکتوبات قلمی تصاویر، قدیم اسلحہ، بیدری ظروف، قدیم شجرے اور نقشے وغیرہ داخل ہیں،

آئے دن میوزیم کے نوادرات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے چنانچہ اس سال نواب عنایت جنگ بہادر نے کئی نادر اشیا عنایت فرمائی ہیں، جن میں قلمی تصاویر، مشاہیر کے خطوط، تاریخی کاغذات، اور قدیم نقشے وغیرہ داخل ہیں، ڈاکٹر غیاث صدیقی نے سکہ جات عہد مغلیہ وایسٹ انڈیا کمپنی، خطاطی کے نمونے، ٹکٹ مہر ریاست حیدرآباد کا ایک سٹ ایک قدیم نقشہ اور مدرسہ محمود گاواں کی نادر پینٹنگ عطا فرمائی ہے جو عہد اورنگ زیب میں بنائی گئی تھی، جناب مرزا شکور بیگ صاحب نے تین عکسی تصویریں عنایت فرمائی ہیں۔

نواب عنایت جنگ بہادر نے میوزیم میں کئی دن صرف کرکے میوزیم کی تنظیم جدید فرمائی ہے جس کے لئے ادارہ نواب صاحب کا شکر گزار ہے

میر سراج الدین علیخان
معتمد میوزیم

استفادۂ کتب خانہ

"اردو کے وقیع کتب خانہ (شعبۂ مخطوطات و مطبوعات اور دار المطالعہ)" ایوان اردو" سے اردو زبان اور ادب کے شیدائی، طلباء و طالبات اور ریسرچ اسکالرس صاحبان بڑی تعداد میں استفادہ اور مطالعہ کی غرض سے دور و نزدیک کے مقامات سے آتے رہتے ہیں۔ ذیل میں چند اصحاب کے نام درج کئے جاتے ہیں جنھوں نے مختلف اوقات میں یا متواتر کئی روز ادارہ کے کتب خانے کے مخطوطات یا مطبوعات سے استفادہ فرمایا۔ مخطوطات کی ترتیب و اشاعت اور حوالوں کے سلسلے میں اُن کی تعلیمی بی ایس یا ایم، اے کے نصاب سے متعلق یا پی، ایچ، ڈی کی ڈگری کے حصول کے سلسلے میں مطبوعات کے ذخیرہ سے مواد حاصل کیا

(ادارہ)

۱۔ محترمہ ذاکرہ غوث ریسرچ اسکالر مدراس یونیورسٹی مدراس

۲۔ جناب حمید شطاری صاحب ریڈر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

۳۔ ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اردو کالج جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

۴۔ محترمہ خدیجہ عارف النساء جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

۵۔ محترمہ معینہ سراج متعلم یم، اے جامعہ عثمانیہ

۶۔ محترمہ نجمہ صدیقہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ

۷۔ جناب طیب انصاری، ایم اے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

۸۔ جناب نسیم نصرتی 5-3-1 مشیرآباد۔ حیدرآباد

۹۔ جناب شبیر انور نائب معتمد حلقہ فکر و نظر چلپورہ حیدرآباد

۱۰۔ جناب ضیاء الدین احمد شکیب مددگار اسٹیٹ آرکائیوز حیدرآباد

۱۱۔ محترمہ بدر فضل صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

۱۲۔ جناب امیر چند، ریسرچ اسکالر

۱۳۔ جناب بدیع حسینی صاحب ریسرچ اسکالر جا

۱۴۔ جناب حمید آزموری ڈپٹی چیف پارکنگ انسپکٹر ج

۱۵۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں لکچرار جامعہ عثمانیہ حی

۱۶۔ جناب قیوم صادق صاحب ریسرچ اسکالر

۱۷۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ پروفیسر جامعہ عثمانیہ ج

۱۸۔ جناب محمد منظور احمد صاحب لکچرار آرٹس کالج کر

۱۹۔ مولانا محمد معز الدین قادری صاحب کتب خانہ لا بد

۲۰۔ جناب سلطان رضا صاحب 199-9-5 حیاء علی

۲۱۔ محترمہ رفیق فاطمہ صاحبہ ریسرچ اسکالر جام

۲۲۔ جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب ریڈر جام

۲۳۔ محترمہ حمیرہ جلیلی ریسرچ اسکالر جامعہ ع

۲۴۔ جناب ڈاکٹر محمد جمال شریف اے جی، آ د

۲- ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ
۲- جناب سلیمان صاحب ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۲- محترمہ زاہدہ ابوالحسن ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ -
۱- جناب نذیر الدین صاحب ضیا دگوڑہ، حیدرآباد
۲- محترمہ فرزانہ صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۲- ڈاکٹر محمد عبدالمطلب صاحب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۲- جناب قاضی محمد ذکریا امیر فاروقی صاحب ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲- پرنس نواب میر نقی علیخان ثاقب شانتی نگر، حیدرآباد
۳۱- جناب ارشاد علی خان صاحب ایم اے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد
۳- مولوی غلام رسول صاحب پائین درگاہ یوسفین نامپلی حیدرآباد
۳- جناب مصطفیٰ کمال احمد ایم اے ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۳- جناب قادر خلیل ۲۷-۶-۳-۲۲ سلطان شاہی حیدرآباد ۲
۳- محمد مجیب الرحمٰن صاحب ڈرائنگ ماسٹر بی ٹی ایس محبوب نگر
۳- جناب قاضی متین الدین صاحب ریسرچ اسکالر اورنگ آباد
۳۹- جناب محمد نصیح الدین انصاری سابق پٹیل کار تحصیل جہیز
۴- جناب مجاہد الانصاری صاحب محکمہ اطلاعات، حیدرآباد
۴۱- ڈاکٹر انور معظم صاحب ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۴۲- محترمہ اقبال سلطانہ صاحبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۴۳- محترمہ ثریا جمال صاحبہ ایم اے ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۴۴- جناب مرزا اظہر افسر صاحب آل انڈیا ریڈیو۔ حیدرآباد
۴- جناب فرحت وہاب صاحب حیدرآباد
- جناب میر حسن صاحب سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر ایس آئی آر مدراس
محترمہ سلمیٰ بلگرامی صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
علامہ حیرت بدایونی صاحب معظم پورہ حیدرآباد
جناب میر سراج الدین علیخان صاحب سابق مددگار ناظم آثار قدیمہ

۵۰- جناب جلال الدین ارمان فاروقی متعلم ایم اے جامعہ عثمانیہ
۵۱- علامہ نادح قریشی صاحب مغلپورہ حیدرآباد ۲
۵۲- جناب قمر ساحری ایم اے ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۵۳، جناب حمیدالدین سلیم ایڈیٹر ترجمان حیات، حیدرآباد
۵۴، جناب شفیع الدین صاحب حیدرآباد
۵۵، جناب نجم الدین صاحب "
۵۶، خیرالدین صاحب سواجی گوڑہ
۵۷- جناب رؤف خلش صاحب ادارہ مصنفین نو حیدرآباد
۵۸ " اکبر علی صاحب حیدرآباد
۵۹ " نجم عبدالقادر صاحب "
۶۰ جناب میر احمد علی قادری شانتی نگر حیدرآباد
۶۱ - " " میر معظم صاحب ریسرچ اسکالر پونا یونیورسٹی
۶۲ - " نظام الدین مغربی لکچرار اردو کالج حیدرآباد
۶۳ - جناب انتخار علی عباسی صاحب پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد
۶۴ " قادر محی الدین صاحب حیدرآباد
۶۵ " احمد رسول صاحب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۶۶ - مرزا جبار بیگ صاحب "
۶۷ - جناب حسین علیخان صاحب "
۶۸ - جناب محمود قادر صاحب ملک پیٹھ حیدرآباد
۶۹ - جناب صلاح الدین نیر صاحب ادارہ خاتون دکن حیدرآباد
۷۰ - جناب رزاق فاروقی صاحب لکچرار عثمانیہ کالج کرنول
۷۱ - جناب شاہ سوار علی صاحب ارم منزل حیدرآباد
۷۲ - پروفیسر ظل حسنین، شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی
۷۳ - جناب فیض الحسن خیال صاحب موتی گلی، حیدرآباد
۷۴ - جناب افضل الدین فاروقی صاحب معتمد تعلیمات "

۷۵۔ جناب [illegible] صاحب [illegible] حیدرآباد

۷۶۔ جناب عشرت کرتپوری صاحب ہمدرد [illegible] عابد روڈ

۷۷۔ جناب سید محمد زکی صاحب حیدرآباد

۷۸۔ جناب خواجہ معین الدین عارف بیابانی حیدرآباد

۷۹۔ جناب سید دلاور حسین صاحب سابق چیف انجینیر تجارہ دل حیدرآباد

۸۰۔ حضرت قدر عریضی صاحب [illegible] باہ جنی علم حیدرآباد

۸۱۔ محترمہ سرور جہاں صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

۸۲۔ جناب قطب الدین احمد صاحب اسسٹنٹ آرکائیوز، حیدرآباد

۸۳۔ ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب لیکچرار شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ

۸۴۔ جناب مولوی عارف الدین حسن صاحب ۸،۴ آغاپورہ

۸۵۔ محترمہ رخسانہ سید صاحبہ متعلم ایم اے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

۸۶۔ محترمہ نفیسہ فرید صاحبہ " " "

۸۷۔ جناب سرور مرزائی لیکچرار گلبرگہ کالج

۸۸۔ محترمہ فاطمہ یزدانی صاحبہ بیگم ڈاکٹر یزدانی مرحوم پنجہ گٹہ روڈ

۸۹۔ محترمہ رفیق النساء بیگم صاحبہ ریسرچ اسکالر ناگپور

۹۰۔ جناب نجم الدین علیخاں صاحب حیدرآباد

۹۱۔ محترمہ سرور جہاں صاحبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

۹۲۔ جناب بشیر احمد خاں صاحب ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ

۹۳۔ " اصغر علی انصاری صاحب ریسرچ اسکالر ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ

۹۴۔ محترمہ سرور جہاں صاحبہ حیدرآباد

۹۵۔ جناب تدبیر الدین احمد صاحب [illegible] حیدرآباد

۹۶۔ " [illegible]

۹۷۔ محترمہ [illegible] جامعہ عثمانیہ

۹۸۔ محترمہ فریدہ فاطمہ صاحبہ " "

۹۹۔ مولانا حافظ ابو یوسف ایم بی اے حیدرآباد

۱۰۰۔ جناب سید محی الدین صاحب اسسٹنٹ آرکائیوز حیدرآباد

۱۰۱۔ " افضل علیخاں صاحب "

۱۰۲۔ نواب میر عسکر علیخاں صاحب زعفران شانتی نگر حیدرآباد

۱۰۳۔ پنڈت سری رام شرما لیکچرار ہندی جامعہ عثمانیہ "

۱۰۴۔ جناب سید اختر علی صاحب شاہ متعلم اردو عالم "

۱۰۵۔ جناب نجم الدین صدیقی صاحب ریسرچ اسکالر آزاد انسٹی ٹیوٹ

۱۰۶۔ مولوی خورشید احمد جامی صاحب ۱۰۰، سلطان پورہ حیدرآباد

۱۰۷۔ " جناب حمید خان آئیم سکنڈ لانسرز "

۱۰۸۔ " سید صفی الدین قادری تہنیت منزل، پنجہ گٹہ روڈ

۱۰۹۔ جناب قطب سرشار معتمد بزم ادب ناگر کرنول (اے۔ پی)

۱۱۰۔ " جواد عابدی صاحب ارم منزل، حیدرآباد

۱۱۱۔ " فرحت حسین "معتمد بزم انیس" پرانی حویلی بلدہ

۱۱۲۔ " باقر منظور صاحب چنچل گوڑہ، حیدرآباد

۱۱۳۔ " مرزا حسن بیگ صاحب سبائی یاقوت پورہ حیدرآباد

۱۱۴۔ " سید جمیل الرحمن صاحب نیا ملک پیٹھ حیدرآباد

۱۱۵۔ " جہاندار افسر صاحب سابق رکن بلدیہ، مغلپورہ

۱۱۶۔ " منوہر داس لاہوتی صاحب لے جستھان بھون دارالشفاء

۱۱۷۔ محترمہ لیاقت بیگم صاحبہ متعلم ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹیٹیوٹ

۱۱۸۔ جناب شہریار کاؤس جی، باغ عام روڈ حیدرآباد

۱۱۹۔ " یوسف عشرت صاحب یاقوت پورہ، حیدرآباد

۱۲۰۔ " سید [illegible] قادری [illegible]

۱۲۱۔ " [illegible] صاحب [illegible] حیدرآباد

۱۲۲۔ " انور کمال خوندمیری صاحب ملک پیٹھ، د

۱۲۳۔ " رشید الدین صاحب ٹرانسپورٹ [illegible] آصفی، بالفا

۱۲۴۔ " احمد علیخاں صاحب ادیب فاضل اردو

امداد و اعانت

۱۹۶۱ء میں حسب ذیل اصحاب اور اداروں نے کتب خانہ میوزیم اور دارالمطالعہ کو اپنے گرانقدر عطایا سے نوازا جس کے لئے ادارہ ان اصحاب اور اداروں کا دلی شکر گزار ہے۔ خصوصاً ادارہ کی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات اور مطبوعات قبل انطباع ہند کے قدیم و جدید مختلف فنون کی کتابیں، رسالوں کی فائیلیں کتب خانے کے لئے اور سب رس میں تبصرہ کی غرض سے وصول ہوتی رہی ہیں۔ ہم اپنے علم دوست قارئین سے خواہش کریں گے کہ وہ اپنے علمی و ادبی ذخیرے کو تلف ہونے سے بچائیں اور ایسی کتابیں، علمی و ادبی اور تہذیبی نادر اشیا ادارہ ادبیات اردو کو تحفتہً مرحمت فرما کر محفوظ فرمائیں۔ ادارے کو ملنے والے ایسے ذخیرہ کی سالانہ فہرستیں، معطی کے نام کی صراحت اور شکریہ کے ساتھ ادارے کے ترجمان ماہنامہ سب رس کی خاص اشاعت "ادارہ نمبر" میں شائع کی جاتی ہیں، تاکہ ان عطایا سے دیگر ارباب نظر، ریسرچ اسکالر اور اردو دوست حضرات واقف ہو سکیں۔ (ادارہ)

جناب مولوی سید ذکاء الدین حسین صاحب چیف انجینیر تعمیرات حکومت ہند و سابق چیف انجینیر آندھرا پردیش نے ادارہ کے کتب خانہ کو (۲۷) اہم اردو مطبوعات تحفتہً مرحمت فرمائیں۔

ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے دوسرے سالانہ کل ہند مشاعرے میں حیدرآباد کے ممتاز فوٹو گرافر جناب شاہ علی (دہلی) فوٹو اسٹوڈیو نے ایوان اردو میں آویزاں کرنے کے لئے جناب مخدوم محی الدین کا پورٹریٹ تحفتہً دینے کا اعلان کیا اور صدر ادبی ٹرسٹ نواب ... ٹرسٹ نے مشاعرہ گاہ میں وقار خلیل نے ادارہ کے ... کیا۔

... غیاث صدیقی صاحب نے جناب میر سراج الدین طالبی ...

آفس سکریٹری ادارہ کو اپنے والد نواب میر معین الدین خان صاحب معین زخم ملت عظام الدولہ کی طرف سے ادارہ کے اردو میوزیم کے لئے مدرسہ محمود گاواں کی پینٹنگ اور چند مخطوطات اور نادرات جن میں فن خط علمی کے نمونے ... وغیرہ شامل ہیں تحفتہً مرحمت فرمایا۔

جناب شاہ علی (دہلی) فوٹو اسٹوڈیو حیدرآباد ... ایوان اردو کے آرٹ گیلری کے لئے نذر کیا۔

بیگم اشرف جناب حکیم عبدالمجید دہلوی صاحب متولی ہمدرد دہلی نے ادارہ کو ایک ہزار روپیہ کا عطیہ مرحمت فرمایا۔

جناب اے یعت، انڈیا کنسلٹنگ انجینیر بمبئی نے ادارہ
کی خدمات سے متاثر ہوکر ایک سو ایک روپیہ مرحمت فرمایا

جناب پی، سوکمارن صاحب بحیثیت ڈائرکٹر ٹمبر اینڈ
ٹریڈنگ کمپنی۔ وکٹوریہ ہاؤس، وکٹوریہ گارڈن۔ بمبئی ۲۷
نے جناب سید لدار حسین صاحب کی معرفت ادارہ کو تین سو
روپیہ روانہ فرمائیے ۔

جناب الحاج مرزا شکور بیگ صاحب نے ادارہ کے میوزیم
کے لئے جامعہ عثمانیہ کی طرف سے ۱۹۳۲ء میں اسٹیج کئے گئے
تین ڈراموں کے گروپ فوٹوز تحفتہً عنایت کئے ۔

انجمن ہلال اسلام لاہور کی طرف سے ادارہ کے کتب خانے کے
لئے (۱۱) مذہبی کتابیں تحفتہً وصول ہوئیں ۔

جناب سعادت علیخاں نے " مہدی نواز جنگ کی زندگی
کے چند پہلو" نامی کتاب ادارہ کی نذر کی ۔

انجمن ہلال اسلام لاہور نے بذریعہ ڈاک دو قسطوں میں (۲۰)
اسلامی ادب پر مشتمل قدیم وجدید کتب رسائل کتب خانہ
کو تحفتہً روانہ کئے ۔

جناب عبدالشکور صاحب (حیدرآباد) نے مشہور ہفتہ وار
"مدینہ" بجنور کے ۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۲ء کے فائیل ادارہ کو تحفتہً نذر کئے ۔

جناب عارف الدین حسن صاحب
امتحانات نے نصاب اردو امتحانات
کتب خانہ کے لئے عطا کیں ۔

جناب رکن الدین احمد صاحب عزیز باغ دا
نے کتب خانہ کے لئے اپنے والد نواب دین یا
کا انگریزی نسخہ ادارہ کو تحفتہً ارسال فر

ڈاکٹر سید عبداللطیف، وقار خلیل صاحب
صدیقی صاحب افسانہ اور فہمیدہ ممتاز صاحبہ (میسور) نے
مطبوعات کتب خانہ کے لئے تحفتہً روا

نواب عنایت جنگ بہادر نے شمس الاخبار
کے ۲۵ رسائل اور چند مخطوطات اور مطبوعات کتب
تحفتہً عطا فرمائیں ۔

جناب اسحاق ایوبی صاحب انفارمیشن
ان فارمیشن بیورو حکومت حیدرآباد نے
ڈیویژن کی مرتبہ و مطبوعہ انگریزی رپورٹ
ارسال فرمائیں ۔

انجمن اسلام لاہور کی طرف سے
اردو مطبوعات ادارے کے کتب خانہ کو

اردو امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اردو

سنہ ۱۹۴۰ء سے ادارہ کے اردو امتحانات اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم، اردو فاضل شعبۂ امتحانات کی مجلس مشاورت کے فیصلوں کے مطابق سال میں دو بار جون اور دسمبر میں اضلاع کے علاوہ شہر کے مختلف مرکزوں پر منعقد ہوا کرتے ہیں، جن میں اعلیٰ تعلیم کے خواہشمند اصحاب کے علاوہ جیل کے قیدی بھی بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔

ادارہ کے امتحان "اردو عالم" کی شہرت اور مقبولیت گذشتہ چند سالوں سے دو چند ہو گئی ہے۔ ایسے طلبا و طالبات جو میٹرک یا اس کے مماثل امتحان کا بار اٹھا نہیں سکتے یا پھر کسی وجہ سے شرکت کے بعد ناکامی کا منہ دیکھا ہو وہ بجائے مایوس ہونے کے ایوان اردو کا رخ کرتے ہیں۔ اور ادارے کے امتحان "اردو عالم" میں شرکت کی درخواست دیتے ہیں۔

اردو عالم سے کامیاب امیدواروں کو جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحان "ادیب کامل" میں داخلہ مل جاتا ہے جس کا معیار علی گڑھ یونیورسٹی میں انٹر کے برابر ہے۔ اس کے بعد طلبہ یا تو علی گڑھ یونیورسٹی، جامعہ اردو یا پھر عثمانیہ یونیورسٹی سے فائدہ اٹھا کر دو تین سال کے عرصہ میں "بی او ایل" یا اردو پنڈت کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اگر وہ چاہیں تو [illegible] میں داخل ہو کر یا پھر انگریزی کا امتحان دے کر بی اے بھی ہو سکتے ہیں۔ یا ملازمت اختیار کر کے اردو درس و تدریس کا کام آغاز کر سکتے ہیں۔

ادارہ ادبیات کے امتحانات کے اس پس منظر کے بعد سنہ ۱۹۶۶ء کے جون اور دسمبر کی میقاتوں کی شرکت کر کے کامیاب ہونے والے امیدواروں کی ایک مکمل فہرست درج کی جاتی ہے۔

(ادارہ)

نتائج اُردو امتحانات" ادارہ ادبیاتِ اُردو" حیدرآباد دکن

منعقدہ جون ۱۹۶۷ء

امتحان اُردو دانی

۱۔ مرکز انوار العلوم کالج حیدرآباد

۱۰۔ مرزا عبدالقادر بیگ بابر مرزا (امتیاز)

۸۔ رحمانی بیگم (کامیاب)

۱۷۔ محمد اکبر (")

○

۲۔ مرکز بودھن (نظام آباد)

۹۔ محمد بشیر (کامیاب)

۱۲۔ مرزا کلیم بیگ (")

۱۵۔ وحید الدین (")

۱۸۔ محمد ثناء الدین (امتیاز)

۱۹۔ لائق علی (کامیاب)

۲۲۔ صحیفہ بیگم (")

۲۳۔ سیدہ زلیخا خاتون (")

۲۴۔ جمیلہ بیگم (کامیاب)

۲۵۔ خیرالنساء بیگم (")

۲۶۔ سیدہ رضیہ خاتون (")

○

۳۔ مرکز نظام آباد

۲۷۔ محمد معین الدین (کامیاب)

۲۸۔ حافظ سید منظم علی (امتیاز)

۲۹۔ سید مظفر علی (")

۳۰۔ محمد عبدالرشید (کامیاب)

۳۱۔ احمد عبدالعزیز خاں (")

۳۴۔ قمرالنساء بیگم (امتیاز)

○

۴۔ مرکز پوتھر (عادل آباد)

۴۷۔ عبدالقدوس (کامیاب)

۴۸۔ تاج الدین (")

۵۱۔ شیخ عبدالحکیم (")

۵۲۔ عبدالحکیم (کامیاب)

۵۳۔ محمد امام خان (")

○

۵۔ مرکز جونیئر سرشیفا ہائر اسکول (بلدہ)

۵۶۔ نذیر ولد شیخ لال (کامیاب)

۵۷۔ عبدالستار (")

۵۸۔ شیخ عبدل (")

۵۹۔ نذیر عبدالیوسف علی (")

(۶۰) محمد (")

(۶۱) عبدالرحیم (")

(۶۲) ہاشم (")

(۶۳) شیخ محمد (")

(۶۴) محمد یوسف (")

(۶۵) محمد شریف

(۶۶) پاشاہ

(۶۷) عبدالرفیع

۶۸- محمد بشیر (کامیاب)
۶۹- راجہ راؤ (")
۷۰- محمد نعیم (")

○

امتحان اردو زبان دانی

○

مرکز آرمور (نظام آباد)
۲- سید کلیم احمد (درجہ دوم)
۳- محمد فرحت اللہ خاں (")
۸- محمد عبدالعلیم (")
۴- محمد نظام الدین (درجہ سوم)
۵- طاہر ضیاء الدین خاں (")
۶- احمد عبدالکلیم (")
۹- سید عبدالمبین (")

○

- مرکز انوار العلوم کالج حیدرآباد
۱۱- سید زوار علیخاں (درجہ اول)
۱۲- زینت عائشہ (درجہ سوم)

○

مرکز جونیر شیفائیلا اسکول (بلدہ)
عبدالقادر (درجہ سوم)

۴- مرکز ر نظام آباد)
۱۴- محمد عبدالوحید (درجہ سوم)

امتحان اردو عالم

۱- مرکز آرمور (نظام آباد)
۵- احمد عبدالعلیم (درجہ سوم)
۶- محمد نعیم الدین اآن (درجہ سوم)
۸- محمد فہیم الدین اعجاز (")
۹- محمد محبوب علی (")
۱۱- آمنہ خاتون صدیقی (")

○

۲- مرکز بانسواڑہ (ضلع نظام آباد)
۰- محمد نعمان خاں (درجہ دوم)
۳۰- انتصار فاطمہ (")
۱۴- سید محبوب علی (درجہ سوم)
۱۵- سید خواجہ یوسف الدین قادری (سوم)
۱۹ احمد پاشاہ (سوم)
۲۰- شن راؤ (")
۲۷- عائشہ بیگم (")
۲۹- فاطمہ بی (")
۳۱- محمدی فاطمہ (")
۳۲- طاہرہ بیگم (")

۴۴- کلیم النساء بیگم (سوم
۳۵- رفیع النساء بیگم (")

○

۳- مرکز انوار العلوم کالج بلدہ (ذکور)
۳۹- حافظ محمد عبدالحق صدیقی دوم
۴۵- علی بن عبداللہ (")
۴۷- حاجی محمد غوث (")
۴۸- حبیب انور خاں (")
۵۲- محمد سعید الدین (")
۵۳- میر محبوب علی (")
۵۴- عبدالرحمن (")
۵۹- محمد عبدالرب چیلی (")
۶۱- حسن عرفانی (")
۷۰- سید حفیظ الدین حسین (")
۸۵- سید مظہر حسن (")
۱۰۲- میر ریاست علی (")
۱۰۷- سید عبدالوحید (")
۱۱۰- محمد عبدالحمی (")
۱۲۴- محمد عبدالرحمن (")
۱۶۸- سید احمد (")
۱۷۱- سید رشید احمد (")
۱۷۲- سید بشیر احمد (")
۱۷۷- الیسن زوجی (")

۲۲۷ - عبدالرحمن خان (دوم)
۲۲۹ - محمد یوسف خان (")
۲۳۰ - محمد سعادت (")
۳۸ - محمد انور خان (سوم)
۴۴ - عبداللہ ہندی (")
۴۹ - محمد بن علی (")
۵۰ - خواجہ کریم الدین انصاری (")
۵۸ - سید جمال الدین (")
۶۰ - سید سردار امام الدین (")
۶۲ - سید عبدالقدیر حسینی (")
۶۵ - محمد عبدالماجد حسینی (")
۶۶ - شیخ عبدالغفار جیلانی (")
۶۷ - شیخ احمد (")
۶۸ - سید مہدی حسین (")
۶۹ - مرزا جبار بیگ (")
۷۱ - سید محمود پاشاہ قادری (")
۷۲ - سید قادر پاشاہ ملتانی (")
۷۳ - سید خواجہ رؤف الدین (")
۷۴ - محمد عبدالاحد (")
۸۱ - میر شجاعت علی (سوم)
۸۴ - سید مخدوم حسینی (")
۸۵ - محمد معز الدین (")
۸۹ - سید عارف قادری (")

۹۴ - سید شاہ شمیم الدین مست تمر (سوم)
۹۵ - محمد غوث (")
۹۶ - طیب بن طاہر عمران (")
۹۹ - محمد نظام الدین (")
۱۰۰ - سید معز الدین احمد قادری (")
۱۰۳ - محمد اسد اللہ حسینی (")
۱۰۴ - محمد آدم (")
۱۰۵ - محمد عبدالرشید رومی (")
۱۰۶ - محمد اختر جبین خان (")
۱۱۱ - سید خلیل الرحمن (")
۱۱۳ - محمد ظہیر الدین (")
۱۶۵ - وجاہت علی خان (")
۱۶۶ - مرزا رفعت علی بیگ (")
۱۷۳ - محمد عبدالقادر (")
۱۷۴ - سید امیر حسین (")
۱۷۵ - امتیاز الحق اقبال (")
۱۸۱ - شیخ فرید اللہ (")
۱۸۲ - مظہر حسین (")
۲۰۳ - محمد ضیاء الدین متقی (")

۵

۴ - مرکز انوار العلوم کالج بلدہ اناث

۱۲۲ - ساجدہ فصیح (درجہ دوم)
۱۲۵ - سیدہ القمر (")

۱۴۵ - زیب النساء بیگم دوم
۱۴۸ - بلقیس فاطمہ (")
۱۴۹ - طلعت نسرین (")
۱۵۰ - اقبال سلطانہ (")
۱۶۹ - غوثیہ سلطانہ (")
۱۸۵ - انیس سلطانہ (")
۲۲۲ - پروین (")
۱۱۴ - نجم النساء بیگم درجہ سوم
۱۱۵ - عزیز سلطانہ (")
۱۱۶ - فضل جہاں بیگم (")
۱۲۰ - نسیم سلطانہ (")
۱۲۳ - سیدہ زہرہ (")
۱۲۴ - امتہ الفاطمہ (")
۱۲۷ - حشمت النساء بیگم (")
۱۲۸ - فریدہ بیگم (")
۱۳۰ - قدسیہ سلطانہ بیگم (")
۱۳۱ - فاطمہ بیگم (")
۱۳۲ - جمیل النساء بیگم (")
۱۳۳ - قمر النساء (")
۱۳۴ - سیدہ سراج النساء بیگم (")
۱۳۶ - سیدہ عزیز النساء بیگم (")
۱۳۷ - سیدہ النساء بیگم (")
۱۳۸ - حبیب النساء بیگم (")

۱۴۰- رضیہ سلطانیہ (سوم)
۱۴۷- رحیم النساء (〃)
۱۴۸- دیدار النساء بیگم (〃)
۱۸۰- گوہر زلیخا (〃)
۱۸۳- سلمیٰ بیگم (〃)

○

مرکز بودھن (ضلع عادل آباد)

۲۳۴- عبدالسمیع (درجہ سوم)
۲۳۵- محمد زین العابدین خاں (〃)
۲۳۶- پی اسنجیوا ریڈی (〃)
۲۳۷- محمد اختر علی (〃)
۲۳۸- یم نرسیوان ورس (〃)
۲۳۹- آمنہ بیگم (〃)

○

مرکز بودھن (نظام آباد)

۱۸۶- جلیل احمد (درجہ سوم)
۱۸۷- محمد عبد المجید (〃)
۱۸۸- اسحاق احمد نقشبی (〃)
۱۸۹- سید احمد (〃)
۱۹۰- شیخ داؤد (〃)

○

مرکز نظام آباد

۱- محمد عبد القدیر (درجہ سوم)

۱۹۲- محمد عبد الکریم فاروقی (سوم)
۱۹۳- سید عظمت اللہ (〃)
۱۹۶- حافظ ابراہیم محی الدین (〃)
۱۹۷- حافظ محمد عبد المجید (〃)
۱۹۸- محمد عزیز احمد (〃)
۱۹۹- سید علی (〃)
۲۰۰- محمد سرور (〃)
۲۰۱- احمد حسین (〃)

○

۸- مرکز محبوب نگر

۲۰۵- محمد غوث (درجہ دوم)
۲۱۳- احمد اللہ شریف (〃)
۲۱۴- محمد عبد الغفار عبد الکریم (〃)
۲۱۵- محمد عبد الغفار امیر علی (〃)
۲۳۲- محمد کریم الدین (〃)
۲۴۴- خیر النساء بیگم (〃)
۲۰۳- محمد ولی الدین (درجہ سوم)
۲۰۴- محمد عباس علیخاں (〃)
۲۰۶- خلیل خاں (〃)
۲۰۷- محمد حسین (〃)
۲۰۸- احمد عبد الرحیم (〃)
۲۰۹- محمد کمال الدین (〃)
۲۱۰- ہمنت راؤ کلبانی (〃)

۲۱۱- محمد قمر الزماں صدیقی (سوم)
۲۱۲- محمد حنیف (〃)
۲۱۷- سلیم النساء (〃)
۲۱۸- کریم النساء (〃)
۲۳۰- علی احمد (〃)
۲۳۳- سعیدن سلطانہ (〃)
۲۴۲- سید رفعت اللہ کاظمی (درجہ سوم)
۲۴۳- رحیم النساء بیگم (〃)
۲۴۵- سید علی ابراہیم (〃)
۲۴۶- سید مسعود علی (〃)
۲۴۷- محمد بشیر علی (〃)
۲۴۹- افضل خاں (〃)

۹- مرکز نشر ل جبل (حیدر آباد)

۱۵۱- سید عزیز احمد ہمدانی (درجہ دوم)
۱۵۵- ایشور بھگت (〃)
۱۵۷- محمد غوث (〃)
۱۵۴- جی نرسلو (سوم)

اردو فاضل

۱- مرکز انوار العلوم کالج (حیدر آباد)

۱- احمد رسول (درجہ دوم)

نوٹ: امتحان ہال میں ناجائز ذرائع استعمال کرنے کی پاداش میں رول نمبر ۲۵ کو دو امتحانات اور رول نمبر ۲۳، ۲۴، ۲۷ و ۲۶ کو ایک امتحان میں شریک ہونے کی اجازت نہ ہوگی۔

نتائج اردو امتحانات ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

منعقدہ دسمبر ۱۹۶۷ء

امتحان اردو دانی

۱- مرکز آرمور (نظام آباد)

۱- سید معصوم حسین انور (امتیاز)

۲- مرکز جے اسی اسکول (حیدرآباد)

۲۳- گوردھن لال (امتیاز)

۴- محمد بشیر (کامیاب)

۵- محمد ہاشم (")

۷- عبدالستار (")

۸- محمد شریف (")

۹- نذیر (")

۱۴- محمد وحید (")

۱۵- محمد شرف الدین (")

۱۷- محمد یوسف (")

۱۸- محمد شریف (")

۲۰- علی بشیر (")

۲۲- محمد صابر (کامیاب)

اردو زبان دانی

۱- مرکز آرمور (نظام آباد)

۱- محمد عبدالرزاق (درجہ سوم)

۲- محمد احمد (")

۳- محمد عبدالجلیل (")

۲- مرکز جے اسی اسکول (حیدرآباد)

۹- محمد احمد (درجہ دوم)

۱۵- علی خان (")

۱۰- محمد سلیم (درجہ سوم)

۱۲- نعیم حسینی (")

۱۳- عظیم الدین (")

۱۹- ایوب بن احمد (")

۲۱- عبدالرزاق (")

۳- مرکز ناگر کرنول (محبوب نگر

۳۳- محمد شفیع الدین احمد (د

۳۵- محمد محمود علی (

۳۷- رضیہ بیگم (

۳۹- قمر جہاں (

۲۳- محمد حیات (درجہ

۲۵- محمد متین الدین (

(۲۶)- محمد امجد اسعد (

۲۷- محمد اسحاق (

۲۸- محمد رؤف الدین (

۳۰- محمد نظام الدین (

۳۴- محمد عطاء الرحمن (

۳۶- محمد غیاث الدین (

۳۷- محمد مجیب حسین (")

۳۸- محمد لبیب (")

۳۹- سید حامد حسین (")

۴۰- محمد رشید احمد (")

۴۱- سید اقبال علی سلیم (")

۴۲- محمد لیاقت علی (")

۴۳- خواجہ معین الدین

۴۵- سید نعیم اللہ حسینی

۴۶- محمد محبوب علی

۴۸- عابدہ بیگم

۴- مرکز انوار العلوم کالج (حید

۵۱- سعیدہ بانو (درجہ

۵۲- حسن بانو (

اردو عالم

۱- مرکز آرمور (نظام

۲- احمد عبدالمجید (د

- محمد عبدالسمیع (درجہ سوم)
- محمد شریف الرحمن (")
- سید خواجہ معین الدین (")
- شیخ احمد (")
- لطیف النساء (")
- سلطانہ بیگم (")

○

ز- میسور (کرناٹک)

۱۹- پرجبین سلطانہ (درجہ دوم)
۱۹- عزت النساء (")
۱۹- یس، قمر النساء (")
۱۹- مہر النساء (")
۱- محمد اسلم (درجہ سوم)
۱- میر عزیز الدین (")
۱- خالدہ بانو (")

○

ز- ناگر کرنول (محبوب نگر)

۱- محمد حسین (درجہ دوم)
۱- محمد موسیٰ (")
۱- محمد سراج الدین (")
۱- شیخ سیادت علی خاں (")
۱- شیخ قطب الدین منظور (")
۱۱- قمر سلطانہ (")
۱- محمد عبدالمجید (درجہ سوم)
۱۱- محمد تراب علی (")
۱- محمد نصیر اقبال (")
۱۱- شیخ مسعود (")

○

ز- بانسواڑہ (ضلع نظام آباد)

۲- محمد عبدالسلیم (درجہ دوم)
۲- محمد صبغت اللہ الکمالی (")
۲- ناصرہ بیگم (")
- جلیل احمد (درجہ سوم)
۱- سید عثمان (")
۱- سید حسین (")
۱- محمد سلیم الدین (")
۱- شیخ اکرام حسین (")
۱- سید عنایت الحسن (")
- شیخ احمد حسین (")
۱- محمد عارف حسینی (")
۱- محمد اطہر حسین (")
- محمد ابطال حسن (")
- ممتاز بیگم (")

۳۳ - نور جہاں بیگم (درجہ سوم)

○

۵- مرکز- کرنول (آندھرا پردیش)

۳۷ - سید عارف اللہ حسینی (درجہ دوم)
۴۲ - قادر ولی شیخ (")
۴۳ - عبدالرشید (")
۴۴ - عبدالکریم (")
۴۵ - حافظ عبداللطیف (")
۴۶ - ایس، خواجہ حسین (درجہ سوم)
۴۸ - عبدالرحیم خاں (")
۴۹ - ایم، عبدالواحد (")
۵۰ - حفیظ الرحمن (")
۵۱ - سید سلیم پاشاہ (")
۵۲ - سید ابوالحسن حسینی (")
۵۳ - ڈی، نظام الدین (")
۵۵ - مرشد پیر (")
۵۶ - محمد فضل الرحیم (")
۵۷ - عبدالحمید خاں (")
۵۸ - سید حسین (")
۶۰ - محمد مصطفیٰ حسین (")

۶- مرکز محبوب نگر (آندھرا پردیش)

۶۲ - محمد اسحاق (درجہ دوم)
۶۷ - محمد عبدالجلیل (")

۶۸ - محمد مخدوم علی (درجہ دوم)
۶۹ - سید اختر علی شاہ (")
۷۰ - راما چاری (")
۷۵ - خواجہ معین الدین (")
۹۸ - میمونہ بیگم (")
۹۹ - سلطانہ بیگم (")
۱۰۰ - اقبال النساء بیگم (")
۱۰۹ - بی، راما نجا (")
۱۰۲ طیبہ تبسم زبیری (")
۶۴ - گوردھن داس (درجہ سوم)
۶۶ - ای، ایم کرن، سنگھ (")
۷۲ - خواجہ نثار الدین احمد (")
۷۳ - محمد عبدالستار (")
۷۴ - احمد حسین (")
۷۵ - محمد اسحاق (")
۷۷ - محمد غلام دستگیر قریشی (")
۷۸ - سید وزیر الدین (")
۷۹ - میر فرخندہ علی (")
۸۱ - محمد خواجہ ذوقی (")
۸۲ - محمد مقصود علی (")
۸۳ - شیخ محمد (")
۸۵ محمد مجیب الرحمن نیازی پوری (")
(۸۷) محمد عبدالعزیز (")

٨٧ - محمد باقر شریف (درجہ سوم)
٨٨ - جے شنکر راؤ (")
٨٩ - محمد عمر شریف (")
٩٠ - خواجہ شمس الدین (")
٩٢ - ٹھاکر کشن سنگھ (")
٩٣ - محمد عبدالرؤف (")
٩٤ - محمد رشید الدین (")
٩٥ - محمد خلیل الرحمن (")
١٠٢ - شریفہ بی (")
١٠٦ - محبوب خاتون (")
١٠٧ - فرحت النساء (")
١١٠ - بدر سلطانہ (")
١١٢ - مہر النساء (")

○

٧ - مرکز انوار العلوم کالج
حیدرآباد دکن

١٣١ - سید شاہ حیدر حسینی (درجہ دوم)
١٣٢ - میر رضا علی کاظمی (")

١٣٧ - میر عارف علی (درجہ دوم)
١٣٩ - محمد منیر الدین (")
١٤١ - محمد عبدالعزیز (")
١٤٥ - اشفاق احمد (")
٢٦ - عبدالقدیر (")
٥٤ - شیخ علی (")
٧٢ - زاہدہ بیگم (")
١٥٥ - محمد نعیم الدین (")
١٦٠ - سیدہ پروین (")
١٧٨ - اقبال بانو (")
١٧٩ - خورشید بانو (")
١٢٦ - خواجہ معین الدین احمد (سوم)
١٢٧ - محمد عبدالرحیم (")
١٣٨ - سکندر علی (")
١٣٨ - سید خواجہ معین (")
١٤٠ - شیخ ابراہیم (")
١٤٢ - محمد باسط علی (")
١٤٣ - سید سلطان (")

١٥١ - محمود علی خاں (در
١٥٢ - محمد آصف حسین (
١٥٤ - محمد عبدالحفیظ (
١٨٦ - محمد محبوب علی رشید (
٢٠١ سید حسن عابد زیدی (
١٥٨ - محمودہ بیگم (
١٥٩ - رحمت النساء بیگم (
١٦٣ - رفیق النساء بیگم (
١٦٩ - شہناز بیگم (
١٧٠ - سرفرازہ بیگم ("
١٧٤ - رشیدہ
شرف الدین خان ("
١٧٥ - سیدہ خاتون ("
١٧٧ - فضل النساء بیگم ("
١٨٢ - ثروت سلیمین (

○

فہرستِ مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اردو

بہ لحاظ حروف تہجی

جنوبی ہند (حیدرآباد دکن) کے سب سے بڑے علمی و ادبی مرکز ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے قیام ۱۹۳۱ء سے اب تک تقریباً تین سو (۳۰۹) کتابیں مختلف موضوعات پر شائع کی ہیں جن میں ادب، تحقیق، تنقید، تذکرہ۔ شاعری۔ افسانہ۔ تاریخ کلچر۔ سائینس ادب اطفال۔ سوانح۔ پورٹین۔ ترجمے۔ دکنیات۔ غرض سبھی موضوعات شامل ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو نے خصوصاً دکن کی تاریخ و تہذیب و ادب کے نادر اور اہم گوشوں پر گرانقدر ادب پیش کیا ہے اس کی کئی کتابیں ادب میں نہ صرف حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ سنگ میل قرار دی گئی ہیں۔ علمی، ادبی اور تحقیقاتی کام کرنے والوں کے نزدیک تو یہ مطبوعات اوراق گرانقدر سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ادارہ کی کئی ایک کتابیں اپنی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر سررشتہ تعلیم کے نصاب میں شامل ہو گئی ہیں۔ ذیل میں اب تک شائع شدہ مطبوعات ادارہ کی ایک مکمل فہرست بلحاظ حروف تہجی شائع کی جا رہی ہے۔ جس کتاب پر یہ ⊗ علامت ہو اسے خارج از اشاعت سمجھا جائے۔ (ادارہ)

سلسلہ نمبر	نام کتاب	مصنف / مرتب	قیمت	سلسلہ نمبر	نام کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
۱	آب دوز اور سرنگ	فیض محمد صدیقی	۷۵ پیسے	۶	اردو انسائیکلوپیڈیا	ادارۂ ادبیات اردو	۱/۲۵
[illegible]	آبگینۂ شعرا (مجلد)	بشیر النساء بیگم بشیر	۶/- روپے	۷	اردو دانی کی پہلی کتاب	اظہر الدین	-/۲۵
[illegible]	آریائی زبانیں ٥	ڈاکٹر سدھیشور ورما	۱/۵۰	۸	اردو دانی کی دوسری کتاب	اظہر الدین	-/۴۰
[illegible]	ادبی تحریریں (مجموعہ مضامین ڈاکٹر زور)	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۲/۰۰	۹	اردو کی لاج	بشیر النساء بیگم بشیر	-/۲۵
				۱۰	اردو مثنوی کا ارتقاء ٥	پروفیسر عبدالقادر سروری	۲/-
[illegible]	اردو املا	مولوی غلام رسول	-/۵۰	۱۱	اردو میں سائنسی ادب	خواجہ حمید الدین شاہد	۱/۵۰

۱۲	ارمغانِ احمد	خواجہ حمید الدین شاہد	1/00
۱۳	ارمغانِ جذب	راگھویندر راؤ جذب	1/00
۱۴	ارمغان محمد قلی شاہ	ادارہ	/50
۱۵	اسلامی عدل گستری	عبد الحفیظ صدیقی	1/62
۱۶	اشوک اعظم	سیدہ مہدی جعفری	1/50
۱۷	اقبال کا تصور عشق	ڈاکٹر غلام عمر خاں	1/75
۱۸	اقبال کا تصور خودی	"	3/00
۱۹	انوار	علی اختر	3/00
۲۰	ایوان سخن	پروفیسر سید محمد	-/75
۲۱	باتیں	شجاع احمد قائم	1/-
۲۲	بادۂ سخن ○	ڈاکٹر زور	-/75
۲۳	باغ و بہار (ایڈیشن)	"	2/00
۲۴	برف میں آگ	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	2/00
۲۵	بلاغت	ڈاکٹر سلیم اللہ حسینی	-/75
۲۶	بلقان	عبد الحفیظ صدیقی	-/75
۲۷	بہمنی سلطنت	پروفیسر مجید صدیقی	2/50
۲۸	پانی کی کہانی	فیض محمد صدیقی	-/75
۲۹	پن چکی	مبارز الدین رفعت	2/0
۳۰	پودوں کی کہانی ⊗	پروفیسر سعید الدین خاں	1/00
۳۱	تاریخ ادب اردو	ادارہ	2/00
۳۲	تاریخ ادبیات عربی ⊗	سید ابو الفضل	3/00
۳۳	تاریخ انگلستان	منشی فیض الدین	2/50
۳۴	تاریخ سیاسیات	پروفیسر مجید صدیقی	3/50

۳۵	تاریخ نامدار دکن	احمد علی بیگ چغتائی	
۳۶	تحفۃ الشعراء (آفتاب)	ڈاکٹر حفیظ قتیل	
۳۷	تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول ⊗	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	
۳۸	" " جلد دوم ⊗	" " "	
۳۹	" " جلد سوم	" " "	
۴۰	" " جلد چہارم	" " "	
۴۱	" " جلد پنجم	" " "	
۴۲	تذکرہ نوادر ایوان اردو	" " "	
	جلد اول		
۴۳	ترجمان زندگی	سید علی منظور	50
۴۴	تعلیم سلسلہ	ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	/0
۴۵	تماشائے اہل ہنر	رشید الحسن ایم-اے	50
۴۶	تنویر تخییل	نجم الدین صدیقی	50
۴۷	ٹھنڈی بجلیاں	بھارت چند کھنہ	2/0
۴۸	ٹیگور راداس کی شاعری ⊗	مخدوم محی الدین	/50
۴۹	جب میں طالب علم تھا	شاہ غیاث	-/25
۵۰	چیونٹی ⊗	ڈاکٹر مینداراج سکسینہ	/75
۵۱	حدیقۃ السلاطین (فارسی)	علی اصغر بلگرامی	10/-
۵۲	حرف شیریں	قاضی غلام محمد	1/50
۵۳	حیات بخشی بیگم	نصیر الدین ہاشمی	/75
۵۴	حیدر آباد	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	/62
۵۵	حیدر آباد فرخندہ بنیاد	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	1/50
۵۰	حیدر آباد کے بڑے لوگ	غلام پنجتن شمشاد	2/0

خطابیات	ڈاکٹر رحیم الدین کمال	۱/۷۵	۸۰	سب رس (بہادر شاہ ظفر)	محمد اکبر الدین صدیقی	۱/-
دادا بھائی نوروزجی	ظہیر الدین احمد	-/۲۵	۸۱	" (ٹیگور نمبر)	" " "	۱/-
دارالعلوم کے سپوت	حافظ محمد مظہر	۱/۰۰	۸۲	" (نذر نمبر بالتصویر)	" " "	۲/-
داستان ادب حیدرآباد	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۱/۵۰	۸۳	" (عزیز جنگ نمبر)	" "	-/۵۰
دفتری معلومات	ظہیر الدین احمد	-/۳۷	۸۴	" (یادگار قلی نمبر ۶۶ء)	" "	۱/-
دکنی ہند و اردو	نصیر الدین ہاشمی	۲/۵۰	۸۵	سچ کا جادو	عبدالحبیب حضرمی	/۵۰
دیوان عشق اورنگ آبادی	محمد اکبر الدین صدیقی	۲/-	۸۶	سراج سخن	پروفیسر عبدالقادر سروری	۱/-
دیوان ہاشمی بیجاپوری	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۲/-	۸۷	سر سید احمد خاں	ظہیر الدین احمد	۱/-
رادھا اور رنگ محل	وزیر حسن دہلوی	۱/۵۰	۸۸	سرگزشت ادارہ	خواجہ حمید الدین شاہد	۲/-
راہبر و رکاروان	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۱/-	۸۹	سرگزشت حاتم	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۲/-
رباعیات الہام	ڈاکٹر پرنس موہندر راج سکسینہ	۱/۵۰	۹۰	سرگزشت غالب	"	۱/-
رسائل طیبہ	طیبہ بیگم	۲/۰۰	۹۱	سروجنی نائیڈو	وزیر حسن دہلوی	۲/-
رزق اردو داں	مرزا عظمت اللہ بیگ	۲/۲۵	۹۲	سلک گوہر	جلال الدین اشک	/۵۰
رم جھم	سمرنا گرستان سہنا	۱/۵۰	۹۳	سلسلہ سوانح سلاطین آصفی	سید مراد علی طالع	۱/-
رہبر سخن (بہاری لال رمز)	ڈاکٹر زور	۱/۰۰		بالتصویر (۶) کتابوں کا سیٹ		
روح غالب	" "	۲/۰۰	۹۴	سمندری عجائبات	احمد حسین نقوی	۱/۲۵
باغ مختار یہ	مختار علی دانش	۵/-	۹۵	سومنات ادارہ ⊗	ادارہ	۱/۵۰
زہریلے پودے	ڈاکٹر عبدالسلام	۱/۷۵	۹۶	شاد و اقبال ⊙	ڈاکٹر زور	۳/-
[illegible]	[illegible]	۲/-	۹۷	شعرائے شاہجہ	معین قریشی و	۴/-
[illegible]					باقی صدیقی	
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	۱/-
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	"	۱/[illegible]
[illegible] (انجمن نمبر)	محمد اکبر الدین صدیقی	[illegible]	۱۰۰	الجبیانی کائنات	پروفیسر محمد علی خاں	[illegible]

۱۰۱	طلسمِ تقدیر *	ڈاکٹر زور	-/۱	۱۱۹	کیف و کم	یوسف ناظم
۱۰۲	عرب اور عربستان	جہاں بانو نقوی	-/۷۵	۱۲۰	کیفِ سخن ⊗	ڈاکٹر زور
۱۰۳	عروض	ڈاکٹر کلیم اللہ حسینی	۱/۸۵	۱۲۱	گارساں دتاسی	ڈاکٹر زور
۱۰۴	علم خانہ داری	محمودہ صدیقی	-/۵۰	۱۲۲	گریہ و تبسم ⊗	صاحبزادہ میکش
۱۰۵	عماد الملک	فیض محمد صدیقی	-/۵۰	۱۲۳	گاندھی جی	خورشید احمد جامی
۱۰۶	فن تقریر	ادارہ	۱/۵۰	۱۲۴	گنج طلسم (ڈرامہ)	ڈاکٹر زور
۱۰۷	فکر مت کرو	قاضی زین العابدین	-/۲	۱۲۵	لیلیٰ	عظیم النساء بیگم
۱۰۸	فیضِ سخن ⊗	ڈاکٹر زور	-/۷۵	۱۲۶	مال والوں کی تاریخ	مراد علی طالع
۱۰۹	فہرست کتب خانہ	مولوی غلام رسول	-/۳	۱۲۷	ماہ لقا اور دوسری نظمیں	عزیز احمد
	مطبوعات (جلد اول)	محمد اکبر الدین صدیقی		۱۲۸	متاعِ سخن ⊗	ڈاکٹر زور
۱۱۰	" (جلد دوم)	" "	۲/۷۵	۱۲۹	مجموعہ نظم حالی	ادارہ
۱۱۱	" جلد سوم	" "	۲/۵۰	۱۳۰	محبت کی چھاؤں	مرزا ظفر الحسن
۱۱۲	قطب شاہی سلاطین اور آندھرا سنسکرتی انگریزی			۱۳۱	محمد حسین آزاد	جہاں بانو نقوی
		ڈاکٹر زور	۱/۲۵	۱۳۲	محمد قلی کی جیون کہانی	وقار خلیل
				۱۳۳	مختار الملک سالار جنگ	فیض محمد صدیقی
۱۱۳	قواعد اردو امتحانات ادارہ	شعبہ اردو امتحانات	-/۲۵	۱۳۴	مدراس میں اردو ⊗	نصیر الدین ہاشمی
				۱۳۵	معانی سخن (انتخاب)	ڈاکٹر زور
۱۱۴	قطب شاہی سلاطین اور آندھرا سنسکرتی (تلگو)	ڈاکٹر رام راجہ	-/۲	۱۳۶	کلام محمد قلی قطب شاہ	
				۱۳۷	معلم بالاتفاق	سید زاہد حسین
۱۱۵	سکندر کی ناؤ	میر محمد علی خاں میکش	۱/۵۰	۱۳۸	مکاتیب سلاطین	عباس علی خاں
۱۱۶	کشاکش ثانی ⊗	شجاع احمد تائر	-/۷۵		قطب شاہیہ	
۱۱۷	گلشن الحقائق (جام)	محمد اکبر الدین صدیقی	-/۲		بنام سلاطین مغلیہ	
۱۱۸	کلیات غواصی	پروفیسر محمد بن عمر	-/۳		(ایران فارسی)	

…ت شاد عظیم آبادی	ڈاکٹر زور	۳/-
…کی دنیا	رشید قریشی	۱/-
…سخن (جلد اول) ⊗	ڈاکٹر زور	۵/-
(جلد دوم)	״ ״	۴/-
…زور	ادارہ سب رس	۱/-
…ان شاہی خاندان	محمد عبد الرحمٰن خاں	۵/-
…شاہیر قندھار دکن	محمد اکبر الدین صدیقی	۱/۵۰
…تصانیف کے اردو تراجم	میر حسن	۱/۵۰
…مقام غالب	مبارز الدین رفعت	۲/-
…تاریخ دکن	پروفیسر عبد المجید صدیقی	۱/۷۵
…مولانا ابو الکلام آزاد	وقار خلیل	/۵۰
…وں کی کہانیاں	حبیب ابراہیم	/۷۵
…یاں داد خاں سیاح	ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	۲/-
…میر محمد مومن	ڈاکٹر زور	۳/-
…دکن	سکینہ بیگم	۱/۵۰
…محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر زور	۵/-
…رحمانی	وقار خلیل	
…دلی	جہاں بانو نقوی	۳/۵۰
…پرویت	عزیز یار جنگ عزیز	۱/۵۰
…تو تدری	سید علی منظور	۲/-
…سخن ⊗	ڈاکٹر زور	/۷۵
…مسکائے	محمود حسین بدخشی	۲/۵۰
…اماکی شاعری	میر حسن	۱/۵۰

۱۶۲	وہمی	وزیر حسن دہلوی	۵/۵۰
۱۶۳	ہمارے پھول	پروفیسر محمد سعید الدین	۱/-
۱۶۴	ہندوستانی تمدن	ڈاکٹر ایشور ٹوپا	۲/۷۵
۱۶۵	ہوش کے ناخن ⊗	میر حسن اور مخدوم محی الدین	—
۱۶۶	یلینیا	فضل الرحمٰن	۱/-
۱۶۷	یاد امجد	محمد اکبر الدین صدیقی	۲/-
۱۶۸	یاد ساقی	״ ״ ״	۱/-
۱۶۹	یادگار جشن سیمیں	حمید الدین شاہد	۱/-
۱۷۰	یادگار زور	محمد اکبر الدین صدیقی	۶/-
۱۷۱	یادگار صفی اورنگ آبادی	حمید الدین شاہد	۱/-
۱۷۲	یادگار محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر زور	/۱۵
۱۷۳	یادگار نصیر الدین ہاشمی	محمد اکبر الدین صدیقی	۲/-
۱۷۳	یورپ جنگ سے پہلے	پروفیسر ہارون خاں شیروانی	۲/۵۰
۱۷۴	ارسطو جاہ ⊙	پروفیسر عبد المجید صدیقی	—
۱۷۵	ہندوستانی قومیت کا تمدنی پہلو	ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا	۱/۲۵

ادارۂ ادبیات اردو کے صدر، نائب صدر، کارکن مجلسین اور شعبے ایوان اردو بلیک

۱۵ر جنوری ۱۹۳۱ء ادارہ ادبیات اردو قائم ہوا۔
۱۰ر جنوری ۱۹۴۱ء فراہمی زمین و عمارت کے لیے صدر جہد شروع کی گئی۔ ۳ر جنوری ۱۹۴۶ء حضرت خواجہ حسن نظامی نے عمارت کا نام "ایوان اردو" تجویز فرمایا۔
۲۷ر جنوری ۱۹۵۵ء ادارے کی سلور جوبلی منائی گئی۔
۱۵ر اپریل ۱۹۵۵ء مجلس انتظامی نے محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ کی تحریک پر ادارے کے لیے زمین حاصل کرنے کی خواہش کی
۲ر اکتوبر ۱۹۵۵ء بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور نے اس قطعہ زمین کو ادارے کے نام بطور عطیہ رجسٹری کرا دی۔
۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۵ء [illegible] الدین نظامی چیف ٹاؤن پلانر نے نقشہ مکمل کیا۔

۶ر نومبر ۱۹۵۵ء حیدرآباد کے چیف منسٹر ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ نے سنگ بنیاد رکھا۔ حکومت آندھرا پردیش کے علاوہ حضور نظام کے چیرٹی ٹرسٹ، سالار جنگ اسٹیٹ، نظام ٹرسٹ [illegible] فراہمی عطیات اور چندہ و رقم سے تعمیر [illegible] کی مدت میں [illegible] کی تکمیل ہوئی۔
۱۲ر مارچ ۱۹۶۲ء بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر نے اس ایوان کا افتتاح فرمایا۔ اور جناب بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش نے افتتاحی جلسے کی صدارت فرمائی

۱۔ ادارے کے صدر

نواب سر مہدی یار جنگ بہادر
۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۷ء

نواب لیاقت جنگ بہادر
۱۹۴۷ تا ۵۸

نواب زین یار جنگ بہادر
۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۱

پروفیسر سید علی اکبر
۱۹۶۱ء

۳۔ نائب صدور

نواب لیاقت جنگ بہادر
۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۷ء

نواب زین یار جنگ بہادر
۱۹۴۷ء ۱۹۵۸ء

پروفیسر سید علی اکبر
۱۹۶۱ء تا ۱۹۳۰ء

پروفیسر عبدالمجید صدیقی
۱۹۵۸ء

جناب سید دلدار حسین صاحب ۱۹۶۱ء

رائے جانکی پرشاد صاحب
۱۹۶۲ء

محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ
۱۹۶۶ء

۴۔ مجلس انتظامی

صدر: پروفیسر سید علی اکبر صاحب
نائب صدور: پروفیسر محمد عبدالمجید صدیقی صاحب
" رائے جانکی پرشاد صاحب
" محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ
اراکین: جناب ایل این گپتا صاحب
جناب حامد علی عباسی صاحب
جناب سید دلدار حسین صاحب
نواب عنایت جنگ بہادر
جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب
جناب شاہ تقی الدین قادری صاحب
جناب من راج صاحب سکسینہ
جناب میر سراج الدین علیخانی صاحب
جناب بشیر حسن صاحب
ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب
جناب عارف الدین حسن صاحب
معتمد ادارہ [illegible]

۲۔ ادارے کے معتمدین

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۱۹۳۱ء تا ۱۹۶۲ء

ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ ۱۹۶۲ء

۵۔ مجلس اشاعت تاریخ و تمدن

صدر: پروفیسر عبدالمجید صدیقی
اراکین: نواب عنایت جنگ بہادر
جناب آقائی حسین ضابط
نواب عباس حسین صاحب
ڈاکٹر چراغ علی حقیر بگجرار

معتمد
جناب میر سراج الدین علیخانی صاحب

...یم بالغان اردو امتحانات	۷۔ مجلس انتظامی "سب رس"	۸۔ مجلس نشر و اشاعت
پروفیسر سید علی اکبر ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد عمومی جناب رائے جانکی پرشاد صاحب پروفیسر سید محمد صاحب مولوی غلام رسول صاحب جناب نصیر الدین صاحب نظامی جناب محمد منظور احمد صاحب جناب محمد اکبر الدین صدیقی جناب کنول پرشاد صاحب کنول محترمہ ڈاکٹر خالدہ بیگم صاحبہ جناب عارف الدین حسن صاحب	نگران:۔ پروفیسر سید علی اکبر مولوی میر حسن صاحب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جناب رمن راج سکسینہ صاحب ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب جناب محمد منظور احمد صاحب منتظم:۔ وقار خلیل صاحب مہتمم: محمد جمال الدین صاحب معتمد:۔ جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب	صدر:۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی اراکین۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد عمومی پروفیسر ایم اے رحمٰن جناب میر بدر علیخاں ایڈیٹر سیاست جناب میر سراج الدین علیخاں صاحب جناب وقار خلیل صاحب جناب منظور احمد صاحب معتمد:۔ محمد محمود حسین صاحب
...س انتظامی کتب خانہ	۱۰۔ مجلس ادب اطفال	۱۱ مجلس انتظامی اردو انسائیکلوپیڈیا
نواب عنایت جنگ بہادر پروفیسر عبدالمجید صدیقی جناب خواجہ محمد احمد صاحب جناب مولوی غلام رسول صاحب جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب	صدر:۔ شری پی ہنمنت راؤ (ایم پی) ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد عمومی جناب دھریندر پرشاد صاحب جناب مرزا سرفراز علی بیگ صاحب جناب مرزا علی صاحب طالع جناب وقار خلیل صاحب جناب محمد منظور احمد صاحب معتمد: ڈاکٹر محمد مصلح الدین صاحب	صدر:۔ پروفیسر سید علی اکبر پروفیسر عبدالمجید صدیقی ڈاکٹر محمد محسن محشر عابدی جناب خواجہ یوسف الدین صاحب رائے جانکی پرشاد صاحب ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب معتمد:۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ
عملہ دفتر ادارہ ادبیات اردو جناب سراج الدین علی خاں صاحب سکریٹری (اعزازی)	جناب محمد جمال الدین صاحب منتظم ادارہ جناب رفیع الدین صاحب انصاری (لائبریرین) جناب وقار خلیل صاحب منتظم سب رس نگران دارالمطالعہ	محمد عبداللہ صاحب کار پرداز محمد نذیر الدین صاحب چوکیدار

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد (اے۔پی)

تختہ آمد و خرچ من ابتدا ۱ اپریل سنہ ۱۹۶۶ء لغایت ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۶۷ء

خرچ	روپے	پیسے	روپے	پیسے
اخراجات مطبوعات				
اخراجات اشاعت و خریدی کتب برائے فروخت بشمول ڈاک خرچ			۴۱۷	۴۰
" معاوضہ مصنفین			۶۵۰	۰۰
" اشاعت سب رس				
ا۔ اخراجات طباعت بشمول قیمت کاغذ	۲،۲۱۵	۹۵		
ب۔ متفرق و ڈاک خرچ	۹۲	۹۹	۲،۳۰۸	۹۴
اخراجات برائے محصول کار باغ			۲۲	۵۰
" اردو امتحانات			۱،۷۰	۴۰
" کتب خانہ				
(۱) تنخواہ عملہ کتب خانہ	۱،۱۱۰	۰۰		
(۲) صادر و متفرق اخراجات	۲۱	۶۷	۱،۱۳۱	۶۷
علمی و ثقافتی مصروفیات و تقاریب				
(۱) علمی و ادبی مصروفیات	۵۱	۵۰		
(۲) یوم محمد قلی قطب شاہ	۷۳۸	۸۹		
(۳) " زور	۴۵۵	۷۹	۱،۲۴۶	۱۸
اخراجات دفتر ادارہ				
(۱) تنخواہ عملہ دفتر	۳،۲۶۰	۰۰		
(۲) ٹیلیفون، بجلی اور پانی	۱،۰۸۴	۱۸		
(۳) صادر، طباعت، ڈاک خرچ	۱۱۲	۸۷		
(۴) متفرق اخراجات	۲۸۴	۶۶		
(۵) آڈٹ فیس	۱۰۰	۰۰	۴،۸۴۱	۷۱
ادائی بہ محترمہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور برائے تنصیب سنگ مزار			۵۰۰	۰۰
" پیشگی برائے اخراجات			۸۵۰	۰۰
سلک اختتامی نقد و بنک				
(ا) نقد	۳،۰۳۸	۹۱		
(ب) نقد سلک در اسٹیٹ بنک صدر دفتر	۷،۶۱۷	۴۱		
(ج) اسپیشل سیونگس بنک اکاونٹ در کنٹرا بنک				
(۱) ادارہ کھاتہ ۱۹۱ = ۰۳				
(۲) سب رس " ۴۲۰ = ۱۲	۶۱۱	۲۳		
گلشن اکاونٹ جی رگھوناتھ مل بنک ضم شدہ بہ کنٹرا بنک لمیٹڈ	۱۵۸	۹۰		
بحکم ڈائرکٹر اسٹیٹ بنک	۲،۰۷۲	۰۳	۱۳،۵۰۲	۴۹

میزان ۲۳،۲۳۱ - ۰۹

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد (اے۔ پی)

تختہ آمدنی ابتدائے یکم اپریل ۱۹۶۶ء لغایتہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۷ء

آمدنی	روپے	پیسے	روپے	
سلک افتتاحی				
۱۔ نقد رقم	۱,۵۵۵	۵۵		
ب۔ رقم در کرنٹ اکاونٹ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد (صدر دفتر)	۶,۷۴۴	۴۱		
ج۔ ،، اسپیشل سیونگس بنک اکاونٹ کنٹرا بنک لمیٹڈ حیدرآباد				
۱۸۴۳ = ۳ ادارہ اکاونٹ (۱)				
۳۰۴۳ = ۲۱ سب رس اکاونٹ (۲)	۵۸۸	۴۴		
د۔ کلکشن اکاونٹ جی رگھوز تھول بنک ضم شدہ بہ کنٹرا بنک لمیٹڈ	۱۵۸	۹۰		
ھ۔ فکسڈ ڈپازٹ بہ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد (صدر دفتر)	۵,۶۲۴	۳۲	۱۴,۶۶۹	[illegible]
آمدنی از مطبوعات ادارہ			۱۰۶۵۲	[illegible]
آمدنی از ماہنامہ سب رس				
ا زر سالانہ	۲۴	۷۱		
ب معاوضہ اشتہارات	۱۳۰	۰۰		
ج فروخت نمونہ وقدیم شمارے	۱۶	۶۸	۳۸۷	[illegible]
آمدنی از کار باغ			۱۰۷	[illegible]
امداد از حکومت ہائے ہند وآندھرا پردیش				
ا۔ **از حکومت آندھرا پردیش**				
۹,۰۰۰ = ۰۰ برائے امداد باہمی ادارہ بابتہ ۶۷-۱۹۶۶ء (۱)				
۵۰۰ = ۰۰ ،، انعقاد جشن یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۶۷ء (۲)	۶,۵۰۰	۰۰		
ب۔ **از حکومت ہند**				
برائے امداد ادارہ بابتہ ۶۷-۱۹۶۶ء	۲,۵۰۰		۹,۰۰۰	۰۰
آمدنی از امتحانات اردو				
فیس امتحانات میٹرو رنڈم، عارضی صداقت نامہ جات، قیمت فارم شرکت وقواعد وضوابط و پرچہ جات سوالات سال گزشتہ			۱۵۶۳۷	[illegible]
عطیات: (۱) برائے یوم محمد قلی قطب شاہ	۱۴۷	۵۷		
(۲) ،، یوم اردو	۳۱	۰۰	۱۵۸	[illegible]
امداد از محکمہ بلدیہ، حیدرآباد برائے دارالمطالعہ ادارہ			۴۰	[illegible]
آمدنی از منافع کھاتہ جات بنک				
فکسڈ ڈپازٹ	۴۵۱	۷۱		
(۱) ۷ = ۰۰ سیونگس بنک اکاونٹ ادارہ				
(۲) ۱۶ = ۰۰ ،، سب رس	۲۳	۰۰	۴۷۳	[illegible]
آمدنی متفرق				
ا۔ آمدنی از ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ				
۷۰۰ = ۰۰ بابتہ کرایہ ۳۵۰ = ۰۰ بابتہ بجلی (۲)				
۶۵ = ۳۶ ۔ دا ٹیلیفون بلز (۳) ب	۳,۷۷۶	۶۵		
ب۔ کرایہ بیان نامہ [illegible]	۱۴۷	۰۰	۳۰۹[illegible]	[illegible]
وصول از مدات [illegible]				
صدر میزان	—	—	[illegible]	[illegible]

مقام: حیدرآباد (اے پی)
تاریخ ۱۸/۷/۱۹۶۷ء

تنقیح کیا اور درست پایا۔

دستخط: ایس، پی، دستگیر اینڈ کمپنی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ

ادارہ کی اہم مطبوعات

نمبر	نام کتاب	نام مصنف
۱	تذکرہ اردو مخطوطات جلد پنجم	مرتبہ ڈاکٹر زور
۲	فہرست مطبوعات کتب خانہ ادارہ	محمد اکبر الدین صدیقی
	جلد اول	مولوی غلام رسول
	جلد دوم	محمد اکبر الدین صدیقی
	" " جلد سوم	"
۳	حدیقۃ السلاطین (فارسی مکمل)	علی اصغر بلگرامی
	ٹائپ کی طباعت	
۴	ادبی تحریریں	ڈاکٹر زور
۵	میر محمد مومن	"
۶	کلمۃ الحقائق (برہان الدین جانم)	محمد اکبر الدین صدیقی
۷	دیوان ہاشمی (بیجاپوری)	ڈاکٹر حفیظ قتیل
۸	کلیات غواصی	محمد بن عمر مرحوم
۹	معانی سخن (انتخاب کلام) محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر زور
۱۰	تاریخ ادب اردو	[illegible]
۱۱	داستان ادب [illegible]	ڈاکٹر زور
۱۲	کیفیت و کم [illegible]	[illegible]
۱۳	[illegible]	[illegible]

ایجنسی کی کتابیں

۱	اردو کے اسالیب بیان	ڈاکٹر زور	1/50
۲	ہندوستانی لسانیات	" "	3/00
۳	ہندوستانی فونیٹکس (انگریزی)	" "	4/00
۴	باغ و بہار	مرتبہ ڈاکٹر زور	2/00
۵	انوری بیگم (ناول)	طیبہ بیگم بلگرامی	2/00
۶	تجربی طبعیات	پروفیسر نصیر احمد عثمانی	2/00
۷	طلسم تقدیر	ڈاکٹر زور	1/00
۸	نقشہ اور نقشہ سازی	حفیظ صدیقی	[illegible]
۹	اسٹوڈنٹس قرآن (انگریزی)	ڈاکٹر ہاشم امیر علی	5/00
۱۰	سیر اعظم (تذکرہ)	پروفیسر محمد نصیر الدین	1/10
۱۱	ذکر و فکر (انتخاب کلام)	تہنیت النساء بیگم	2/00
۱۲	بسر و شکر	" "	2/[illegible]
۱۳	تسلیم و رضا	"	2/00
۱۴	[illegible] (تذکرہ)	مراد علی [illegible]	
۱۵	[illegible]	مرتبہ ارشاد حسین	[illegible]
۱۶	[illegible]	پروفیسر [illegible]	[illegible]
	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

ر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

۱۹۳۸ء جلد ۳۱ شمارہ ۱۱

س نومبر ۱۹۶۸ء

ماہنامہ

سب رس

نگران

وفیسر سید علی اکبر

مجلس مشاورت

ر گوپی چند نارنگ۔ میراج سکینہ۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں

محمد منظور احمد

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

تہتم — منتظم

اقبال الدین — وقار خلیل

سالانہ چھ روپے غیر ممالک سے دس روپے

تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے

ے پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے

کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر

بادسے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

گذشتہ مہینے میں ۲۰ ستمبر کو ایوان اُردو میں پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی کے انتقال پر جناب سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ ادبیاتِ اُردو کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر مغنی تبسم اور راقم الحروف نے مرحوم کے کارناموں پر روشنی ڈالی اس کے بعد تعزیتی قرارداد پیش ہو کر منظور ہوئی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے تحریک کی کہ سب رس کا ایک خاص شمارہ پروفیسر مرحوم کی یاد میں شایع کیا جائے اس کو جناب صدر نے منظور کیا اور آئیندہ کوئی شمارہ ان کی یاد میں نکالنے کی اجازت عنایت فرمائی۔

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی بجائے خود ایک ادارہ اور انجمن رہے ہیں۔ ان کے دوست احباب، شاگردوں اور وابستگان سے درخواست ہے کہ وہ اپنے مضامین ختم نومبر تک ارسال فرمائیں تاکہ ان کے شایانِ شان سب رس کا یادگار شمارہ شائع کیا جاسکے۔

ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات اُردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم - ۲۹ ڈسمبر تا ۳۱ ڈسمبر بلدہ اور اضلاع کے مراکز پر ایک ساتھ منعقد ہوں گے فیس داخل کرنے کی آخری تاریخ ۲۰ ڈسمبر مقرر کی گئی ہے۔ اضلاع میں مراکز کے قیام کے تعلق سے جناب عارف الدین حسن صاحب معتمد امتحانات ادارہ ۲-۶-۸۷۲ اسپیشل سی آئی بی۔ آغاپورہ حیدرآباد ۱ سے مراسلت کر کے معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ادارہ ان امتحانات کو سنہ ۱۹۴۰ء سے فروغ اردو کے سلسلے میں منعقد کرتا آرہا ہے اور اب تک ہزاروں اصحاب شرکت کر کے اپنے تعلیمی معیار میں اضافہ کر چکے ہیں۔ ادارہ ان امتحانات کی نگرانی کیلئے اضلاع کے تمام مراکز پر اپنے نمایندے روانہ کرتا ہے جو سوالات کے پرچوں کے ساتھ جاتے اور جوابی بیاضوں کے ساتھ واپس ہوتے ہیں۔ ان کی خصوصیت سے سرکاری اور جامعاتی امتحانات کے مراکز بھی جاری ہیں۔ جامعہ اردو علی گڈھ نے اُردو عالم کے امتحان کو مستند قرار دیا ہے۔ اس امتحان کو کامیاب کر کے ادیب کامل میں شریک ہو سکتے ہیں جس کو بی او ایل (عثمانیہ) میں شرکت کیلئے قبول کیا گیا چنانچہ اس طریقے سے کئی امیدواروں نے اپنی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کی ہے۔

اس رسالے میں ڈاکٹر عابدی، ڈاکٹر احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر مغنی تبسم، پروفیسر شیخ زید اور جناب سید یوسف کمال بخاری ڈائرکٹر آف میوزیم بھوپال کے مضامین تنقیدی اور تحقیقی ہیں۔ خصوصاً جناب بخاری صاحب نے تو زک جہانگیری کے نیشنل میوزیم کو جہانگیر کا قلمی ثابت کرنے میں جو عرق ریزی کی ہے وہ قابل داد ہے اور یقیناً بہ نظر استحسان دیکھی جائیگی۔ یہ مضمون انگریزی میں اسلامک کلچر میں شایع ہوا ہے اردو میں ابھی تک منظر عام پر نہ آیا تھا۔ ہم بخاری صاحب کے ممنون ہیں کہ یہ مضمون آپ نے سب رس کو عنایت فرمایا۔

محمد اکبر الدین صدیقی

از امیر حسن عابدی

فاتح گیلانی

میر رضی متخلص بفاتح کو "میرزا" اور "شاہ" بھی کہا گیا ہے۔ مگر ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بہرحال آپ صفوی کے چشم و چراغ اور شیخ علی حزین کے اقربا میں سے تھے۔ گیلان کے شہر رشت میں پیدا ہوئے جس پر آپ کو کافی ناز رشت سے ایک جذباتی لگاؤ تھا۔

هست فاتح بلبل گلزار رشت — طالب آمل اگر از آمل است

گرد شهرت گر خدا خیر است گیلان در جهان — لیک فاتح هر زمان بینی ز شهر رشت ماست

انھوں نے کوہ حیدر کا بھی ذکر کیا ہے جو غالباً رشت میں ہے ؎

کوه حیدر صد فلک از طور سینا برتر است — برتر از شان کلیم الله شان حیدر است

بعد میں آپ اصفہان جا کر رہنے لگے جہاں کے دریا کی توصیف کی ہے ؎

ای خوشا زاینده رود اصفهان — کاسمان طاقی ز طاق این پل است

دیوان فاتح کا ایک قلمی نسخہ سالار جنگ میوزیم میں ہے (لم ۱۰۷، ادب نظم فارسی) جس کی کتابت ن حاجی خاں نے ۱۱۶۴ھ میں ذی الحجہ کے مہینہ میں حیدرآباد میں کی تھی۔ اس نسخہ میں شاہ فاتح کے حالات سے قلمبند کئے گئے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علوم دینی وغیرہ کی تحصیل کے بعد فاتح زیارت عتبات عالیات انہ ہوئے۔ سب سے پہلے وہ وطن سے نجف گئے۔ جہاں تین دن رات ضریح مبارک کے سامنے کھڑے برابر روتے جاتے تھے۔ تیسری شب میں جب دنیا سوئی ہوئی تھی روضہ سے دست مبارک بلند ہوا اور نے فاتح کے ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیعت کیلئے آواز دی جب بیعت سے فراغت ہوئی تو دوسری آواز آئی ، ظاہری کیلئے مشہد مقدس کے شاہ عرفان کو حکم دیدیا گیا ہے۔ اسی وقت سے فاتح کی درویشی کا سلسلہ اور وہ تارک الدنیا ہو کر فقیرانہ لباس میں سفر کرتے ہوئے مشہد پہنچے۔

ادھر شاہ عرفان نے دو درویشوں کو ان کے استقبال کیلئے بھیجا جو فاتح کرمان کے پاس لیگئے

بسال ۱۱۸۰ ہجری / ۶۷-۱۷۶۶ عیسوی

فاتح نے ابتدائے جوانی میں کبھی یہ مصرع کہا تھا: سلکی کو تا مراد در بزم عرفان جادہد۔ جب شاہ عرفان کی نظر ناز پڑی تو انسے پوچھا کہ کیا انھوں نے یہ مصرع کہا تھا۔

اسکے بعد روضۂ امام رضا میں فاتح نے شاہ عرفان کے ساتھ دو چلّے کھینچے جسکی برکت سے بنیز عرفان کی توجہ سے انکی کیفیت بہت بدل گئی۔ ہندوستان خاصکر دکن اور حیدرآباد میں انسے بے شمار خوارق عادا ظاہر ہوئے۔ نیز جس سرزمین پر فاتح پہنچے تھے ان سے بوے وحدت لوگوں کے دماغ تک پہنچتی اور ان کو بے خود و مدہوش بنادیتی تھی۔

چونکہ شاہِ مردان کی طرف سے انکو فاتح کہکر پکارا گیا تھا اسلئے یہی انکا تخلص اور لقب ہوگیا۔

بہرحال جب ایران پر افغانیوں کا تسلط ہوا تو فاتح ۱۱۲۴ - ۱۱۳۱ ہجری / ۱۷۱۳ - ۱۷۱۹ عیسوی کے درمیان ہندوستان آئے۔ مؤلف تذکرۃ الشعراء نے آپ کو عہد فرخ سیر ۱۷۱۳ - ۱۷۱۹ عیسوی کا شاعر بتلایا ہے حسبِ ذیل شعر میں آپ نے اپنے ہندوستان آنے کا سبب بھی بتلایا ہے:۔۔۔

زامیر خود نپرسی ز غریب خود نگوئی !!! کہ زعشق من برآمد سوے ہند از ولایت

بہرحال یہاں آنے پر آپ نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ نیز ہندوستان کی باربار تعریف کی ہے۔۔

فاتح چو روشنش شدہ چشم از سواد ہند این سرمہ راد گر بصفاہان نمی دہد

حسب ذیل شعر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ یہاں آکر لوگوں کی ہدایت اور ان کے معیار کو بلند کرنا چاہتے تھ

بیا فاتح ز ایران چشم اہل ہند روشن کن کہ قدر سرمہ داد گرد راہ اصفہان اینجا

پھر بھی ظاہر ہے کہ مسافرت کے عالم میں انہیں وطن یاد آتا رہا ہوگا اور وہ ایران کو فراموش نہیں کرتے تھے۔ نیز یہاں انہیں تلخیوں کا سامنا کرنا پڑا اور تہی دستی کی زندگی دیکھنی پڑی جس کے نتیجے میں وہ یہاں سے برداشتہ خاطر ہوکر شکایت کرنے لگے ؎

گریم بہ تیرہ بختی خود گر بہ ملک ہند اشکم کدام قطرہ کہ صد رود نیل نیست

فاتح ز تہی دستی خود داد کہ در ہند ہردم گہر اشک درین بادہ بیارد

ز فاتح ای صبا در گلشن ایران پیامی بر کہ روز روشن خود در دیار ہند شب کردم

سرد برگ غزل خوانی چو بلبل نیست در ہندم درین گلشن برنگ غنچہ فاتح دل گرفت از من

بھنا از قول من فیضی نباشد بی نصیبان را ز آب خضر در ظلمات سبب ترک کئے توان کردن

حسب ذیل اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اس سفر میں انہیں وطن جیسی عزت نصیب نہ ہوئی وہ ایران واپس جانا چاہتے تھے ؎

در وطن عزت دیگر بود آزادان را — جلوۂ کبک بکہسار نماید خود را

در وطن خاطر آزادہ دلان آزار است — در چمن غنچہ دل افگار نماید خود را

با ایران ای روم فاتح ز ہند از درد بیدردی — چو بیماران دہم تغییر از بہر شگون جا را

مگر بھی اس ملک کو بالکل فراموش کرنے کے لئے وہ تیار نہ تھے ۔

با ایران گر شود بخت سیاہت آرزو فاتح — خدا نا کردہ یاد ہند گاہے میتوان کردن

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں پہلے وہ دہلی میں رہے اور اس کے بعد دکن گئے۔ جہاں وہ حیدرآباد

میں رہے ۔

حیدرآباد است فاتح چون دل فاتح خراب — چشم آن دارم کہ از فضل و کرم آباد باد

اس کے بعد وہ ارکاٹ چلے گئے ۔

افگن بخود زنار بگردن فاتح — می برد عشق بتاں جانب ارکاٹ مرا

مؤلف ریاض الشعراء نے لکھا ہے کہ فاتح نے ایک سال تک شاہجہاں آباد میں انتہائی گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی، مگر سفینۂ ہندی میں بتایا ہے کہ وہ ہندوستان میں صرف ایک سال رہے۔ اگر ریاض الشعراء کا کہنا مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ دہلی میں ایک سال اور اس کے بعد دکن وغیرہ میں بھی کچھ رہے ہوں گے مگر اگر سفینۂ ہندی کی بات مانی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک ہی سال میں دہلی حیدرآباد اور ارکاٹ وغیرہ رہے۔

مؤلف ریاض الشعراء نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایک سال کے بعد شاہجہاں آباد سے زیارت بیت اللہ کے قصد سے روانہ ہوئے اور راستہ کے درمیان ڈاکوؤں اور لٹیروں کے ہاتھوں مع تمام قافلہ کے قتل کر دیئے گئے۔ سفینۂ ہندی میں بھی یہی عبارت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک سال کے قیام کے بعد جب وہ زیارت بیت اللہ کیلئے روانہ ہوئے تو گجرات کے پاس لٹیروں نے انہیں قتل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ سفر کے وقت فاتح نے ایک غزل کہی تھی جس کے مقطع میں اس سفر کی طرف اشارہ ہے ۔

صبا از گلشن ایران ز فاتح این پیامی بر — کہ روز روشن خود در دیار ہند شب کردم

مگر حسب ذیل شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دکن سے دہلی کیلئے دوبارہ روانہ ہوئے ۔

چو گل ز ملک دکن چند فاتح از سیرش — کہ باز شوق ہوائے دیار دہلی کرد

واپسی میں راستہ میں قتل کر دیئے گئے تھے۔ مؤلف تذکرۂ بے نظیر نے بھی اس کی تائید کی ہے اور یہی صحت سے قریب ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دہلی واپس ہو کر انکا زیارت بیت اللہ کا ارادہ رہا ہو۔ شیخ علی حزیں نے اپنے تذکرہ میں تحریر کیا ہے کہ فلاں سال نواح گجرات میں فاتح چوروں کے ہاتھوں قتل کئے گئے تھے۔ فاتح نے قسم اور … خیال

بابا شجاع الدین کی مدح کی ہے۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ حضرات انہیں ایران میں ملے تھے یا ہندوستان میں ؎

بشورہ آمدہ فاتح بذبانہ قاسم — خوش است شورش مستان اگرچہ بے ادبی است

کرد فاتح صید حسن خلق احسن خاں مرا — زان گل و بلبل طبع سخن گستر بود

زہے عید ہمایون نوای بابا شجاع الدین — تبارک باد و میمون نوائے بابا شجاع الدین

اپنے معاصرین میں سے ہندوستان کے کسی نامر علی کی موت پر اظہار افسوس کیا ہے۔ نیز حسب ذیل شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے مربی رہے تھے ؎

قابل تربیت امروز کسے نیست بہ ہند — رفت نامر علی از دست تو فاتح افسوس

مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کون صاحب ہیں۔

فاتح کا تذکرہ نویسوں نے بڑے احترام سے ذکر کیا ہے۔ مولف تذکرہ بے نظیر نے انہیں "درویش صاحب تجرد مشرب، حق آگاہ"[1] کہکر یاد کیا ہے اور صاحب ریاض الشعراء ان کے متعلق لکھتے ہیں" از اعاظم سلسلۂ علویہ صفویہ از اکابران طبقہ جلیلہ بود"[2] ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ رسمی مذاہب کی تنگنائیوں سے بلند اور معرفت کے اعلیٰ مدارج پر فائز تھے ؎

ز شد فتحی بکارم ہیچ از دیر و حرم فاتح — دگر چشم نوازش حلقہ سانم نیست زین درہا

بدریائے می وحدت بسان قطرہ افتادم — عجب سرشار و دریا نوش این میخانہ ام امشب

مقصود دیر و کعبہ بود امتیاز دین — اسلام و کفر ہر دو پی دین بہم زنند

نیز ہندوستان آکر ان کی وسیع المشربی میں اضافہ ہوگیا تھا اور وہ یہاں کی بت پرستی سے کافی متاثر تھے نیز انھوں نے برہمن اور بت پرستوں کا بار بار ذکر کیا ہے ؎

فاتح از عشق بتی بت نہ پرستم چہ کنم — بت پرستم بخدا روی دلم سوی بتی است

برہمن گشتم و بت سجدہ کردم در رہ عشقت — ندارد ہر کہ تاب عاشقی از کار برخیزد

مگر نصیحت اور عرفان میں وہ طریقت کے ساتھ شریعت کے سختی سے پابند نظر آتے ہیں۔ وہ نماز روزہ جیسی چیزوں کو ترک کرنے کے قائل نہ تھے۔ نیز اخلاقی قدروں پر اصرار کرتے تھے اور انکے انحطاط کے شاکی تھے

زنہار مخور روزۂ ماہ رمضان را — کین لقمہ حرام است نگہدار دہان را

خواندہ گر آیۂ ان تخرق الارض ای پسر — کبر را در راہ رفتن ہان نسازی راہبر

---

[1] ص ۱۰۲ [2] فہرست ف

بجای بانگ نماز و تلاوت قرآن		نوای بربط و چنگ است یا علی مددی

فاتح کو حضرت علیؑ سے غیر معمولی عقیدت تھی ؎

ز فیض ساقی کوثر نیم محروم چون فاتح		گرفتم دامن ساقی کوثر شاہ دلدل را

یا علی سرور ارباب یقین عشق اللہ		ای غبار قدمت روح فزای فقرا

میرسد سلسلۂ نقر فقیران از تو		گو بہت گر نبود کفر خدائی فقرا

یا علیؑ کیست کہ در دہر ثنا خوان تو نیست		ہست منسوخ ہر آن آیہ کہ در شان تو نیست

ان کے علاوہ وہ تمام آئمۂ اہل بیت کے دل سے معتقد تھے ؎

فاتح برون نمی رود از خاندان دین		یعنی سگ محمد و آل محمد است

حسب ذیل غزل میں سب کی زیارت گاہوں کا فرداً فرداً ذکر کیا گیا ہے ؎

میرسان بر سر خاک نجف از این محزون		گذرت گر فتد ای باد صبا عشق اللہ

عمر ہا شد کہ ز درگاہ تو گشتم محروم		در رہ ہند بصد جور و جفا عشق اللہ

وز نجف چون بسر خاک حسینؑ راہ بری		تحفہ از ما ببرای باد صبا عشق اللہ

کاظمین قبلۂ اہل کرم و اہل دل اند		جان ما در رہ شان باد فدا عشق اللہ

چون ازی سامرہ ای باد صبا بہر خدا		برسان بر سر شہ سرور ما عشق اللہ

زان طرف بر در سلطان خراسان چون رسی		برسان از من غمگین برضا عشق اللہ

ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک رند مشرب انسان تھے ؎

چون شمع گشت عمر مرا صرف دوستان		یکسان ببزم فقر و شہنشاہ سوختم

مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ تند خو بھی واقع ہوئے تھے ؎

فاتح تند خوی تو از دو جہان رمیدہ است		رام نمی شود بکس ہر کہ گزیدہ خوی تو

مولف ریاض الشعرا نے ان کے دیوان کے متعلق لکھا ہے "دیوان آن عارف زمان قریب سہ چہار ہزار بیت بود و تمام ابیاتش است بر حقایق و معارف بسیار و حل مسائل و نکات لطیفہ ں شمار[1] اور صاحب اکار ستان سخن نے ان کے اشعار کے متعلق کہا ہے "از بیارگان سمار فکرش عالم خواطر مستغنی است"[2] شیخ علی حزیں نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ کسی نے فاتح کے کچھ اشعار انھیں سنائے۔ نیز ان اشعار کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے خالی از حالتی و کیفیتی

---

[1] فہرست ن ۲۱ ص ۱۷

معنوی نمونے[1]۔

دیوان فاتح کے نسخہ سالار جنگ میوزیم کے علاوہ جس میں تقریباً ۲۰۴۵ شعر ہیں ایک بیاض میں (۱۱۲۹، اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد) ان کے کلام کا بہت بڑا انتخاب مل گیا ہے جس میں تقریباً ۱۷۲۷ شعر ہیں۔ البتہ اس انتخاب میں صرف غزلیں ہیں، جبکہ نسخہ دیوان میں غزلوں (۱۷۴۵ شعر) کے علاوہ رباعیاں (۱۳ عدد) مخمس (۵ عدد) اور ایک ہفت بند بھی ہے۔ نیز نسخۂ دیوان میں نثر میں فاتح کے حالات زندگی دیئے ہوئے ہیں۔ بہرحال ان دونوں نسخوں کی مدد سے فاتح کی شاعری کا پوری طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نیز ان کی زندگی کے بہت سے جزئیات معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ یہ انتخاب اور یہ نسخۂ دیوان اس مطلع سے شروع ہوتے ہیں ؎

الٰہی بلبل گلزار شکرت کن زبانم را
بہار از حمد خود دہ گلبن باغ زبانم را

فاتح کو اپنی شاعری اور معرفت پر فخر تھا: —

فاتح کلید گنج حقیقت زبان تست — خواہد شدن درآئینہ از جوش آب آب
فاتح ہمہ خلق برت سجدہ نمایند — گر مرد خدا بودن تو خلق بدانند

بزرگوں میں شمس تبریزی[2] سے انکو بڑی عقیدت تھی جن پر ایک پوری غزل کہی گئی ہے ؎

رسیدم من بدیوان خیال شمس تبریزی — دہم چون شرح چون وصف کمال شمس تبریزی

حسب ذیل غزل میں بنگال کا ذکر ملتا ہے اور شاید حافظ[3] کی غزل "بہ بنگالہ می‌رود" سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے ؎

طوطی کلک سخن سنجش چہ شکر ہا کہ ریخت — فاتح ما دوش گویا عازم بنگالہ شد

فاتح کے کلام میں کافی تصنع اور آورد ہے، جسکی وجہ سے ان کے اشعار مشکل ہو گئے ہیں۔ یہاں انکے کچھ اس قسم کے اشعار بطور نمونہ کے پیش کئے جا رہے ہیں ؎

نباشد ناخدائی جز خدا بحر ہویت را — بود طوفان کثرت موجۂ دریائے وحدت را
چلیپا موج ہر سو می زند چون مسطر دریا — ندیدم غیر وصف زلف او در دفتر دریا
ببیضۂ چرخ در ہر مرغ سرای فقرا — مرغ فکرت نکند پر بہوای فقرا

۱؎ ص ۱۰۱۴، کلیات سعدی
۲؎ متوفی بسال ۶۴۵ ہجری / ۱۲۴۷ عیسوی
۳؎ متوفی بسال ۷۹۱ ہجری / ۱۳۸۹ عیسوی

از بیضۂ حباب زند عندلیب سر　　افتاده تا کہ عکس توای گلبدن در آب

فاتح نے عجیب و غریب ردیفوں میں غزلیں کہی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں ؎

فاتح تو مست از عشق و من یلّی یلّا یلّا　　رفتہ ز دست از عشق من یلّی یلّلہ یلّلہ[1]

یا کہتے ہیں ؎

ای شاہ خوبان یلّلہ دی ماہ تابان یلّلی　　ای راحت جان یلّلہ دی جان جانان یلّلی

ایک غزل میں تمام الفبا کا ذکر کیا گیا ہے :—

تا بخون من نگارین کرد دال و سین و تے　　ریخت خونم را بہ تیغ عین و میم و زے و ہے

مگر اسی کے ساتھ ساتھ انکے دیوان میں بہت سے سلیس، سادہ، رواں اور شگفتہ اشعار بھی جن میں سے بعض یہاں نقل کئے جا رہے ہیں ؎

رہ عشقست باید زد قدم در لامکان اینجا　　کہ باشد زیر ہر نقش قدم صد آسمان اینجا

تو در عشق حقیقی عاقبت خواہی کمر بستن　　نہ بندی دل بزنجیر سر زلف بتان اینجا

عاشق رندی ترا با دین و با ایمان چہ کار　　کی مرا باشد سر سودای این بازار ہا

کعبہ و بتخانہ ایم و مسجد و میخانہ ایم　　کافریم و مومن و گبر و مسلمانیم ما

نیست فاتح غیر ما موجود در عالم کسی　　ہر چہ می گویند خلق آنیم ما آنیم ما

بصحرای قیامت موی سر آشفتہ چون آیم　　بخوانم صد غزل در وصف ہر تاری ز کاکلہا

ہمچو شیخ کعبہ پیر خانقاہش شد مرید　　مست گردد گر ملک بیند قدح نوش مرا

دم وحشی غزالان الفت ماست　　قیامت تازہ زاد وحشت ماست

ہنگام جلوہ خون شہیدان نگار اوست　　ریزد صبا چو رنگ خزان نو بہار اوست

بکجا روم چہ سازم بکہ گویم این حکایت　　کہ دلم ز غصہ خون شد ز جہان جہان شکایت

از کاوکاو غمزہ نہ خود سینہ است خبر　　آئینۂ تو شوخی مژگان ندیدہ است

گریہ خواہم ہمہ از خون دل آید بکنار　　از دل و دیدہ بمن ساغر و مینا بخشید

رسواست ہر کہ شیفتۂ گلرخان شود　　در پردہ بوی گل نتواند نہان شود

---

[1] یہ غزل بیاض میں اسی طرح سے دی ہوئی ہے مگر نسخۂ سالار جنگ میں بجائے یلّی یلّلہ یلّلہ کے یلّا تیلّی یلّلہ

وقت آن آمد کہ کوہ و دشت پیمائی کنم — نالہ را دیوانہ و مجنون و صحرائی کنم
درکشوری کہ نیست جز آئینہ مشربان — مردان قسم خورند بدامان پاک من
ہمان پروانۂ شمع حضورم من کہ میگشتم — ترا برگرد سر بی بال و پر در بزم تنہائی

ایک رباعی بھی بطور نمونہ کے پیش کی جاتی ہے جسکو شیخ علی حزیں نے بھی اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے ؎

از روز ازل رضا بتقدیر شدیم — صد جا سگ نفس را گلوگیر شدیم
برخوان کسی چشم طمع نکشودیم — خوردیم ز بس گرسنگی سیر شدیم

فاتح کے مخمس پیغمبر کی نعمت اور حضرت علیؑ کی مدح میں ہیں۔ نیز ان کا ہفت بند ملا کاشی کے ہفت بند کے جواب میں ہے ؎

(ماخذ)

۱۔ فاتح گیلانی :۔ انتخاب دیوان فاتح، بیاض نمبر ۱۱۲۹، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد۔
۲۔ فاتح :۔ دیوان فاتح، نسخہ خطی شمارہ ۱۰۷۴ (ادب نظم فارسی) سالار جنگ میوزیم حیدرآباد۔
۳۔ علی قلی خان والہ داغستانی :۔ ریاض الشعرا، نسخہ خطی شمارہ ۲۷۔۴۰۔۵۸ نیشنل میوزیم، نئی دہلی۔
۴۔ سید عبدالوہاب افتخار :۔ تذکرہ بے نظیر، سٹیٹ ہاؤس الہ آباد ۱۹۴۰ء
۵۔ مولوی مظفر حسین صبا :۔ روز روشن، مطبع شاہجہانی بھوپال۔
۶۔ نواب نورالحسن خاں :۔ نگارستان سخن، مطبع شاہجہانی بھوپال۔
۷۔ بھگوان داس ہندی :۔ سفینۂ ہندی، ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی۔ پٹنہ۔ ۱۹۵۸ء
۸۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق :۔ تاریخ ادبیات ایران، چاپخانہ پیروز۔
۹۔ محمد عبدالغنی خاں :۔ تذکرۃ الشعرا۔ مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ علیگڑھ۔
۱۰۔ شیخ محمد علی حزیں :۔ کلیات حزیں، مطبع نولکشور۔ ۱۲۹۳ھ

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

غالب انانیت کے آئینہ میں

غالب کی نثر اور نظم میں انانیت کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ غالب نے عمداً مختلف انداز سے اپنی عظمت کو نثر و نظم میں پیش کیا ہے۔ اردو میں دو ادیب اس حیثیت سے ممتاز ہیں ایک مولانا آزاد جنھوں نے غبار خاطر میں انانیتی ادب پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور یہی رجحان خطوط غالب میں بھی ملتا ہے۔ لیکن خطوط کے علاوہ خود شاعری میں غالب نے یہ کیفیت نہایت وضاحت اور تفصیل سے پیش کی ہے اور اپنی شخصیت و اہمیت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے مولانا ابوالکلام آزاد کی انانیت میں کوئی تضاد نہیں مگر غالب کی انانیت تضاد سے بریز ہے۔ اس میں غالب بیسوں کی خاطر اپنے آپ کو بہت گرا کر پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ جو خطوط انھوں نے نواب رام پور کو لکھے ہیں اور جو اب عرشی صاحب کی کوشش سے منظر عام پر شائع ہو کر آچکے ہیں۔ ان میں شاعر اپنی خودداری اور انانیت کو نقش و نگار طاق نسیاں بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو نہایت گرا کر پیش کرتا ہے اور کہیں کہیں شبہ گداگروں کے طرز کا ہونے لگتا ہے۔ اس کے برعکس مولانا آزاد کے یہاں اس طرز کا تضاد موجود نہیں۔

انانیت ویسے تھوڑی بہت ہر ذی کمال کا خاصہ ہے خصوصاً شعراء کا تو یہ مخصوص میدان ہے چنانچہ مشہور عرب ناقد ابن رشیق لکھتا ہے کہ عجیب بات ہے کہ اگر کوئی اپنی تعریف خود کرے تو لوگ اسکو بے وقوف بنائیں لیکن شعراء اپنے اشعار میں خوب اپنے گیت گاتے ہیں اور کوئی اُن پر اعتراض نہیں کرتا وہ کہتا ہے کہ معاشرہ نے یہ رعایت ان کو دے رکھی ہے۔

غالب کی انانیت کا اصل مرکز ان کی سخن وری ہے۔ آخر میں نثر میں بھی ان کو اپنی عظمت کا احساس ہو گیا تھا اسی بناء پر غالب نے اپنی زبان پر قدرت بیان کا سلسلہ کئی خطوط میں کیا ہے اشعار میں بھی بار بار اپنی انفرادیت کا اظہار کیا ہے۔ ان کی انانیت مختلف انداز سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اگرچہ اصل دعویٰ ان کا شاعری میں ہے اور مختلف انداز سے وہ اپنی عظمت کو جتانا چاہتے ہیں مگر پھر بھی ان کی انانیت صرف ایک میدان میں عظمت پر بس نہیں کرتی بلکہ وہ شجاعت و جنگجوئی پر فخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صرف شاعری میرے لئے باعث عزت نہیں بلکہ عظمت کیلئے دوسری چیزیں بھی ہیں ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری   کچھ شاعری ہی ذریعۂ عزت نہیں مجھے

"سوپشت" کا مبالغہ بھی ان کی انانیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ بعض خطوط میں
خاندانی حالات بیان کئے ہیں جس میں فوجی خدمات کا ذکر ہے۔

انانیت زندگی میں

موجودہ تصور یہ ہے کہ زندگی کا عکس ادب ہوتا ہے کسی
زندگی میں انانیت کا وجود بھرپور انداز سے ملتا ہے اس
زندگی کے قابل ذکر ہیں۔

ایک بار دلی کالج میں فارسی پروفیسر کی جگہ خالی تھی غالب وہاں بحیثیت
پر بیٹھ کر پہونچے انٹرویو کیلئے اور انتظار کرنے لگے کہ صاحب آکر میرا استقبال کریں کیونکہ اس
استقبال کرتے تھے اور لینے آیا کرتے تھے۔ غالب بہت دیر بیٹھے رہے۔ پھر چپراسی کو بھیجکر کہا
تب "صاحب" غالب سے آکر ملے اور بتایا کہ آج آپ اپنی غرض سے آئے ہیں۔ اس لئے یہاں
نہیں کروں گا ہاں جب آپ شہر میں ملیں گے تو میں ضرور آپ کو وہی عزت دوں گا جو کہ پہلے
غالب نے کہا کہ صاحب میں تو عزت کیلئے نوکری کرنے آیا تھا اب جبکہ نوکری سے آبرو اور کم ہو
چنانچہ وہ ملازمت چھوڑ کر اپنے گھر آ رہے۔ یہ یقیناً شاعر کی انانیت کا واضح ثبوت ہے۔

دوسرا واقعہ ان کی "جوا بازی" کا ہے۔ غالب چند پیسے تفنناً رکھکر تاش کھ
کوتوال جس کو غالب سے دشمنی تھی۔ اس نے اس جرم میں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ دائر کر دیا اور
کی سزا دیدی۔ اس پر جو خطوط انھوں نے لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ نے ان
کاری لگائی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ حالی نے غالب کی انسانیت کے گیت جو بھی گائے ہوں۔ مگر
بحیثیت ادیب کے اعلیٰ درجہ و مرتبہ پر فائز ہیں مگر بحیثیت انسان کے وہ ہرگز مذکورہ بالا
سکتے ہیں۔ جوا، شراب اور بادشاہوں کی خوشامد و تملق یہ چند اخلاقی عیوب بھی ان سے
خوشامد تو یقیناً انانیت کے خلاف عناصر ہیں اور یہ غالب کی زندگی میں پوری طرح موجود
تھے۔ ان کی زندگی میں انانیتی تضاد ہے۔ بالکل یہی چیز ان کے ادب و شاعری میں بھی ملتی
توضیح میں بعد میں کروں گا۔

انانیت شاعری میں

غالب اپنے کو سارے شعرا سے ممتاز و منفرد اسلوب
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالب
انا کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کی شاعری پر کوئی انگلی نہیں رکھ سکتا اور اس

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم — تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

غالب اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ صنفِ غزل میری وسعت کیلئے ناکافی ہے ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل — کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

ایک خاص انداز سے وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میرے اشعار میں دل سوزی ہے اس بنا پر پُر اثر ہیں بلا اثر کے شاعری کیلئے

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ — پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

وہ اپنے خامہ کی آتش فشانی کا ذکر یوں بھی کرتے ہیں ؎

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی — یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

"اب اس میں دم کیا ہے" بظاہر تنقیص کا شبہ دلاتی ہے مگر ایسا نہیں ہے مراد ہے کہ اب وقت آخر ہے۔ ان تمام اشعار میں غالب ... پوری طرح آچکا ہے۔ غالب کا فخر و انانیت غیر معمولی انداز سے ان کے کلام میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

اپنے اشعار کے مضامین پر بھی فخر کرتے ہیں ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ان کی انانیت کبھی اس پر فخر کرتی ہے کہ لوگ رسائی سے میرے کلام کو سمجھنے سے قاصر ہیں ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

معاملہ یہیں تک ہوتا تو ٹھیک تھا۔ بار بار وہ ذرا ٹھہر کر یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ میں ولی ہوں۔ کم از کم ان کے ...یت میں ولی ہونے کی کیفیت سے سکون محسوس ہوتا تھا چنانچہ کہتے ہیں ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

آگے چل کر ایک عجیب انداز سے دعوے بزرگی کر ہی دیا۔ کہتے ہیں ؎

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی — ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

ایسے لوگوں کو عرفِ عام میں مجذوب کہا جاتا ہے جو شریعت کا ظاہرا احترام نہیں کرتے مگر تقرب الی اللہ ان کو ... ایسے لوگ دراصل میں توازن نہیں رکھتے۔ غالب تھا ان کی یہ کیفیت عدم پیروی شریعت ظاہر

...آپ کو نہایت اہم سمجھتے تھے چنانچہ یہ اشعار ملاحظہ ہوں جن سے ان کو دراصل تسکین ملتی تھی اور ان کا ... کیفیت سکون پاتا تھا ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک — اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

انانیت نثر میں اگرچہ نثر میں ان کی تصانیف بھی ہیں جن میں خاصہ مسالہ انانیت کا موجود ہے مگر میں ان کے نثری شاہکار یعنی خطوط تک اس بحث کو محدود رکھوں گا۔

غالب کے سلسلہ میں یہ بات یقینی ہے کہ ان کو خطوط میں جہاں موقع ملا ہے اپنی شخصیت کو خوب اچھالا ہے۔ کبھی اس نے عبدالصمد استاد کو گڑھ لیا کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ان کا کوئی استاد نہ تھا مگر کبھی اس پر فخر کیا کہ میں مبداءِ فیاض سے مستفیض ہوں۔ اس سے ان کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں کہ مجھے نواب لکھا کرو۔ بہت سے انگریز بھی مجھے نواب لکھتے ہیں۔ اس طرح گویا ان کی انانیت کو ایک تسکین ملتی ہے۔ یہ شوق بھی خوب ہے کہ کھانے کو تو ہے نہیں اور شوق نواب لکھنے کا۔ جب کہ خطوط ہی میں وہ اپنی معاشی زندگی کی تکالیف کا بیان تفصیل سے کرتے ہیں۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ میرا نام اتنا مشہور ہے کہ تم صرف میرا نام اور شہر دلی لکھ دیا کرو خط مجھے مل جائیگا۔

ایک خط میں فرماتے ہیں کہ میں نے خطوط نگاری کی ایک نئی راہ نکالی ہے اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں:-

"مرزا صاحب میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

انانیتی تضاد اور اس کا حل میں اپنا یہ خیال پیش کرتا ہوں کہ غالب جہاں جھکتے ہیں خوشامد کرتے ہیں اپنی حقارت کا بیان کرتے ہیں سب مدح کی ایک قسم ہے اور جس پر شبہ ذم کا ہوتا ہے۔ ورنہ سب تعبیر ریا ہیں ان کی انانیت کی۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اگر وہ قانع اور غیور ہوتے تو نواب رام پور کو اس انداز کے تملق آمیز خطوط نہ لکھتے۔ مگر یہ قابل غور مسئلہ ہے کہ جب اس زمانے میں ۱۰۰ ماہوار مفت میں گھر بیٹھے نواب صاحب غالب کو روانہ کر دیتے تھے تو اگر وہ اس انداز کے خطوط لکھیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے بلکہ شکر و شرافت کا تقاضہ ہے۔ مومن نے کسی کی شان میں قصیدہ نہ کہا مگر جب انکو ایک راجہ نے ہتھنی پیش کی تو بطور شکریہ کے ایک قصیدہ کہہ ہی دیا۔

وہ تمام اشعار جن میں غالب کی انانیت پر حرف آتا ہے دراصل اس میں بھی وہ اپنی منقبت نکال لیتے ہیں۔ وہ نظم جو بہادر شاہ کو تنخواہ ماہ بہ ماہ کرنے کیلئے لکھی تھی۔ اس کے دو اشعار ملاحظہ ہوں جو اس مسئلہ کو حل کر دیتے ہیں:-

شاد ہوں اپنے جی میں کہ ہوں ۔۔۔ بادشہ کا غلام کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح ۔۔۔ تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

آج مجھ سا نہیں زمانہ میں ۔۔۔ شاعر نغز گوئے خوش گفتار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد ۔۔۔ قہر ہے گر کرو نہ مجھکو پیار

یہ غالب کے انانیتی تضاد کے حل کی ایک شکل ہے مگر میرا ایک خیال اور ہے اور اس کی صحت پر مجھے پورا یقین ہے ممکن ہے کہ میرے اس نظریہ پر کسی کو استعجاب ہو، مگر فکر کو آزاد فضا ملنی چاہیئے۔ دستور زباں بندی صحیح نہیں ۔ انانیت کے بارے میں مندرجہ ذیل خصوصیات میرے نزدیک غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں ۔

۱ ۔ انانیت ہمیشہ اعلیٰ فنکاروں، شاعروں اور ادیبوں میں پائی جاتی ہے ۔ کم قیمت فن کار کو یہ جرارت نہیں کہ عظمت کے دعوے کرے ۔

۲ ۔ مغربی مصنفین کا خیال ہے کہ انانیت احساس کمتری کا عکس ہے مگر میرا اپنا تصور یہ ہے کہ انانیت ہمیشہ انھیں اشخاص میں ملتی ہے جن کے حوصلے بلند ہوں۔ جن کے عزائم میں سمندروں کی وسعت اور طوفانوں کی ہاہمی ہو اور جو کچھ کرنے کی صلاحیت لیکر آئے ہوں۔ انانیت پسند ادیب اعلیٰ تخلیق پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ غالب اور ابوالکلام آزاد نے ہمارے ادب میں اعلیٰ تخلیقات پیش کی ہیں۔ اسی طرح عربی میں متنبی نے انانیت سے کام لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر اعلیٰ فنکار انانیت کا کچھ نہ کچھ شکار ہوتا ہے۔ یہ احساس کمتری نہیں بلکہ بلندی کی دلیل ہے اس سے فنکار اپنے فن کی عظمت کو نمایاں کر سکتا ہے۔ اسی میں زندگی کی بلندیاں پوشیدہ ہیں۔

۳ ۔ فخر انسانی فطرت کا ایک لاینفک جز ہے اگر کوئی صاحب امتیاز ہوتا ہے تو وہ اپنے مخصوص امتیاز و صلاحیت پر فخر کرتا ہے۔ اردو تغزل میں محبوب کے ناز و غمزہ کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ محبوب کو اپنے حسن پر فخر ہے احساس ہے' واقعہ یہ ہے کہ فخر محسوس کرنا انسانی فطرت ہے خصوصاً اپنی صلاحیتوں کا احساس بذریعہ بشریت ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبان کی فصاحت کا ذکر ایک بار اس انداز سے فرمایا کہ " انا افصح العرب بید انی من قریش " میں عربوں میں سب سے فصیح ہوں البتہ میرا تعلق قبیلۂ قریش سے ہے۔ عرب ناقد ابن رشیق اپنی شہرہ آفاق کتاب " العمدۃ " میں لکھتا ہے کہ سارے انسانی طبقات میں صرف شعراء کو انسانی معاشرے نے یہ اجازت دی ہے کہ وہ اپنی تعریف آپ کریں۔ اگر شعراء کے علاوہ کوئی خود اپنی تعریف کرے تو لوگ اس کو مضحکہ بنالیں میں ابن رشیق کے اس نظریہ پر اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ حق ہر اعلیٰ فنکار کو حاصل ہونا چاہیئے بلکہ حاصل ہے ۔ فخر برا نہیں اگر فنکار نے کوئی اعلیٰ چیز پیش کی ہو ؛ ورنہ بلا قابل قدر ادبی تخلیق کے انانیت جہالت ہے ہم اردو شاعری میں اصناف کی تقسیم معنوی انداز پر نہیں کی گئی ہے ۔ عربی میں اعتذار، شکوی، فخر اور حکمت' اضیاف (مہمان نوازی) اور حماسہ (شجاعت) وغیرہ۔ بطور اصناف سخن کے موجود ہیں۔ چنانچہ مشہور کتاب " الحماسہ " کے ابواب کی تقسیم اسکے مشہور شاعر و مرتب ابو تمام نے مذکورہ اصناف میں کی ہے۔ فخر اگر کسی غلط کام کیلئے استعمال نہ ہو تو اچھی چیز ہے اس سے دوسروں کو آگے بڑھنے اور کام کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ اور آرزو کی دولت عطا ہوتی ہے۔

۵ ۔ اردو مشاعروں میں داد دینے کا طریقہ کیا ہے ؟ کیا اعلیٰ سے اعلیٰ شاعر اس پر راضی ہو جائے گا وہ خون جگر

لٹائے اور آپ اس کی تعریف میں چند الفاظ بھی نہ کہیں؟ کیا اس کی یہ توقع احساس کمتری ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ انسانی جبلت ہے۔ فکر و فن کی عظمت کا تقاضہ ہے اور خود اپنے آپ کو اپنے احساس سے ہلکا کرنے اور شاعر کے ضمیر کو مطمئن کرنے کا ذریعہ ہے جس سے اس کی انانیت کو تسکین ملتی ہے۔ لاکھ منکسر المزاج شاعر ہو اگر آپ اسکے جائز حق کو مشاعرہ میں غصب کریں دوبارہ وہ آنے کی جرأت نہ کرے گا! اسلیئے کہ یہ ایک فطری حق ہے اور انسانی تقاضہ۔ انانیت کس میں نہیں؟

۶۔ شاعرانہ تعلیاں درحقیقت انانیت کا پرتو ہیں۔ شاعروں کے علاوہ ادیبوں و نثاروں میں بھی یہ کیفیت موجود ہے۔ سرسید کے فارسی اشعار جو علیگڑھ تحریک مرتبہ نسیم قریشی میں شائع ہوئے ہیں۔ وہ سرسید کی فنکارانہ عظمت پیش کرتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم ‌ ‌ ‌ مسیحا اشک می آرد نہ درمانے کہ من دارم
فلک یک مطلع خورشید دارد بہ ہمہ شوکت ‌ ‌ ‌ ہزاراں مطلعہا دارد گریبانے کہ من دارم

خود حالی کی بعض نظمیں نہایت تعلی آمیز ہیں۔ اگرچہ وہ نہایت منکسر المزاج انسان تھے۔ مولانا آزاد کے علاوہ میرامن نے اپنی ملاحت و زبان پر باغ و بہار کے مقدمہ میں فخر کیا ہے اسی طرح رجب علی بیگ سرور نے کیا ہے پھر اس بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب تفاخر سے لبریز ہیں۔

۷۔ مفاخرت اور انانیت کی نفسیاتی تحلیل احساس کمتری ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر ادب کیلئے باعث صد فخر و فیض ہے کہ اس کے ذریعہ سے فکر و نظر کی اشاعت ہوتی ہے تنقیدی پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور ادبی و شعری تخلیق میں زبردست وفنکارانہ اضافہ ہوتا ہے۔ انانیت سے مجبور ہو کر جب شاعر فخر کرتا ہے تو اس کے معاصر اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ یعنی فنی اعتراض اس طرح ایک سلسلہ فکر و نظر کا روشن ہو جاتا ہے اس کی مثال خود غالب کی انانیت میں قاطع برہان وغیرہ سے دی جاسکتی ہے جو سارا مناقشہ غالب کی انانیت کی تمنا و تماشا سے عبارت تھا۔

انیس و دبیر کی چشمک نے جو زبردست شاعرانہ تخلیق کو جنم دیا ہے وہ سب اسی انانیت کا پرتو نہیں تو اور کیا ہے۔ شعراء اپنی انانیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ فخر کرتے ہیں اور کاوش و کاہش سے فکر کے لئے آفاق خون جگر کی لالہ کاری سے پیش کرتے ہیں۔

عربی شاعری کا ایک پورا دور اسی انانیتی کیفیت و چشمک کا غماز ہے۔ اخطل، جریر اور فرزدق نے ایک دوسرے کے خلاف اشعار کا انبار لگا دیا چونکہ فرزدق نہایت اونچے خاندان سے تھا اسلیئے وہ اپنے آبا پر فخر کرتا ہے۔ اس نے ان فخریہ اشعار میں اتنے الفاظ استعمال کر ڈالے کہ نحویوں اور اہل لغت نے کہا کہ اگر فرزدق کی شاعری نہ ہوتی تو ایک تہائی عربی ختم ہو جاتی۔

غالب کی انانیت، ان کے عزائم حوصلے اور بلندی فکر کی ترجمان ہے ان کی انانیت کے بجز بیکراں

سفینہ درکار ہے۔

غالبؔ کی شاعری بھی اس انانیت سے پُر ہے اور ان کے خطوط بھی اس کیفیت سے لبریز ہیں۔ انانیت کے تصور میں غالبؔ کا ایک مصرع پیش کیا جا سکتا ہے کہ : —

" بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی "

میرا تصور یہ ہے کہ جس قدر انسان کے عزائم بلند ہوں گے اسی قدر اس کی انانیت واضح ہوگی۔ اسی انداز سے اس کے اندر خمارِ تشنہ کامی ہوگا۔ انسانی معاشرہ میں دو طرز کے لوگ ہیں ایک اپنی حالت پر قانع اور راضی بہ رضا رہنے والے اور دوسرے اعلیٰ مقاصد کے طلبگار' بلندیوں پر جان دینے والے اور زندگی پر عظمت حاصل کرنے کے شائق۔ چنانچہ مشہور عرب شاعر متنبی کہتا ہے : —

" لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو معمولی زندگی پر خوش ہوتے ہیں۔ ان کی سواری ان کے دونوں پیر ہیں اور ان کی جلد ان کا کپڑا ہے۔ لیکن میرے پہلو میں ایسا دل ہے جس کی تمناؤں کیلئے کسی افق کا تعین ممکن نہیں "۔

پس غالبؔ اسی طبقہ سے تھے جو' اپنی حالت پر قانع نہ تھا اور بقول متنبی جب عزائم بلند ہوں تو قلت وسائل کا آدمی شکار ہو جاتا ہے اور اسی صورت میں "خمارِ تشنہ کامی" پیدا ہوتا ہے جس میں انانیت ابھرتی بکھرتی اور پروان چڑھتی ہے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۴ سے آگے)

۱۔ نوائے ازل مرتبہ:۔ ریحانی لکھنوی — ملنے کے پتے :۔ زندگی کا نور پوسٹ بکس ۱۵۵
۲۔ رنگِ ترانہ مرتبہ:۔ ریورنڈ ہنیسن ریحانی } عابد روڈ۔ حیدرآباد ۱۔ اے پی

نوائے ازل مسیحی اردو شعراء کے مختصر اور منتخب کلام پر مشتمل چالیس صفحات کا ایک کتابچہ ہے جس میں (۳۴) بقید حیات مسیحی شعراء کی مختصر نظمیں شامل ہیں۔ تمام نظموں میں مسیحیت کی تبلیغ کے پہلو اور مسیحی نقطۂ نظر شامل ہے۔

رنگِ ترانہ مسیحی مشاعرے کا باتصویر گلدستہ ہے۔ یہ کل ہند مشاعرہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ اردو کے مشہور اور قادر الکلام مسیحی شاعر ریورنڈ ہنیسن ریحانی لکھنوی ثم حیدرآبادی اس مشاعرہ کے معتمد اور اس گلدستے کے مرتب ہیں۔ گلدستہ میں سترہ مسیحی شعراء کی تصویریں اور کلام شامل ہے۔

وقار خلیل

ڈاکٹر مغنی تبسم

سب رس

سب رس وجہی کا نثری کارنامہ اور اردو نثر کی پہلی ادبی تخلیق ہے۔ اولیت کا یہ سہرا ہی وجہی کے لئے باعث افتخار نہیں ہے وہ اردو کا بہت بڑا ادیب اور صاحب طرز انشا پرداز تھا۔ زبان کی قدامت وجہی شناسی اور اس کے مرتبے کے تعین میں مزاحم ہوتی ہے۔ قدیم اردو سے موانست پیدا کرلی جائے تو ہم ایک ایسے شاہکار سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں جس کا جواب ساری اردو نثر میں نہیں ملتا۔

وجہی کے اسلوب نثر کا جائزہ لینے سے پہلے "سب رس" کے صنفی نوعیت کا تعین ضروری ہے۔ ادب کے مورخوں نے اس کا شمار داستانوں میں کیا ہے اور بعض نقادوں نے داستان مان کر ہی اس پہ اظہار خیال کیا ہے یہ ایک مغالطہ ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ وجہی نے سب رس میں ضمناً ایک داستان بھی بیان کی ہے۔ حسن و دل کے قصے کو جو سب رس میں بیان کیا گیا ہے۔ کہاں تک داستان کہنا بجا ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ قصہ خود ایک پیرایہ بیان ہے۔ سب رس کو داستان ٹھیرانے والے اگر سبب تالیف کتاب ہی تامل سے پڑھتے تو اس مغالطہ کا شکار نہ ہوتے۔ وجہی لکھتا ہے کہ "سلطان عبداللہ قطب شاہ ایک دن صباح کے وقت بیٹھے تخت' یکایک غیب تے کچھ رمز پاکر دل میں اپنے کچھ لیا کر وجہی نادرمن کوں' دریا دل گوہر سخن کوں۔۔۔ بلائے۔ پان دیئے بہوت مان دیئے ہور فرمائے کہ انسان کے وجود میں کچھ عشق کا بیان کرنا اپنا ناؤں عیاں کرنا۔ کچھ نشان دھرنا' وجہی بہوگنی گن بھریا' تسلیم کرکے سر پہ ہاتھ دھریا' بہوت بڑا کام اندیشیا' بہوت بڑی فکر کریا۔ بلند ہمتی کے بادل نے دانش کے میدان میں گفتاراں برسایا' قدرت کے اسراراں برسایا۔"

اس کے آگے اپنی تصنیف کی تعریف میں یوں رقم طراز ہوتا ہے کہ:۔

"اگر کسی میں سخن شناسی ہور اسرار دانی ہے تو یو کتاب گنج العرش بحر المعانی ہے۔ جیتا کوئی طبیعت کے کواڑ کھولے گا۔ اس کتاب میں نیں سو بات کیا بولے گا۔ جو کچھ آسمان ہور زمین میں ہے سو اس کتاب میں ہے جو کچھ دنیا ہور دین میں ہے سو اس کتاب میں ہرگز کوئی فصیح اس فصاحت سوں بات نیں کیا اس دھات بات کوں سلاست نیں دیا۔۔۔ جیتے جو ساراں جیتے فہم داراں' جیتے گن کاراں ہوئے آج لگن کوئی اس جہاں میں ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملاکر

نیں بولیا ..... غرض بھوت نادر نادر باتاں بولیا ہوں۔ دریا ہو کر موتیاں رولیا ہوں۔ موتیاں کی موجاں کا میں دریا ہوں۔ تمام موتیاں سوں بھریا ہوں"

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عشق و معرفت کے مضامین بیان کرنا وجہی کا اصل مقصد تھا اور وہ اسے ایک ادبی کارنامہ بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ سب رس کو نظم و نثر کی ملی جلی تالیف قرار دیتا ہے۔ سب رس میں داستانی حصہ صرف زیب داستان کے لئے ہے۔

سب رس کی صنفی حیثیت کا پوری طرح تعین کرنا اور اسے کوئی نام دینا مشکل ہے۔ کیفیت تخلیق میں یہ انشائیے سے یوں مماثلت رکھتا ہے کہ اس میں مصنف اپنے خیالات کو جو اس کے مطالعے اور زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں کا نچوڑ ہیں اور جن میں فلسفیانہ گہرائی اور گیرائی بھی ہے کسی منصوبے کے بغیر بے تکلف پیرایہ میں بیان کرتا چلا گیا ہے۔ سب رس کے بعض اجزا اپنی جگہ مستقل انشائیے ہیں۔ سب رس کی ٹکنک کے چند پہلو "گلستاں" اور اس زمرے کی بعض دوسری تصانیف کے ان حصوں سے مماثلت رکھتے ہیں جن میں مصنف پہلے حکمت اور دانش کی کوئی بات کہتا ہے اور اس ضمن میں تمثیلاً حکایات اور اشعار لاتا ہے۔ سب رس میں مختلف حکایتوں کے بجائے ایک ہی قصے کے اجزا وقفے وقفے سے پیش کئے گئے ہیں۔ وجہی ان اجزا کو بات کا رخ بدلنے یا بات کو آگے بڑھانے کے لئے سہارے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ سب رس کے پیرایہ اظہار کا خاص وصف آزاد تلازمۂ خیال ہے وہ کسی مضمون کو پہلے ہی سے سوچ کر ترتیب کے ساتھ بیان نہیں کرتا بلکہ اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ یوں خیال سے خیال نکلتا اور بات سے بات پیدا ہوتی ہے۔ جہاں کوئی مضمون پورا ہوا۔ یا سوچ کی راہ بند ہوئی وہ قصے کی طرف رجوع ہوتا ہے اور قصہ بیان کرتے ہوئے کسی لفظ یا نقرے سے اس کے منقطع خیالات کی رو جاگ پڑتی ہے اور پھر وہ انشاپردازی کے جوہر دکھانے لگتا ہے۔ وجہی کا کمال یہ ہے کہ اس نے داستانی حصہ کو اپنی انشاپردازی سے داخلی طور پر اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ سب رس کے منصوبے میں قصہ ایسا خارجی اور آزاد وجود نہیں رکھتا۔ قصے میں ایک تمثیلی رنگ ضرور ہے لیکن وہ خود مکتفی تمثیلی داستان نہیں ہے سارا قصہ ایک مسلسل شعری استعارہ ہے۔ وجہی نے اس پردے میں ان معاملات اور کیفیات کو بیان کیا ہے۔ جو محبوب اور عاشق کے درمیان اولین تعارف کے بعد ساعت وصال تک گزرتی ہیں۔ افراد قصہ بھی استعارے ہیں جو تشخص اور تجسم سے وہ مکمل تمثیلی رمز نہیں ہیں۔ جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ قصے میں غمزہ غمزہ ہی ہے اور غمزہ ہی کا کام انجام دیتا ہے دوسرے تمام کرداروں کا بھی یہی حال ہے۔ سب رس کا قصہ اپنی ماہیت میں مسلسل غزل ہے جس کا ہر جزو ایک شعر کی نثری توسیع ہے۔

سب رس کی صنفی حیثیت کے اس تجزیئے کے بعد وہ سارے اعتراضات رد ہو جاتے ہیں جو اس مفروضے پر قائم ہیں کہ سب رس ایک نثری داستان ہے۔ سب رس کو داستان کے معیار پر جانچنا اور اس کے غیر داستانی حصوں کو غیر جزوی پند و موعظت قرار دینا دراصل نقادوں کی اسی غلط فہمی اور کم فہمی کا نتیجہ ہے۔

جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں۔ سب رس کے دو تخلیقی محرکات اور مقاصد ہیں۔ ایک عشق و معرفت کے رموز بیان کرنا دوسرے انشاء پردازی کا کمال دکھانا۔ یہ محرکات و مقاصد وجہی کی شخصیت کی آئینہ داری بھی کرتے ہیں۔ سب رس میں وجہی ایک عارف، حق شناس، مفکر، شاعر اور ادیب کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ وجہی کا اسلوب اس کی شخصیت کے انہیں پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔

سب رس کا مطالعہ کریں تو جو چیز ہم کو فوری متوجہ کرتی اور چونکاتی ہے وہ اس کا لہجہ ہے جس میں انفرادیت اور قطعیت کے ساتھ خاص طرح کی اپنائیت بھی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک باکمال عظیم اور دلکش شخصیت کے حضور میں پہنچ گئے ہیں۔ یہ شخصیت ہمارے دل میں احترام اور محبت کے جذبات ابھارتی ہے۔ کبھی وہ دلنشیں پیرائے میں حیات و کائنات کے رموز کھولتا اور سمجھاتا ہے کبھی کوئی لطیفہ اور قصہ چھیڑ دیتا ہے اس کے احوال و افکار اور نفسی کیفیات کے ساتھ اس کا لہجہ بھی تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ کبھی شدت جذبات میں اس کا انداز خطیبانہ ہو جاتا ہے اور کبھی خود کلامی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

لہجے کی ان خصوصیات کے ساتھ وجہی کی نثر کا عام رنگ شاعرانہ ہے۔ شعریت کا در آمد نثر کے لئے تو عیب ہو سکتی ہے لیکن وجہی کی انشائے لطیف میں شعریت کا امتزاج اور شاعرانہ زبان کا استعمال ایک ناگزیر عمل بن گیا ہے۔ یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ وجہی نے تصوف و معرفت پر کوئی علمی کتاب تصنیف نہیں کی بلکہ اپنے تجربوں اور مشاہدوں سے بنے ہوئے افکار اور شاعرانہ وجدان کو لفظوں کا پیرہن دے کر ایک ادبی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

اب ہم وجہی کے اسلوب اور اظہار کی چند نمایاں خصوصیات کی نشاندہی کریں گے۔ وجہی کے اظہار کا ایک خاص وصف تمثیل نگاری ہے وہ اپنے خیالات کی وضاحت کے لیئے اپنے دعووں کو ثابت کرنے کے لیئے اور کبھی بات میں زور پیدا کرنے کے لئے تمثیل سے کام لیتا ہے اس کی تمثیلیں تشبیہیں ہوتی ہیں یا کہاوتیں۔

ایک جگہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ خدا کا دیدار مشکل ہے محال نہیں ہے۔ یہ کام عاشق کی دلیری پر موقوف ہے۔ وہ اس خیال کو تمثیل کے پیرائے میں یوں پیش کرتا ہے۔

"یوں کیا خالہ کا گھر ہے۔ کانٹیاں کو لانگ جاتا تو باغ میں پھول پاتا۔ جکوئی دریا میں جاتا

سو موتی لے آدے۔"

وجہی کے نزدیک عاشق کا مرتبہ عابد سے بہت اونچا ہے۔ عشق اور بندگی کے فرق پر تمثیل ملاحظہ ہو۔

"عاشقی مصاحبت ہور یاری۔ عبادت بندگی ہور خدمت گاری۔ محبوباں ہیں سو صاحب کی گود میں سوتے۔ چاکراں ہیں سو ہات جوڑ کھڑے ہوتے۔ نفر جیتا بڑا ہوا بی محبوبی کا ناز کچھ ہور ہے۔ یو راز کچھ ہور ہے سرو پچھاڑ لیتے ہیں تو بی کیا کچھ کسے دیتے ہیں؟ کیتک محبوب ایسے ہیں۔ مطلوب ایسے ہیں جو دسے بھی نہیں لیتے بردرا در در بدر یہاں آسمان دین کا انت۔"

سب رس میں ابتدا سے آخر تک یہ تمثیلی پیرایہ نمایاں ہے۔ اظہار کے دوسرے پیرائے اس کے تابع ہیں۔ اسی پیرایہ میں وہ تشبیہات کا نگار خانہ سجاتا ہے۔ وجہی کی چند تشبیہات ملاحظہ ہوں۔

عشق میں بدنامی جوں کھانے میں نمک جوں روپے میں چھنک جوں محبوب میں ٹھمک"

ایک جگہ شراب کو عشق کا لازمہ قرار دیتا ہے۔ اس تمثیل میں تشبیہ کی کرشمہ سازی بھی شامل ہے۔

"جان عاشق ہور معشوق اچھے وہاں شراب نا اچھی تو بڑا حیف۔ جوں نمک نیں سو کھانا بے نمک کھانے تے آدمی نے کیا سودا پایا نا جوں جوت نیں سو گھر۔ جوں مٹھائی نیں سو شکر۔ جوں معنا نیں سو بات۔ جوں ۔۔۔ سخاوت نیں سو ہات۔ جوں پانی نیں سو لہوا جوں سبزہ نیں سو ہوا جوں حسن میں سو نار کا جل میں سو سنگار"

اسی ضمن میں وصف نگاری بھی آتی ہے وجہی نے محبوب کے سراپا کے ایک جزو اور عشق کی ایک ایک حالت اور کیفیت کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ عاشق کے آنسوؤں کی توصیف ملاحظہ ہو۔

"چنداں کس کس لذت بھرے درداں سوں انکھیاں میں تے پڑیا ہے بند ایک ایک۔ اگر تو عاشق ہے تو بند بند کا لذت دیکھ۔ اس غم میں کیوں خوشی آئی۔ اس کڑوائی میں کون رکھے مٹھائی کانٹیاں تے پھول کی باس کون لیا ہے۔"

آگ میں پانی ہے وہ پانی کون پیا ہے وہ بھنورا کاں ہے جو یو باس لیوے وہ پروانہ کاں ہے جو یو پانی پیوے ہور اس پانی کی خبر دیوے یو قطرا ہے بہوت لذت بھریا ہر قطرے میں سو سو دریا۔

تمثیل نگاری اور وصف نگاری کے لئے وجہی نے جو زبان استعمال کی ہے وہ مجاز، کنایوں اور استعاروں کی زبان ہے۔ کم عبارتیں ایسی ہوں گی جن میں وجہی نے محض روزمرے پر قناعت کی ہو۔ وجہی کی زبان کے اس پہلو کی وضاحت ان چند فقروں سے ہو سکتی ہے۔

محنت کا جھاڑ راحت کے پھل بار لیا وے۔ امید کے چمن میں تے گود بھر بھر کر پھول چننا نفروں کی فکر کی کسوٹ بنیا۔

وجہی کبھی اپنے بیانات کی تائید میں اور کبھی کلام میں زور اور اثر پیدا کرنے کے لئے عربی، فارسی، اردو اور دکنی کی کہاوتیں، اقوال اور آیات قرآنی احادیث اور فارسی اور دکنی اشعار جا بجا لے آتا ہے۔ اس عبارتوں میں کہاوتوں کا استعمال برجستہ اور معنی خیز ہوتا ہے خود وجہی کی اپنی عبارتیں بلیغ ہوتی ہیں وہ اپنے نثر کو ایسی تعمیم دیتا ہے کہ اس کے جملے ضرب الامثال اور اقوال زرین کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ وجہی کے چند ایسے اقوال ملاحظہ ہوں۔

جس سوں لگیا کام اس کا چ اچھا قام عاشق کی عبادت حسن دیکھنا، راگ سننا۔ شراب پینا، عاشق کی مصاحبت، اور یاری عبادت، بندگی ہور خدمت گاری۔

جان تا زا، ایمان تازا تو سب جہان تازا، مشقت خالی نہیں جاتی۔ ہمت خالی نہیں جاتی۔

ان اقوال کے حسن تعمیر میں قافیوں کا خاص حصہ ہے۔

سب رس کی نثر مقفیٰ مسجع اور مرصع نثر ہے لیکن وجہی کے اسلوب کی یہ خوبی ہے کہ کہیں بھی آورد تکلف اور تصنع کا گمان نہیں گزرتا۔ قافیوں سجع اور ترصیع کو وجہی نے اپنے لہجے اور طرز اظہار میں اس طرح سمو کر عبارت کی بے ساختگی اور برجستگی کمال فن کی داد طلب کرتی ہے۔ وصف نگاری میں بالعموم اسم یا صفات با قافیہ لائے گئے ہیں۔ جیسے:۔

کرامت کتے سو عقل تمام جکچھ دنیا میں ہوا سب عقل کا کام عقل تے ہوا سب حلال ہور حرام عقل تے پکڑ لیا ذوق خاص ہور عام عقل تے رکھے ہر ایک نام نہیں تو کاں تھا صبح ہور شام شیشہ ہور جام لیتہ صیاد دام صاحب علام۔

قوافی کے استعمال کی دوسری صورت وہ ہے جہاں ردیف فعل ہوتی ہے اور فعل کی تکرار سے وہ کسی بات پر زور دینا چاہتا ہے مثلاً:۔

اگر منگتا ہے غم کوں مارے تو شراب پی۔ اگر منگتا ہے حجاب تیرے نکلے بارے تو شراب پی۔ اگر منگتا ہے سخاوت کے ہات نے تو شراب پی۔ اگر منگتا ... تو شراب پی۔ اگر منگتا ہے معشوق سوں ... تو شراب پی۔ عشق کا نظارہ کرے تو شراب پی۔ دل میں محبت بھرے تو شراب پی۔ اگر ... اونچا چڑتے منگتا ہے تو شراب پی۔ اگر خدا کو ...

قوافی کے ساتھ وجہی نے صنعت تکریر کا استعمال بھی بڑے فن کارانہ انداز میں کیا ہے۔ یہاں ردیف کے برعکس الفاظ کی تکرار جملوں اور فقروں کے آغاز میں ہوتی ہے اور اس کی تاکید اور زور پیدا ہوتا ہے۔ سب رس میں اس صنعت کے استعمال کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

عشق ہم باطن ہم ظاہر، عشق سب جا گا حاضر ناظر، عشق ’’اندر‘‘ عشق پادشاہ، عشق کوں کس کا ڈر
عشق ہم مست ہم ہوشیار۔ ہم بے خبر، ہم باخبر، عشق سلطان چھتر اس کا رسوائی تخت استغنائی۔ عشق کا حشم بے پروائی
عشق لاوبالی سب ٹھار بھریا ہے۔ عشق کہیں نیں خالی۔

وجہی کی زبان اور اس کے اظہار کا ایک خاص قول متناقض یا استبعاد کے استعمال میں جھلکتا ہے۔ استبعادی زبان کے استعمال سے وجہی کے اسلوب میں دلکشی اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے استبعاد سے وہ معنی آفرینی اور رمز نگاری کا بھی کام لیتا ہے۔

وجہی کے استبعادی اظہار کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

جتنے عاقلاں نے عقل دوڑائے۔ آخر عشق کی بے آرامی میں آکر آرام پائے قال حال ہوتا ہے۔ فراق وصال ہوتا ہے۔

ایک جگہ ذات و صفات کی بحث میں لکھتا ہے:۔

واں کیا دیکھیے گا چرا اور چوں۔ وہاں سب خالی ہور لبالب، واں کچھ نیں اور سب ہے واں کچھ نیں ہور سب واں تے آتا۔ جاں کچھ نیں واں کیوں کوئی جاتا۔ اس کچھ نیں میں ہے سب کچھ۔

وجہی نے اپنے اسلوب کو صنائع بدائع کے استعمال سے نکھار سنوار کر دلکش اور جاذب توجہ بنا دیا ہے۔ وجہی کی نثر کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو شاید ہی کوئی عبارت صنعتوں سے خالی ملے گی اور شاید ہی کوئی صنعت ایسی چھوٹے گی جس سے وجہی نے کام نہ لیا ہو۔ اس کے باوجود کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوگا کہ کوئی جملہ یا عبارت محض صنعت کی خاطر لکھی گئی ہو۔

پروفیسر شیخ فرید

ٹھاکر لعل برہان پوری اور اس کی تصنیف

"دستور العمل"

برہان پور — دارالسرور — صدیوں علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کے ادباء اور شعراء۔ بیش بہا جواہر پارے اپنی ذہنی تخلیقات کی شکل میں زمانے کو عطا کیئے اور زمانہ کی ناقدری دیکھیے کہ ا ہاتھوں نے کچھ حصّہ برباد کر دیا۔ کچھ فرزندانِ تثلیث کے ہاتھوں یورپ پہنچ گیا۔ کچھ کو ابنائے زمانہ کی کنجوس رکھا ہے۔ اس لیئے بہت سا حصّہ ہماری رسائی سے دور ہے اور راقم کی محدود علمیت اور ذرائع نے اُن ا اس کی رسائی کو دشوار تر بنا دیا ہے۔

سطورِ ذیل میں ٹھاکر لال (برہان پوری) کی تصنیف "دستور العمل" کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ جو مغ سے متعلق فارسی دستاویزات میں سے ایک اہم دستاویز ہے۔

سلاطین مغلیہ کے مرکزی اور علاقائی نظم و نسق کے تفصیلی جائزہ کیلئے تاریخ کے ایک طالب علم کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ان میں مغل دور کی فارسی کتابیں خطوط کے مجموعے۔ فرامین۔ یورپین سیاحوں اور یادداشتیں اور دیگر فارسی مسودات خاص طور پر نہایت اہم ہیں۔ ان میں اس عہد کے واقعات۔ نظم و نسق کے اصول بیان کیئے گئے ہیں۔ کہیں ان اصولوں کی عملی شکلیں ہیں۔ اس کے علاوہ اہم شخصیتوں کے تفصیلات بھی فراہم ہو جاتی ہیں۔

مسلم اور غیر مسلم مورخوں، انشاء پردازوں، وقائع نگاروں اور ادیبوں کی نگارشات اور تخلیقات اس عہد کے سیاسی اور سماجی، عسکری اور اقتصادی حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ اُن حالات اور واقعات کے اصولوں اور ان اصولوں کی عملی شکلوں کا استنباط بھی کیا جا سکتا ہے۔

انتظام سلطنت سے متعلق ٹھاکر لال کی تصنیف اہم مسودہ ہے۔ اس کا مکمل نسخہ برٹش میوزیم اس کتاب میں صوبوں، سرکاروں اور جاگیروں کا حال تاریخی واقعات کے ساتھ درج ہے۔ یہ کتا نسق کے متعلق مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ اس کے سرورق پر مرقوم ہے۔

"دستور العمل شاہنشاہی مرتبہ منشی ٹھاکر لال"

لیکن اس مخطوطہ کے تتمہ میں سنہ ۱۱۹۲ھ تک تمام شاہان مغلیہ کے نام تاریخ وار درج ہیں۔ جو بعد کے اضافے معلوم ہوتے
قم کے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ برٹش میوزیم کے نسخے سے مختلف ہے۔ یہ نسخہ اصول سے بحث کرتا ہے اور بعد کی
معلوم ہوتا ہے۔

ٹھاکر لعل ولد چتر بھوج داس۔ قوم کایستھ۔ ماتھر۔ مصنف دستور العمل ... کے حالات زندگی کے بارے میں
معلومات محدود اور مختصر ہیں اور ان کا انحصار صرف "دستور العمل" پر ہے۔ ٹھاکر موصوف اور اس کی تصنیف کے ذکر سے
مذکرے اور تاریخیں خالی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب۔ دستور العمل کے دیباچہ سے مصنف اور اس کی تصنیف پر روشنی پڑتی ہے۔

"دستور العمل" ——— علم سیاق کہ سرِ دفتر آن خرد ارجمند و مستوفیانِ عقل بلند جوہر شناسائی را بعرصۂ روزگار آوردہ و
کمال را بمیزانِ ظہور سنجیدہ، بچندین صیغہ و قواعد مرتب، دادہ اند، چنانچہ اکثر۔ دستور العمل بملاحظۂ حساب دانِ تبار و
مار ٹھاکر لعل ولد چتر بھوج داس۔ قوم کایستھ۔ ماتھر۔ سکنۂ دار السرور برہان پور۔ آمدہ۔ از آن جا کارخانہ جات
طین عظمیٰ و سرکاراتِ کبریٰ درجِ سن و حساب ہائے دقیق از روئے ہائے کہ در ہندوی معتبر و معروف است، ارقام
پذیرفتہ۔ نو آموزان ایں وقت بہ دریافت و فہم آں چوں حسود در کنجِ حیرانی بماندند و بالفعل رشتۂ سلطنت برہم و
یں سرکاراتِ عمدہ نامنتظم۔ بناءً علیہ از مدّت بخاطر ایں ... ہیچ مدانے می رسد کہ بحسب ضرورت آنچہ روزگار حال را
ید شود، نسخہ، ترتیب دادہ تا سریع الفہم، طالبانِ این فن و موجبِ مواد، بقدر حصول معاش، در ین دیر کہن باشد درین
لا عزیز از جان سعادت اقتباس لالہ گوکل داس برائے تربیت پیش احقر الناس می آمدند و ما فی الضمیر سابق ملاحق
ت پذیرفت۔ ہر چند کہ خود کسبِ انشاء نمود و دوزنگا پوئے پائے اوقات فرسودہ، اما بیمنِ فتوحاتِ قبلہ گاہی بیکنٹھ
، و بزرگانِ عالی قیاس کہ فی الجملہ سرمایۂ ابد دریں مسلم شدہ۔ بہ ترتیب و تالیف این چند ورق پرداخت و بتاریخ نہم رجب
ب سنہ ۱۱۸۱ھ یکہزار و یکصد و ہشتاد ہجری علم اختتام آن برافراخت۔ توقع از کاملِ ہنران آنست کہ بہ نظرِ تصدیق و بہ نگاہِ
و تحقیق نوازش فرمودہ، صورتِ قصورِ دستور باصلاح منظور خواہند فرمود "

دیباچہ کے مذکورہ بالا اقتباس سے امورِ ذیل کی صراحت ہوتی ہے:—

نام مصنف ——— ٹھاکر لعل ولد چتر بھوج داس۔

نام تصنیف ——— دستور العمل۔

سبب تصنیف ——— "نوآموزانِ وقت" کے لئے یہ کتاب علم سیاق میں لکھی گئی ہے۔

——— برہان پور میں سلاطین وقت کے کارخانے تھے[1]۔ اور ان میں حساب کتاب عربی اور ہندی

---

[1] شاہجہاں، جہاں آرا، اورنگ زیب کے کپڑے کے کارخانے تھے۔ ملاحظہ کیجئے ب ——— (باقی صفحہ نمبر ۲۶ پر)

رقم اور اعداد میں لکھا جاتا تھا۔

ایک مدت سے مصنف کے ذہن میں یہ بات تھی کہ زمانے کے مطابق ایک مفید کتاب ترتیب دے۔ جو اس فن کے خواہاں کرنے والوں کے لیے سریع الفہم ہو اور حصول معاش کا موجب بن سکے لہذا چند صیغے اور قواعد ترتیب دے کر زیر نظر کتاب مکمل کی

سن تصنیف —— تصنیف کی ابتدا کی تاریخ کی کہیں صراحت نہیں ہے۔ کتاب کی تکمیل کی تاریخ ۹ رجب ۱۲۱۱ھ ہے

"دستور العمل" کے ترقیمہ کی دلچسپ عبارت بھی ملاحظہ کیجئے گا "تمام شد کتاب دستور العمل بتاریخ چہاردھم جمادی الاول ۱۲۱۶ھ ہجری بدستخط نہال سنگھ ولد ٹیکا رام ابن دیو رام قوم کایستھ اوناؤ۔ سکنہ موہان باشندہ لکھنو... از باعث آمدن روزگار مکانیہ دکھن دارالسرور برہان پور ... بوقت جنگ ... از سرحد ... مہاراجہ جسونت راؤ نواب عمدة الملک نظام علی خان و دولت راؤ سندھیا و جسونت راؤ ہلکر ... نگارش یافت۔"

ترقیمہ کی مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ کاتب نہال سنگھ ولد ٹیکا رام ہے۔ مہاراجہ پونا، نظام علی خان، دولت راؤ سندھیا اور جسونت راؤ ہلکر کے درمیان جنگ کے زمانہ میں برہان پور آیا اور کسی نسخہ سے ۱۴ جمادی الاول ۱۲۱۶ھ کو نقل کیا

ترتیب مضامین: —— دستور العمل دو ابواب پر مشتمل ہے

باب اول کی ابتداء میں مروجہ سنین —— الٰہی، ہجری، فصلی، جلوسی وغیرہ کا ذکر ہے۔ ان سنین کے مہینوں اور دنوں کے نام بھی مرقوم ہیں۔ ایک گوشوارہ میں عربی اسماء، ایام کو سیاقی تحریر میں بھی درج کیا گیا ہے۔

ذیل کے مختلف گوشواروں کے نمونے دیئے ہوئے ہیں: ——

۱۔ نقد و جنس کا حساب

۲۔ بودنی خانہ کا حساب —— حاصل اعمال و تفصیل ——

۳۔ عمارات —— فیل خانہ، اصطبل، کاؤ خانہ ——

۴۔ شاہ گنج اور راویر پرگنہ کے حاصل اعمال اور آمدنی کا گوشوارہ ——

۵۔ داخلہ خزانہ ہائے عامرہ

۶۔ زمین —— اقسام و پیداوار ——

جہاں اسم نویسی کی تفصیل ہے وہاں ملازمان سرکار، اہل قلم اور خدمتگاروں کی فہرست دی ہوئی ہے۔ ملازمین کی تنخواہ کے

۱۔ برہان پور کے مضافات۔ ۲۔ خزانہ عامرہ اور راویر پرگنہ کی انصاف کی تفصیل ہے۔ داروغہ —— میر محمد اور مشرف خوشحال رائے کے نام دیئے ہیں۔

(۲۵ جمادی الاول)

(۱) رقعات عالمگیری۔ ... (۲) دستور العمل نویسی مخطوطہ ... (۳) خطوط عالمگیری ...

گوشوارہ میں قاعدے اور اصول بھی مذکور ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ کیجئے :۔۔۔

اسناد عامل و خدمات : ۔۔۔

(الف) پرگنہ فیض آباد کی جاگیر ۔۔۔۔ خوش وقت رائے کے نام

(ب) شاہ گنج کی داروغگی ۔۔۔۔ میر محمد علی کے نام

(ص) سرکاری فیض آباد پرگنہ ۔۔۔۔ محمد مصطفیٰ کے نام

تصدیق وکالت کے نمونے :۔۔۔۔

(الف) صوبہ برار کی متصدی گری کی وکالت (ب) سررشتۂ بیوتات کی وکالت

(ص) پیادہ ملازم کی وکالت (ج) تھمم آباد کے جاگیرداروں کو مطلع کرنے کی وکالت

(د) محمد بیگ اور دیگر ملازمین کو محمد قلی ۔عامل جہانگیر پورہ ۔کی خدمت میں متعدد رہنے کی اطلاع ۔

(ی) مرزا احمد خاں کو پروانۂ راہداری ۔

دیوار اور زمین کی پیمائش کے نمونے اور طریقے مندرج ہیں طول و عرض اور ارتفاع کی پیمائش اور اس کے لئے اہم مسالہ اور مزدوری کی شرح کی تفصیل ہے۔ اس ضمن میں :۔ (۱) طرح اوزان (۲) طرح تمسک ضمانی (۳) قرض (۴) رہن گرو رکھنے کی رسید (۵) ضمانت نامہ (۶) قرض نامہ وغیرہ کے نمونے دیئے ہوئے ہیں ۔

مکان کی فروخت کے سلسلہ میں مکان کے محل وقوع اور گرد و حویلی کے بارے میں کئی تمسک کے نمونے ہیں۔ مچلکا اور ضامنی مال اور حاضر ضامن کے نمونے بھی دیئے ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا نمونوں کے بعد ترقیمہ کی عبارت ہے۔ جو کاتب، من کتابت اور کاتب کے یہاں نور آنے کی وجہ کو بیان کرتی ہے ۔

باب دوئم :۔۔۔ دوسرے باب میں زراعت، حوض، کنواں، دیوار وغیرہ کی مساحت کا بیان ہے اس میں مینار، محیط، کنواں، حوض، خندق وغیرہ کے ناپنے کے مختلف ضابطے اور قاعدے بیان کئے گئے ہیں۔ پیمائش کے متعدد طریقوں کی شکلوں کے ذریعہ وضاحت کی گئی ہے اور آخر میں حساب جس کے قواعد رقم ہیں۔

مختلف شعبوں کی ذیل میں اہم مناصب کا ذکر ہے :۔۔۔

دیوان، بخشی، متوفی خانساماں، دیوانِ بیوتات پیش دست بخشی، پیش دست خانساماں، پیش دست دیوانِ بیوتات، دیوان، وکیل مطلق، دیوانِ خالصہ، تحویلدار، عرض مکرر ۔

اس کے بعد مختلف شعبوں میں کام کی تقسیم کی تفصیل ہے۔ مختلف فن کاروں کے نام اور کام کا تذکرہ ہے۔

اس تذکرہ کے بعد مرقوم ہے :۔۔۔

وزیر اعظم دولت خواہی و جان سپاری منظور داشتہ مطلب' ہا بہ عرض رساند و ہرکس از اطراف و جوانب' معاملات و واقعات (ب) موافق حکم' داخل واقع نماید' حقیقت صوبہ داران ممالک محروسہ' در خلوت خانہ بہ عرض رساند و بموجب حکم تجویز عزل و نصب کند۔

فرامین جہان مطاع ..... جس و عطایات در حسب ضرورت صوبہ داران از جناب قدسی ارسال گرداند۔ جزو کل اہل خدمات مہمات کارگاہ سلطنت را بنظر تدقیق در آوردہ' ہر کسے را بحال داشتن یا تغیر کردن ..... بعمل آرد و ہر معاملہ بہ عرض رسانیدہ' دستخط نمودہ بمتصدیان عملہ و ..... بسپارد۔

پروانہ تنخواہ و جاگیر اہل مناصب در ہر صوبہ بہ مہر خاص خود مرحمت کند۔ صدر الصدور و دیوان خالصہ و خانساماں در معنی پیشکاران وزیر اعظم اند۔

انتظام سلطنت ابد قرین ہمیں است؎

مذکورہ بالا اقتباس کے بعد امیر الامرا آصف الدولہ کی عرضی ہے اور خاتمہ کتاب۔

اقتباس بالا سے وزیر اعظم کے فرائض اور اس کے رفقائے کار پر روشنی پڑتی ہے۔

بابر اور ہمایوں کے عہد میں صرف ایک وزیر ہوا کرتا تھا۔ اکبر نے سلاطین دہلی کے تاریخی حالات اور بیرم خاں کے واقعات سے تجربات کی روشنی میں وزیر اعلیٰ کا منصب ختم کر دیا۔ اور اس کی جگہ کئی دیوان مقرر کر دیئے۔ ہر دیوان کی نگرانی میں ایک محکمہ ہوتا تھا۔ دیوان اعلیٰ یا وزیر کے علاوہ محکمۂ دیوان حسب ذیل افراد پر مشتمل ہوتا تھا:۔

دیوان خالصہ ـــــ خالصہ اراضی کے لئے　　دیوان تن ـــــ تنخواہوں کے لئے

مشرف ـــــ محاسب خاص　　مستوفی ـــــ حساب کی تنقیح کرنے والا

داروغہ ـــــ　　تحویل دار ـــــ

میر بخشی بخشی اول دوم و سوئم کے عہدے قائم کئے گئے اور ان کے فرائض مقرر کئے گئے۔ ان تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابو الفضل نے "غسل خانہ یا خلوت خانہ" کہا ہے۔ وہ بالعموم "دولت خانہ" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ بعد کی تاریخی کتب میں دیوان کے لئے " عا ہوا ہے۔ عبد الحمید لاہوری اور محمد صالح نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ غسل خانہ' خلوت خانہ کیسے بن گیا درمیان ایک کمرہ تھا جس میں اکبر غسل کیا کرتا تھا۔ یہاں وہ چند قابل اعتماد اشخاص سے ملاقات کر لیا کرتا تھا۔ بعد ہونے لگا۔ دربار کے امیروں کو بھی وہاں آنے کی اجازت حاصل ہوئی اور سلطنت کے کام وہاں انجام پانے لگے۔

مختصر یہ کہ سلاطین مغلیہ کے مرکزی اور صوبائی نظم و نسق کے جائزہ کے لئے "دستور العمل" بھی ایک قابل ذکر

سید یوسف کمال بخاری

نیشنل میوزیم نئی دہلی میں تو زک جہانگیری کا قلمی نسخہ

نیشنل میوزیم میں خطی مخطوطات کے ذخیرہ میں ایک نسخہ توزک جہانگیری (سوانح جہانگیر) موجود ہے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے۔ کہ متذکرہ بالا نسخہ جہانگیر کے اپنے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے۔ چنانچہ مغلیہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ناظرین ومحققین کو ..... قدرتی طور پر یہ معلوم کرنے کی خواہش ہوئی کہ آیا یہ نسخہ اصلی ہے یا نہیں۔ متعدد محققین نے اس نسخہ کو دیکھا ہے اور موافق ومخالف نظریوں کا اظہار کیا ہے اس دلچسپ اور متنازعہ فیہ مسئلہ نے مجھے اس نسخہ کے بالاستیعاب اور تفصیلی مطالعہ پر آمادہ کیا۔

یہ نسخہ سنہ ۱۹۵۶ء میں نیشنل میوزیم کی آرٹ پرچیز کمیٹی (نئی اشیاء کی مجلس خرید) نے لکھنو کے ایک سوداگر سے خریدا۔

نسخہ کی ظاہری حالت اچھی نہیں ہے۔ ۲۷۳ اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ اوراق بوسیدہ اور کرم خوردہ ہیں تاہم متن آسانی سے پڑھا جاسکتا ہے۔ زیادہ ناقص نہیں ہے۔ اوراق کا طول وعرض (۱۰) اعشاریہ (۴) انچ اور (۶) اعشاریہ (۴) انچ بالترتیب (۲۶) اعشاریہ ۵ سنٹی میٹر اور (۱۶) اعشاریہ (۵) سنٹی میٹر ہے۔ نسخہ مجلد ہے جلد اغلباً چرمی ہے جو عمدہ کپڑے سے پوشیدہ ہے جس پر گلہائے زنگارنگ نکھار دکھا رہے ہیں۔ خان بالیغ کاغذ پہ یہ نسخہ ضبط تحریر میں لایا گیا ہے لیکن ناقص الآخر ہے اور ... سن جلوسی (جہانگیری) پرختم ہوجاتا ہے۔ یہ ساتواں سن جلوسی بھی نامکمل ہے۔ جس میں دو یا تین صفحات غائب ہیں حاشیہ ... مسلسل ومتواتر نمونہ ہائے گل تصاویر وحوش وطیور سے آراستہ ومزین ہے۔

نسخہ کا آغاز حسب معمول سرلوح کی نیچے والی تختی میں "اللہ اکبر" کے الفاظ سے ہوتا ہے اس کے بعد مندرجہ ذیل ... تحریر ہیں: —

"از عنایات بیغایات الٰہی بساعت نجومی از روز پنجشنبہ بیستم جمادی الثانی ہزار و چہاردہ ہجری گذشتہ" ..... الخ

اور خاتمہ پہ قوسین میں تحریر کردہ الفاظ پر ہوتا ہے، —

"راجہ نرسنگ دیو بہ منصب چہار ہزاری ذات و دو ہزار و دویست سوار مقرر گشت"

۷- ... کرام سے اجازت چاہوں گا کہ اس نسخہ کی جانچ پڑتال منفی حیثیت سے کروں۔ یہ مدنظر رکھتے ہو

یہ نسخہ جعلی ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں جو شبہات و اعتراضات دماغ میں دوران تحقیقات پیدا ہوئے پیش کرتا ہوں :-

۱۔ نسخہ پر طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ تحریر از آغاز تا انجام یکساں نہیں ہے۔ (تحریر کردہ مختلف خطوط ہیں)۔ اس حقیقت سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ یہ نسخہ بادشاہ کا دستی تحریر کردہ نسخہ نہیں (اور) دعویٰ کی نفی و ابطال ہو جاتا ہے کہ یہ اصلی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شہنشاہ نے بطور املا متعدد واقعہ نویسوں سے مختلف لکھوایا ہو۔ بدیں وجہ ضبط شدہ واقعات مختلف خطوں میں نظر آتے ہیں۔

۲۔ (الف) یہ بھی امکان ہو سکتا ہے کہ کسی شخص نے جہانگیر کے خط کی بعینہٖ نقل کرنے کی کوشش کی ہو تاکہ ایک جعلی نسخہ تیار کر سکے اور پھر یہ دعویٰ کرے کہ یہ اصلی نسخہ بادشاہ کے ہاتھ کا تحریر کردہ نسخہ ہے تاکہ یہ نسخہ بے بہا مابعد کے زمانہ میں امراء و عمائدین میں سے کسی کے ہاتھ فروخت کر کے مالا مال ہو جائے۔

(ب) ہو سکتا ہے کہ یہی مندرجہ بالا سعی کسی نے موجودہ دور میں کی ہو تاکہ نیشنل میوزیم کی مانند کسی (کو فروخت) کر کے قسمت بنائیں۔

۳۔ شاہی کتب خانہ کی کوئی مہر اس نسخہ پر حسب معمول ثبت کیوں نہیں ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں یہ کتابیں شاہی کتب خانہ میں ہوتی تھیں ان سب پر مہریں معہ شاہی دستخطوں، اشارات و حواشی کے ثبت ہوتی تھیں۔

۴۔ یہ تین اوراق شمار نمبر ۱۲۲، ۱۵۱، ۲۳۴ کا کاغذ اور طرز تحریر مختلف کیوں ہے۔ تمام نسخہ میں نظر سے بر (گزرا) کہ تحریر بے نقطہ بجز مندرجہ بالا تین اوراق کے۔

۵۔ تزک جہانگیری کا کوئی نسخہ جہانگیر کے ہاتھ کا تحریر کردہ موجود ہونا محال ہے کیونکہ جہانگیر خود اپنے کبھی کوئی نسخہ احاطہ تحریر میں نہیں لایا بلکہ املا کیا ہے نتیجتاً موجودہ نسخہ کا جہانگیر کے ہاتھ کا لکھا ہونا ناممکن ہے۔

۶۔ سر سید احمد خاں کے علیگڑھ ایڈیشن کے تزک کے صفحہ ۳۵۲ پر شہنشاہ جہانگیر نے لکھا ہے :-

"از عمر ضعیفی کہ دو سال پیش ازیں عارض شدہ بود و ہنوز ہست دل و دماغ ہمراہی نمود کہ
مسودات سوانح و وقائع توانم پرداخت درینولا کہ معتمد خاں از خدمت دکن آمدہ
سعادت آستان بوس دریافت۔ چوں از بندہ ہائے مزاج داں و شاگردان سخن فہم
بود و سابق نیز سر رشتۂ ایں خدمت ضبط وقائع بہ عہدہ او بود حکم فرمودم کہ از تاریخ کہ
نوشتہ ام آئندہ مشارٌ الیہ بخط خود نویسد و ذیل مسودات من داخل سازد و آنچہ بعد ازیں
سوانح شود بطریق روزنامچہ مسودہ نمودہ بہ تصحیح من رسانیدہ بہ بیاض می سپردہ باشد"

نقدہ "نوشتہ ام" ہست مذکورہ بالا عبارت کے اس مفہوم کی تائید نہیں ہوتی کہ بادشاہ نے یہ سوانح

کسی دوسرے سے لکھوائی ہے۔ شہنشاہ کا مقصد "کہ نوشتہ ام نہ" کہ نویسانیدہ ام ہے یعنی میں نے کہا اور کسی
ے نے تحریر کیا۔

۷۔ کیا سبب ہے کہ اس نسخہ کی عبارت مصدقہ مطبوعہ تزک سے مطابقت نہیں رکھتی
ہماری جانچ دراصل مندرجہ ذیل نکات پر منحصر ہونا چاہیئے: —

سب سے مقدم اور اولین بر کھ اس امر کی ہونا ضروری ہے کہ نسخہ زیر بحث واقعی شہنشاہ جہانگیر کا اپنا قلمی ہے۔
اگر شہنشاہ جہانگیر کے مصدقہ دستخطی نمونے نسخہ زیر بحث کی لکھاوٹ سے مطابقت رکھتے ہیں تو یہی سب سے بڑا ثبوت
نسخہ کے اصلی ہونے کی بابت پیش کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے حواشی پر زیبائشی بیل بوٹے پرندوں اور جانوروں کی تصاویر ہیں ان کی جانچ بھی ضروری ہے اگر یہ آرٹ
منصور کا ہے جو جہانگیر کے دربار کا مشہور مصور ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ نسخہ پر یہ زیبائشی فن منصور نے
شاہ جہانگیر کے لیے پیش کیا ہوگا۔

اگرچہ اس زیبائش فن کا منصور سے متعلق ہونا اس امر کا واضح اور بدیہی ثبوت نہیں ہو سکتا کہ یہ نسخہ جہانگیر کا قلمی ہے
تاہم از کم یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ یہ نسخہ کبھی بھی جہانگیر کے مقبوضات میں رہا ہوگا۔

تیسری چیز اس بات کی تنقیح ہے کہ نسخہ میں استعمال کیا ہوا کاغذ جہانگیر کے زمانہ کا ہے یا نہیں؟
حالانکہ تنقیحات نمبر دو اور تین مسئلہ متنازعہ فیہ کے فیصلہ کے لئے کوئی بلا راست ثبوت نہیں ہو سکتے پھر بھی
یہ دو باتیں اس نسخہ کی جانچ کے لئے محققین کے ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

اگر نسخہ زیر بحث واقعی جہانگیر کا قلمی ہے تو یہ بات بھی لازم ہو جاتی ہے کہ ہم خود نسخہ زیر بحث کی اپنی تاریخ کے بارے میں
معلومات کریں کہ یہ جہانگیر کے پاس سے ہوتا ہوا۔ کس طرح اور کن حالات میں نیشنل میوزیم تک پہونچی۔

سب سے پہلے جہانگیر کے لکھنے کے طریقہ کی جانچ کرنی چاہیئے اور معلوم کرنا چاہیئے کہ اس کے طرز تحریر میں کونسی نمایاں
خصوصیات ہیں۔ اس مقصد کے لئے میں نے جہانگیر کی لکھائی کے نمونے مختلف مسودات اور دستاویزات سے فراہم کیے جو مختلف عجائب
گھروں اور اداروں سے مل سکے۔ ان مختلف نمونوں کو جب میں نے یکجا کیا اور ان کا معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ سب ایک دوسرے
سے پوری مطابقت نہیں رکھتے۔ حالانکہ یہ سب تحاریر جہانگیر کی اپنی ہیں۔ جس کی تصدیق ہو چکی ہے۔ اور آخر میں دی ہوئی ان
نمونوں کی تصاویر سے صاف ظاہر ہوگا۔

یہ تحریریں سب کی سب بے قاعدہ اور بے ترتیب نستعلیق میں مختلف نوعیت کیساتھ ہیں۔ اور ان کو مندرجہ
ذیل اقسام میں رکھا جا سکتا ہے۔

۱۔ تحریر نقطہ دار ۲۔ تحریر بے نقط ۳۔ تحریر مشترک (نقطہ دار و بے نقط)

کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ایک خاص شخص کی لکھائی ہمیشہ ایک جیسی ہو اور ایک دوسری تحریر سے مماثلت رکھے اسی طرح کوئی بھی یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتا۔ اس کی لکھائی تا عمر ایک سی رہی اور اس میں کوئی بھی فرق پیدا ہوا۔ حالات ایک ہی انسان کے قلم کے دائروں میں افتراق پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کئی حالات سامنے ہیں مثلاً بچپن، نوجوانی، جوانی اور ادھیڑ عمر انسان کی مختلف مزاجی کیفیت۔ خوشی کا عالم، حزن و ملال کی کیفیت، خوف، نشہ کی حالت سکون اور دماغی ہیجان وغیرہم بہر نوع ان اختلافات کے باوجود جو مختلف حالات ایک ہی انسان میں تبدیلیوں کا باعث ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بات لازم و ملزوم ہے کہ کوئی نہ کوئی انفرادیت یا خصوصیت ایسی ضرور ملجاتی ہے ذہن و نظر میں یہ واضح کردیتی ہے کہ یہ خط اس کے لئے اجنبیت نہیں رکھتا بشرطیکہ اس کو ایسے خط سے واقفیت یا لگاؤ اور یہی تجربہ ہمیں اس وقت ہو جاتا ہے جب ہم اپنے کسی عزیز دوست یا جانی پہچانی شخصیت کا خط پڑھ رہے ہوں۔ ..
جونہی ہم سرنامہ پر لکھا ہوا پتہ پڑھتے ہیں ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ خط ہمیں کس کی جانب سے موصول ہوا ہے۔ یہ دراصل نہیں ہے بلکہ بصارت ہے۔ جو ایک خاص شخصیت کی لکھائی کی تصدیق کرتی ہے۔

اگر دو انسانوں کی لکھائی میں کچھ یکسانیت ہو تو بھی ہر لکھائی کی خصوصیت اور انفرادیت خود ہی کسوٹی بن کر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور ہم پرکھ لیتے ہیں کہ کونسی تحریر کس شخص کی ہے اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ یہ بصارت ہے جو یہ تو تیزی رکھتی ہے۔ اس میں دلائل کو کوئی مقام حاصل نہیں ہے اسی طرح عام حالات میں ہم شناساؤں کو ان کی آوازوں سے پہچان لیتے ہیں۔ کسی بھی شناسا کی صورت دیکھے بغیر اسکی آواز سے اسکو پہچان لینا مشکل نہیں ہے یہاں بھی قوت سامعہ، دماغی قوتوں سے اوپر ہے اسلئے ہم اس نتیجہ پر باسانی پہونچ جاتے ہیں کہ جہانگیر کی مختلف تحریروں کے نمونے جو میں نے فراہم کئے ہیں خود شہنشاہ جہانگیر کے ہاتھ کے ہی لکھے ہوئے ہیں۔ اس صداقت کو ذہن میں محفوظ کئے ہوئے میں نے قریبی زاویہ سے ان تحریروں کے نمونوں کو دیکھا اور یہ سمجھ لیا کہ ان میں طرز نگارش اور اسلوب تحریر میں قدر مشترک موجود ہے۔

ان تمام نمونوں کے غور و فکر سے معائنہ کے بعد یہ ضروری ہے کہ اس نسخہ زیر بحث کی لکھائی سے مقابلہ اور موازنہ کیا جائے۔ طرز تحریر میں اختلاف ہونیکے باوجود اگرچہ کسی بھی نمونہ تحریر کی کسی بھی صفحہ سے مماثلت ہو جاتی ہے تو یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے کہ نسخہ مذکور جہانگیر نے اپنے قلم سے تحریر کیا ہے۔

موازنہ کے وقت یہ محسوس ہوا کہ تمام تحریر اس نسخے کی ابتدا سے انتہا تک بے نقطہ ہے سوائے صفحات ۱۵۵-۱ اور ۲۳۸ کے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا نسخہ دونوں تحریروں میں لکھا گیا ہے یعنی نقطہ دار اور بے نقطہ اسلئے لکھائی کا اختلاف کبھی بھی موجب انکار نہیں ہو سکتا کہ نسخہ مذکور اصلی نہیں ہے۔

انتہائی دقیق اور گہری نظر سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ قلم کی حرکات، دائرے، زاویے، آڑھے ترچھے خط (VERTICAL SHAFTS HORIZENTAL LINE) حروف کی عمودی و اُفقی کشش کچھ نہ کچھ

ہی نمونۂ تحریر سے مطابقت اور مماثلت رکھتے ہیں اور قارئین خود بھی نسخۂ مذکور کے مختلف صفحات کی مماثلہ سطروں
ذکر کے دیکھ سکتے ہیں۔

واقعتًا بلا جھجک یہ کہہ دینا مشکل ہے کہ نسخۂ مذکور کی لکھائی جہانگیر کے دیگر دستخطی نمونوں سے مطابقت رکھتی ہے۔
انصاف کی بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کیلئے ماہرین دستاویزات کی رائے طلب کی جائے۔ میں کم از کم تین
ماہرین کی رائے لے رہا ہوں۔ سائنسی اور ٹیکنیکی بنیادوں پر بغیر تاریخی پس منظر کے اپنی رائے دیں گے اور اس میں بلاشبہ
کسی غرض یا تعصب کا شائبہ بھی نہ ہوگا۔ یہ ماہرین جہانگیر کے مصدقہ دستخطی نمونوں سے نسخہ زیر بحث کا مقابلہ کرنے کے بعد اپنی
رائے کا اظہار کریں گے۔

مورخوں اور محققوں کا ایک گروہ اس امر کا حامی ہے کہ جہانگیر نے اپنی سوانح حیات خود نہیں لکھی ہے بلکہ دوسروں سے لکھوائی
اور اسی لئے ان کے خیال میں جہانگیر کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تزک کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے اگر ہمارا نقطۂ نظر صحیح اور
قابل قبول ہے تو جونہی ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ نسخہ مذکورہ کی لکھائی جہانگیر کے اپنے قلم کی ہے تو پھر ہمیں مندرجہ بالا آراء پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔
یہاں میں دو محققین کی رائے کو قارئین کے لئے پیش کرتا ہوں:—

چارلس ریو اپنی رائے اس طرح پیش کرتا ہے:—

"تزک جہانگیری" کے اس وقت دو تصحیح شدہ نسخے موجود ہیں یا یوں کہئے کہ دو مخصوص
کارنامے ایک ہی نام سے پائے جاتے ہیں۔

ان نسخوں میں سے ایک جو تاریخ وار مرتب کیا گیا ہے۔ مہر تصدیق ثبت ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس پر شک کیا جائے
وہ جو شہنشاہ (جہانگیر) کا رسم تاجپوشی سے اس کے عہد حکومت کے سترہ سال تک تحریر کیا گیا ہے اور بعد ازاں شہنشاہ کی
ہدایت پر اسے معتمد خاں۔ انیسویں[1] سال جلوس کی ابتدا تک لکھتا رہا جیسا کہ خود نسخہ مذکور میں تحریر ہے (مطبوعہ نسخہ صفحہ ۲۵۲)

سر سید احمد خاں نے تحریر کیا ہے:—

واضح باد کہ شہنشاہ جہانگیر احوال فرماں روائے خود تا اوسط سال ہفدہم خود تحریر نمودہ بعد ازاں معتمد خاں
کہ از امرائے معتمد جہانگیر بود حکم فرمود کہ خان مذکور از آئندہ مسودات تحریر نمودہ باصلاح جہانگیر در آوردہ شامل
کتاب می نمودہ باشد چنانچہ معتمد خاں تا اوائل سال نوزدہم جلوس مسودات را نوشتہ باصلاح در آوردہ بعد ازاں
محمد ہادی مولف دیباچہ تا آخر ایام حیات تکمیل نمود[2]

۱۔ مسودات فارسی محفوظ برٹش میوزیم جلد اول صفحہ ۲۵۳ نمبر اضافی ۲۶ اور ۲۱۶
۲۔ تزک جہانگیری مولفہ سر سید احمد خاں علیگڑھ مطبوعہ ۱۸۶۴ء مندرجہ حاشیہ صفحہ ۱
ٹ: چار ماہ کی مسلسل کوششوں کے بعد بھی تصاویر کے بلاکس حاصل نہ ہو سکے جس کا ادارہ کو افسوس ہے۔

جہانگیر کی سوانح خود جہانگیر کے قلم سے لکھے جانے کی صداقت کے بارے میں سر سید احمد خاں اور چارلس ریو کے بیانات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے اس کے علاوہ خود توزک جہانگیری سے بھی اس امر کی شہادت مل جاتی ہے۔ متعلقہ عبارت اس مقالہ کے شروع میں نقل کی جا چکی ہے جس میں جہانگیر نے فارسی میں تحریر کیا ہے "کہ نوشتہ ام" اس لئے اس فقرہ کا ہرگز یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ "کہ نویسانده ام" اس لئے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ جہانگیر نے اپنی سوانح خود اپنے قلم سے تحریر کی ہے اور یہ قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کہ جہانگیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی توزک کا وجود ممکن ہی نہیں ہے۔

میں نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ اس نسخہ کے بارے میں معلومات فراہم کروں کہ یہ جہانگیر سے ہوتا ہوا کس طرح نیشنل میوزیم پہونچا لہذا میں نے اس تاجر سے رابطہ پیدا کیا جس نے نسخہ زیر بحث میوزیم کو فروخت کیا تاکہ معلومات فراہم کروں کہ اس نے اس نسخہ کو کہاں سے حاصل کیا اور اس سے پہلے یہ کس کے پاس تھا اور کس فرد یا خاندان کو یہ نسخہ کس سے دستیاب ہوا لیکن تاجر موصوف نے اس سلسلہ میں باوجود میری پر زور استدعا کے کوئی بھی معلومات فراہم نہیں کی اور ماخذ بتانے سے انکار کر دیا جس سے میں قطعی مایوس ہو گیا۔

میں نے نسخہ زیر بحث کا توزک جہانگیری کے اس مطبوعہ نسخے سے موازنہ و میلان کیا جسے سر سید احمد خاں نے ۱۸۶۴ء علیگڈھ سے شائع کیا تھا۔ بائیس ۲۲ صفحات تک اس مسودے کی عبارت مطبوعہ نسخے سے ملتی رہی عام اس سے کہ چند ... الفاظ کہیں کہیں تبدیل ہو گئے ہیں، لیکن اس تبدیلی سے عبارت کے مفہوم میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہ ہو سکی بس یہ اختلافات نظر انداز کئے جانے کے قابل ہیں اور ان کی موجودگی سے عبارت کی ہم آہنگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ان اختلافات کی چند مثالیں درج ذیل ہیں: ---

نسخہ محفوظ نیشنل میوزیم	توزک جہانگیری مؤلفہ سر سید احمد خاں	صفحہ	سطر
بخاطر	برخاطر	ص۲ الف	س۴
تا روضہ	تا بدرگاہ روضہ	〃 〃	س۹
ہفت در روزہ	ہفت روزہ	〃 〃	س۱۳
آگرہ بسری برد	آگرہ استقامت داشت	ص۲ ب	س۸
ہشیاری ہرکہ شنیدم	ہشیاری شنیدم	ص۳ الف	س۱۲
متصل	متصدی	ص۴ الف	س۱
قدیم کلاں	قدیم بزرگ	〃 〃	س۷
سبحان عالم	روندھائے عالم	〃 〃	〃
کمبوکی (حاشیہ اگلے صفحہ پر)	سیوتی	[illegible]	〃

بدہ ہائے قدیم پدرونست		؎۲ بندہ ہائے قدیم منت	۱۲ب	۹ب
سنہ ع ۱۰۱		دکوئی سنہ اس نسخہ میں نہیں دیا گیا	۱۳ب	اوپر سے
از ہا ہزار و دو پانصدی		از ہلہ پانصدی	۱۶ب	۵ب
اگر لفضل مجموعہ		سرسید کے مؤلفہ نسخہ میں تین اشعار درج ہیں جبکہ نسخہ زیر بحث میں ان اشعار کو حذف کر دیا گیا	۱۸ب	۵ب
گوشہ		توشہ	۲۲ب	۶ب

میرے مشاہدات درج ذیل ہیں :—

(۱) سلسلہ تحریر سے حواشی پر دئے ہوئے زیبائشی نقش و نگار کٹ گئے ہیں اگر نسخہ زیر بحث شہنشاہ کا قلمی نہ ہوتا بلکہ اس نے کسی سے لکھوایا ہوتا جیسا کہ عام طور سے ایک گروہ کا قیاس ہے تو پھر یہ کسی خوشنویس کے ہاتھوں سے خوشخط لکھا ہوتا کیونکہ وہ جان لیتا کہ نسخہ مذکورہ شہنشاہ کی ڈائری ہے اور اس لئے وہ اسے خوبصورت اور صاف لکھنے کی کوشش کرتا۔ کاٹ چھانٹ قطع و برید حواشی پر سے عبارت کا گذر جانا اور ترمیم وغیرہ جیسی چیزیں اس نسخہ میں ہرگز نہ پائی جائیں کیونکہ ان حامیوں نے صفحات کے حواشی پر دیئے ہوئے نقش و نگار کو عمداً اور بدصورت بنا دیا ہے اور یہی واقعاتی چیز ہمیں اس نتیجہ پر پہونچا دیتی ہے کہ نسخہ زیر بحث خود شہنشاہ جہانگیر کے قلم سے لکھا ہوا ہے اور اس نے صفحات کی خوبصورتی کا لحاظ کئے بغیر ہی لکیروں کو قطع کر کے اپنی تحریر آگے تک بڑھا دی ہے کیونکہ اس پر خوبصورتی و صفائی کو قائم رکھنے کی پابندی عائد نہیں ہوتی۔

(۲) بغیر اعراب یا نقاط لگائے یہ نسخہ مخلوط لکھا گیا ہے اور تحریر کی یہ خصوصیت جہانگیر کی دوسری تحریر سے بھی مشابہ دکھائی ہے۔

(۳) صفحہ ۱۶۵ ب پر حاشیہ پر ایک تحریر ہے جو اصل متن میں ایک اضافہ ہے۔ شہنشاہ نے پہلی بار متن لکھنے کے بعد جب نظر ثانی کی ہوگی تو اصل تحریر میں کچھ اضافہ کیا ہوگا۔ یہ اضافہ کردہ تحریر اصل متن کا ہی ایک حصہ دلا ینفک ہے کیونکہ سرسید احمد خاں کے مطبوعہ ایڈیشن میں موجود ہے

(۴) حاشیہ پر آرائش کا کام متن لکھے جانے کے بعد کیا گیا ہے جیسا کہ صفحہ ۱۷۷ ب کے مشاہدہ سے واضح ہوتا ہے نتیجے سے تیسری سطر حاشیہ کو قطع کر گئی ہے، ور حاشیہ پر کیا ہوا مطلا کام عمودی سطر پر مسلسل نہیں کیا گیا چونکہ درمیان میں حروف حائل ہو گئیں۔

(۵) صفحہ ۱۷۸ (ا) پر صفحہ کے بیچوں بیچ ایک سطر پر خط نسخ پھرا ہوا ہے اور دائیں جانب کے حاشیہ پر اصل متن ایسا

ؔ ۱۔ پہلے لفظ "کیتوکی" "کرسیوتی" لکھا گیا تھا۔ بعدہٗ "کیتوکی" کیا گیا جیسا کہ نسخہ زیر بحث میں "سیوتی" کا "س" کاٹنے سے ظاہر ہوتا ہے شاید شہنشاہ نے نظر ثانی کرتے وقت یہ اصلاح کی ہے ۲۔ میرا خیال ہے کہ نسخہ زیر بحث میں صحیح لکھا ہوا ہے اور سرسید احمد خاں کے مؤلفہ نسخہ میں سہواً لکھنے سے رہ گیا ہے۔

چند الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے جو کہ اصل متن کی تحریر کے وقت چھوٹ گئے ہونگے یا شہنشاہ نے بعد میں اس تحریر کو بڑھایا ہو لیکن یہ الفاظ سرسید احمد خاں کے ایڈیشن میں موجود نہیں ہیں۔

(۶) اورنگ زیب کی ایک مہر چسپاں ہے جو صاف پڑھی نہیں جاتی الفاظ یہ ہیں عالم گیر محی الدین بادشاہ غازی الہ ... جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ میوزیم کے نسخہ کی تحریر کا مقابلہ کرنے کیلئے جہانگیر کی دوسری دستی تحریروں کو حاصل کرنے کی سعی کی بالآخر مجھے یہ تحریریں۔ مختلف خطی نسخوں پر حواشی کی شکل میں دستیاب ہوئیں۔ جو کہ ملک کے مختلف کتب خانوں اور عجائب میں محفوظ اور موجود ہیں۔ ان نمونہ ہائے تحریر کی ایک فہرست درج ذیل ہے۔ . . . .

قارئین کی سہولت کے پیش نظر تمام فوٹو جو میں نے حاصل کئے ہیں وہ اور ایک فوٹو میوزیم کے نسخہ میں سے اس صفحہ کا ... الفاظ "نورالدین ابن اکبر بادشاہ" تحریر ہیں فی الحال یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں میوزیم کے نسخہ سے کوئی ایسا صفحہ پیش کروں جو متن جمع کئے ہوئے دوسرے مقامات کے نمونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بالکل یکساں ہو لہذا مقابلہ و موازنہ کیلئے ہمیں میوزیم کے نسخہ اور دوسری تحریروں کے چند مشترک الفاظ تک ہی جائزہ کو محدود کرنا پڑیگا چنانچہ میں نے میوزیم کے نسخہ سے چند نمونے انتخاب کئے ہیں جن میں جہانگیر اور اکبر کے نام آئے ہیں کسی شخص کی تحریر نہیں اسکے دستخط کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے میں تمام دلچسپی رکھنے والے محققین اور مورخین کو دعوت دیتا ہوں کہ .... اس نسخہ کا جائزہ لیں اور اپنے سے آگاہ کریں کہ واقعی یہ نسخہ اصلی ہے یا جعلی۔

جہانگیر کی مستند دستخطی تحریروں کی فہرست

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں ۲ تحریریں موجود ہیں۔

(۱) ذخیرہ حبیب گنج فہرست نمبر ۲۹/۳۰ عربی کتاب موسوم بہ شرح موقف مطول کے آخری صفحہ پر خود قلمی تحریر ہے (اکبر اللہ اکبر مطول در علم فصاحت بخط میدا (المحققین) و سند مدققین میر سید (شریف) جرجانی .... (بعد ملاحظہ) داخل کتابخانہ این نیاز مند۔ درگاہ الہی شد سر جلوس مطابق ۱۰۲۳ حررہ محمد نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ غازی۔

(۲) دوسری تحریر ایک ترکی دیوان کے صفحہ پر ہے (اب یہ ورق کتاب سے علحدہ کر دیا گیا ہے) اور مندرج کتب خانہ میں ہے۔

متن

اللہ اکبر نیم آذر سنہ داخل کتابخانہ این نیاز مند درگاہ الہی شد نورالدین جہانگیر سنہ ابن اکبر بادشاہ

دونوں تحریروں پر شاہی مہر ثبت نہیں ہے۔ لیکن اسی صفحہ پر شاہجہاں کی مہر ثبت ہے جس سے اول الذکر تحریر کے مستند ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

خدابخش اورینٹل لائبریری بانکی پور پٹنہ

۳- فہرست (CATALOGUE) نمبر ۲۲۱ کتاب موسوم بہ دیوان مرزا کامران کے سر ورق پر جہانگیر کی دستخطی تحریر موجود ہے

(متن)

اللہ اکبر - دیوان مرزا کامران کہ عم پدر بزرگوار منست بخط محمود اسحٰق شہابی حررہ نورالدین محمد جہانگیر شاہ
اکبر سنہ ۲۰ جلوس موافق سنہ ۱۰۲۵ھ

اس تحریر پر جہانگیر کی کوئی مہر ثبت نہیں ہے اسی صفحہ پر شاہ جہاں کی بھی دستخطی تحریر موجود ہے اور اس کی مہر بھی مذکورہ بالا تحریر کی دائیں جانب ثبت ہے۔

(۴) فہرست نمبر ۲۱ کتاب موسوم بہ دیوان حافظ کے اندر ایک صفحہ پر جہانگیر کی تحریر موجود ہے۔

(متن)

وقتے کہ از الہ باس بقصد بل —— حضرت والد بزرگوار خوسب —— آگرہ بودم در اثنائے راہ ——
رسید کہ تفال بدیوان حافظ —— باید نمو این غزل بر آمد —— ہم سعادت خدمت —— ورضاجوئی و حاضر بو-
در واقعہ ناگزیر دست د..... —— ہم دولت موروثی —— آوری گشت کہ بقیہ مضمون —— غزل بود
در جمدی الثانی (سنہ) —— کشودہ شد راقمہ نورالدین ابن اکبر بادشاہ غازی (عکس چہارم)

اس دستخطی تحریر پر جہانگیر کی کوئی مہر چسپاں نہیں ہے۔

(۵) متذکرہ بالا کتاب کے ایک دوسرے ورق پر جہانگیر کی ایک اور دستخطی تحریر ہے۔

(متن)

والسلام —— اجمیر بر سر را تا رفتہ بودم در پیکار —— بید الماس تراشیدہ از سر من افتاد ——
چوں ایں را چوب بدانستہ تفال —— دیوان خواجہ نمودم این غزل —— بر آمد و روز دیگر تعویذ بیدار ——
حررہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ غازی فی ماہ محرم سنہ ۱۰۲۰ھ (عکس پنجم)

۵- اس صفحہ پر دوسری تحریر بھی ہے۔

اس تحریر پر بھی جہانگیر کی مہر ثبت نہیں ہے۔

رضا کتب خانہ رامپور

۶- فہرست شمارہ ۵۵ کتاب موسوم بہ رسالہ خواجہ عبداللہ انصاری کے صفحہ اول پر جہانگیر کی ایک تحریر ہے:-

(متن)

رسالہ خواجہ عبداللہ انصاری خط ملا سلطان علی از پیشکش خان خاناں بتاریخ ۲۴ جمادی الاول سنہ ۱۰۲۳ سنہ ۹ جلوس

حررہ جہانگیر ابن اکبر بادشاہ غازی (عکس ششم)

سالار جنگ میوزیم حیدرآباد دکن

(۷) اندراج عمومی ۹۴۴/۹ نسخۃ القرآن۔ صفحہ اول پر جہانگیر کی تحریر ہے۔

(متن)

اللہ اکبر بنام بار خدائے عز و جل این نیاز مند درگاہ صمدیت بقدوۃ العارفین و سراج المتقین حسن خواجہ بتہ ماہ الہی سنہ جلوس مطابق ۲ رمضان المبارک ۱۰۲۰ برسم ارمغان فرستاد حررہ نورالدین جہانگیر شاہ ابن اکبر بادشا (عکس ہفتم الف)

۸۔ اسی صفحہ پر دوسری تحریر بھی ہے۔

(متن)

این کلام ملک علام کہ بخط زبدۃ الکتاب خواجہ یاقوت غلام مستعصم عباسیت۔

بتاریخ دوازدہم امرداد سنہ ۹ جلوس مطابق بست و ہفتم جمادی الثانی ۱۰۲۳ ہجری داخل کتابخانہ این نیاز مند درگاہ الہی شد حررہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ غازی (عکس ہفتم ب)

۹۔ فہرست نمبر ۲۱۲ دیوان حافظ صفحہ اول پر تحریر ہے :—

(متن)

اللہ اکبر بکم آذر سنہ ۱ داخل کتابخانہ این نیاز مند درگاہ الہی شد در دار الخلافہ آگرہ۔ جمعہ نورالدین جہانگیر بادشاہ، درخانہ پدرم از عموی من محمد حکیم مرزا رسید۔

ذیل میں زیر بحث نسخہ توزک جہانگیری کے چار صفحات کے فوٹو جن میں جہانگیر کے دستخط یا اس کا نام وا مقابلہ کیلئے پیش ناظرین ہے۔

(۱) نمبر ۱ پر بالائی قطعہ کے اندر الفاظ "اللہ اکبر" ملاحظہ ہوں اور اس کا مقابلہ جہانگیر کے دوسرے خطی نمونوں لفظ "اکبر" سے کیجئے۔

اس تحریر پر بھی جہانگیر کی مہر ثبت نہیں ہے۔

جہاں وہ لکھتا ہے" نورالدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ"

(۲) عکس نمبر ۸ کی بالائی سطر میں مرقوم الفاظ" جلال الدین اکبر بادشاہ نورالدین" ملاحظہ کیجیے۔

(۳) اسی فوٹو میں دوبارہ اوپر سے تیسری سطر میں الفاظ" نورالدین جہانگیر بادشاہ" ملاحظہ کیجیے۔

(۴) عکس نمبر ۹ صفحہ ۲ (الف) میں نیچے سے پانچویں سطر میں مرقوم الفاظ" اکبر بادشاہ" ملاحظہ کیجیے

تصاویر پر شہنشاہ جہانگیر کی خودنوشت تحریریں

(حاشیہ از سائمن ڈگبی)

میں جناب بخاری صاحب کے خیال کی پر زور تائید کرتا ہوں کہ نسخہ توزک جہانگیری شہنشاہ کے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے
ـدت سے جہانگیری دور کی عمدہ تصاویر پر مرقوم شدہ تحریریں جمع کر رہا ہوں۔ جو مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر قطعی امکان یا
ـساتھ شہنشاہ کی ذات سے منسوب کی جاسکتی ہیں۔ میری یہ فہرست ابھی مکمل نہیں ہے لیکن میں یہاں ان دستخطی . . .
ـوں کا ذکر کروں گا جو پہلے بھی کسی نہ کسی اشاعت میں شائع ہو چکی ہیں ان سے جہانگیر کے دستخطی تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ
ـجاتا ہے۔ یہ ساری تحریریں بھدے نستعلیق طرز میں ہیں ان تمام خصوصیات کے ساتھ جن کا جناب بخاری صاحب نے
ـہے اور وہ خصوصیات بعینہٖ نسخۂ زیر بحث کی تحریر سے مماثلت رکھتی ہیں۔ اور یہی خصوصیات وکٹوریا اینڈ البرٹ
لندن کے نسخہ اکبرنامہ پر جہانگیر کی تحریر کردہ عبارتوں میں موجود ہیں۔

"ایک مزید خصوصیت ان تحریروں کی یہ ہے کہ یہ عام طور سے تصاویر کے اندرونی حصے میں پائی جاتی ہیں نہ کہ حاشیہ کے۔"
نمایاں دستخطی تحریر سے قطع نظر ان تحریروں میں سے کچھ کا اندازِ عبارت ایسا ہے کہ ایسے الفاظ صرف جہانگیر ہی کے قلم سے
ـسکتے تھے۔ مثال کے طور پر ایران کے شاہ عباس اول کی تصویر جس میں اسے جہانگیر کے برابر باادب بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے
ـں میں شاہ کے سر پر "شبیہ برادرم شاہ عباس" لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح جہانگیر کی محل جودھ بائی کے بھائی راجہ سورج سنگھ پر
ـوئی عبارت "طغائی خرم" (خرم کے چچا) مغل دربار کے سخت آداب مجلس کی تحت صرف خرم (یعنی شاہجہاں) کے باپ ہی کا
ـہو سکتی ہے۔ ان ہی دستخطی تحریروں میں جن سے جہانگیر کے مذاق کا بھی پتہ چلتا ہے وہ عبارات ہیں جو ان معروف
ـروں کی تصاویر پر تحریر ہیں جو اس کے عہد حکومت میں دربار میں پیش کئے گئے تھے اسی ضمن میں وکٹوریہ اور
ـمیوزیم میں زبرا کی تصویر ہے جس کے داہنی جانب یہ عبارت تحریر ہے:—

استر جو میر جعفر کے ہمراہ حبشہ سے آیا تھا اور جس کی تصویر نادر زمانہ استاد منصور نے کھینچی تھی سنہ ۱۰۳۰ ہجری سنہ ۱۷ اور
ـدوستان کے نیشنل میوزیم میں عام گمان ہاتھی کی تصویر ان دستخطی تحریروں کی بنیاد شناخت اس معروف جہانگیری البم
ـسکتی ہے جس کا بیشتر حصہ برلن میں ہے جسے کیونسل (KUCHNAL) اور گوئز (GOELZ) نے ہندوستانی کتابی تصاویر
(INDIAN BOOK PAINT... کے نام سے شائع کیا تھا ایک حصہ طہران میں ہے اور بعض اوراق پریشان دیگر

ـوبنگ سن - ہندوستان کے سلاطین اور شہنشاہوں کی تصاویر پلیٹ ۳۵ الف
(STCH... ۲۷ (بجنسہ) پلیٹ ۲۷ ، ڈبلیو۔ جی۔ آرچر: انڈیا سالانہ نمبر ۱۹۶۲ء ص ۸۴ تصویر ساتھ نہیں آئی۔
ـنئی ایڈیشن ۱۹۲۲

مقامات میں ہیں۔ یہ البم جس کے حاشیے اس قدر مزین ہیں بظاہر ایک شاہی ملکیت ہوسکتی ہے اور غالباً دہلی سے دیگر مالِ غنیمت کے ساتھ نادر شاہ کے قبضہ میں آیا۔ اس کی اکثر تصاویر پر ویسی ہی بھدی نستعلیق تحریریں ہیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔

ان تصاویر میں کچھ کے راجہ 'راؤ بھارو' کی شبیہ ہے جس کے چاروں طرف داہنی جانب وسط سے شروع ہوکر حسب ذیل عبارت تحریر ہے۔

تصویر راؤ بھارو زمیندار ولایت کچھ جسے گووردھن نے کھینچی تھی اور جو سنہ ۱۳ مطابق سنہ ۱۰۲۷ھ شہر احمدآباد میں معتبر زمینداروں میں سے ہے جو اس سرزمین کے کسی بھی حاکم سے ملاقات کو نہ آیا تھا۔

کیونسل اور گیٹیر نے غالباً اس معروف فقرہ سے ناواقفیت کی بنا پر 'حرره' کو 'حضرت'[۱۳] پڑھ لیا۔ باوجودیکہ یہ فقرہ تشدید اور پیش کے ساتھ صاف لکھا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں حضرات یہ سمجھنے سے قاصر رہ گئے۔ جہانگیری البم کی یہ تمام تحریریں خود جہانگیر کی ہیں۔ طہران کے مسودہ کے ایک صفحہ پر یہ دستخطی[۱۴] تحریر ہے ۱۰۱ عمل فرخ بیگ بقلم جہانگیر اکبر بادشاہ (کذا)

اس مثال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تحریریں البم میں صفحات کی حاشیہ بندی سے پیشتر کی ہیں اور انہیں حسب ضرورت کہیں کہیں تراش دیا گیا ہے مجھے تو یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے نپرسٹک میوزیم پراگ[۱۵] میں رکھے ہوئے اس البم کے اس دلچسپ صفحہ پر جس کے ایک حصہ میں بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ کی شبیہ کے اوپر اس سلطان کے علم موسیقی کو حسب ذیل مبالغہ آمیز فقرہ میں سراہا گیا ہے دراصل جہانگیری کے تاثرات قلمبند ہیں جن کو صفحہ کی حاشیہ بندی کے وقت کاٹ کر نکال دیا گیا بعد کو خطاط محمد حسین زریں قلم نے دوبارہ خود تحریر کیا

اللہ اکبر شبیہ ابراہیم عادل شاہ دکنی فرمان دار بیجاپور جو کہ دکن کے علم موسیقی میں خود کو اہل فن کا سردار تصور کرتا ہے عمل فرخ بیگ سنہ ۵ جلوس مبارک موافق سنہ ۱۰۱۹ھ بندہ کمترین محمد حسین زریں قلم جہانگیر شاہی نے تحریر کیا۔

جہانگیر کی ایک اور دوماٹوی دستخطی تحریر ہے جو تلف ہوگئی یہ ایک تصویر کے اوپر تھی جسے شاید خود شہنشاہ نے انگریزی سفیر سرطامس رو کو پیش کیا تھا اس تحریر کا ایک عکس طامس رو کی اصل تصنیف "سفارت" میں زیارت کے اندر شائع ہوئی تھی انگریزی فن کار نے اس قدر کامیابی سے سنہ ۱۰۲۶ھ در شہر مانڈو تحریر منوہر داس پچاس سالگی۔

---

[۱۳] KECHNAL (بجنسہ) پلیٹ ۳۶ روگرس اور بیورج کے ترجمہ "تزک جہانگیری" میں اس امیر کا نام راؤ بھارا ہے حصہ دوم ص ۱۰

[۱۴] GODARD (بجنسہ/شبیہ) ۰ ۷ ص ۱۳/۲ پر جس کا بیان ص ۲۱/۱ پر یوں ہے۔

[۱۵] جیکٹ مغل اسکول کی ہندوستانی تصاویر' آرنیہ بکس' لندن ۱۹۶۰ ص ۱۰ پلیٹوں کی فہرست میں غلطی سے اس کا نمبر ۵ (ص ۷) ہے اس کا بیہودہ ترجمہ جو درج ہوا ہے مغل فنون کی تاریخ کے کسی بھی معیار سے گرا ہوا ہے' شبیہ ابراہیم عادل خاں دکنی حاکم بیجاپور جس نے اپنے علم موسیقی کے ذریعہ ملک دکن کو شہرت بخشی اور اپنی رعایا کو ہدایت بخشی اور جس نے سنہ ۱۰۱۹ھ (سنہ ۱۶۱۱ء سنہ ۱۶۲۱ء) میں فرخ بیگ کو اپنے برابر جگہ دے کر اس کے کارنامہ کا صلہ اس اعزاز کی شکل میں دیا تحریر محمد حسین زریں قلم بندہ جہانگیر ۲۰ سر ولیم فاسٹر سرطامس رو کی سفارت ہندوستان میں نیا ایڈیشن آکسفورڈ ۱۹۲۶ ص ۸۹ اور ص ۱-۶ تک کے سامنے کی تصاویر پر جہانگیر کی تحریر کا نسخہ سنہ ۱۰۲۴ ہجری کے درمیان ... صاف نہیں ہیں۔

سہیل اختر

سر پٹکتے ہی رہے خواب ہواؤں کی طرح
غم مگر پھیل گیا دل پہ گھٹاؤں کی طرح

دشتِ غم میں جو کبھی تجھ کو پکارا میں نے
خامشی گونج اٹھی تیری صداؤں کی طرح

کیا خبر تھی کہ ترے قرب کے روشن لمحے
دل پہ جھپٹیں گے شب غم میں بلاؤں کی طرح

اس نئے دور میں ماضی کی روایات کہن
جسم انساں پہ ہیں بوسیدہ قباؤں کی طرح

حسرتیں شہرِ نگاراں میں لئے کاسۂ دل
ایک اک چہرے کو تکتی ہیں گداؤں کی طرح

ہم کسے زخم دکھائیں کہ یہاں لوگ سہیل
دیدہ و دل پہ مسلط ہیں خداؤں کی طرح

حباب ہاشمی

حدِ جنوں سے بھی آگے گئے ہیں دیوانے
ملے گی منزلِ مقصود کب خدا جانے

کئے ہیں تو نے منور دلوں کے کاشانے
ترے وجود سے آباد ہیں صنم خانے

جو تم نہ تھے تو بہاریں خزاں سے بدتر تھیں
تم آگئے تو چمن بن گئے، یہ ویرانے

ہر ایک دوست مجھے اجنبی نظر آیا
فریب مجھ کو کچھ ایسے دیئے ہیں دنیا نے

تمام عمر رہی یونہی چاک دامانی
چلے ہیں اہلِ خرد آج مجھ کو سمجھانے

شبِ فراق ہجومِ غم و الم کے طفیل
تمہاری یاد چلی آئی دل کو بہلانے

حباب اشکِ ندامت ہیں اُن کی آنکھوں میں
قبول کیجیے خلوص و وفا کے نذرانے

رونق دکنی سیمابی

ثمرہ میں زہر بھی رکھتے ہیں یہ شیر و شکر والے
یہاں ان میں کون اہلِ خیر اور ہیں کون شر والے

خرد بینی مآلِ خود شناسی سے عبارت ہے
ہیں بے بہرہ مگر اس بات سے علم و ہنر والے

گزر خوش آب سے پانی اتر جائے تو پتھر ہے
مگر پھر بھی انھیں سے کھیلتے ہیں سیم و زر والے

خودی اور بے خودی دو زاویئے ہیں خود شناسی کے
نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے وہ دل والے یہ سر والے

تن آسانی عمل کی راہ میں کانٹے بچھاتی ہے
فلک کو تک رہے ہیں بے بسی سے بال و پر والے

نظر کی بے سر و سامانیاں دیکھی نہ جائیں گی
نگاہیں چار آخر کیوں کریں ہم سے نظر والے

سرِ منزل ہے منزل در حقیقت دور ہے لیکن
گر پڑے راستے ہی میں ہو گئے ہیں یارانِ سفر والے

بس اک جینے کی خواہش ہے جیے جاتے ہیں ہم مر کے
حیاتِ خضر رکھتے ہیں حیاتِ مختصر والے

دیارِ غیر میں رونقؔ یہ فکرِ عافیت کیسی
بھلا ہم بے گھروں کا درد کیا سمجھیں یہ گھر والے

ریورنڈ ہتین ریحانی

نظر کچھ اور آئے زندگی کا رنگ عالم میں
اگر انسان ہو جائے شریکِ انسان کے غم میں

یہ کیا جبرِ مشیت ہے اٹھا کر پی نہیں سکتے
اگرچہ فاصلہ کچھ بھی نہیں ہے جام اور ہم میں

پہنچ کر محفلِ نا امیدی میں اک روز دم لیں گے
ترانے گائے جائیں گے ہمارے خیر مقدم میں

تمہارے مئے کشوں کے دامنِ تر سے لپٹ جائے
کہاں ہے تاب اتنی شعلۂ نارِ جہنم میں

بنا دیں گے گلستاں در گلستاں ہر ستارے کو
نہاں روحِ بہاراں ہے ہماری سعیِ پیہم میں

ہماری حسرتیں یوں تو بہت نکلیں مگر اب بھی
دل اپنا غم میں کچھ چھپا اور کچھ ہے چشمِ پرنم میں

ابھی تو اس نے آنسو [illegible] ابتدا کی ہے
نہ جانے اور کتنا حوصلہ ہے ابر

کبھی پھولوں کی صحبت میں ہنسے تھے ہم بھی
سزا اس کی ابھی تک پا رہے ہیں

ڈاکٹر سیّد اختر احمد

رتحت ہدایت فطرتِ انساں رواں ہوتی
ین زیر پا رشکِ نگارِ آسماں ہوتی

رادے سے ترے جاری ہے ابتک عالمِ امکاں
شیت میں نہ ہوتی گر تو یہ دنیا کہاں ہوتی

رے جلوؤں کی حیرت سے دھڑکتا دل جو رک جاتا
ہ مرگِ ناگہاں، میری حیاتِ جاوداں ہوتی

رے سوزِ دروں سے اُس کے شعلے سرد پڑ جاتے
جو بجلی بھی مجسّم ہو کے فرشِ آشیاں ہوتی

تنا دل کی آخر بن گئی خود فاصلہ ورنہ
کھنچتے، نہ ہیں گھٹتا نہ دوری درمیاں ہوتی

کھل جاتا، محبت جگمگا اُٹھتی !!
گونگا ہے اگر اس کو زباں ہوتی

گریزاں گر نہ رہتا آدمی، اختر
یہ، اس طرح کیوں درمیاں ہوتی

عزمی

حیدرآباد دکن

حیدرآباد مروت کی بہاروں کا چمن
خار بھی جس کے ہیں کلیوں کی طرح غنچہ دہن
حسنِ افکار کا احساس دماغوں کا وطن
مرکزِ دیدہ وراں ارضِ دکن ارض دکن
سانولی شام جنوں جسکی سحر بھاگ متی
ماہ و خورشید محبت سے ہر اک دل روشن
کوہساروں کی ہواؤں میں وہ راگوں کی بہار
بھیرویں رام کلی میگھ بسنت اور یمن
ارض تقدیس و فا شہر نگار ہستی
کوئے آتش نفساں میکدۂ شعر و سخن
تربیت گاہ ادب وہ کہ نہیں جسکی مثال
جسکا ہر خورد و کلاں کم سخن و شیریں سخن
کفر و ایمان کی تہذیب کا وہ سنگم ہے
جسکے دامن میں نہیں کوئی کسی کا دشمن
عافیت گاہ ہمیشہ سے رہا ان کیلئے !
علم و فن جب بھی ہوئے ہیں کہیں آوارہ وطن
یہ وہ بستی ہے جہاں رہتے ہیں انسان فقط
نہ رقابت نہ شکایت نہ حسد اور نہ جلن
تلخیٔ گردشِ ایام کا شکوہ نہ گلہ !!!
یہ وہ میخانہ ہے جسمیں ہیں سبھی رند مگن
کوئی فردوس زمیں پر ہے اگر اے عزمی
ایک میرا ہی وطن ہے جسے کہتے ہیں دکن

باقر منظور

کیا جاذبِ دل چہرۂ ایوانِ غزل ہے
محبوبِ نظر حسنِ گلستانِ غزل ہے
بجلی ہے محبت کی رواں اس کی رگوں میں
پُر نور بہت شمعِ شبستانِ غزل ہے
ہوتی ہے جہاں نشو و نما فکر سخن کی
گہوارۂ فطرت وہ دبستانِ غزل ہے
محفوظ ہے دامن میں فصاحت کا خزانہ
یہ حسنِ بلاغت بھی تو فیضانِ غزل ہے
پاکیزگیٔ فکر بھی تخئیل حسین بھی
ہر جذبۂ اُلفت تہہ دامانِ غزل ہے
اک نغمۂ دلکش ہے محبت کی فضا میں
تہذیب تکلم پہ بھی احسان غزل ہے
وہ حسن کی دیوی جسے کہتے ہیں محبت
وہ حسنِ غزل شانِ غزل جانِ غزل ہے
منظورِ نظر صنفِ سخن ہے یہی باقر
فطرت مری شرمندۂ احسانِ غزل ہے

رؤف خیر

اس ادا پہ تو مٹا جاتا ہے طالب کوئی
سُننے والا ہے کوئی اور مخاطب کوئی

آج تک بھی ہے جو تسکین انا سے قاصر
زندگی ہے کہ بھٹکتا ہوا راہب کوئی

ہنس رہا ہے مری پلکوں پہ جو یہ قطرۂ کرب
افقِ درد سے ٹوٹا نہ ہو ثاقب کوئی

یوں تجھے دیکھ رہا ہوں میں تھکی نظروں سے
جیسے شرمندہ ہو حالات سے تائب کوئی

مرنے والوں پہ تو بہتان تراشو لیکن
جینے والوں کو دو الزام مناسب کوئی

زندگی تو نے پلٹ کر نہیں دیکھا ورنہ
دور تک دیکھ رہا تھا تری جانب کوئی

غم جدا' فکر جدا' زیست کی اقدار جدا
خیر شاعر ہے مگر میر نہ غالب کوئی

زیبؔ غوری

شامِ غم جلوہ فشانی بھی تو ہو
کچھ جگر کا خون پانی بھی تو ہو

غم میں رفتہ رفتہ مستی آئے گی
کچھ دنوں یہ مے پرانی بھی تو ہو

کیا توجہ کا تری احسان اٹھائیں
اعتبارِ زندگانی بھی تو ہو

پست ہے طوفانِ غم کا حوصلہ
سر سے اونچا میرے پانی بھی تو ہو

کیجیے گا ان کے کیا رُودادِ غم
کیا کہوں، کوئی کہانی بھی تو ہو

اُن پہ کھلتا جا رہا ہے رازِ دل
بے زبانی، بے زبانی بھی تو ہو

دشمنِ صبر و قرارِ دل سہی
تم ہماری زندگانی بھی تو ہو

تنگ ہوں خود اپنے ہاتوں کس قدر
مجھ پہ میری مہربانی بھی تو ہو

کیا تقابل طبعِ جولاں سے مری
کوئی دریا میں روانی بھی تو ہو

کیا اٹھائے کوئی لطفِ انتظار
زیبؔ عمرِ جاودانی بھی تو ہو

کلونت سنگھ جانیؔ

چھلکی ہوئی تیری آنکھوں کا یہ جام جدھر ہو جاتا ہے
رندوں کی حقیقت کیا ہوگی میخانہ اُدھر ہو جاتا ہے

جب حد سے گذر جاتی ہے خلش اور ٹیس کی حد کو چھوتی ہے
دل شمع کا شعلہ ہو کہ نہ ہو پروانے کا پر ہو جاتا ہے

جب حسن کی آن پہ بن جائے تب عشق تلی پہ جاں لیکن
فرہاد کا دل ہو جاتا ہے منصور کا سر ہو جاتا ہے

تقلید میں رندوں کی پہنچا زاہد بھی تمہاری محفل میں
معلوم نہ تھا یوں چٹکی میں صحبت کا اثر ہو جاتا ہے

مانا کہ صبح کے دامن میں ہر چیز ہے لیکن اے جانی
ظلمت کی سیاہی سے خالی دامانِ سحر ہو جاتا ہے

عطا کلیانوی

رُباعیات

(۱)

اک عشق ہیں ٹپکا ہوا آنسو میں ہوں
خود آپ سے بھاگا ہوا آہو میں ہوں
اک چاہ میں ہاروت کو کرتا ہوں اسیر
زہرہ کا جگایا ہوا جادو میں ہوں

(۲)

میں اپنی خودی کو قید کر دیتا ہوں
ہر جلوہ گری کو قید کر دیتا ہوں
جب اپنا جنوں اُتارتا ہوں سر سے
شیشے میں پری کو قید کر دیتا ہوں

(۳)

یوں سامنے "عالم مثال" آجائے
جیسے دل میں کوئی خیال آجائے
اک ساز کو مضراب میں چھیڑ تو دوں
ڈرتا ہوں کہیں تم کو نہ حال آجائے

(۴)

جلوہ کوئی دیکھا ہے نظر سے پہلے
خورشید کو پایا ہے سحر سے پہلے
ہر چند کہ مجھ کو نہ ملی راہ گذر
منزل پہ میں پہنچا ہوں سفر سے پہلے

(۵)

اوہام کو الہام نہیں کہہ سکتے
ہر قول کو پیغام نہیں کہہ سکتے
میخانے میں ہے خون سے لبریز سبو
ہم بادۂ گلفام نہیں کہہ سکتے

(۶)

کب دل کو نگاہوں کا پیام آیا ہے
کس وقت تمہارا دورِ جام آیا ہے
جلوے تو ہیں سامنے مگر ہوش نہیں
اللہ مرے! عجب مقام آیا ہے

(۷)

ہیں عشق میں انوار خود آگاہی کے
ہیں فقر میں اسرار شہنشاہی کے
افلاک کی منزل سے جو ہیں دور بہت
اسباب ہیں پرواز میں کوتاہی کے

نقد و نظر

اُردو زبان کا مذہبی ورثہ

قیوم صادق احمد پوری۔ ملنے کا پتہ۔ علوی بکڈپو محمد علی روڈ بمبی ۳ و اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد۔ صفحات ۱۰۲ قیمت تین روپے۔

قیوم صادق صاحب نے اس سے پہلے اپنی ایک مرتبہ کتاب "اردو ادب میں تنقید کی اہمیت" پیش کی ہے۔ اس طرح ادبی دنیا ان سے ناواقف نہیں۔ پیش نظر کتاب "اردو زبان کا مذہبی ورثہ" ان کے ایک ایسے مطالعہ کا نتیجہ ہے جبکہ ان کو اس امر کا خیال ہوا کہ آخر اردو میں کن کن مذاہب کی تعلیمات ملتی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ۔ اگر اردو زبان صرف مسلمانوں کی ہوتی تو غیر مسلم خصوصًا ہندو اپنی مذہبی کتابیں اس کثرت سے اس میں کیوں شائع کرتے؛ ہندو عیسائی، سکھ، جین اور بہائی مذہب اور ہندوؤں کے متعدد اصلاحی فرقے مثلاً آریہ سماج، برہمو سماج، دیو سماج، کبیر پنتھ، رادھا سوامی مت۔ تھیوسوفیکل سوسائٹی وغیرہ ان سب کا اپنے مذہب واخلاق کی نہ صرف مستند اور چوٹی کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرکے شائع کرنا بلکہ سینکڑوں چھوٹی بڑی کتابوں کو تالیف کرکے اردو کے ذریعہ عوام تک پہنچانا اس حقیقت کا ناقابل انکار ثبوت ہے کہ یہ مشترک زبان ہندوستان کے بڑے حصے کی عام زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرح موجودہ ہرزہ سراؤں اور یاوہ گویوں کو جو اردو کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں مسکت جواب دیا ہے۔ کتاب کا آغاز اردو کی ابتدا سے کیا ہے اور اس کے بعد کے عنوانات میں مذہبی لہریں، صوفیانہ شاعری، مذہبی لٹریچر، قرآن مجید کے اُردو تراجم، غزل میں مذہبی خیالات، نعت اور مرثیہ شامل ہیں۔ آخری دو عنوانات نثری اسلوب اور غیر مسلموں کا حصہ قدرے موضوع سے ہٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن متن میں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کا تعلق مذہبی ادب سے رہا ہے۔ یہ جایزہ کسی صورت میں بھی مکمل نہیں کہلایا جاسکتا موضوع اس قدر وسیع ہے کہ دفتر کے دفتر سیاہ کئے جاسکتے ہیں لیکن فاضل مصنف نے صرف اشارے کئے ہیں اور ان کا مقصد بھی قاری کو موضوع کی طرف متوجہ کرنے سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا۔ تاہم اس مختصر سی کتاب میں بہت سی کارآمد باتیں بھی آگئی ہیں۔ اسلئے صادق صاحب کا یہ کام سراہے جانے کے لائق ہے۔

اقبال قلندر نہیں تھا

صائب عاصمی۔ ناشر تخلیق کار پوسٹ بکس نمبر ۲۰ لاہور سائز $\frac{1}{12}$ کراؤن صفحات ۲۲۰ قیمت ندارد

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں کئی علائم و اشارات استعمال کئے ہیں۔ انھیں میں ایک قلندر بھی ہے۔ اقبال کے قلندر اور مردِ مومن میں دراصل کوئی فرق نہیں۔ قلندر کو صائب عاصمی نے لغوی معنی میں استعمال کرکے یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ اقبال قلندر نہ تھے اور خواہ مخواہ لفظ قلندر استعمال کرکے شاعر نے ایسی مقدس شخصیت کی توہین کی۔ بات

جب علائم واشارات کی ہو تو یہ اعتراض منفی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اقبال نے جو درس دیا ہے اس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو قلندر کی ایک خاص تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے ابھرے گی بہ شرطیکہ ہم قبل از قبل کوئی معہود ذہنی نہ رکھتے ہوں۔

اسرار کائنات واشرف المخلوقات

ڈاکٹر اختر احمد۔ ناشر پالی اسٹڈی سرکل ۷۳۴-۴-۲۲ پرانی حویلی حیدرآباد۔ صفحات ۱۶۶ قیمت تین روپے ساٹھ پیسے۔

ڈاکٹر صاحب جہاں جسمانی امراض کے معالج ہیں وہیں وہ ذہنی انتشار کے علاج کے بھی ماہر ہیں۔ اسرار کائنات اور اشرف المخلوقات کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں موجودہ دور کے حالات میں جس میں عوام کی پریشان حالی کے اظہار کے بعد حکومتی، صنعتی، جوہری، تعلیمی اور مذہبی انقلابات سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرا باب نظام کائنات سے متعلق ہے جس میں نیچر، مادہ، کائنات میں اشیاء کا ربط باہم، وقت اور فاصلہ اور حقیقت کائنات اور انسانی تصورات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ مسائل پیچیدہ ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کے دلچسپ انداز بیان نے ان کو سلیس اور آسان بنا دیا ہے۔ تیسرے باب کا عنوان "کرہ ارض" ہے۔ اس میں اہم موضوع سماجی ناانصافیاں۔ اسباب حیات اور انسان اور ہماری دنیا ایک مہمان خانہ اور کارخانہ ہیں۔ ان میں فاضل مصنف نے بعض پتہ کی باتیں بتائی ہیں مثال کے طور پر ان دو چار جملوں کو پڑھیے۔

"اب مذہب کے بجائے سیاسی نظریات نے جگہ لے لی ہے۔ سیاسی گروہ بندیاں کم و بیش اتنی ہی تخریبی ہیں جیسے مذہبی گروہ بندیاں تھیں۔ اب بھی کمزور عوام کا پہلے ہی کی طرح استحصال کیا جا رہا ہے ...... پہلے کے حکمران اقتدار کے بھوکے تھے اور اب طاقتور گروہ دولت کا بھوکا ہو گیا ہے۔ پہلے عوام کی زبان پر پہرے بٹھائے جاتے تھے اب ان کی معیشت پر پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں ...... بیشتر سیاسی رہنما عوام کے ساتھ برائیوں کے خلاف آواز اٹھانے میں بڑا چڑھ کر حصہ لیتے ہیں"۔

اس طرح ڈاکٹر صاحب نے موجودہ دور کے سماجی نقائص اور حکومتی معائب پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ چوتھا باب "اشرف المخلوقات" ہے جس میں جسم، دماغ، ذہن انسانی، نیکی و بدی، ضمیر، روحانیت۔ بنی نوع انسان میں ذہن کی اہمیت اور حیات انسانی میں دین کی اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔ آخری باب کا عنوان "نظام حکومت" ہے جس میں جمہوریت کی تعریف اور اس کے اغراض و مقاصد اور طریق کار کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

"کتاب" باوجود اس کے کہ مختصر ہے لیکن اپنی جامعیت کے لحاظ سے مختلف نوعیتوں کے مضامین کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور چونکہ انداز بیان دل نشین ہے۔ قاری کہیں گرانی محسوس نہیں کرتا۔ ڈاکٹر صاحب نے جن موضوعات کو اپنایا ہے وہ آج ہر ایک عامی کے دل کی آواز ہیں اسلئے یقین ہے کہ کتاب کو مقبولیت عام حاصل ہوگی۔

محمد اکبر الدین صدیقی

(باقی صفحہ ۶۴ پر ملاحظہ ہو۔)

یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ جلد ۳۲ شمارہ ۱

جنوری ۱۹۶۹ء

ماہنامہ

سب رس

نگران

پروفیسر سید علی اکبر

(مجلسِ مشاورت)

ن۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ رمن راج سکسینہ
ڈاکٹر غلام عمر خاں۔ محمد منظور احمد۔

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم — منتظم

جمال الدین — وقار خلیل

سالانہ چھ روپے غیر ممالک سے دس روپے
ششماہی تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے

کے ہر پرچہ کیلئے ۵۷ پیسے کے ٹکٹ کا نام ضروری ہے۔ پرنٹر و پبلشر
اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر
اردو خیریت آباد حیدرآباد ۴ سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

سب رس کا یہ بتیسواں سال شروع ہو رہا ہے۔ اب تک اس نے جو خدمات انجام دی انھیں ملک کے اکثر ادیبوں اور معاصرین نے سراہا ہے لیکن ان کے خیالات کو ہم نے سب رس کے صفحات پر نہیں کیا محض اس لئے کہ ہم کام کئے جا رہے ہیں اور ادیبوں اور معاصرین نے ہمارے بارے ..... میں جو کہی ہمارا انعام ہے۔ سب رس بالالتزام سال بھر کے بارہ شمارے اپنے خریداروں کو دیتا آرہا ہے اور نامساعد کے باوجود اس نے کبھی اپنے خریداروں سے اشتہارات فراہم کرنے کی خواہش کی اور نہ وسیع پیمانہ پر توسیع اشاعت پروگرام بنایا۔ معاصرین کے اشتہارات شایع کرنے میں بھی کوتاہی نہ برتی۔ چنانچہ اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو اردو گھر فنڈ اور غالب صدی کے دو اشتہار اس شمارے میں شریک ہیں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ ہر اردو کو اس میں اپنا حصہ ادا کرنا ہے۔ ہمیں جو تحقیقی اور تنقیدی مضامین وصول ہو رہے ہیں۔ اس سے یہ انداز ہے کہ ہمارے نوجوان محققین کچھ سہل انگاری برت رہے ہیں اور جتنا زیادہ غور و فکر سے کام لینا چا نہیں لے رہے ہیں۔ یہ رفتار خود ان کیلئے مناسب نہیں رہے گی۔ تحقیق، وسعت نظر، اور دقت نظر چا مطالعہ کی گہرائی اور دور بینی ضروری ہے۔ مختلف مسایل کا پیدا ہو جانا الجھاؤ کا باعث ہوتا ہے۔ ان نبٹنا ہمارے محقق کا فریضہ ہے۔ ہمارے طلباء جو ایم اے کیلئے مقالے لکھتے ہیں وہ اس منزل سے دوا گذر جانا چاہتے ہیں۔ انھیں بردباری سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے موضوع پر جب تک کافی نہ کریں قلم نہ اٹھائیں ورنہ انھیں تنقید کا نشانہ بننا پڑے گا۔ حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ ز سے زیادہ لکھا جائے اور انھیں منظر عام پر لایا جائے۔ سب رس نے جہاں بلند پایہ ادیبوں کے شہ کا کئے وہاں نوجوان ادیبوں کی تخلیقات کو بھی پیش کیا اور آئندہ بھی وہ اپنی اسی پالیسی پر عمل پیرا نجیب اشرف ندوی نمبر کیلئے کرم فرماؤں نے مضامین لکھنے شروع کر دیئے بعضوں نے بھیج بھی دیئے توقع ہے کہ ہم جلد ہی یہ نمبر پیش کر دیں گے۔

محمد اکبر الدین صدیقی

ابو محمود

حاجی بغلول

اردو کے مزاحیہ کرداروں میں فسانۂ آزاد کے خوجی کے بعد اگر کوئی دلچسپ کردار ہے تو وہ حاجی بغلول ہے
اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی کا درمیانی زمانہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ میں چند زندہ دل شوخ طبع اہل قلم
جمع ہو گئے تھے۔ ان میں منشی سجاد حسین، پنڈت رتن ناتھ سرشار، چودھری محمد علی، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، حضرت
شوق اور ریاض خیرآبادی خاص شہرت کے مالک تھے۔ انھیں حضرات کی شوخ نگاری کی بدولت اخبار
اودھ پنچ کی بنیاد پڑی اور دیکھتے دیکھتے یہ اخبار ادبی حلقوں میں ہمہ گیر شہرت حاصل کر گیا۔ کوئی نصف صدی تک
اس کی دھوم دھام رہی۔ اسی اخبار میں رتن ناتھ سرشار کا مشہور مزاحیہ ناول فسانۂ آزاد قسط وار چھپتا رہا اور
اسی اخبار میں اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین کے قلم سے حاجی بغلول کے حالات بالاقساط چھپتے رہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مغربی علوم اور مغربی تہذیب انگریزوں کے سیاسی موقف کے ساتھ ساتھ ملک میں
پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ عام بیداری کے اس عبوری دور میں لکھنؤ ہی ایک ایسا شہر تھا جہاں پولو اور گھوڑدوڑ کے
ساتھ ساتھ بٹیر بازی، کنکوے بازی اور مرغ بازی کے چرچے باقی تھے۔ ایک طرف مغربی طرز کے ہوٹل اور بار قائم
ہو رہے تھے تو دوسری طرف بھانڈ و جلسے بھی چل رہے تھے۔ جانِ عالم پیا (واجد علی شاہ) کے دور کی رنگینی گو پھیکی
پڑ گئی تھی مگر مٹی نہ تھی۔ ہر چند امرا اور شرفا کے پاس پرانی شان و شوکت کے وہ سامان تو نہ رہے تھے جو دورِ امارت
میں انھیں حاصل تھے پھر بھی جھوٹی شان اور کھوکھلی امارت کے ٹھاٹھ باٹ ہنوز باقی تھے۔ میاں خوجی کا کردار بھی
اسی کھوکھلی تہذیب کا آئینہ دار ہے اور ہمارے حاجی بغلول بھی اسی کی عکاسی کرتے ہیں۔

تو لیجئے حاجی بغلول سے ملئے۔ بغلول آپ کا نام نہیں عرفیت ہے۔ اصلی نام تو جیسا کہ حضرت نے بقلم خود
تحریر فرمایا ہے "جناب حاجی محمد بلیغ العلی صاحب، قبلہ مکی مدنی ثم لکھنوی ولد جناب غفراں مآب قبلہ گاہی مولوی
…الٰہی صاحب غفر اللہ ذنوبہ و علی تلبیس مقامہ ہے۔"

آپ آفاقی واقع ہوئے ہیں۔ عمر کا بیشتر حصہ بمبئی میں جہازوں کی دلالی میں گزارا، نہ حج کیا نہ مکہ سے واسطہ
رہا تا ہم اپنے آپ کو حاجی، مکی، مدنی کہنے اور کہلوانے پہ ہمیشہ مصر۔ چنانچہ جہاں گشت بمبئی سے چھوٹے تو
… نکلے۔ من چلے ان کی انوکھی چال ڈھال اور نرالی وضع قطع سے اس درجہ محظوظ ہوئے کہ انھیں

پکڑ ہی لیا۔ چھوٹے بڑے ہر ایک کا سامان تفریح تھے۔ صورت اور ہئیت ہر لحاظ سے اس قابل تھے کہ روتا دیکھ کر ہنس پڑے۔ ہر محفل میں شمع محفل اور ہر بزم میں رونق بزم۔ یار لوگ ان کو ادبدا ادبدا کر چھیڑتے اور ان جی بھر کے جلی کٹی سنتے اور لطف اٹھاتے۔

حلیۂ مبارک ملاحظہ ہو' سر پر گنبد نما عمامہ' ریاض نے شاید اسی عمامے کی شان میں کہا تھا ؎

اپنے سر میرے گنہ کا بار رہنے دیجئے ‫ ‫ ‫ شیخ جی اچھی ہے یہ دستار رہنے دیجئے

لمبی عبا جس کے بند ہمیشہ کھلے رہتے۔ پہنتے کیا تھے جسم پر لٹکا لیتے تھے۔ پنڈلیوں تک جھولتا ہوا کرتہ پچکے ہوئے گال' چھدری داڑھی' چیاں سی دھنسی دھنسی آنکھیں جن میں سرمہ گھٹا ہوا' خیر سے ایک ٹانگ بھی لنگ۔ کرتے ہوئے چلتے تھے' ہاتھ میں چھڑی جسے آپ جریب زیتونی کے نام سے یاد فرماتے تھے یہ جریب زیتونی آپ کے سلاح خانے کا راس المال تھی۔ جب طیش میں آتے ہر کس و ناکس کو اسی کی دھمکی دیتے تھے۔

جریب زیتونی کیا تھی خوبی کی تدولی تھی۔ مزاج کا پارہ ہمیشہ چڑھا ہوا علمیت کا یہ حال کہ کریما مقیماں بچپن میں مارے باندھے پڑھ لیا تھا۔ اسکے علاوہ بقول مصنف آپ انگریزی بھی اس قدر جانتے تھے کہ اسکول ریڈر زیر مطالعہ رکھ سکتے تھے۔

طبیعت کے لحاظ سے سیلانی تھے۔ معاش کے ظاہری ذرائع تو نہ تھے لیکن متوسط الحال لوگوں کی طرح بآرام بسراوقات کر لیتے تھے۔ دو چار دوستوں کے ہاں دو ایک جوڑے کپڑے رکھ چھوڑتے جہاں کچھ دن ٹھیرے کپڑے بدلے۔ کمر بند کسی سے مانگ کر ڈال لیا۔ میلے کپڑے دھوبی کو دیئے اور دھلائی کے واسطے انھیں دوست کا سامنا کرا دیا اور جریب زیتونی ہاتھ میں لے نکل کھڑے ہوئے۔ بندر کی طرح۔ گھر کی فکر نہ ہانڈی چولھے کا غم۔ اس مجسم ظرافت اور مضحک صورت وسیرت کی وجہ سے ہر مجلس میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ کوئی پبلک جلسہ ہو۔ جلسہ شروع ہو سے پہلے ہی حضرت رونق افروز ہو جاتے اور صدر بن بیٹھنے پر اصرار بلکہ تکرار کرتے۔ لطف یہ کہ دنیا کا کوئی مسئلہ معاملہ پیش ہوا۔ آپ بلا وقفیت اور اجازت دضد بٹیر کی طرح بولنے کو موجود۔ ممکن نہ تھا کوئی تجویز پیش ہو اور آپ مخالفت یا کم سے کم ترمیم پیش نہ فرمائیں۔ محفل میں گانے والوں کو بیوقوف چیزوں کی فرمائش سے زچ کر دیتے۔ صبح کا وقت اور شام کلیاں کی فرمائش دوپہر رات اور بھیرویں پر اصرار۔

عمروں سے لونڈ پرے رہے۔ جنسی نا آسودگی نے بوالہوسی کا جامہ پہن لیا تھا۔ راگ رنگ، عیش و طرب محفلوں میں شریک ہوتے تو کئی کئی دن تک باسی کڑھی میں ابال آتا رہتا۔ ایک شب ایک جلسہ میں شریک ہوئے جس میں صاحب محفل کی آشنا بھی گانے آئی تھی۔ دونوں کو آشنایانہ چیتون' راز و نیاز کے اشعار پر گوشہ چشم کے اشارے' خندہ ہائے زیر لبی' بیتے کی بات پر کسی کی چشمک کسی کے رخساروں پر جھینپ سے خون کی جھلک پر جوش "

ں ایسا کچھ نظروں میں کھبا کہ بعد برخاست جب بچھے بستر استراحت پر تشریف لائے اور لحاف اوڑھکر
تو دل سے باتیں ہونے لگیں۔ آپ بھی ذرا سن لیں۔

"یار حاجی! تم نے اتنی عمر مفت ضائع کی۔ دنیا دیکھ ڈالی۔ سب پاپڑ بیلے مگر لذت عشق کا مزا نہ چکھا۔ کورے

ورے رہے۔

اگر آج ہماری معشوقہ ہوتی اور ہماری محبت غزل گا کہ ہماری طرف اس طرح بتاتی ہوتی تو ہم کو بھی یہی
ن حاصل ہوتا۔ ہم بھی دانوں کو تکھتی میں بٹھائے پھرتے۔ اندر سے گلوری آتی اور یاروں کو دکھا کر ہم خوش ہوتے
سرکس۔ عیش باغ کے میلوں میں ہمارے وعدے بھی پورے ہوتے۔ کوئی ہم سے روٹھتا ہم مناتے۔ ہم روتے
اور کوئی آنچل سے ہمارے آنسو پونچھتا۔ افسوس ہے کہ اتنی عمر مفت رائیگاں گئی۔ حیف ہے اس زندگی پر اور
ہے اس پرہیزگاری پر۔ ابھی اسی طرح بے مزہ سیٹھی زندگی سے کسی کے عشق میں موت آنا ہزار درجہ بہتر ہے۔
کچھ بھی ہو عاشق ہوا اور ضرور ہو خدا کی عنایت اور زمانے کی آزادی کے صدقے معشوقوں کی کمی نہیں صرف
کم جراتی نالائقی ہے۔ وہ تو میں توجہ نہیں کرتا ورنہ بہت کچھ اگر آج عورتیں یا ذرا سا اشارہ پائیں لونڈیاں
ڈنڈیاں میں ذرا سا اظہار تعشق کر دوں اگر عورت پانی نہ بھرنے لگے تو حاجی نام نہیں ... وغیرہ وغیرہ۔
ی رات حاجی صاحب نے اس قسم کے ہذیانات میں بسر کی۔ صبح سویرے منھ اندھیرے عمامہ زیب سر فرمایا۔
ب دیتوں ہاتھ میں لے مکان سے شتر بے مہار کی طرح چل کھڑے ہوئے۔ سارا دن شہر بھر کے صدقے ہوتے
تے۔ جس عورت پر نظر پڑی عاشق سے واسطے گھورنے لگے خیریت گذری کسی نے ٹھکائی نہ کر دی۔ آخر کار
ے کہ شام کو ناشاد۔ نامراد گھر پہنچے۔ مگر عشق کے بھوت نے رات کی نیند حرام کر دی۔ دوسرے دن پھر وہی چکر
ت نے سوچا کہ جب عشق کرنے چلے ہو تو یہ پیدل جوتیاں چٹخانا کیا۔ کوئی سواری ہونا چاہیئے جس پر آن بان سے
۔ ہو کر معشوق کی تلاش کی جائے۔ جس قدر تزک و احتشام سے جائینگے اسی قدر معشوق کے دل میں جگہ ہوگی
کیا نام کہ (یہ حضرت کا تکیہ کلام ہے اور جب حضرت جذبے میں آتے ہیں تو کیا نام کہ" کا یہ تیجہ خوب خوب
یں کھلاتا ہے) لیکن کیا نام کہ سواری کون ہونا چاہیئے۔ سب سے بہتر گھوڑا ہے۔ جا بجا چاہا ایڑ دی اور
ل سے گئے۔ کم خرچ بالا نشیں۔

بالفعل تلاش معشوق بر طاق رکھ کر گھوڑے کی تلاش شروع ہوئی ہے۔ اب لکھنؤ میں گھوڑے
ن ہو اگر اور دلال ایسا نہ تھا جس کے پاس حاجی بغلول نہ پہنچے ہوں اور اس سے کہا نہ ہو۔ کردیے دنوں
گھوڑے کا مول تول ہو رہا ہے۔ ... کی مہلت نہ ... نہیں ہے
... خرید فرمایا اور ... ڈالا اور اپنی ... سواری ... کر لیا

گھوڑے سے پہلے گھوڑے کا ساز و سامان کباڑیوں کی دوکانوں سے فراہم کر لیا۔ اب ذرا اس سامان کی
ملاحظہ ہو۔ ایک کرم خوردہ باگ ڈور، تین عدد دیمک چاٹی میخیں، ایک پھٹی رسان کا بوسیدہ تھیلہ بطور تو
کے، ایک گنجا برش، کھریرے کی جگہ ایک بالٹی جس کا سلسلہ خاندان ماں کی طرف سے چھلنی سے اور باپ
جانب سے فوارے سے ملتا تھا۔ یہ سب سامان نخاس سے بمشکل پیتنگی خرید لیا گیا۔ گھوڑا خوش خرید تو نہ مل
طے یہ پایا کہ نیلام سے چھڑایا جائے۔ چنانچہ تمام دوستوں کو آگاہ کیا گیا کہ کل مابدولت گھوڑا خریدنے نیلام
جاتے ہیں سب ساتھ چلو۔ سب سے وعدے لئے گئے اور دوسرے دن نکل کھڑے ہوئے نیلام گھر۔ وہاں
پہنچے تو کسی دوست کو نہ پایا۔ سخت جھلائے اور لگے ایک ایک کا نام لیکر پکارنے کہ گر کوئی ہو تو جواب دے۔ ا
نام کہ کہتے ہوئے صلواتیں سناتے۔ نیلام گھر میں لشتم پشتم گھس پڑے اور تُرت گھوڑوں کی دیکھ بھال ش
کر دی۔ ہر گھوڑے میں کیڑے نکالنے لگے۔ سب کے سامنے عیب گرانے لگے۔ نیلام گھر کے منیجر نے چپراسی کو حکم
کہ اس بڈھے کو نکال باہر کرو۔ یہ دلال معلوم ہوتا ہے۔ اس پر چراغ پا ہو گئے اور لگے کہنے ہم دلال ہیں
نام کہ بھلے آدمیوں کو پہنچانتا ہے؟ زبان سنبھال کر بات کرو ہم خریدار ہیں خریدار۔ جریب نیتوئی اُٹھتی ہی
کہ لوگوں نے ہاں ہاں کہکر روک لی۔ پکڑ دھکڑ کر کرسی پر لا بٹھایا اب لگے آپ ہر مال پر بولی بولنے۔ ہر مال پر بولی
آپ ہی کی ہوتی۔ خدا خدا کر کے گھوڑوں کی باری آئی اور اچھے اچھے سب گھوڑے کھٹ کھٹ چھوٹتے چلے گئے
حاجی بغلول پہلے ہی بولی کے بعد چپ سادھ لیتے۔ اب مریل ٹٹو، سڑیل خچر، چند بکریاں، دو تین خارشتی کتے باقی
حاجی کو اضطراب ہوا۔ ایک جانور دبلا پتلا جس کا مورث اعلیٰ سودا کا گھوڑا اور جس میں دجّال کا گدھا
ودیعت رکھا گیا تھا۔ آیا۔ حجت ختم کرنے کو یکبارگی دس روپے بولی لگا دی ایک بوڑھے قصاب نے
بارہ روپے لگائے۔ آپ نے پندرہ تک دام لگا دئے اور بولی ختم ہو گئی۔ گھوڑی کیا تھی۔ ایک تماشہ تھی۔

حاجی بغلول کو ایک چھوکرا بھی سائیسی کیلئے مل گیا۔ اسکا نام تھا حرفہ۔ ریوڑی پہ چھوکرا کیا تھا
گا مٹھو تھا۔ آفت کا پرکالہ تھا۔ حاجی صاحب کو اُس نے ناک چنے چبوا دئے۔ گھوڑی کی سائیسی کے ساتھ
ساتھ تلاش معشوق میں حاجی صاحب کو وہ وہ چل دئیے ہیں اور وہ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پلایا ہے کہ
میاں کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔

گھوڑی کیا آئی احباب کو چھیڑ نکالنے کا اچھا مشغلہ ہاتھ آگیا۔ کوئی گھوڑی کی نسل اور نسب
کرید کرید کر پوچھتا ہے۔ کوئی حاجی کی شہسواری کی جھوٹی تعریفوں کے پل باندھتا ہے اور کوئی فرضی معشوق
کی منہ زبانی ایسی کرکے حاجی کو اشتعال دیتا ہے۔ ابھی گرمی آئی بھی نہ تھی ابال آ گیا۔ طبیعت لہرا گئی
تذکرہ معشوق کی ٹھہری۔ کہنے لگے ارے بڑا غضب ہو گیا ہم بھول ہی گئے ورنہ حیدر آباد ...

اور مصروف تلاش ہو جاؤ۔ ایسا نرالا معشوق ہو کہ انتخاب زمانہ گھر پہنچتے ہی تیاری کا
دل دیا۔ حرفہ ریوڑی، گھوڑی کس کر فوراً لے ہی آئے اور حاجی صاحب لد بھی گئے۔ جس مقام پر
ں کی امید شناسائی کا اطمینان تھا اور اس عجلت میں جہاں جہاں خیال جا سکا سب جگہ پہنچے
ہ کے کمروں سے لیکر تنگ و تاریک گلیوں کے ٹوٹے پھوٹے مکانوں تک کا جائزہ لیا۔ دھوبنوں
ں والیوں، ساقنوں، تمبولنوں تک پر نظر انتخاب دوڑائی مگر کوئی نظر میں نہ سمائی۔ سوچا شہر کی
ں چھاننا فضول ہے۔ دیہات کا رخ کرنا چاہیئے۔ شاید آرزوئے دلی بر آئے اور کوئی معشوق ملجائے۔
حرفہ ریوڑی جلو میں حضرت گھوڑی پر سوار گاؤں گاؤں کا چکر لگانے لگے۔ اس آوارہ گردی میں
ے بڑے کٹھن مقام بھی آئے۔ خوب درگت بنی مگر تلاش جاری رہی۔ آخر کار ایک میواتن جو جھونپڑی
دروازے پر اپلیاں تھاپ رہی تھی کوئی چودہ برس کا سن اس کی اٹھتی جوانی گدرائے بدن، ہاتھ
ں کی تازگی۔ بدگمانی سے پاک شوخ و شنگ چتون کا ایسا قوی اثر پڑا کہ گھوڑی کی باگ رکی
پاؤں سے حس و حرکت رفوچکر ہوئی اور حاجی صاحب منہ کھول، دیدے پھاڑ سکتے کی حالت میں
ٹ کے مہتاب ہو گئے۔ جب ذرا ہوش میں آئے۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ آج جا کر محنت ٹھکانے لگی۔
تعشق کو گھونسلہ، نقد دل کو صندوقچہ ملا۔ اب کیا ہے پالا مار لیا۔ انشاء اللہ وہ وہ جوہر عشق
ے ہوں کہ لیلیٰ و مجنوں کا افسانہ داستان پارینہ ہو جائے۔

دنیا دیکھے کہ عشق بازی یوں ہوتی ہے۔ گاؤں والوں نے ایک اجنبی بوڑھے کھوسٹ کے جو یہ
دیکھے تو خوب مرمت کی۔ حرفہ ریوڑی غائب، گھوڑی اڑن چھو، اور حضرت زمین پر پڑے کراہ رہے
بہ ہزار خرابی گھر آئے۔ ہلدی چونا تھپوایا اور کئی دن تک نشۂ عشق ہرن رہا۔ اور پھر سارے شہر میں
کہ حاجی صاحب عشق فرما رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ سٹھیا گئے ہیں بڈھے بھی۔ کوئی کہتا ہے۔ گو تر میں پھول
غرض جتنے منہ اتنی باتیں یاروں کی بن آئی اور حاجی صاحب کے چھیڑنے کا ایک نیا بہانہ ہاتھ
ب حرفہ ریوڑی کو ملا کر حاجی صاحب کو یوں بیوقوف بنانے کی ٹھہری کہ عمل تسخیر پڑھوایا جائے۔
صاحب کھیل اٹھے۔ عامل، جوتشی، رمال، فال گو قسم کے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ آخر اسی گاؤں کی
ویران مسجد میں عمل تسخیر کی ٹھیری۔ حاجی بغلول راتوں رات وہاں پہنچائے گئے۔ میاں کئے گئے اور
[illegible] طور منتر پڑھوائے گئے۔ [illegible]
[illegible] جتن کر رکھا تھا۔ غرض حاجی [illegible] جب
حال معلوم ہوئی تو ایک [illegible]

ساتھ سینکڑوں صلواتیں سناتے ہیں۔ اب شرم کے مارے دوستوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ گھر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اسی عالم حزن و ملال میں اپنے آپ سے یوں گویا ہوتے ہیں "اے نیک بخت (محبوبہ) افسوس تم کو خبر نہیں کہ کوئی حاجی جان دیتا ہے یوں دم توڑتا ہے۔ آپ تو کھیتی باڑی میں جی بہلاتی یا گھر کے چکی چولہے میں پڑی ہوگی۔ (اے توبہ) مصروف ہوگی یا اپلیاں پیاری پیاری بنائی ہوگی مگر سوکھ کر یہاں عشق کی دھوپ میں ہم کنڈا ہوئے جاتے ہیں۔

ہائے میں آج کوّا ہوتا اور جہاں تم ہو وہاں بیٹھکر قاؤں قاؤں کی صدا سناتا تم ہنکالنے اُٹھتیں اور ہم تمہارے سر پہ آ بیٹھتے۔ ہائے تمنّا ہے کہ ہم تمہاری گائے بھینس ہوتے اور "کیا نام کہ" تم ہمارے گلے میں رسی باندھ کر چرانے لیجاتیں پٹھوں پہ تمہارے نازک ہاتھ پھرتے۔ تم دودھ دوہتیں اور ہم تم کو ہوتے "کیا نام کہ" اگر کہو تو بھی چلیں اب تو آپ کے عاشقوں میں ہوگئے۔ آج تک کبھی یہ چوٹ نہیں اٹھائی کا لکھا اب تو ہم دنیا میں تمہارے عاشق مشہور ہوگئے۔ سب پر بھید کھل گیا ؎

میرے دل کے مونڈھے پہ بیٹھو صنم تم   تنِ زار گھٹ کر کٹھیرا ہوا ہے

ہائے سینے میں الاؤ لگا ہوا ہے۔ بھُس کی آگ کی طرح اندر ہی اندر دل سلگ رہا ہے" اسی اثناء حاجی لغلول نے ایک غزل بھی لکھ ڈالی جسے مصنف نے لغلولہ کا نام دیا ہے لیجئے وہ لغلولہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے

لغلولہ

یاروں کو کیوں ہے واقعہ یہ کھیل ہوگیا   کیا امتحان عشق میں میں فیل ہوگیا
تن ہوگیا ہے سوکھ کے کانٹا ببول کا   اپنے تو حق میں عشق امر بیل ہوگیا
اسٹیشنِ عدم کو چلے ہم فراق میں   جانی تمہارا عشق ہمیں ریل ہوگیا
ملوا دے رب کسے کھیت بھی جو تینگے تو بینگے   کیا نام کہ خوشی سے اگر میل ہوگیا

دیوانی فوجداری سے جھگڑے ہیں عشق کے
لغلول کیا ڈریگا اگر جیل ہوگیا

(بہ شکریہ "ادب" حیدرآباد)

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

مرزا فرحت اللہ بیگ کا طنز و مزاح

طنز اور مزاح کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ ایکدوسرے کیلئے ناگزیر تو نہیں لیکن ایک اچھا فنکار ان کو ایکدوسرے کیلئے لازم قرار دیتا ہے طنز کامیاب نہیں ہو سکتا تا آنکہ وہ مزاح کا سہارا نہ لے اور مزاح میں بانکپن پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں طنز کے عناصر شامل نہ ہوں۔ مزاح اگر خالص ہو تو اس کی سرحدیں عموماً پھکڑ پن سے جا ملتی ہیں۔ اسی طرح طنز جس کی بنیاد ظرافت پر نہ ہو گالی گلوج یا دہقانیوں کی طرح منہ چڑانا ہوگا۔ نہ صرف مشرقی زبانوں کے ادب میں بعض مصنفین نے بلکہ چند ایک مغربی ادیبوں اور نقادوں مثلاً تھیکرے، میریڈتھ اور رینانس وغیرہ۔ نے صرف مزاح کی اہمیت تسلیم کی ہے وہ طنز کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ اس میں ناگواری کی کیفیت پائی جاتی ہے لیکن طنز و مزاح کا ایک دوسرے سے دامن بچانا ممکن نہیں وہ ایکدوسرے پر منحصر ہیں۔ طنز و مزاح کے قریبی ارتباط کا ذکر کرتے ہوئے ENGLISH SATIRE میں نارمن فرلانگ نے لکھا ہے۔

"ادبی طنز کیلئے دو عناصر ضروری ہیں ایک کسی مضحک یا کراہت آمیز چیز یا واقعہ پر تنقید اور دوسرے مزاح"

اردو ادب میں طنز و مزاح نگاروں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہم جن ادیبوں کو خالص طنز نگاروں میں شامل کرتے ہیں وہ اس قدر خالص نہیں۔ مزاح کی چاشنی بھی ان کے یہاں کم یا زیادہ وجود رکھتی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے فنکار اپنے تیکھے طنز اور طنز کی زہرناکی کیلئے شہرت رکھتے ہیں لیکن کیا ان کے ہاں طنز محض ہے؟ ان کا مزاح صرف تبسم زیرلب کی حیثیت رکھتا ہے۔ عالمانہ اور فلسفیانہ سطح پر — بعینہ پطرس، شوکت تھانوی اور رشید احمد صدیقی اپنے مزاح کیلئے شہرت رکھتے ہیں لیکن یہ بھی خالص مزاح نگار نہیں کیونکہ ان کا مزاح اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب وہ طنز کے تیر و نشتروں سے کام لیتے ہیں۔ کامیاب فنکاروں کے ہاں طنز و مزاح کا امتزاج اس خوبی و خوبصورتی سے ہوتا ہے کہ ان کے مابین حد فاصل قائم نہیں رہ سکتے۔ یہ امتزاج جس قدر بہتر ہوگا فنکار اسی قدر کامیاب!

مرزا فرحت اللہ بیگ کا شمار اُن ادیبوں میں ہوتا ہے جو اپنے مزاح کیلئے معروف ہونے کے باوصف ایک ممتاز طنز نگار بھی ہیں اُن کے ہاں کیفیت وکمیت کے لحاظ سے مزاح کو اہمیت حاصل ہے۔ ادب میں مزاح کئی طرح سے پیدا کیا جاتا ہے۔ واقعاتی مزاح' واقعات کی خاص ترتیب یا اُن کو مسخ کرکے' پطرس کے مضامین اس کی اچھی مثال ہیں۔ یہی واقعاتی مزاح کبھی چٹکلہ بازی اور لطیفہ گوئی کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ شفیق الرحمن اس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فقروں کی تراش خراش اور بذلہ سنجی کے ذریعہ بھی مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کا فن بذلہ سنجی (W(۲) کا فن ہے۔ اسلوب سے مزاح پیدا کرنا ان سب سے جدا ہے وہ جن کا مزاحیہ اسلوب ہوتا ہے نہ تو الفاظ اور جملوں کے درو بست سے مزاح پیدا کرتے ہیں اور نہ واقعات کو مسخ کرکے اُن کا مزاح اُن کی دلکش زبان' خوبصورت محاوروں اور روزمرہ میں ہوتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ ایک ایسے ہی فنکار ہیں جو اپنے مزاحیہ اسلوب کیلئے شہرت رکھتے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی ایک اہم تصنیف' نذیر احمد کی کہانی' کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی' ایک ایسی شخصیت کا مرقع ہے جو اپنی سنجیدگی' متانت اور عالمانہ وزن و وقار کیلئے ایک زمانہ میں شہرت رکھتی ہے ڈپٹی نذیر احمد کو طنز ومزاح سے کوئی خاص تعلق تو نہیں تھا لیکن مرزا فرحت اللہ بیگ کا مرقع پڑھنے کے بعد ڈپٹی نذیر احمد کی مزاح سے بھرپور شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ تبسم برلب ہی نہیں۔ قہقہہ بردوش بھی! یہ نذیر احمد کی شخصیت کا کمال نہیں' فرحت اللہ بیگ کے اسلوب کا بانکپن ہے" نذیر احمد کی کہانی. کئی وجہ سے امتیازی شان رکھتی ہے مثلاً یہ کہ یہ مرقع نگاری کا اچھوتا نمونہ ہے کہ اس میں کردار کی جیتی جاگتی تصویر پیش کردی گئی ہے۔ اس میں دہلی کی ٹھیٹ اور با محاورہ زبان ملتی ہے۔ لیکن اس کا مزاحیہ پہلو بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں فرحت اللہ بیگ اپنے شگفتہ اور متبسّم اسلوب سے کردار نگاری کرتے ہیں یہاں اُن کا اپنا انداز یہ ہی جدا ہے۔ یہ ٹکنک کامیاب طریقہ پر کسی اور مرقع نگار کے یہاں نہیں ملتی۔ شوکت تھانوی نے "شیش محل" میں مزاحیہ مرقع نگاری کی ہے لیکن اس میں انھوں نے نہ تو عالمانہ سطح کو برقرار رکھا گیا ہے اور نہ ہی مرقع نگاری کی دیگر خوبیاں "شیش محل" میں ملتی ہیں۔ فرحت اللہ بیگ شخصیت کو مسخ کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ واقعات کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں بلکہ اپنے اسلوب سے تحریر کو بہار بہ داماں بنادیتے ہیں عزیز احمد کا خیال ہے۔

> "اس مضمون میں مرزا صاحب کی تحریر اور کردار نگاری کی شوخی دراصل محبت کی شوخی ہے اور یہ اسلوب کی بے تکلفی کی وجہ سے ادب بن گئی ہے۔ زبردستی کی ظرافت نہیں بنی۔ اس مضمون کی ہئیت اور تکنک ادب اور حیات دونوں کے

اعتبار سے انوکھی اور غیر معمولی ہے۔ کہانی کا جتنا حصہ نذیر احمد کی زبانی ہے اس میں ظرافت کی نوعیت مختلف ہے کیونکہ وہ نذیر احمد کی ظرافت ہے اس ظرافت اور اپنی شوخی میں فرق قائم رکھنا فرحت اللہ بیگ کے مزاحیہ اسلوب کا بڑا کمال ہے[1]۔"

مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کا حلیہ، چال ڈھال، کردار و گفتار، کھانا پینا، بات چیت، نشست و برخاست، علم سے اُن کی وابستگی، اُن کے کاروبار، غرض اُن کی ہر ادا، ہر حرکت اور ہر معاملہ کو اتنی شگفتگی اور والہانہ پن کے ساتھ ضبط تحریر میں لایا ہے کہ ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ یہاں مزاح نذیر احمد کے حلیہ سے نہیں برستا بلکہ فرحت اللہ بیگ کے اسلوب سے مزاح جھلکتا ہے۔ جس کے باعث ڈپٹی صاحب کا حلیہ بھی مزاح پارہ بن جاتا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے مولوی نذیر احمد کی خامیوں کی پردہ پوشی نہیں کی ہے۔ بلکہ ایک دیانت دار مرقع نگار کی طرح اُن کی خامیوں کو ہمارے سامنے پیش کر کے اُن کی شخصیت کو حقیقی خد و خال میں اپنی حرکات و سکنات کے ساتھ لا کھڑا کر دیا ہے ایسے مواقع پر وہ اپنے مزاحیہ اسلوب سے کام کر جاتے ہیں۔ اُن کی خامیوں کو اپنے اسلوب کے غلاف میں یوں لپیٹتے ہیں کہ قارئین خامیوں سے زیادہ اس غلاف کے بیل بوٹوں کی صناعی میں محو ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسا ہی موقع ہے۔

"کوڑی کوڑی کا حساب دیکھتے۔ اعتراضوں کی بوچھاڑ سے پریشان کرتے اور کہتے جاتے "بھئی حساب جو جو بخشش سو سو" فقرے کے پہلے جزو سے تو بیچاروں کو روز واسطہ پڑتا لیکن دوسرے جزو کا دیکھنا کسی کو نصیب نہ ہوا[2]۔"

غلام یزدانی صاحب جو مرزا فرحت اللہ بیگ کے ادب سے زیادہ اُن کے مزاج سے واقف ہیں۔ اُن کے مزاج کے اس پہلو کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"فرحت کا آرٹ بھی لطیف ہجو گو CARICATURIST کا آرٹ تھا جو بغض اور دشمنی سے بالکل پاک تھا۔ البتہ کمزوریوں کو وہ ایک دلکش اور پسندیدہ انداز میں بیان کرنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے[3]۔"

"نذیر احمد کی کہانی . . ." میں ایسے اور چند واقعات ہیں جو اپنے طور پر سیدھے سادے اور سنجیدگی کے حامل

---

[1] یادگار فرحت صفحہ ۱۰۱ [2] نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی اور کچھ میری زبانی صفحہ ۴۲ [3] یادگار فرحت صفحہ ۱

ہونے کے باوجود محض مصنف کے شگفتہ اور متبسّم طرزِ بیان کے باعث دلنشین اور دلآویز نظر آتے ہیں۔ ہاں کہیں کہیں انھوں نے واقعات کا انتخاب ہی ایسا کیا ہے جو مزاح کے عناصر کے حامل ہیں یا واقعات کی ترتیب ہی اسی طرح کی گئی ہے کہ مزاح جھلکتا ہے۔ دیکھا جائے تو ایسے واقعات میں بھی مزاح کی چاشنی اُن کے اسلوب کی مرہونِ منت ہوتی ہے ایک اقتباس دیکھئے :-

"آخر میں (مرزا فرحت اللہ بیگ) گون لے کر گیا اور لاہور سے آکر واپس کر دی
جب مولوی صاحب نے گون پر قبضہ کر لیا اس وقت بہت خفا ہو گئے۔ کہنے لگے :
اب کے تو اگر میری کوٹھری میں گھسا تو اچھا نہ ہوگا۔ کل کو میرا کیش بکس اٹھا کر
لیجائے گا۔ خیر دانی (ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب) گون لیجاتا تو کچھ ہرج نہ تھا
کیونکہ واپسی کی تو اُمید رہتی مجھے کب اُمید تھی کہ آپ بزرگ واپس بھی کریں گے
وہ تو کہو میرا حلال مال تھا جو واپس آگیا" میں نے کہا "مولوی صاحب اگر پہلے
سے معلوم ہو جاتا کہ آپ کو گون کی واپسی کی توقع نہیں ہے تو آپ اس کی تمام عمر
شکل بھی نہ دیکھتے" ہنس کر کہنے لگے" شستے بعد از جنگ کی صورت ہے آئندہ
میں دینے میں احتیاط کروں گا اور تم واپسی میں احتیاط کرنا"۔[1]

فرحت اللہ بیگ اپنے مزاح کے اعتبار سے اُس گروہ میں شمار ہوتے ہیں جو مشرقیت کا دلدادہ ہے۔ وہ مشرقی اقدار سے پیار کرتے ہیں اور مشرقی تہذیب کے عاشق ہیں لیکن اُن کی ذہنیت کچھ ایسی شدید بھی نہیں۔ وہ بڑے لبرل اور کھلے دل و دماغ کے مالک ہیں۔ وہ مغرب کی اچھی چیزوں کو پسند بھی کرتے ہیں لیکن جہاں کہیں انھوں نے مغرب کی کورانہ تقلید پائی ہے اور ایسے مناظر اُن کے سامنے آئے ہیں کہ خود اہلِ مشرق، مشرقی اقدار کو مسخ کر رہے ہیں تو انھوں نے اس کو برداشت نہیں کیا۔ ہمارے سماج میں مغرب کی تقلید آج سے ۵۲ سال پہلے بھی عام تھی اور آج بھی وہی حالت ہے۔ ہم مغربی تہذیب کی جگمگاہٹ۔ اُس کی ظاہری شان اور اُس کے بھاوپر کچھ ایسے فریفتہ ہیں کہ اپنی تہذیب کی اخلاقی اقدار ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہیں۔ بلکہ اُن سے نفرت کی جانے لگی ہے۔ سب سے پہلے ایک ہندوستانی بھائی کا حال سنئے جن کو انگریزیت کا نیا نیا شوق چرایا تھا۔

"میں سمجھ گیا کہ آج ہمارے ہندوستانی بھائی کو انگریزیت کا نیا شوق چرایا ہے
کمرے سے بیوی نے لوٹا ساتھ کر دیا ہوگا۔ یہاں سوٹ پہن کر لوٹا ساتھ رکھتے

---

[1] نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی صفحہ

شرم آتی ہے اسی لئے اس کی ملکیت سے انکار کیا جا رہا ہے۔ گھڑی گھڑی اُن کا
ہاتھ مونچھوں پر جاتا اور خالی آتا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ مونچھیں پہلی دفعہ
منڈائی گئی ہیں۔ رہ رہ کر ٹائی درست کرتے، کوٹ اور واسکوٹ کی سلوٹیں نکالتے
یہ اس بات کی دلیل تھی کہ سوٹ پہننے کی عادت نہیں ہے۔ ہاتھ میں موٹی سی
انگریزی آداب مجلس کی کتاب تھی اس سے سمجھ لیجئے کہ عالم ہو کر یہ کہیں
عمل کرنے جا رہے ہیں۔ بکسوں کی زیادتی بتا رہی ہے کہ سفر کے عادی نہیں
اس لئے بے ضرورت سامان سمیٹ لائے ہیں۔ (مضمون: صاحب بہادر)

اسی طرح مغربی تہذیب نے ہماری سماجی زندگی کے تار و پود بھی بکھیر دیئے ہیں خوشگوار گھریلو زندگی کا جو تصور رہا ہے اُس پر ضرب پڑی ہے۔ یہی جدید تعلیم کی برکت ہے۔ اکبرالہ آبادی نے تو ازدواجی زندگی کے ایسے گوشوں پر خوب طنز کئے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کی نگاہ بھی سماجی زندگی کے ان گوشوں پر پڑی ہے جہاں انھوں نے محسوس کیا کہ مغربی زندگی سے ہمارے سماج کی جڑیں کھوکھلی ہوتی جا رہی ہیں تو وہ اپنے طنز و مزاح سے وار کرتے ہیں مغربیت نے کئی ہندوستانیوں کی ازدواجی زندگی کو کھائل سا کر دیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے نشتروں کا کمال دیکھے

سلیقہ کا یہ حال کہ بچوں کی مالک آیا، باورچی خانہ کی مالک ماما، سینے پرونے کے
ذمہ دار درزی درزی نہیں "ٹیلر ماسٹر"... شام ہوئی اور بیگم صاحبہ ہواخوری کو
نکلیں، صاحب ایک طرف گئے اور بیگم صاحبہ دوسری طرف گئیں۔ اب نہ اُن کو
اُن کی خبر اور نہ اُن کو اِن کی۔

یوں تو ہر فنکار کیلئے لیکن طنز و مزاح نگار کیلئے خصوصاً مشاہدہ کی وسعت اور بصیرت کی گہرائی اولین شرط ہے۔ یہ صحیح ہے "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر" لیکن مشاہدۂ حق بھی تو لازمی ہے فرحت اللہ بیگ کا مشاہدۂ حق بے حد وسیع ہے اُن کی نگاہ معاشرہ کے تقریباً ہر پہلو پر ہے۔ انھوں نے کسی خاص موضوع پر ہی خامہ فرسائی نہیں کی ہے۔ اُن کے یہاں ادبی، سماجی، تاریخی، سیاسی، قانونی، سوانحی اور خیالی غرض ہر موضوع مل جائیگا۔ یہ اُن کی طبیعت کی ہمہ گیری اور دلچسپیوں کی گوناگونی کا واضح ثبوت ہے۔ اُن کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ وہ مختلف واقعات کو ایک ہی رنگ میں پیش نہیں کرتے بلکہ جو واقعہ جس اسلوب کا متقاضی ہوتا ہے اُس کیلئے وہ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔

ہر اچھے طنز نگار کی طرح فرحت اللہ بیگ کے ہاں طنز و مزاح مقصد نہیں وسیلہ ہے۔ دراصل وہ معاشرہ پر طنز کرتے ہیں اس کے مضحک پہلوؤں کو اُجاگر اور اس کی سوئی ہوئی حسوں کو بیدار

طنز اُن کے ہاں مزاح کے خول میں ہوتا ہے۔ اُن کے طنز و مزاح کے اسلوب کی طرحداری یہ ہے کہ وہ چٹکیاں لیتے جاتے ہیں کچھ اس طرح سے کہ جس شخص کے چٹکیاں لی جاتی ہیں وہ بھی مسکرا دیتا ہے اور جیسے ہی مسکراہٹ ختم ہوتی ہے وہ اپنے محاسبہ پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی اچھے طنز و مزاح نگاروں کی پہچان ہے۔ یہاں دیکھئے اخبار کے مدیرین کا خاکہ کس سلیقہ اور شائستگی سے اڑاتے ہیں:—

"اُن کی ظاہری حالت پر نہ جانا یہ بڑے آدمی ہیں۔ سوتے میں بھی مضمون لکھ لیا کرتے ہیں۔ کیوں نہ ہو بڑی تقدیر والے آدمی ہیں۔ چار دفعہ جان بوجھ کر جیل جا چکے ہیں اور سرکاری روٹیاں کھا چکے ہیں۔ سچ ہے جس کو خدا رکھے اس کو کون چکھے"۔ (مضمون "ایڈیٹر صاحب کا کمرہ")

ان اقتباسات میں جہاں طنز کے نشتر ہیں مزاح کی چاشنی بھی کمیت و کیفیت کے لحاظ سے طنز و مزاح کا پلہ برابر سا ہے۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے۔ اُن کے ہاں مزاح کے مقابلہ میں طنز کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے۔ کسی فنکار کا رجحان جب طنز کی طرف زیادہ ہوتا ہے تو گویا اُس کی ذمہ داری افزوں ہو جاتی ہے کیونکہ مزاح جتنا زیادہ دامن بچایا جائیگا طنز نگار کو اتنا ہی زیادہ چوکس ہونے اور اپنے قلم پر قابو رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے JOHN M. BULLITT اس ضمن میں لکھتا ہے:—

"طنز میں مصنف اور قاری کے تعلقات زیادہ نازک اور حساس ہوتے ہیں کیونکہ طنز کی کامیابی کا انحصار اس پہ ہوتا ہے کہ مصنف کسی اخلاقی مسئلہ پہ قاری کو اپنا مرید بنائے رکھے اور وہ جس کی مذمت کرتا ہے قاری بھی اُس کی مذمت کرے۔ اس مقصد کے حصول اور اس تعلق کو برقرار رکھنے کیلئے طنز نگار کو نہ غیر تنقیدی رویہ اختیار کرنا چاہیئے اور نہ چراغ پا ہونے کی ضرورت ہے"۔[1]

فرحت اللہ بیگ کے جن مضامین میں طنز کے عناصر زیادہ ملتے ہیں وہ ایسے ہیں جن میں وہ کسی اخلاقی مسئلہ کو پیش کرتے ہیں ظاہر ہے تا آنکہ وہ اپنی ذمہ داری کا کما حقہٗ احساس نہ کریں قاری کو اپنا مرید نہیں بنا سکتے۔ ہمارے خوشحال گھرانوں کی اولاد جس بے راہ روی کی شکار ہے دیکھئے کس طرح سے وہ اس کو بے نقاب کرتے ہیں:—

"لا کلاس کا صداقت نامہ بھی مل گیا۔ اب کیا تھا والدین امتحانِ وکالت کی

---

1. ANATOMY OF SATIRE P 38

تیاری کیلئے سر ہو گئے۔ مگر میں بھی ایک ذاتِ شریف ہوں ایک بڑھیا اور بڈھے کو دھوکہ دینا کیا بڑی بات ہے۔ میں نے تقاضہ کیا کہ علیحدہ کمرہ مل جائے محنت کروں۔ بال بچوں کی گڑبڑ میں مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ چند روز اسی حیلے سے ٹال دیئے لیکن آخر تنگ آکے بڑی بی نے اپنے سونے کا کمرہ خالی کر دیا۔ اب میں دوسری چال چلا۔ دروازوں میں شیشے تھے اُن پر کاغذ چپکا دیا۔ لیمپ روشن کرکے آرام سے سات بجے سو جاتا اور صبح نو بجے اٹھتا۔ اگر کسی نے آواز دی اور آنکھ کھل گئی تو ڈانٹ دیا کہ خواہ مخواہ میری پڑھائی میں خلل ڈالا جاتا ہے۔ اگر آنکھ نہ کھلی اور صبح کو سونے کا الزام لگایا گیا تو کہدیا کہ میں پڑھتے وقت کبھی جواب نہ دوں گا۔ آئندہ کوئی مجھے دق نہ کرے۔"

رشید احمد صدیقی کے بقول طنز و ظرافت کی مثال سفلی عمل کی سی ہے اگر عمل پورا نہ ہو تو عامل خود ہی اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ طنز و مزاح کا فن نزاکت کا فن ہے ایک ماہر اور چابکدست فنکار کامیابی کے ساتھ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تا آنکہ وہ تہذیبی اقدار کا شعور نہ رکھتا ہو، ادبی روایات سے کما حقہٗ واقف نہ ہو۔ زبان و بیان پر اس کو عبور حاصل نہ ہو اور اُس نے اپنے عہد کے سماجی حالات کا تجزیاتی مطالعہ نہ کیا ہو۔ یوں کہنے کو ہم ادب میں طنز و مزاح کو ضمنی حیثیت دیتے ہیں۔ کھانے میں نمک جیسی[1]۔ لیکن غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کھانے میں نمک کی کمی ہو یا زیادتی اُس کے ذائقہ کو بگاڑ دیتی ہے اور یہ زیادتی ہدفِ ملامت بنتا ہے، وہی سفلی عمل والی بات کہ عمل پورا نہ ہو تو خود عامل شکار ہو جاتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ کا فن اُن عناصر سے ترکیب پایا ہے ایک کامیاب طنز و مزاح نگار کیلئے لازم ہیں تہذیبی اقدار کا رچاؤ۔ سماجی مطالعہ، ادبی روایات سے ہم آہنگی اور زبان و بیان پر قابو اُن کے فن کے عناصر اربعہ ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے اُن کو بس یہی لکھنا تھا۔ انداز بڑا ہی شائستہ اور شستہ اسلئے تیر نشانہ پر بیٹھتا ہے۔ پہلی نظر میں ہم طنز و مزاح کا احساس کرتے ہیں لیکن غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے برسرِ عام عریاں کر دیا ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے وہ کس طرح ڈاکٹروں کی "سرجری" کرتے ہیں: —

"ڈاکٹری کی جماعت میں شریک ہو گئے۔ بڑی نوابی سے وہاں پانچ برس گذارے امتحان میں بیٹھے پاس ہوئے اور سند مل گئی کہ آج سے اس شخص کو اختیار ہے کہ

---

[1] عربی کا مشہور مقولہ ہے: — الملح فی الکلام کالملح فی الطعام

جس کو چاہے زہر دے کر مار ڈالے جس پر چاہے چھری چلا دے، جس کو چاہے
عدم آباد پہنچا دے کسی قانون کی رو سے اُس کے مقابلہ میں ضرر شدید زہر خورانی
یا قتل عمد کا مقدمہ قائم نہ ہو سکے گا۔ (مضمون "عشق کی گولیاں")

زبان و بیان پر قابو فرحت اللہ بیگ کے طنز و مزاح کی ضمانت ہے کسی بھی ادیب کے اسلوب میں جان و جذبہ اسی طرح پیدا ہوتے ہیں کہ موضوع کی فکر انگیزی کے ساتھ وہ زبان و بیان پر کتنی قدرت رکھتا ہے۔ الفاظ محاوروں، روزمرہ، تشبیہات، تلمیحات، اصطلاحات اور ضرب الامثال کا استعمال وہ کتنی مہارت کے ساتھ کرتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ کو ڈپٹی نذیر احمد کی شاگردی کا شرف حاصل تھا اور وہ اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اردو سیکھی تھی وہ دلی کی ٹکسالی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اُن جیسا اہل زبان اردو ادیبوں میں کم اور طنز و مزاح نگاروں میں تو دو ایک ہی ملیں گے" نذیر احمد کی کہانی ..." پھول والوں کی سیر" دہلی کا یادگار مشاعرہ" یا مضامینِ فرحت" کے کسی بھی حصہ کے کسی بھی مضمون کا مطالعہ کیجئے فرحت اللہ بیگ کا اسلوب شوخی، شگفتگی، خوش مذاقی شادابی اور شائستہ مزاجی کی کیفیتوں سے مالامال نظر آئیگا۔ وہ ایک زندہ دل اور آزاد منش انسان تھے اُن کے مضامین میں زندہ دلی اور سرشاری کے جواہر موجود ہیں اُن کے اسلوب میں آبشار کی گھن گرج نہیں خاموش ندی کی روانی ملے گی۔

ایک اور وصف جو فرحت اللہ بیگ کے فن کو بلند مقام کرتا ہے وہ اُن کا ظریفانہ لہجہ ہے۔ "لب و لہجہ" کا مزاح اسلوب کے مزاح سے بھی زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے اس کیلئے فنکار کو بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ از حد لطیف اور انتہائی بلیغ ہوتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے مضامین کا لب و لہجہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ لب و لہجہ کی شاعری کی طرح لب و لہجہ کی نثر اُسی وقت ممکن ہے جب کہ فنکار زبان و بیان پر کامل قدرت رکھتا ہو۔ فرحت اللہ بیگ اس منصب کے حامل ہیں۔ ان کے موضوعات میں تنوع اور اُن کے طنز و مزاح میں خوشگوار عناصر پائے جاتے ہیں۔ اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں وہ اپنی آواز سے پہچانے جائیں گے اور اپنے موضوعات سے زیادہ اپنے اسلوب و لب و لہجہ کے باعث شہرتِ دوام کے مستحق رہیں گے۔

قاضی متین الدین

اورنگ آباد میں اُردو افسانہ نگاری

سرزمین اورنگ آباد کو صدیوں سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ اہمیت نہ صرف سیاسی، تہذیبی، علمی اور تاریخی نوعیت کی حامل ہے بلکہ ادب میں بھی اپنا ایک شاندار ماضی رکھتی ہے اسی سرزمین سے ولی، سراج، صفی اور وجد پیدا ہوئے اور اردو شاعری میں اپنا ایک منفرد و ممتاز مقام حاصل کیا۔ نہ صرف شاعری بلکہ ادب کی دیگر اصناف سخن پر بھی خاطر خواہ توجہ ہر زمانے میں دی گئی اور وقیع تخلیقات پیش کر کے داد تحسین حاصل کی گئی۔

اردو افسانہ نگاری کے فروغ کیلئے بھی یہ سرزمین ہمیشہ سازگار رہی ہے۔ افسانہ نگاری کے ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے گورنمنٹ کالج اورنگ آباد کے میگزین "نورس" کی خدمات کو کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم جب گورنمنٹ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل تھے اسی زمانے سے یہ میگزین نکل رہا ہے۔ 'نورس' بھی مرحوم ہی کا دیا ہوا نام ہے۔ اس میگزین میں کالج کے طلباء کی ادبی تخلیقات شائع ہوتی تھیں اور یہ سلسلہ کالج کے آغاز سے تاحال جاری ہے۔ اس طرح "نورس" نے اردو افسانہ کے ارتقاء میں بھی اپنا اہم حصہ ادا کیا ہے اور آج بھی ادا کرتا آرہا ہے۔

اردو افسانہ نگاری کے فروغ میں آزادیٔ ملک اور ۱۹۵۵ء کے درمیان ایک تعطل کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ ملک کی آزادی، تقسیم ملک اور بالخصوص ریاست حیدرآباد کے انڈین یونین میں انضمام کی وجہ سے تعطل کی کیفیت شدت سے برقرار رہی تھی۔ اس دور میں عام طور پر خوف و ہراس [illegible] کیفیت، ذہنی تفکرات کی وجہ سے نہ صرف ادبی جمود طاری تھا۔ بلکہ زندگی ہی میں ایک ٹھہراؤ اور [illegible] کی سی کیفیت تھی۔ ان حالات کا اثر اورنگ آباد کی ادبی سرگرمیوں پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر [illegible] سکا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ کیفیت دور ہوتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۵۵ء آگیا [illegible]

۲۰ فروری ۱۹۵۵ء اورنگ آباد کی ادبی تاریخ میں ایک [illegible] اہم [illegible] مولانا [illegible]

اورنگ آباد کے ادب دوستوں کی جدوجہد سے "مطلع ادب" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مطلع ادب کے قیام کے لیے بی سعید۔ رفعت نواز۔ الیاس فرحت اور بشر نواز کی کوششیں ہمیشہ یادگار رہینگی۔

"مطلع ادب" نے شاعری، تنقید اور افسانہ نگاری کے فروغ میں نہایت اہم حصہ ادا کیا۔ پابندی سے ماہانہ ادبی اجلاس منعقد ہوتے۔ جس میں کالج کے پروفیسر، طلبا، ادیب و شاعر اور باذوق حضرات شریک ہوتے تخلیقات پڑھی جاتیں۔ مباحثے ہوتے، تنقید ہوتی اور اس طرح فنکاروں کو نہ صرف ابھرنے کے مواقع حاصل ہوتے بلکہ ان کی ہمت افزائی بھی کی جاتی۔

اردو افسانہ نگاری کے ارتقاء میں "مطلع ادب" کی کوششیں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ جن افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات تنقید کے لیے پیش کیں انھیں یہاں کی صاف ستھری تنقید سے اپنی فنکارانہ صلاحیتیں ابھارنے کے زیادہ مواقع حاصل ہوئے اور اس طرح وہ ہند و پاک کے موقر ادبی رسائل میں شائع ہونے لگے اور ان کی شہرت و مقبولیت ہندوستان تک ہی محدود نہ رہی۔ ان افسانہ نگاروں میں الیاس فرحت، رفعت نواز، رشید انور اور محمود شکیل کے نام قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ سریندر کمار مہا۔ غوث ساجد، اقبال حفیظ، اثر فاروقی، رشید الدین اور یوسف حامد نے بھی اپنے وقت کی منتخب تخلیقات پیش کی ہیں۔

۱۹۶۱ء سے "مطلع ادب" کی سرگرمیوں میں بھی تعطل کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ تاہم مطلع ادب کے فنکار ادب کی خدمت میں سرگرم رہے اور ان کی تحریریں سے ہند و پاک رسائل متزین نظر آتے تھے۔ جوگندر پال کی اورنگ آباد میں آمد افسانوی ادب کی نشاۃ ثانیہ بن گئی۔ امنگیں پھر سے جوان ہو گئیں ادب کے جدید رجحانات کی بھرپور نمائندگی ہونے لگی اور اس شہر کے تاریخ ساز ذہن پھر سے اپنی جولانیاں دکھلانے لگے۔

۱۹۶۷ء میں "مطلع ادب" کی جانب سے اورنگ آباد کے فنکاروں کے منتخب افسانوں کا مجموعہ "جستجو" شائع ہوا۔ جوگندر پال، سرسوتی بھون کالج کے پرنسپل ہیں۔ کافی عرصہ تک جنوبی افریقہ میں قیام کرنے کے بعد ہندوستان لوٹے اور مستقل طور پر اورنگ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ اس طرح نہ صرف اورنگ آباد کی خوش نصیبی میں اضافہ ہوا بلکہ یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں جان پڑ گئی۔

جوگندر پال کا شمار ملک کے بہترین اور چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اردو افسانہ کو مالامال کرنے میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان کے افسانوں میں ہندوستانی اور جنوبی افریقہ کی تہذیبوں کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ جنوبی افریقہ میں وہ ہندوستانی سمجھے جاتے رہے اور جب وطن

نے تو ان کو خود وطن والے اجنبی سمجھتے رہے۔ یہ محرومی اور بے رخی ان کے افسانوں کا "درد" ہے۔

الیاس فرحت، اورنگ آباد کے افسانہ نگاروں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے ۳۰ سے
زائد افسانے ہندو پاک کے ادبی رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ وہ کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت چغتائی
سے زیادہ متاثر ہیں۔ معاشرے کی خرابیاں ان کے افسانوں کا موضوع بنتی ہیں۔ ان خرابیوں کے
ذمہ داروں پر وہ بھرپور طنز کرتے ہیں۔

رفعت نواز ہندو پاک کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کی خصوصیات جزئیات
نگاری، جذبات نگاری کی عکاسی اور بہترین کردار نگاری ہیں۔

ہندوستان میں نچلے اور متوسط طبقے کے مسائل پر پریم چند کے بعد سے خصوصی توجہ دی جانے لگی
پریم چند کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اس طبقے کے مسائل کو حسن، فنکارانہ انداز اور حقیقت کی آمیزش
کے ساتھ کامیابی سے پیش کیا۔ ان میں کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس
کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ رشید انور نے بھی اپنے افسانوں میں نچلے اور متوسط طبقے کی نمائندگی کی ہے۔
اب تک ان کی (۱۵) پندرہ سے زائد کہانیاں معیاری رسائل میں چھپ چکی ہیں اور ملک کے طول و
عرض سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔

رشید انور بے انتہا مخلص انسان ہیں۔ حساس دل رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں
میں انسانوں کے دکھ، معمولی معمولی باتیں اور ان کی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔
وہ بڑے خلوص کے ساتھ ان مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ رشید انور گہرا سماجی شعور رکھتے ہیں۔ ان کے
افسانے فن اور تکنیک، مواد اور ہیئت کے لحاظ سے مکمل ہوتے ہیں۔ ان کے کردار قاری کے ذہن پر
لافانی نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

محمود شکیل بھی اورنگ آباد کے بے انتہا کامیاب افسانہ نگار ہیں ان کے افسانوں کی شہرت
ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمود شکیل پاکستانی رسائل میں زیادہ چھپتے ہیں
ہندوستانی رسائل سے تقریباً بے نیاز ہیں۔ ان کے افسانوں کی زبان بے انتہا شیریں اور مرصع
ہے۔ مطالعہ کی وسعت کے باعث ان کی تخلیقات میں فنی پختگی کا احساس پایا جاتا ہے۔

رشید الدین نے ابتدا میں طنزیہ و مزاحیہ افسانے لکھے بعد میں ان کا رجحان مضمون نگاری
اہم کی جانب مائل ہو گیا۔ آج کل محکمۂ تعلقات عامہ حیدرآباد میں مترجم کے فرائض انجام
دیتے ہیں۔

(باقی صفحہ نمبر ۲۲ پر)

سید جعفر صادق

پیروڈی اور کنھیا لال کپور

لفظ "پیارا" یونانی لفظ ہے - جس کے معنی ذیلی یا جزوی کے ہیں۔ پیروڈی مرکب لفظ ہے "پیارا" اور "اوڈ" سے اس کی ترکیب ہوئی ہے۔ اوڈ کے معنی ہیں گیت - پیروڈی کے لفظی معنی گو گیت کی ذیلی چیز یا ذیلی نیت کے ہیں۔ مگر عرفِ عام میں یہ نقل یا اِمی ٹیٹنگ کے لیے استعمال ہے۔ اور نقل کے لیے ضروری ہے کہ پہلے کوئی چیز اصل کی صورت میں موجود ہو۔

کالنس ڈکشنری میں پیروڈی کے معنی یہ درج کئے گئے ہیں۔

"ایک نقل ہے کسی نظم یا گیت وغیرہ کی۔ جس کا اگرچہ طرز مماثل ہوتا ہے مگر موضوع مضحکہ خیز حد تک علحدہ یا اسے کم زور نقالی کہا جاسکتا ہے"۔ بعض لوگ اسے جواب نغمہ بھی کہتے ہیں۔ نغمہ یا گیت کا تذ نقالی کے لیے اس مرکب لفظ میں یوں آیا ہوگا کہ دنیا میں ہر قسم کے ادبی اظہار کے لیے ہر زبان میں شعر اولیت حاصل رہی تو ظاہر ہے کہ شعر کی نقالی بھی نثر سے پہلے ہوئی ہوگی۔ جب ایک لفظ نقالی کے لیے ہو گیا تو رفتہ رفتہ لغوی معنوں سے زیادہ وسیع مرادی معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

پیروڈی ظرافت یا مزاح کی وہ قسم ہے جس میں کسی خاص شاعر یا ادیب کی مشہور تصنیف یا تخ کا مذاق اڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ جس تخلیق کو بھی ہدف بنایا جارہا وہ اس قدر مشہور ہو کہ پیروڈی پڑھنے میں آدمی کا ذہن اصل کی طرف منتقل ہو جائے۔ ورنہ یہ کوشش مضحکہ انگیز ہو جاتی ہے۔ اور لطفِ سخن باقی نہیں رہتا۔ یہ ایک ایسی تصنیف ہے جو مزاحیہ انداز میں ا چیزوں پر کی جاتی ہے جنھیں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔

شاید یہ بات کسی حد تک سچ ہے کہ ہم نفسیاتی طور پر جسے عزیز تر سمجھتے ہیں اس کی خامیوں شدت سے محسوس کرتے ہیں اور جب تنقید کرتے ہیں تو دل آزاری کی بجائے دل خوش کن طریقے ان خامیوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لحاظ سے پیروڈی کو تنقید کی ایک لطیف قسم خیال کیا جاتا ہے مگر یہ تنقید سنجیدہ تنقید سے کہیں زیادہ اپنا کام کرتی ہے۔ گویا ہنسی ہنسی میں اصلاح کا کام بھی انجام اور بات نہ کہنے والے کو بُری معلوم ہوتی ہے۔ نہ سننے والے کو بُری لگتی ہے، مگر اس کے لیے اعلیٰ فن کا

زورت ہے۔[1]

ہنسنا ہر انسان کا فطری عضویاتی فعل ہے اور صحت کے لیے ضروری ہے۔ لیکن ہنسی کو با معنی بنانا مشکل ہے ں کیلئے ریاضت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہنسی کو جب طنز کے طور پر استعمال کیا جائے تو یہ ایسی تلوار ہے کہ اسے چوکنے پر وار کرنیوالا خود زخمی ہو جاتا ہے۔ اسی لیے رونا آسان ہے اور رُلانا بھی شاید آسان ہے ہنسنا ں — مگر یہ ہنسنا ہنسانا یاد رہے کہ با معنی اور ذہین ہنسنا ہے ورنہ ہنسنے کو تو بے سوچے سمجھے لوگ ہنستے ہیں۔ عورتیں تی ہیں۔ اکثر احمق ہنستے ہیں۔ اور کچھ لوگوں کی شکل بھی ایسی ہوتی ہے کہ وہ ہنستے نظر آتے ہیں۔

پیروڈی اصل میں خورد بین بھی ہے اور دور بین بھی۔ اس لیے وہ کمزوریاں جو عام آدمی کی نظر سے جل ہوتی ہیں قریب تر اور نمایاں تر نظر آتی ہیں۔ ایسی کمزوریوں کو بھانپنے کے لیے دور رس نظر اور شدید حساسیت ضرورت ہوتی ہے۔ ادیب اور شاعر کے لیے ضروری ہے کہ اس کی حساسیت عام آدمی سے زیادہ ہو۔ طنز نگار کیلئے س کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

پیروڈی لکھنے والا جس صنف ادب کی پیروڈی لکھ رہا ہو اس میں خود مہارت تامہ رکھتا ہو۔ مماثل لاحیت کے بغیر پیروڈی منہ چڑانا بن جاتی ہے۔ ہم سرکس میں اس عام اصول کا اطلاق کر سکتے ہیں کہ سرکس ہنسانے والا مسخرہ جن لوگوں کی نقل کرتا ہے ان ہی کے مماثل کرتبوں کو ماہرانہ طریقوں سے ادا کرنے کی اہلیت ہے۔ فرق یہ ہے کہ دوسرے کرتب کرنیوالے سنجیدگی کے ساتھ فن کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن مسخرہ ان کی نقل رنے کے لیے اس فن کے کسی مضحکہ خیز پہلو کو ابھار کر تا ہے۔

پیروڈی ایک طرح سے قلمی یا لفظی کارٹون ہے۔ جس طرح کارٹون کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہو بہو ہو یہ نہ ہوتے ہوئے بھی صاحب تصویر کی پوری شخصیت کی چھاپ رکھتا ہو کہ دیکھنے والا بغیر کسی شک و شبہ کے اصل خصیت کو پہچان لے۔

کارٹون اصل تصویر کی تحریف ہوتا ہے۔ اس میں چھوٹی چیزیں بہت چھوٹی اور بڑی چیزیں بہت یادہ بڑی نظر آتی ہیں۔ یہ گویا شخصیت یا شکل کی تحریف ہو گی۔ اسی طرح پیروڈی میں الفاظ و خیالات کی ایسی تحریف کی جاتی ہے کہ سنجیدہ ادب مزاحیہ بن جائے۔

پیروڈی کا طنز تلخ نہیں ہوتا۔ اس کا وار ہلکا ہوتا ہے۔ اچٹتی چوٹ پہنچانے والا چرکہ نہیں چھوڑتا۔ عام قاری جن چیزوں کی خوبیوں کا معترف ہے اور اتنا ہے کہ خامیوں کی طرف انگلی نہیں اٹھاتی

---

[1] چند خیالات ظفر احمد صدیقی کے مضمون اردو ادب میں پیروڈی اور ڈاکٹر اعجاز حسین کی کتاب نئے ادبی رجحانات میں پیروڈی سے اخذ کئے ہیں۔

وہ پیروڈی میں اصل چیز کا بے تکا پن محسوس کر لیتا ہے۔

پیروڈی کا مسلک تفریحی ہونا ضروری ہے۔ کبھی تفریح کا مقصد اصلاح و تعمیر ہوتا ہے اور کبھی تخریب کبھی کبھی تعمیر و تخریب کا پہلو ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ پیروڈی اصل میں ایک سٹاک یعنی جھٹکا ہے۔ جو اندھا دھند کسی راستے پر بڑھے چلے جانیوالے کو اچانک خبردار کرتا ہے کہ راستہ بے خطر نہیں ہے۔

ہر ادب میں بڑے بڑے مشہور لکھنے والوں کی پیروڈیاں لکھی گئی ہیں۔ اردو میں غالب، حالی، شبلی، میرامن، اور اقبال کی پیروڈیاں لکھی جا چکی ہیں، حال کے زمانے میں فیض اور مخدوم پر ہاتھ صاف کیا جا چکا ہے۔ اشعار ہی کی نہیں، نثر کی بھی پیروڈی ہوتی ہے۔

مولانا آزاد کی غبار خاطر کی بہت ہی عمدہ پیروڈی شوکت تھانوی نے "یار شاطر" کے نام سے لکھی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ پیروڈی اتنی ہی مشہور ہو جائے کہ جتنی اصل تخلیق ہے۔ یہ تو پیروڈی کار پر منحصر ہے کہ اس کا جوہر زندہ رہنے کے قابل ہو۔ زمانے کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ کچھ ادیب دس بیس سال چلتے ہیں اور کچھ پچاس سال۔ ایک صدی شہرت کی گزار لینا کم ادیبوں کو نصیب ہوتا ہے۔ صدیوں کو اپنی شہرت سے ہرا دینا ایک آدھ کا حصہ ہے اس لیے پیروڈی کار وہی زیرک و ذہین ہے جو ایسے شاعروں اور ادیبوں کی پیروڈی لکھے جو لافانی ہیں ورنہ اصل کے ساتھ نقل بھی زمانے کی گرد میں چھپ جاتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی نقال خود پائے کا ہوتا ہے۔ کہ اس کے ساتھ اصل کی شہرت برقرار رہتی ہے۔ اردو ادب میں ایک ایسی مثال موجود ہے انشاؔ نے جو شعر مصحفیؔ کو چڑانے کی خاطر لکھے وہ آج تک پر لطف اور زندہ ہیں اور ان کے ساتھ مصحفیؔ کے شعر بھی۔ جدید دور میں مجید لاہوری، شاہد صدیقی، شفیق الرحمان، غلام احمد فرقت کاکوروی، شوکت تھانوی، کیفی اعظمی، راجہ مہدی علی خاں مرحوم، کنھیا لال کپور، احمد جمال پاشا، سلیمان خطیب، طغل فرغانی بے حد عمدہ پیروڈی نگار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔

پیروڈی کا مقصد کبھی لفظی تحریف سے حاصل کیا جاتا ہے۔ کبھی طرز کا چربہ اتار کر اور کبھی کبھی موضوع کا مذاق اڑا کر۔

حقایق بالا کی روشنی میں کنھیا لعل کپور کی پیروڈی نگاری پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ہمیں ایک عمدہ اور معیاری پیروڈی نگار نظر آتے ہیں۔ ان کی اس صلاحیت کا اعتراف اردو طنز و مزاح کے تقریباً تمام تنقید نگاروں نے کیا ہے۔ انھیں اردو ادب کی محفل میں داخلے کے ساتھ ہی فوری عظمت کی سند عطا ہوئی۔ یہ ساری شہرت ان کی ایک پیروڈی ہی کی بدولت ہے۔

"غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں" سچ پوچھیے تو ان کے اس مضمون کو جتنی شہرت حاصل ہوئی اُن کا

نگارشات کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس کا اعتراف انھوں نے خود بھی کیا ہے۔

۱۹۴۲ء میں انھوں نے ایک چونکا دینے والا مضمون "غالب ترقی پسندوں کی مجلس میں" لکھا اور دکی ساری ادبی دنیا میں مشہور ہو گئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ بائرن کی طرح ایک صبح اٹھے اور انھوں نے کو مشہور پایا۔ لیکن یہ ٹھیک ہے کہ انھیں مشہور ہونے کے لئے شدید انتظار نہیں کرنا پڑا۔ یہ شہرت ان کے بں نہ ہر ثابت ہوئی۔ کیونکہ بہت جلد انھوں نے محنت سے لکھنا ترک کر دیا۔ ہوسکتا ہے شریڈن اپنی ۔ ایک تقریر کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھیں بھی ایک اچھے مضمون کے مصنف کی حیثیت سے دنیا رکھے گی۔[۱]

اس مضمون سے اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ کپور نہ صرف ایک اچھے نثر نگار ہیں بلکہ بے پناہ صلاحیت ئی بھی رکھتے ہیں۔ ان کی اس پیروڈی کاری پر مختلف تنقید نگاروں نے یوں رائے ظاہر کی ہے۔

احتشام حسین نے لکھا کہ میں نے پہلے پہل جب کنھیا لال کپور کا فیچر "غالب جدید شعرا کی ایک میں" ادبی دنیا لاہور میں دیکھا تو مجھ پہ عجیب قسم کا ملا جلا سا اثر ہوا۔ یہ مضمون ایک آدھ مہینے پہلے ں یا کسی اور رسالہ میں شائع ہو چکا تھا۔ لیکن میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ اس سے پہلے کپور کا کوئی بھی مضمون پڑھنے کا خیال مجھے نہیں آیا۔ اس وقت بھی اگرچہ جدید ادب کی بعض امیاں پیش نگاہ تھیں لیکن ان کی پیروڈی یا تنقید اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ یہ احساس ہوا شاید کپور نے جدید شاعری کا محض مذاق اڑانے کے لیے یہ فیچر لکھا ہے۔ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ اسوقت جتنے جدید شعرا تھے وہ سب کے سب ہم خیال اور ہم آواز نہیں تھے۔ اور اس مضمون میں صرف ایک نقطہ نظر کے شعرا پر طنز نہیں تھا۔ اس لیے جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ لکھنے والا نی طنز نگار ہے۔ اور اس کا مقصد کسی خاص قسم کے جدید شعراء کا مذاق اڑانا نہیں ہے موضوع اور یت میں جو بے راہ روی جگہ پا رہی ہے اس کی طرف متوجہ کرنا اور جدید ادب کا رشتہ کلاسکی دب سے جوڑے رکھنے کا احساس دلانا ہے۔[۲]

غلام احمد فرقت کاکوروی فرماتے ہیں:۔۔۔

"غالب جدید شعراء کی محفل میں" والے مضمون میں انھوں نے پروڈیز دل سے لکھی ہیں اور مکالمے غ سے لکھے ہیں۔ اس لیے اس مضمون میں ان کی پروڈیز جو دل سے لکھی ہوئی ہیں۔ ایک بھرپور طنز کا

۱۔ اپنی یاد میں" کنھیا لال کپور۔ ۲۔ کتاب "یا کے" احتشام حسین اودھ پنچ۔ کنھیا لال کپور نمبر

لطف دیتی ہیں۔ مگر ان کالموں کا تعلق چونکہ دل سے نہیں ہے اس لئے وہ شوخی سے عاری ہیں[1]۔

محمد داؤد رہبر نے فرقت کاکوروی اور کنھیالال کپور کی پیروڈی نگاری کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا کہ کنھیالال کپور کی طبیعت فرقت سے زیادہ طرار ہے۔ ان کی تحریفات اسلوبی تحریفیں ہیں، لیکن وہ ہر ہر شاعر کے خواص کو الگ الگ طور پر مکملاً نہیں دکھا سکے[2]۔

احمد جمال پاشا نے ان کی تحریف نگاری کے سلسلے میں (میرے نام ایک خط میں) تحریر فرمایا کہ کپور اچھی پیروڈی نگار ہیں کم از کم ان کی دو پیروڈیاں "غالب ترقی پسند شعراء کی ایک مجلس میں" اور "انارکلی" اردو مزاحیہ ادب میں اضافہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ مگر ان کی بیشتر پیروڈیاں برائے تفنن طبع لکھی گئی ہیں۔ بہرحال ان کا اصل میدان نہیں پیروڈی میں جو قدرت شفیق الرحمان کو ہے یا مداوا اور نارسا میں فرقت کاکوروی جس حد تک کامیاب ہیں وہ کامیابی ان کے حصے میں نہیں آئی۔ ان کا اصل میدان مضمون نگاری ہے اس کے باوجود انھیں اصل شہرت پیروڈی ہی سے حاصل ہوئی (غالب والی پیروڈی) اس کو اتفاق بھی کہا جا سکتا ہے مگر ان کا اصل میدان قرار نہیں دیا جا سکتا[3]۔

کپور نے اپنے زمانے کے چند مشہور شاعروں کی پیروڈیاں لکھی ہیں۔ جن میں آج کچھ پردۂ گمنامی میں چلی گئی ہیں مگر کپور کی پیروڈی کی نسبت سے زندہ ہیں جیسے :- اندرجیت شرما۔ کا نام بکرماجیت ورما۔ تصدق حسین خالد کا، قربان حسین حالص۔ قیوم نظر کا، عبدالحی نگاہ۔ ن۔م راشد کا م ن ارشد۔ میراجی کا ہیراجی۔ فیض احمد فیض کا "غیض احمد غیض"۔ راجہ مہدی علی خاں۔ راجہ عہد علی خاں۔

کپور نے حسب ذیل مضامین میں مختلف جدید شاعروں کی پیروڈیاں لکھی ہیں۔

(۱) حالی ترقی پسند ادیبوں کی محفل میں۔

(۲) سخن فہم۔

(۳) غالب جدید شعراء کی ایک مجلس میں۔

(۴) چینی شاعری (اس مضمون میں چینی شاعری کی پیروڈی کی گئی ہے۔ چینی شاعری سے واقفیت رکھنے والے ہی یہ تصفیہ کر سکتے ہیں کہ کپور اس مخصوص میدان میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں۔ قیاس غالب ہے کہ خود کپور بھی راست طور پر چینی شاعری سے واقف نہیں ہیں۔ ترجمہ پڑھ کر اس قسم کی نگارش پیش کر

---

[1] طنز و مزاح فرقت کاکوروی۔ کنھیالال کپور۔ [2] محمد داؤد رہبر "اردو میں پیروڈی" ادبی دنیا لاہور۔

[3] راقم الحروف کے نام احمد جمال پاشا کا خط۔

ان ہی کا حق ہے۔

ان سب میں فیض کی مشہور نظم تنہائی کی پیروڈی بے مثال سمجھی جاتی ہے۔ جو غالب ترقی پسند شعراء کی ایک محفل میں شامل ہے۔

فیض احمد فیض

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں۔
راہ رو ہو گا کہیں اور چلا جائے گا۔
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار۔
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ۔
سو گئیں۔ راستہ تھک تھک کے ہر اک راہ گزر۔
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ۔
گل کرو شمعیں بڑھا دو مئے و مینا و ایاغ۔
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔

ب کپور کی پیروڈی دیکھئے:-

لگائی

فون پھر آیا دلِ زار نہیں فون نہیں۔
سائیکل ہو گا کہیں اور چلا جائے گا۔
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار۔
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ۔
تھک گیا رات کو چلّا کے ہر اک چوکیدار۔
گل کرو۔ دامنِ افسردہ کے بوسیدہ چراغ۔
یاد آتا ہے مجھے سرمۂ دنبالہ دار۔
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔

---

۱ غالب ترقی پسند شعرا کی ایک محفل میں۔

پیروڈی کا یہ بہترین نمونہ ہے۔ جس میں اصل شاعر کے فن و تخیل کا پورا جائزہ لے کر پیروڈی نگار نے یہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ بغیر تشبیہ و استعارے کا سہارا لئے ہوئے طرز بیان ہلکے پھلکے مضامین میں کیسے صرف کیا جا سکتا ہے۔ یہاں فیض کا مذاق اڑانا کیوڑ کا مقصد نہیں۔ بلکہ اس کے فن کو اپنے طور پر نمایاں کرنے کا خیال ہے۔ تاکہ قدردانوں کا دائرہ اور وسیع ہو جائے۔ اصل نظم سے بعض الفاظ یا مصرعے لینے کا منشا نقالی نہیں ہے' بلکہ اس کو پھر سے۔ ایک دائرے میں متعارف کرنے کا خیال ہے۔ اور جذباتی طور پر فیض کو خراج تحسین ادا کرنا ہے[1]

اس کے علاوہ مجاز کی مشہور نظم آوارہ کی پیروڈی کیوڑ اس طرح کرتے ہیں:-

آوارہ کے دو بند

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں　　تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں　　اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں　　اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں　　اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

پیروڈی

جی میں آتا ہے کہ اڑ کر آج ساغر توڑ دوں　　مار کر پتھر پہ خنجر اپنا خنجر توڑ دوں
اپنا سر پھوڑوں نہ پھوڑوں غیر کا سر توڑ دوں　　وائے حسرت کیا کروں اف ہائے حسرت کیا کروں
جی میں یہ آتا ہے اٹھ کر آشیاں کو پھونک دوں　　پھونک دوں یہ چاند تارے پھونک دوں
پھونک دوں کشتی کو اپنے بادباں کو پھونک دوں　　مہرباں کو پھونک دوں نامہرباں کو پھونک دوں
وائے حسرت کیا کروں اف ہائے حسرت کیا کروں[2]

ن م راشد کی نظمیں اپنے دور میں بہت مشہور ہوئی تھیں۔ جن میں شاعر نے اسوقت کی

۱۔ نئے ادبی رجحانات ڈاکٹر اعجاز حسین۔　　۲۔ حالی ترقی پسندوں کی محفل میں۔ کیوڑ

سیاست کے بارے میں ہندوستانی نفسیات کا تجزیہ کیا تھا۔ مگر انتقام کا جو طریقہ ان میں جو ظاہر کیا گیا تھا۔ اس کے مضحکہ خیز پہلو کو کپور نے اپنے پیروڈی میں یوں ابھارا ہے۔ مشہور ترقی پسند نقاد عزیز احمد نے بھی اس پیروڈی کے ایک حصے کا حوالہ دیا ہے[1]۔

کپور کے م ن ارشد فرماتے ہیں ــــــ

جس کے آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے۔
جس طرح دور کوئی کسی دشت کی پہنائی میں۔
رقص کرتا ہوا کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں۔
کرم شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں۔
ایسی تشبیہ کی لذت سے مگر دور ہے تو۔
تو کہ اک اجنبی انجان کی عورت ہے جسے۔
رقص کرنے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔
اپنے بلے کا دخدا کے مانند۔
دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں۔
خودکشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے۔
پھر پکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اور چپ چاپ دریچے سے پھر جھانکنا
آ میری جان میرے پاس انگیٹھی کے قریب
تاکہ میں چوم ہی لوں عارض گلفام ترا
اور ارباب وطن کو یہ اشارہ کر دوں
اسطرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شب عیش گزر جانے پر
بہر جمع درم و دام نکل جاتا ہے۔
ایک بوڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس۔

---

1. ترقی پسند ادب عزیز احمد

چھوڑ کر بستر سنجاب وسمور[1]

مندرجہ بالا آزاد نظم ن م راشد کی دو نظموں "دریچے کے قریب" اور "انتقام" کی ایک ہی پیروڈی ہے۔ جس طرح انھوں نے ان دو نظموں کے مرکزی خیال کی ایک پیروڈی کی ہے قابل توجہ ہے۔

ترقی پسند غالب والے مضمون میں انھوں نے غالب کی پیروڈی غالب کے چند مشہور اشعار (اولیٰ اور ثانی کی ترتیب کو بگاڑ کر) نظم کے انداز میں دیکھ کر کی ہے ۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار　　　کس کی حاجت روا کرے کوئی
جان تم پر نثار کرتا ہوں　　　شرم تم کو مگر نہیں آتی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کچھ　　　ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
موت کا ایک دن معین ہے　　　اور درویش کی صدا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب　　　کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی۔[1]

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی　　　حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
.... ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے　　　وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے　　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی[2]

میراجی ترقی پسندوں کے ہم عصر ہوتے ہوئے بھی ترقی پسند تحریک کی بنیادی شرائط سے اپنی شخصیت کو علیحدہ رکھتے تھے۔ ان کے ہاں ابہام ملتا ہے جو آج جدیدیت کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ اس ابہام کا مذاق اڑا کر کیور نے ایسی شاعری کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ جو ابہام سے گزر کر بے معنی ہونے کی منزل تک جا پہنچی ہے۔ کیور نے میراجی کا نام مبہم الہ آبادی رکھ کر گویا ان کی پوری شاعرانہ شخصیت پہ تبصرہ کیا ہے ۔

جیسے راہی بھٹک کے منزل سے
جیسے کشتی بھنور کے دامن میں
میرا مطلب ہے بند کمرے میں
کوئی شپیر کہ روشنی میں جو
دیکھ سکتی نہیں ہے راہ اپنی

---

[1] غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں۔　　　[2] ترقی پسند غالب

کوئی راہی غریب بے چارہ
لگاتا ہے اِدھر اُدھر چکّر
جیسے کشتی بھنور کے چنگل میں
پی کے قہوہ بہک گیا ہوں میں
کیسا کڑوا مزہ ہے قہوے کا
بات سیدھی سی کہنا چاہتا ہوں میں
لے رہی ہے دماغ میں چکّر
آہی جائے گی ایک دن لب پر[1]

کپور نے جتنی بھی شعری پیروڈیاں لکھی ہیں اُن میں کارٹون سازی، انحراف، حک و تنسیخ اور لطیف طنز سے اس عمدگی سے کام لیا ہے کہ وہ ان کے اعلیٰ سنس آف ہیومر اور بے پناہ صلاحیت شعر گوئی کا پتہ دیتی ہے۔

کپور شعری پیروڈی کے علاوہ نثری پیروڈی بھی کافی دلچسپ لکھتے ہیں۔ ان کے مطبوعہ مجموعہ ہائے مضامین میں حسبِ ذیل پیروڈیاں شامل ہیں۔

(۱) جاناحاتم طائی کا اسوئین کی تلاش میں (۲) گیارکھاتر (۳) سلیم اور انارکلی
(۴) میرؔ کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ (۵) اُردو ادب کا آخری دور۔

ان کا پہلا مضمون "خفقان" جو کرشن چندر کے افسانے "یرقان" کی پیروڈی میں لکھا گیا تھا کسی مجموعہ میں شامل نہیں۔ کیونکہ دوستوں کی اتفاق لائے سے اسے تلف کر دیا گیا تھا۔ مشورہ دینے والوں میں مہندرناتھ اور کرشن چندر شامل تھے۔ نثری پیروڈیوں میں سب سے زیادہ کامیاب پیروڈی "میر کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ" ہے۔ یہ مقلوبی پیروڈی کی ایک اچھی مثال ہے۔ کپور لکھتے ہیں:۔

میکڈوگل کے خیال میں مالیخولیا کی علامات یہ ہیں (۱) افسردگی (۲) بے خوابی (۳) نوحہ گری (۴) خودکشی کی خواہش (۵) جسم کا گھلنا۔

یہ پانچوں علامات "میرؔ" میں یا یوں کہیے میر کی شاعری میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ افسردگی ہی کو لیجئے میرؔ کا مشہور شعر ہے ؎

شام ہی سے بجھا رہتا ہے دِل ہوا ہے چراغ مفلس کا

---

[1] حالیؔ ترقی پسند ادیبوں کی محفل میں۔

سرِ شام میر پہ گہری افسردگی چھا جاتی ہے۔ آخر کیوں؟ شام کے وقت تو عموماً شاعر لوگ نہایت خوش نظر آتے ہیں کیونکہ اس وقت وہ نئی نئی شیروانیاں پہن کر کلوں میں پان دبا کر مشاعروں میں جلوہ افروز ہوتے ہیں اور میر کو خاص کر خوش ہونا چاہیئے تھا کہ وہ مشاعروں کے بادشاہ تھے۔

شاعرے تو کیا وہ تو عالم پر چھائے ہوئے تھے۔ سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا۔ ظاہر ہے کہ دل کے بجھا رہنے کا سبب یہ نہیں کہ انھیں سودا سے ٹکر لینے کا ڈر تھا۔ قصہ وہی ہے جو میکڈوگل نے بتایا ہے یعنی مالیخولیا۔ اسی طرح افسردگی، بے خوابی، نوحہ گری، خودکشی کی خواہش، جسم کا گھلنا کے عارضوں کو مختلف اشعار سے ثابت کر دیا ہے۔ اور آخر میں نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ میر کو مالیخولیا تھا۔ یہ طرزِ تخیل منطقی لحاظ سے یا واقعاتی اعتبار سے غلط سہی مگر اس میں ندرت و شگفتگی ضرور ہے۔ اس انداز فکر و تحریر میں پیروڈی کی اعلیٰ خصوصیات جھلکتی ہیں۔ دوسرے نقطۂ نظر سے اگر سوچا جائے تو یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ کیور صاحب کو ان تنقید نگاروں پر طنز کرنا ہے جو اشعار کی فنی خوبیوں کی بجائے ان کے پس منظر اور الحاقی عناصر کی طرف زیادہ دھیان دیتے ہیں۔ اس پیروڈی کا مقصد ناقد نما ماہرینِ نفسیات کا مضحکہ اڑانا ہے جو اپنی تحلیل نفسی، نفسیاتی تجزیے، جنسی الجھن اور (ERiPUDUS COMPLEX) ایری پڈس کامپلکس کی مدد سے شاعری کو سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس کے لیے پیچیدہ حوالوں سے مرعوب کرنیوالا انداز اختیار کرتے ہیں۔ چار ملنگوں کی داستان میں جو قصہ چہار درویش کی پیروڈی ہے کیور زیادہ کامیاب نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہمارے سامنے شفیق الرحمن کی لکھی ہوئی میراتھن ٹائپ کی تحریریں پیروڈی کی صورت میں موجود ہیں جیسے "تزکِ سِندباد جہازی" قصہ پروفیسر علی بابا کا وغیرہ وغیرہ۔ شفیق الرحمن کا ہلکا ہلکا مزاح موضوع کو جس روانی سے آگے بڑھاتا ہے کیور کی گہری طنز نگاری وہاں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتی ہے۔

"اُردو ادب کا آخری دور" محمد حسین آزاد کی آبِ حیات کی پیروڈی کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس میں زبان کے علاوہ طرزِ بیان کی بھی .... پیروڈی کی گئی ہے۔ آزاد نے جس طرح اردو ادب کو کئی ادوار میں تقسیم کر کے اس کے ارتقاء کی طرف اشارہ کیا تھا کیور بھی یہی کرتے ہیں۔ اور آخر میں اُردو کے مستقبل سے مایوسی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس تذکرہ نما مضمون میں انھوں نے اپنے ہی دور کے شاعروں اور ادیبوں کو چنا ہے اور ان کے بارے میں نہایت کامیاب اشارے کئے ہیں۔ جیسے احتشام حسین کے بارے لکھتے ہیں ان کی تنقید ایک ہی نکتے کے گرد گھومنے کے بعد وہاں پہنچ جاتی ہے جہاں سے روانہ ہوئی تھی

ملہ نئے ادبی رجحانات "پیروڈی" ڈاکٹر اعجاز حسین۔

بہترین ناصح تھے۔ لیکن آخری عمر تک یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کہنا کیا چاہتے ہیں (احتشام صاحب کی ابتدائی تنقیدیں گنجلک ہوتی تھیں) شفیق الرحمن پر ان کی رائے یہ ہے "مزاح نگار تھے۔ پیروڈی لکھنے میں کمال حاصل تھا لیکن لطیفے جمع کرنے کے شوق نے کہیں کا نہ رکھا (یہ حقیقت بھی ہے کہ شفیق الرحمن کے مسلسل لطیفے ایک قسم کی بے ربطی اور ایک مصنوعی فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ لطیفوں کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کو کافی مستحسن خیال نہیں کیا جاتا) یا کرشن چندر کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں' ساری عمر اس کوشش میں سرگرداں رہے کہ کسی نہ کسی طرح ادب کو گھسیٹ کر پراپگنڈے کے قریب لے آئیں۔ آخری عمر میں اس سعی میں کامیاب بھی ہو گئے تھے"[۱]

کپور نے غبار خاطر کی پیروڈی "گبار کھاتر"[۲] کے عنوان سے لکھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ غبار خاطر ایک مکاتیب کا مجموعہ ہے اور "گبار کھاتر" ایک مختصر ترین پیروڈی ہے۔ غبار خاطر کی کامیاب ترین پیروڈی شوکت تھانوی" یار شاطر کے عنوان سے کر چکے ہیں۔ کپور کی پیروڈی پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بجائے آزاد کی تحریر کی پیروڈی لکھنے کے آزاد کی شخصیت کی پیروڈی لکھ رہے ہیں۔

یہ پیروڈی غبار خاطر کی طرز میں خط کے فارم میں لکھی گئی ہے۔ اس خط کو کسی دوسرے شخص کی جانب سے آزاد کے نام ہونا چاہیئے تھا مگر یہ خط ابوالکلام آزاد اپنے ہی نام لکھتے ہیں۔ مگر ہندی انداز تحریر میں ابوالکلام ایڈیٹر الہلال کے نام ابوالکلام وزیر تعلیم حکومت ہند کا خط ہے۔ پنڈت ابل کلام آجاد سے حرت کے ساتھ شبھکے موہ ترم۔ اسی طرح کپور عربی و فارسی الفاظ کو دیوناگری رسم الخط میں لکھتے ہیں سبب شاید یہ ہے کہ الہلال' البلاغ' کاروان خیال' غبار خاطر کی اردو لکھنے والے ابوالکلام آزاد سیاسی مصلحتوں میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ آخری دنوں میں آزاد نے ہندی کی طرف داری میں جو بیانات دیئے اس پر کپور تلملا اٹھے اور انھوں نے خود آزاد کی تحریر کو ہندی میں لکھ کر دکھا دیا کہ ان کی نثر کا جادو کس طرح زائل ہو جاتا ہے۔ یہاں کپور نے گویا اس بات کی بھی پر زور تائید کی ہے کہ ہر زبان کی کچھ تہذیبی روایتیں ہوتی ہیں اور رسم الخط یا لغات پوری قوم کے کردار کو مسخ کرنے کے برابر ہے۔ غالب کے تین مصرعے کپور نے یوں لکھے ہیں۔

(۱) گالب کے اڑیں گے پرزے
(۲) کابا کس منہ سے جاؤ گے گالب
(۳) مئے سے گرج نشاط ہے کس روسیاہ کو

۱؎ ...ردو ادب کا آخری دور
۲؎ گبار کھاتر

آزاد کی نثر کی پیروڈی کا نمونہ یہ ہے۔

تیپت دنوں کے بعد کھت لکھنے کی توفیک ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بہت مسروف رہا ہوں۔ بارے آج کچھ فرصت ملی د متالا (مطالعہ) کا یہ حال ہے کہ اس کے بعد بھی جب تمہیں کھت لکھ رہا ہوں۔ تلسی راماین نظر کے سامنے ہے۔ سامنے الماری میں رکھا ہوا دیوانے حافج میری طرف اشکبار آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ لیکن کیا کروں بھارت کے شکھشا منتری ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ جیب نہیں دیتا کہ حافج کا شیدائی ہوتے ہوئے بھی دیوانے حافج پڑھ سکوں۔ کسی ملاقاتی نے دیکھ لیا تو گجب ہو جائیگا۔ بھارت ورش کے اکباری پلکوں میں ہلچل مچ جائے گی۔ یعنی آیا دہ بھارت ورش کا شکھشا منتری آجاد جو جلسوں اور اسمبلیوں میں لوگوں کو ہندی سیکھنے کی ترگیب دیتا ہے کھد دیوانے حافج پڑھتا ہے۔[1]

مکمل طور پہ اگر "گبار کھاتر" کو ہندی میں لکھا جائے اور اس کے بعد اس کی فارسی رسم الخط میں نقل کی جائے تو بہت سارے الفاظ بدل دینا پڑے گا۔ مگر کپور صاحب کی توجہ نہ جانے کیوں اس طرف نہ ہو سکی جیسے یہ الفاظ' بعد' فرصت' طرف' حالات' صاف' عجیب' ان الفاظ کو جیوں کا توں لکھ دیا گیا ہے۔ اشعار کے لفظ کو ایک جگہ "اشار" لکھتے ہیں۔ اور دوسری جگہ اشعار جانا حاتم طائی کا اسفوین کی تلاش میں ——

روایتی حاتم طائی کی طرح یہ حاتم طائی بھی اغیار کی خاطر جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے ہیں پیروڈی کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؛ حاتم طائی جب اپنے ساتویں سفر سے گھر لوٹا تو مسز حاتم طائی اسے دیکھ کر پہلے تو ہنسی اور پھر رونے لگی۔ یہ ماجرا دیکھ کر حاتم طائی بہت حیران ہوا۔ وہ اپنی اہلیہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا' اے نیک بخت سچ سچ بتا دل کی بات زبان پر لا کہ تو مجھے دیکھ کر ہنسی کس لیے اور روی کیوں۔ مسز حاتم طائی نے جواب میں کہا ہنسی تو اس لیے کہ اتنی مدت کے بعد تمہاری شکل دیکھنا نصیب ہوی۔ اور روئی اس لیے کہ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے تم ایک دن میرے پاس نہیں رہے۔ ہمیشہ اغیار کی خاطر جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے رہے۔[2]

دی مبارک ٹائمز کے سب ایڈیٹر شری ایس ایچ سبرامنیم جن کی ایک بیوی اور سات بچے ہیں جنھیں ایک مضمون سنومین پر لکھنا ہے۔ اگر یہ مضمون انھوں نے نہیں لکھا تو ان کو ملازمت سے برطرف کر دیا جائیگا۔ اس سب ایڈیٹر کی ملازمت بچانے کے لیے حاتم طائی اسنومین کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں گویا ان کی زندگی کا مقصد خدمت خلق ہے۔

---

1. گبار کھاتر۔ 2. اسنومین کی تلاش میں۔

"کپور صاحب کے حاتم طائی اسنومین کی تلاش میں ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی سر کرنے کیلئے روانہ ہوتے ہیں۔ کپور "اسنومین کی تلاش" میں ان لوگوں کے واہموں پہ طنز کرتے ہیں جو کسی اسنومین یا برف میں رہنے والی سی قسم کی مخلوق کے وجود کو مانتے ہیں۔

"ثریا نے ازراہِ مذاق حاتم سے کہا اے حاتم یہ طوفان تمہارا قافیہ کیا تنگ کرے گا تمہارا قافیہ تو پہلے ہی سے تنگ ہے کہ سوائے ماتم کے حاتم کا کوئی قافیہ نہیں۔"

"اے حاتم معلوم یہ ہوتا ہے کہ بے چارا اسنومین اللہ کو پیارا ہو گیا۔ تو پھر ----؟"

"ہمیں واپس چلنا چاہئیے اگر زیادہ عرصہ یہاں ٹھہرے تو ہم بھی اللہ کو پیارے ہو جائینگے لیکن اس سب ایڈیٹر کا کیا ہوگا ----؟"

"زیادہ سے زیادہ اسے ملازمت سے جواب مل جائے گا۔"

"تم بڑے بے رحم ہو یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس کم بخت کی ایک بیوی اور سات بچے ہیں۔ میں اپنی سات بیویوں اور ایک بچے کے متعلق سوچ رہا ہوں!"

اڑن تشتریوں کے سلسلے میں عہد حاضر کی سائنسی معلومات اس حد تک آگے بڑھ چکی ہیں کہ ان کا وجود مان لیا گیا ہے۔ کپور صاحب ان اڑن طشتریوں کو چکمہ سمجھتے ہیں۔ جو چندا کے عشق میں سرگرداں ہے۔ بہرحال یہ ان سائنسدانوں پر طنز ہے جو زمین پر رہنے والی مخلوق کی بھلائی کا کام کرنے کی بجائے۔ خلاؤں کی تسخیر کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔ بیشتر اقدار زندگی میں کپور رجعت پسند واقع ہوئے ہیں یہ بھی ایک مثال ہے۔ مگر وہ اپنے طنز کے وار میں کامیاب رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز کی انتہا نامعقول نتائج پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ اس پیروڈی کا نتیجہ بھی ایک طنز ہے۔ حاتم اور ثریا ایک عجیب و غریب جانور کے پنجوں کے نشانات برف پر دیکھتے ہیں اور اس کا تعاقب کرتے ہیں۔ گرہ جانور جو ریچھ اور گینڈے کا مرکب معلوم ہوتا تھا۔ ان دونوں کا تعاقب کرتا ہے پہلے تو وہ گھبراتے ہیں لیکن بعد میں چل کر پہچان لیتے ہیں تو عقدہ وا ہوتا ہے کہ یہ جانور ایس ایچ سرا منیم ہے جو لنگور کی کھال پہنے ہوئے ہے ثریا حاتم اور سرامنیم کی رفاقت پر ناز کرتا اور مشورہ دیتا ہے کہ اے صاحبو یہی ماہ تو کام اب بڑا ہی مشکل ہے۔

حاتم نے پوچھا میرے ، ثریا بڑا لنگور کے تعاقب میں مری ایسی [illegible]

نظر آتے ہیں۔ کیوں نہ اس لباس میں ان کی چند تصاویر لے لی جائیں[1]۔
اس طرح سے سبرا منیم کی تصاویر لے لی جاتی ہیں اور حاتم طائی سب ایڈیٹر کی ملازمت بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

سلیم اور انارکلی:۔ امتیاز علی تاج کے ڈرامہ "انارکلی" اور اسی تھیم پر بنائی گئی دو فلموں کی شاندار کامیابی اس کا ثبوت ہے کہ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، سوہنی مہینوال۔ ہیر رانجھا کی طرح انارکلی کی عشقیہ داستان عوام میں کافی مقبول ہے۔ انارکلی کے ڈرامے کو خاص اہمیت اس لئے حاصل ہو گئی ہے کہ یہ اُردو ادب کا کامیاب اکلوتا ڈرامہ ہے۔ اور کپور صاحب نے اس داستان کی پیروڈی کی ہے ان کی یہ پیروڈی واقعات کے لحاظ سے منفرد ہے۔ کیونکہ اس پیروڈی یا طنزیہ ڈرامہ میں جو واقعات پیش کئے گئے وہ فلم یا ڈرامے میں پیش کئے گئے واقعات سے بالکل الگ ہیں۔ اس کے کردار مختلف ہیں اور پیروڈی لکھنے کا مقصد اکبر اعظم کے گناہ کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ حسب ذیل کردار پیش کئے گئے ہیں۔ ہز مجسٹی اکبر، بیربل (ہز مجسٹی کا پرائیوٹ سکریٹری) ابوالفضل وزیر اعظم فیضی وزیر داخلہ ٹوڈرمل وزیر زراعت خانخانان وزیر خارجہ ملّا دو پیازہ وزیر طنز و مزاح، پرنس سلیم نادرہ عرف انارکلی ہز مجسٹی مریم زمانی، سراغ علی خاں۔ افسر اعلیٰ سی آئی ڈی یہ داستان پیروڈی (۶۴) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس میں دس مناظر ہیں اور زمانہ ۱۹۶۰ء کا ہے۔ کپور صاحب ۔ اکبر، سلیم، انارکلی کی روحوں، چالیس کروڑ ہندوستانیوں اور دس کروڑ پاکستانیوں سے معذرت کرتے ہوئے اپنا بیان شروع کرتے ہیں۔ اس پیروڈی میں اکبر ہیں جنھیں ریڈیو سیلون سے لتا منگیشکر، طلعت محمود کے ریکارڈ سننے کا شوق ہے۔ بیربل ہیں جن کے گھر ٹیلی فون لگا ہوا ہے۔ جو پارکر اکیاون (۵۱) سے لکھتے ہیں۔ ابوالفضل ہیں جو بہترین شارک سکن کا سوٹ پہنتے ہیں اور خدا حافظ کی بجائے "گڈ بائی" کہتے ہیں۔ ملّا دو پیازہ اور بیربل کی یہ حالت ہے کہ دونوں ایکدوسرے کو چڑ رہتے ہیں اور دراصل دونوں، امریکن بک آف جوکس، ایک ہی انگریزی کتاب سے لطیفے چراتے ہیں۔ سلیم بی۔ ایس سی کے طالب علم۔ انگریزی سوٹ زیب تن فرماتے ہیں اور فلم لیلیٰ مجنوں کا سکنڈ شو دیکھتے ہیں۔
انارکلی صاحبزادہ اور قمیص پہنتی ہیں بار بار انگریزی الفاظ گفتگو کے دوران بلا تکلف بولتی چلی جاتی ہیں۔ متوسط طبقے کی نیم تعلیم یافتہ لڑکیوں کی نمائندگی اس کردار سے بخوبی ہوتی ہے کہ پیروڈی میں کرداروں کی گفتگو کے ذریعہ کلاسیکل میوزک، ریڈیو کی تقریروں، ہندوستانی فلموں اور ہندوستانی شاعروں کا مضحکہ اُڑایا گیا ہے۔ اس ڈرامے کے لکھنے کا مقصد بھی کپور نے واضح کر دیا ہے۔ کہتے ہیں "یہ سب کچھ میں نے اسلئے

---

[1] منظور حسین کی تلاش میں

وہ بدنما دھبہ آپ کے دامن پر قریب قریب چار صدیوں سے لگا آ رہا تھا۔ اِسے یکسر دھو دیا جائے۔ تاکہ ... صدی کے لوگ انصاف پرور اور عدل گستر اکبر کو روایت کی بجائے حقیقت کے آئینہ میں دیکھیں ... فیصلہ کریں کہ آیا اکبر جیسا عالی نسب اور عالی دماغ شہنشاہ انارکلی کو زمین میں زندہ دفنانے کا حکم ... کر سکتا ہے؟[1]

اس طویل پیروڈی میں مکالموں کی شگفتگی کو برقرار رکھنا کپور کا ہی حصہ ہے۔

ل —— اچھا تو ہز مجسٹی ہیں کہاں مجھے ان سے ایک ضروری بات کہنا ہے۔

—— ہز مجسٹی تو مولانا ۔ اس وقت دیوانِ خاص میں ہیں اور ریڈیو پر لتا منگیشکر کا گانا سن رہے ہیں۔

ل —— لتا منگیشکر کا گانا —— تعجب ۔ تان سین کو یاد نہیں فرمایا آج ۔

—— بات یہ ہے کہ ہز مجسٹی تان سین کے اُستادی گانے سن سن کر تنگ آ گئے ہیں۔ ہر روز وہی میاں کی ٹوڈی ... میاں کی ملہار۔ وہی تانیں وہی پلٹے اور پھر لطف یہ کہ گھنٹوں گانا سنتے رہو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پرسوں کہہ رہے تھے کہ مجھے تو میاں کی ٹوڈی بھی ایسی ہی لگتی ہے جیسے میاں کی ملہار اور مجھے یہ شک گزرتا ہے کہ تان سین کو صرف ایک ہی استادی گانا آتا ہے اور وہ ہر روز اسے ... مختلف نام دیکر سب کو اُلّو بنا رہا ہے۔[2]

... برِ اعظم ریڈیو سُن رہے ہیں) اکبر —— انور' یہ طلعت محمود کا آخری ریکارڈ بج رہا ہے۔ اس کے بعد ... جونہی گانا ختم ہو ریڈیو بند کر دو۔

—— بہت اچھا یور مجسٹی ۔

—— خدا جانے یہ ریڈیو تقریریں اتنی خشک اور غیر دلچسپ کیوں ہوتی ہیں جب بھی غلطی سے ایک آدھ بار سن لیتا ہوں سا ریڈان کی گولی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ انور کیا تم بتا سکتے ہو کہ ریڈیو تقریریں اتنی بے مزہ کیوں ہوتی ہیں ۔

—— غالبًا یور مجسٹی —— اسلئے کہ تقریر کرنے والوں کو بہت قلیل معاوضہ دیا جاتا ہے ۔

—— ہم ۔ ہو سکتا ہے (سگار سلگاتے ہوئے) اچھا یہ امریکی سگار کافی اچھے ہیں اور خرید لو ...

... لی کی تعریف سلیم کی زبان سے یوں کروائی گئی ہے ۔

"بہ خدا وہ معمولی لڑکی نہیں ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں الف الیس سی کے امتحان میں وہ آگرہ یونیورسٹی ...

[illegible]

انارکلی بھی اس کے علاوہ ٹینس کی چیمپین ہے اور بریسٹ اسٹروک (BREAST STROKE) تیرنے میں تو اس کا ریکارڈ رہتے ہیں[1]

اکبر ان تمام باتوں کو مسترد کر دیتا ہے کہ یہ ایک لونڈی ہے۔ سلیم کی یہ کوشش قابل ذکر ہے جب وہ کہتا ہے تعجب ہے ڈیڈی کہ آپ جمہوریت کے دور میں ادنیٰ اور اعلیٰ میں تمیز روا رکھتے ہیں حالانکہ شاعر مشرق بہانگ دہل اعلان کر چکے ہیں سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ[2]

شاہی خون پر یوں ارشاد ہوتا ہے: ـــ

[illegible] معاف کیجیے ـــ شاہی خون کی تھیوری مدت سے ایکسپلوڈ EXPLODE ہو چکی ہے۔ روسی [illegible] ڈاکٹر [illegible] اوسکی نے اپنی تازہ ترین ریسرچ سے ثابت کر دیا ہے کہ شاہی خون اور غیر شاہی خون میں بالکل فرق نہیں[3]۔

چونکہ ڈرامے کا زمانہ ۱۹۶۰ء ہے اسلئے عہد حاضر کی جھلکیاں بار بار دکھائی گئی ہیں۔ جیسے بیربل اکبر کو مشورہ دیتا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے اس معاملے (سلیم اور انارکلی کے عشق والا) کو رفع دفع کر دیجیے۔ اگر بلٹز BLITZ نے اس معاشقے کی تفاصیل چھاپ دیں تو خیر و عافیت معلوم ہو جائیگی اور خدانخواستہ امریکن اخبار ڈیلی اسکنڈل DAILY SCANDLE کو پتہ چل گیا تو مہینوں شہزادے کے عشق کے چرچے ہوں گے[4]۔

اقدار کی تبدیلی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس پیروڈی میں اکبر اعظم ایک ریٹائرڈ پنشنر کے روپ میں پیش ہوتا ہے۔ انارکلی ایک الٹرا موڈرن لڑکی ہو جاتی ہے سلیم متوسط طبقے کے عام نوجوان کی طرح شعر و شاعری اور علم و ادب پر جان چھڑکتا ہے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر ۱۹ سے آگے)

اردو ادب میں جدیدیت کی تحریک بھی چند سالوں سے چل رہی ہے۔ اورنگ آباد میں بھی جدیدیت کے حامی شاعر و ادیب موجود ہیں۔ قاضی سلیم بشر نواز اور فضیل جعفری کا شمار جدید شعراء میں ہوتا ہے۔ ان پر مزید ایک کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ہیں صادق ہیں۔ جو جدید شاعر کے علاوہ مصور اور جدید افسانہ نگار بھی ہیں۔ نئے ابھرتے ہوئے افسانہ نگاروں میں ظہیر علی کیفی عظمت ممتاز یوسف زئی اور سہیل [illegible] جا سکتے ہیں۔ یہ تمام کالج کے طالب علم ہیں لیکن افسانہ نگاری کی بہتر صلاحیتیں بھی ان میں موجود ہیں۔ امید ہے مستقبل میں یہ اچھے افسانہ نگار ثابت ہونگے۔

اُردو گھر فنڈ

انجمن ترقی اردو ہند کی ایک پانچ منزلہ عمارت نئی دلی میں بن رہی ہے۔ اس کا نام اردو گھر رکھا گیا ہے زمین لے لی گئی ہے۔ سنگ بنیاد رکھ دیا ہے۔ اور تعمیر کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

تعمیر کے سلسلے کے جملہ کاموں کیلئے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی ہے جو تکمیل تک نگراں [illegible]

اس عمارت پر لاگت کا تخمینہ ساڑھے سات لاکھ روپیہ کیا گیا ہے اور اردو گھر فنڈ میں انجمن نے جو رقم بچا [illegible] جوڑ جوڑ کر جتن سے رکھی ہے وہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ بنک میں موجود ہے۔ ایک لاکھ بڑے عطیوں [illegible] کی توقع ہے اب پانچ لاکھ اور جمع کرنے کی ضرورت ہے

اس مقصد کیلئے طریقہ کار یہ تجویز کیا گیا ہے کہ خود اراکین انجمن جن کی تعداد لگ بھگ پچاس [illegible] اور انجمن کی شاخوں کے ذمہ دار ملک بھر میں چندہ جمع کریں۔ اس غرض کیلئے چندہ وصول کرنے والوں کے پاس [illegible] اور بڑے شہروں میں مندرجہ ذیل رسیدیں مطبوعہ ہونگی

ایک روپیہ، پانچ روپیہ، دس روپیہ، بیس روپیہ اور پچاس روپیہ والی رسیدیں جن پر رقم چھپی ہوئی [illegible] نام پتے اور وصول کنندہ کے دستخط کی ہے۔ رقم جب دفتر پہنچ جائے گی تو رقم دینے والوں کے نام ہماری زبان میں ہفتہ وار [illegible] رقم بھیجنے کیلئے اتنا پتہ کافی ہوگا۔

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند۔ علی گڑھ (یوپی)

عنقریب ہر ریاست میں جو صاحب بھی چندے کی مہم کے ذمہ دار ہوں گے اُن کے اور اُن کے معاونین [illegible] کا "ہماری زبان" اور دوسرے اخباروں میں اعلان ہوگا۔ تاکہ مقامی طور پر رقم حوالے کرنے میں آسانی ہو۔

اس سلسلے میں "ہماری زبان" کی اشاعت کی طرف بھی اہل استطاعت توجہ کریں تو انجمن کیلئے اور اردو [illegible] کیلئے بڑی تقویت کا باعث ہوگا۔

ہم چاہتے ہیں کہ چندہ دینے والے حضرات وہی رقم دیں جو اُن کے حالات کے مطابق [illegible] بار نہ گزرے۔ مگر ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ جو بھی آپ بسہولت عنایت کر سکیں [illegible] جلد سے جلد پورا ہو جائے اور ہم فخر و مسرت کے ساتھ فہرست کے جلد بند کرنے کا اعلان کر سکیں۔ [illegible]

سب اردو دوستوں کے تعاون سے اُردو گھر بہت جلد بن جائیگا۔

(پروفیسر) آل احمد سرور جنرل سکریٹری انجمن

غالبؔ صدی

ہندوستان کے لافانی فلسفی شاعر مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی صدی مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی سرپرستی میں ۱۵ فبروری سے ۲۱ فبروری ۶۹ء کے ہفتہ میں منائی جارہی ہے۔ مرکزی سنٹیزی کمیٹی جس کے سرپرست صدر جمہوریہ ہند ہیں اور صدر وزیر اعظم ہیں۔ اس ہفتہ کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ امید ہے کہ عظیم شاعر کے شایان شان یہ صدی منائی جائے گی۔

ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی غالبؔ کی صدی منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں جن کی خبریں اخبارات و رسائل میں آتی رہتی ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی ادارے اس سے بڑی دلچسپی لے رہے ہیں۔ یونیسکو کی طرف سے غالب کی جامع سوانح عمری اور اس کے کلام کا انتخاب دو جلدوں میں اس موقع پر شائع ہوگا۔ ہندوستان کے علمی و ادبی ادارے مختلف علاقائی زبانوں میں غالب پر کتابیں رسالے اور مضامین شائع کر کے اس کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔ نئی دلی میں غالب پر چند روزہ سیمنار کی شرکت کیلئے بہت سے ممالک کے ادبی مفکرین آرہے ہیں۔

غالب اکیڈمی نئی دہلی کی اسکیم اور پروگرام غالب صدی کا ایک ٹھوس اور مستقل نتیجہ ہوگا۔ اس کی مجوزہ ریسرچ لائبریری میوزیم اور آڈیٹوریم غالب پر ریسرچ کا ایک بین الاقوامی مرکز ہوں گے اور مقامی طور پر یہ ادبی، علمی اور معاشرتی شعور کی تربیت گاہ کا کام دیں گے۔ اسکیم کی تفصیلات کیلئے اکیڈیمی کا بروشر ملاحظہ فرمائیے اس کی عمارات کی تعمیر کا کام شروع ہوچکا ہے۔ ایک عمارت کا افتتاح خدا نے چاہا تو ۲۱ فروری ۱۹۶۹ء جمعہ کے دن ہوجائیگا جو مرکزی سنٹیزی کمیٹی نے مقرر کر دیا ہے۔

غالب کے مداحوں نے اور ملکی اور غیر ملکی ادیبوں اور علمی اور تہذیبی اداروں نے غالب اکیڈمی کی اسکیم کو نہایت معقول متوازن اور خود کفیل قرار دیا ہے اور وہ اس کی کامیابی کے دل سے خواہاں ہیں۔

خیرات ندیم

یادِ زورؔ کی نذر

اب کے ٹپکا ہے تری یاد کے سینے سے لہو
اب کے نکھرا ہے بہت رنگِ جمالِ اُردو
اب کے محسوس یہ ہوتا ہے کہ نزدیک ہے تو
ایک اک دل میں وہی تیری لگن ہے جیسے
ہر نفس معجزۂ حسنِ سخن ہے جیسے
اور شاداب اُمیدوں کا چمن ہے جیسے
شب کے ماتھے پہ نیا خوابِ سحر لہرایا
راہ کو وقت کے زخموں نے بہت چمکایا
ہم کو پتھراؤ میں جینے کا سلیقہ آیا
جرم ٹھہرا ہے کہ ہم نغمۂ جاں مانگتے ہیں
حسنِ گل جلوۂ رخسارِ بتاں مانگتے ہیں
بات کرنے کیلئے اپنی زباں مانگتے ہیں
وہ زباں جو ہے محبت کے اجالوں کی زباں
جس پہ خود آج بھی تاریخِ ادب ہے نازاں
جسکی راہوں میں اُترتے ہیں مہ و کاہکشاں
اُس زباں کیلئے یہ روک یہ غم کچھ بھی نہیں
دشتِ وحشت میں سہی سنگِ ستم کچھ بھی نہیں
صبح کا ذکر کرو شامِ الم کچھ بھی نہیں

مظفر حنفی

دل تو محبوس تقاضے بھی تو ڈستے ہوں گے
بات کرنے کو کئی لوگ ترستے ہوں گے

ہم سے کچھ لوگ تو شاداب ہیں صحراؤں میں
بیشتر زلف کے سائے میں جھلستے ہوں گے

چند کھیتوں کے مقدر میں نہیں ہے پانی
ورنہ بادل تو بہر حال برستے ہوں گے

میرے آنسو کہ جو آنکھوں کو نہیں نم کرتے
خون دے کر بھی خریدو گے تو سستے ہوں گے

کس قدر ناز ہے آشفتہ سری پر مجھ کو
جیسے بستی میں خردمند نہ بستے ہوں گے

حضرت شیخ عبادت کے نشے میں آکر
پھبتیاں بزم خرابات پہ کستے ہوں گے

طنز آلود سہی۔ زخم ہیں جن کے دل پر
میرے اشعار پہ جی کھول کے ہنستے ہوں گے

شاہراہوں پہ تو مجمع ہے مظفر صاحب
شعر کہنے کے کئی اور بھی رستے ہوں گے

عشرت کرتپوری

یوں ترے ہجر میں ہر لمحہ گذارا جیسے
اک ہتیلی پہ ہو ٹھہرا ہوا پارا جیسے

بزم اغیار میں یوں مہر بلب بیٹھے ہیں
ہم نے رسوائی بھی کر لی ہو گوارا جیسے

ہم نے یہ سوچ کے سینچا تھا لہو سے اپنے
در حقیقت یہ گلستاں ہے ہمارا جیسے

یوں ابھر آیا ہے اے دوست تری یاد کا زخم
شب کے ماتھے پہ دمکتا ہے ستارا جیسے

اسطرح بھولنے والا کوئی یاد آتا ہے
راکھ کی تہہ سے بھڑک اٹھے شرارا جیسے

حیدرآباد میں آئے تو یہ محسوس ہوا
یہ حسین شہر ہے صدیوں سے ہمارا جیسے

خوش نظر آتے ہیں کچھ ایسے جناب عشرت
مل گیا ہے کسی آنچل کا سہارا جیسے

صلاح الدین نیر

تخیّل کے گلشن میں وہی پھول بدن ہو
نیر! کئی برسوں سے جو موضوعِ سخن ہے

بدلے ہوئے حالات کے سینے میں گھٹن ہے
یہ زیست ہے یا سلسلۂ دار و رسن ہے

پھولوں کا لہو جس نے بہاروں میں نچوڑا
سنتے ہیں وہی شخص نگہبانِ چمن ہے

تہذیب کے کاندھوں پہ جو تھا بارِ امانت
لاش اس کی ترے شہر میں بے گور و کفن ہے

خوشبوئے وفا ساتھ ہے گلشن ہو کہ مقتل
اس شہر کی مٹی میں تیرا سانولا پن ہے

یہ ترکِ تعلق ہے کہ اظہارِ وفا ہے
ہونٹوں پہ ہنسی آپ کے ماتھے پہ شکن ہے

امید کا خاموش دیا بجھ نہ سکے گا
مایوسی کے چہرے پہ بھی ہلکی سی کرن ہے

راہی قریشی

جنگ کیا امن بھی تلوار سے وابستہ ہے
زیست ہر دور میں پیکار سے وابستہ ہے

آج بھی حسرتِ اظہارِ تمنا اے دوست
حکمِ پابندیٔ گفتار سے وابستہ ہے

ایک بے کیفی کا عالم ہے بہاروں پہ محیط
ایک ویرانی سی گلزار سے وابستہ ہے

دستِ ساقی میں چھلکتا ہوا ساغر ہے مگر
تشنہ کامی ہے کہ میخوار سے وابستہ ہے

کتنی ویرانی نظر آتی ہے کوچہ کوچہ
کیسی وحشت در و دیوار سے وابستہ ہے

آج بھی موسمِ گل پر ہے خزاں کا پہرہ
آج بھی دامنِ گل خار سے وابستہ ہے

خواہشِ امن و تمنائے سکوں میں راہی
ایک دنیا ہے کہ انکار سے وابستہ ہے

غلام مرتضیٰ راہی

غزلیں

مسموم ہو رہی ہیں مرے ضبط کی فضائیں
سانسیں، شبِ فراق کی، آہستہ آہ بن جائیں
تشنہ ہیں سب، چمن بھی، خزاں بھی، بہار بھی
بوندیں ہمارے خون کی کس کس کے کام آئیں
سرچشمۂ سحر کے ابلنے کی دیر ہے
کچھ اور انتظار کریں، تیرہ لب، دعائیں
پھر جھنجھنا اٹھے مرے سازِ غزل کے تار
جاگیں تصورات کی خوابیدہ مہ لقائیں
کیا جانے کب کھلیں گے لبِ جوئے شیر وقت
ہم تشنہ آرزوؤں کو کب تک لہو پلائیں
اسرارِ کائنات کے کھلنے لگے ورق
افسانۂ حیات کے عنواں بدل نہ جائیں
لو دے اٹھے چراغ، مگر روشنی نہیں!
حیراں ہیں ہم کہ داغِ نظر کس طرح مٹائیں
راہی ہمارا مسلکِ ذوقِ سفر ہے اور
منزل ہمیں ملے بھی تو خاطر میں ہم نہ لائیں

ہمہ تن گوش ہر اک زخمِ نہاں تھا کل رات
دل کی آہٹ پہ بھی تیرا ہی گماں تھا کل رات
اب نہ بھولے سے کبھی دیکھوں گا ماضی کی طرف
ایک لمحہ، کئی صدیوں پہ گراں تھا کل رات
تجھکو دیکھا کیا ہر زاویۂ قربت سے
بند آنکھوں میں بھی دلچسپ سماں تھا کل رات
نیند کے مرحلۂ سخت پہ سب بھول گیا
یاد آئے تو بتاؤں کہ کہاں تھا کل رات
وہی اندیشۂ فردا، وہی امروز کا غم
اک مرا دل تھا جو پابندِ جہاں تھا کل رات
لحظہ لحظہ مجھے ملتی رہی آہٹ تیری
قافلہ وقت کا چپ چاپ رواں تھا کل رات
ٹوٹا پڑتا تھا مرے دل پہ خیالوں کا ہجوم
کیا مرا دل بھی کوئی جنسِ گراں تھا کل رات
دور تک پھیلے تھے اجزائے حقیقت راہی
یا کوئی سلسلۂ وہم و گماں تھا کل رات

نسیم تقوی

دشتِ غربت میں جو آیا ہوگا
کوئی آوارہ بگولا ہوگا
موم کی طرح پگھلنا ہوگا
ہم کو ہر رنگ میں جلنا ہوگا
چاند کتنا ہی دلآویز سہی
اس میں شعلہ بھی دہکتا ہوگا
ہم سے صد رنگ ہے گلشن کی فضا
ہم نہ ہوں گے تو یہ صحرا ہوگا
وقت پھیلے گا تو صدیاں ہوں گی
اور سمٹے گا تو لمحہ ہوگا
چڑھتے سورج کی حقیقت کیا ہے
شام ہوگی تو اندھیرا ہوگا
پھول اب خاک بسر ہے دیکھو
پیرہن بدلا تو کانٹا ہوگا
وہ جو ڈوبا ہے افق کے اس پار
میری تقدیر کا تارا ہوگا

نعیم تقوی

کھو چکا امکانِ رنگ و بو ہمیں
اے ہوس کیوں ڈھونڈتی ہے تو ہمیں
آبروِ احساسِ غربت کی بڑھی
کس قدر پیارے ہیں یہ آنسو ہمیں
ہم ہی تیرہ بخت تھے جویائے حسن
ڈھونڈتی ہے روشنی ہر سو ہمیں
جانِ محفل اب ستاتے ہیں بہت
آکے تیری یاد کے جگنو ہمیں
ہم کہ ہیں دار و رسن سے بے خبر
ہے تمنائے قد و گیسو ہمیں
مٹ نہ جائے اب وقارِ زندگی
عہدِ نو دل میں چھپا لے تو ہمیں
ہے دہانِ زخم کا احساں نعیم
مل گئے اظہار کے پہلو ہمیں

رؤف خیر

میں سا زِ وفا ہوں خیر مگر اظہارِ وفا سے قاصر ہوں
پھر کیسے لٹاؤں نغمے جب اپنی صدا سے قاصر ہوں

پابندِ طبیعت ہو کر بھی پابندِ روایت ہیں دونوں
تم عہدِ وفا سے قاصر ہو میں خونِ وفا سے قاصر ہوں

خوں تھوکتی آنکھیں مت دیکھو گل پھینکتے زخموں پر ہنس لو
باریک نظر تم لوگ نہیں میں بھی تو ریا سے قاصر ہوں

تو سنگِ ملامت برسا میں ہنستے ہوئے سہہ لوں گا دل پہ
اخلاص مری کمزوری ہے اے خون کے پیاسے قاصر ہوں

ٹپکے نہ پرائی دولت پر آنکھوں سے لہو کی چنگاری
میں ہاتھ تمہارے چوم تو لوں توہینِ حنا سے قاصر ہوں

تکمیلِ تخیل شاعر کے انجام کو کہتے ہیں یارو
یہ تشنہ لبی کا احساں ہے تسکینِ انا سے قاصر ہوں

مرزا ظہیر

دادِ آراستگیٔ حسن

جس نے دیکھا ہی نہیں دنیا میں جلوہ حسن کا
اُس کو کیا معلوم ہے رُتبہ و درجہ حسن کا
اہلِ دُنیا سر جھکاتے آئے اس کے رُو بہ رُو
اوج پر دیکھا ازل سے ہی ستارہ حسن کا
رہ گیا ہو کر اُسی کا جس نے دیکھا ایک بار
کس قدر جنّت نظر ہوتا ہے جلوہ حسن کا
گلستانوں کے تبسم میں وہی ہے آشکار
طائرانِ خوش نوا گاتے ہیں نغمہ حسن کا
انتہائے یاس میں سامانِ راحت مل گیا
غم کے ماروں کو بڑی شئے ہے سہارا حسن کا
اہلِ دل جیتے ہیں تو جیتے ہیں اُس کے نام پر
کس قدر جاں بخش ہوتا ہے نظارہ حسن کا
حسن کے سودائی دردِ آرزو دل میں لئے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں دنیا میں سراپا حسن کا
انتظارِ حسن میں فرہاد و وامق چل بسے
ہو سکا ہے ایک بھی وعدہ نہ ایفا حسن کا
مہر روشن ہے زندگی کی حسن سے نکھری ہوئی
ہر گل تر میں نظر آیا ہے جلوہ حسن کا

نقد و نظر

"تبصرہ کیلئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے۔ جن کتابوں پر تبصرہ ہو جاتا ہے۔ وہ ادارہ کے کتب خانہ میں داخل ہو جاتی ہیں اور اوقات کتب خانہ میں ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے"۔

تذکرہ ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ مالک رام۔ ناشر ساہتیہ اکیڈیمی نئی دہلی۔ سائز ڈیمی۔ کاغذ، کتابت، طباعت اعلیٰ صفحات ۴۲۲ مجلد دفتی قیمت ۱۵ روپے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ تذکرہ کئی ناشروں نے بارہا شائع کیا ہے پہلی دفعہ ۱۹۱۹ء میں مولانا کے دوست فضل الدین احمد نے شائع کیا تھا۔ مولانا کے اسلوب کے تعلق سے تو کچھ کہنا نہیں ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ مولانا نے اپنی تحریریں میں جو آیات، احادیث، اشعار اور اسمائے کتب دیئے ہیں ان کے متعلق معلومات رکھنا اور انھیں پوری طور پر سمجھنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔ اس کیلئے اتنے ہی زیادہ مبلغ علم اور درک و بصیرت کی ضرورت ہے جس سے ہمارا آجکل کا تعلیم یافتہ طبقہ محروم ہے۔ اس لئے کہ وہ دینی تعلیم سے بے نیاز ہے اور ہوتا جارہا ہے۔ اب اگر مولانا کی تحریروں کو وہ پڑھنے کی کوشش کرے تو عربی اور فارسی آمیز عبارت اور اس کے مختصر مختصر اور چھوٹے چھوٹے اقتباسات جو جابجا دیئے گئے ہیں۔ اس سے گھبرا جاتا ہے۔ اسی لئے اس کو ایسے انداز میں ترتیب دینے کی ضرورت تھی کہ قاری کی دشواریوں کا کچھ حل نکل آئے۔

غالبیات کے رام جناب مالک رام نے غالبیات کے علاوہ کربل کتھا اور غبار خاطر کو بھی مرتب کیا ہے ان کی ترتیب اس اہتمام سے کی گئی ہے کہ کوئی بات، کوئی اقتباس، کوئی تلمیح اور نہ کوئی شعر تشنہ نہ رہنے پایا اور تمام چیزوں کا حوالہ دے دیا گیا۔ تذکرہ میں بھی فاضل مرتب نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو روبکار لاکر تذکرہ کی اہمیت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ حواشی میں ان تمام بزرگوں اور علما کے حالات اجمالی طور پر دے دیئے گئے ہیں جن کا ذکر متن میں ملتا ہے۔ مولانا نے جو اشعار استعمال کیئے ہیں۔ انھیں متعدد دواوین، کلیات اور تذکروں کی ورق گردانی کر کے شعرا کے نام بتائے ہیں اور اگر مولانا نے کہیں کوئی شعر، کوئی جملہ یا عبارت غلط العوامی ہو تو اصل کتاب سے مقابلہ کر کے اس کی صحت کر دی گئی ہے۔ اور یہ بتلا دیا گیا ہے کہ مولانا نے کیا لکھا تھا یہ اکثر جگہ

ہوا ہے اور ایسا ہونا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ مولانا کی تحریر کا بیشتر دار و مدار حافظہ پر تھا اور وہ قلم برداشتہ لکھتے جارہے تھے۔ انھیں نظر ثانی کا بھی موقع نہیں ملا اور ان کی تحریر کا ایک جزء "تذکرہ" کے نام سے منظر عام پر آگیا اور بقیہ حصہ اب تک تقریباً ناپید ہی ہے۔ اس میں بعض اشعار ایسے بھی ملیں گے جن کے شاعر کا نام معلوم نہ ہوسکا۔

حواشی کے بعد اسمار رجال، اسمائے بلاد واماکن، آیاتِ قرآنی وارد متن اور احادیث واردہ متن کی فہرست ہے۔ آخری فہرست میں حواشی کے ماخذ ہیں جن میں اردو، فارسی اور عربی کی تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں شامل ہیں۔ اس سے فاضل مرتب کی دیدہ ریزی، جانکاہی اور فضیلت علمی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اب تذکرہ کے قاری کو کسی قسم کی وقت محسوس نہیں ہوگی بشرطیکہ وہ عربی اور فارسی سے قدرے واقف ہو۔

ساہتیہ اکیڈیمی قابل مبارکباد ہے کہ اس نے نہ صرف ایک اچھی کتاب اعلیٰ پیمانہ پر شائع کی بلکہ اس کی ترتیب و تدوین کیلئے ایک فاضل مرتب کا بھی انتخاب کیا۔ فاضل مرتب بھی اس سلسلے میں قابل مبارکباد ہیں۔

سیپ ۱۴　سہ ماہی۔ ایڈیٹر نسیم درانی۔ بلاک 'ڈی' شیر شاہ کالونی کراچی ۲۸
قیمت فی پرچہ تین روپے۔ سالانہ چودہ روپے مع خرچ رجسٹری۔

ادارہ فکر نو کا یہ ترجمان نامور ادیبوں اور شعرا کی نگارشات کے ساتھ ساتھ جواں سال ادیبوں اور شعرا کی تخلیقات کو بھی پیش کرتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں محمد احسن فاروقی، جمیل جالبی، فرمان فتحپوری، میمونہ انصاری، اور طیب انصاری کے ساتھ ڈاکٹر کریم الدین احمد اور محمد علی صدیقی بھی نظر آتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے مزاح، فلسفہ، فن اور قوت تخلیق، پر جمیل جالبی نے کلاسیک کے مفہوم، پر فرمان فتحپوری نے اکبر اور سرسید، پر میمونہ انصاری نے حجاب اور رومانیت پر اور طیب انصاری نے مخدوم پر مقالے لکھے ہیں۔ کریم الدین احمد نے قابل اجمیری کا تعارف کرایا ہے اور محمد علی صدیقی نے جمالیاتی اضافیت، جیسے خشک موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ حجاب امتیاز علی ربع صدی پہلے بہت ہر دلعزیز اور مقبول ادیب رہی ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ حجاب امتیاز علی تاج سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حجاب اسمٰعیل کو حاصل رہی ہے اور حجاب امتیاز علی کا روپ دھارنے کے بعد ان کے قلم میں رکاوٹ سی پیدا ہوگئی اور انھوں نے کم لکھا۔ ان کے فن پر ہمارے ادیبوں نے بہت کم توجہ دی ہے، ڈاکٹر میمونہ انصاری نے حجاب کے فن پر لکھ کر بہت پرانی یاد تازہ کر دی ہے۔

طیب انصاری نے مخدوم پر قلم اٹھایا ہے وہ آخری حصہ میں مخدوم کی شاعری سے ہٹ کر بھی کچھ باتیں کہہ گذرے ہیں جس سے مخدوم یا اس کی شاعری سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ واعظانہ انداز ادیب کے لئے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

مطالعہ کے تحت نگار صہبائی نے آرزو لکھنوی کے فن پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے متعدد گیت پیش کئے ہیں

میراجی کی غیر مطبوعہ نظمیں بھی شریک ہیں، افسانوں میں پرانے . . . افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ نئے افسانہ نگار بھی نظر آتے ہیں۔ انتظار حسین، انور، محمد احسن فاروقی، رام لعل، ہنس راج رہبر، اقبال متین، گربچن سنگھ کے ساتھ سلیم اختر رفعت مرزا، دھوی، نکہت مرزا، رشید امجد اور ذوالفقار انور وغیرہ شریک ہیں اور اس طرح یہ ایک دلکش مرقع اور اچھا گلدستہ بن گیا ہے۔ ظہیر کاشمیری کی طویل نظم ایک تصویر یہ، قابل مطالعہ ہے۔

جوش ملیح آبادی نے میرے زمانے کے موسم پر شاعرانہ انداز میں گل کھلائے ہیں اور ٹیگور کا خاکہ بھی لکھا ہے احمد ندیم قاسمی پر آغا سہیل کا ایک سیر حاصل مضمون ہے۔ نثر اور نظم ہر لحاظ سے سیپ کا یہ شمارہ قابل مطالعہ ہے۔

خطوط بہادر یار جنگ

مرتبہ نذیر الدین احمد یونسپل کونسلر۔ ملنے کا پتہ ادبی ٹرسٹ بلڈنگ عابد روڈ حیدرآباد۔ سائز ۱/۱۶ کراؤن۔ خوبصورت ٹائٹل صفحات ۱۱۲ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

یہ ۹۴ خطوط کا مجموعہ ہے جو نواب بہادر یار جنگ نے اکثر مقامی اور بیرونی حضرات کو لکھے۔ ان میں بہت کم خطوط ایسے ہیں جن میں بے تکلفی کا انداز جھلکتا ہو۔ لیکن صاف گوئی نواب صاحب مرحوم کا مسلک رہا ہے اس لئے جگہ جگہ اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ وہ فصیح البیان خطیب تھے۔ خطوں میں بھی ادیبانہ شان کے ساتھ خطیبانہ انداز بھی نظر آجاتا ہے۔ ان میں اسلامی جذبات کی ترجمانی بھی ہے اور قومی مسائل کا ذکر بھی۔ ان خطوط میں معمولی حیثیت کے لوگ بھی ہیں اور متوسط طبقہ کے بھی اس سے مرحوم کی وسیع القلبی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک جاگیردار تھے اور ایسے ہی نظام میں پرورش پائے ہوئے تھے لیکن اسلامی مساوات کے جذبہ سے بھی سرشار تھے۔

بہادر یار جنگ کے خطوط مشاہیر کے نام

مرتبہ نذیر الدین احمد سائز ۱/۱۶ کراؤن ۳۱۲ صفحے قیمت دو روپے

۲۴۸ خطوط کا یہ مجموعہ حیدرآباد اور ہندوستان میں آزادی کیلئے مسلم لیگ کی جدوجہد پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور اس امر کی بھی شہادت پیش کرتا ہے کہ نواب صاحب مرحوم کی خطابت نے کیسے کیسے حضرات کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ نواب صاحب ایک خطیب ہی نہیں بلکہ غیر معمولی طور پر تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ خطوط میں جگہ جگہ اس کا اظہار ہوتا ہے۔ حفظ مراتب کا خیال ان کے متعدد قسم کے انداز تخاطب سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان میں سیاسی، معاشی، اقتصادی اور مذہبی سب ہی خیالات کا اظہار ہوا ہے۔ نواب صاحب مرحوم کے مکتوب الیہم میں ملکی قایدین بھی ہیں اور مشرق متوسط کے قایدین بھی۔ حکومت کے افراد بھی ہیں اور علما اور شائقین بھی۔ اور جن سے نواب صاحب مرحوم جو کام لینا چاہتے ہیں وہ نہایت بلیغ انداز میں بیان کرجاتے ہیں۔ خطابت میں فصاحت و بلاغت کا جو انداز تھا اس کا عکس ہمیں ان خطوط میں بھی ملتا ہے۔ مرتب نے نواب صاحب مرحوم کی تحریروں کا

تحفظ کرکے اہم خدمت انجام دی ہے اس کیلئے وہ قابل مبارکباد ہیں۔

مخدوم ایک مطالعہ

داؤد اشرف، ناشر انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش۔ سائز $\frac{1}{16}$ کراؤن صفحات ۱۶۰ گٹ اپ خوبصورت قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

مخدوم پر اب تک کئی مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ "صبا" نے بھی خاص نمبر شائع کیا ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جو مخدوم پر لکھی گئی۔ مخدوم کی شاعری کے تعلق سے یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا شاعری میں کوئی مقام متعین نہیں لیکن ناقدین مخدوم کی شاعری کے ادوار کو پیش نظر نہیں رکھتے۔

مخدوم کا طالب علمی کا زمانہ رومانی نظموں کا ہے اور ملازمت کی پابندیوں میں جکڑ جانے کے بعد وہ آزادی اور انقلاب کے نعرے لگاتے ہیں۔ ابتدا علانیہ اظہار سے ہوتی ہے اور یہی چیزیں بعد کو ایمائیت اور رمزیت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مخدوم نے تصورات میں تبدیلیاں تیزی سے کیں اور اسی لئے ناقد انھیں کسی ایک سانچے میں نہیں بٹھا سکتا۔ وہ جگر اور فانی نہیں کہ ایک ڈگر پر چلتے۔ انھوں نے جوش سے کچھ لیا لیکن جوش بے عمل ہیں اور مخدوم سراپا عمل۔ عمل کرنے والا بیچاسوں مراحل سے گذرتا ہے وہ رہ نورد شوق ہوتا ہے۔ اور دیگر شعرا اپنی منزل سے آگے دیکھنے نہیں پاتے۔

داؤد اشرف نے مخدوم کی شاعری کا تجزیہ تو کیا ہے۔ لیکن نقادوں کی رائے سے بھی وہ متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن پھر بھی انھوں نے اکثر و بیشتر نظموں کا تجزیہ کرکے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو نے اپنی سب سے پہلی کتاب مخدوم کی تصنیف ٹیگور اور اس کی شاعری شائع کی اور انجمن تحفظ اردو نے اپنی پہلی کتاب مخدوم پر شائع کی۔ دونوں اداروں نے فرزندان جامعۂ عثمانیہ کی حوصلہ افزائی کی۔ ہمیں توقع ہے کہ اس طرح انجمن نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اچھی کتابیں منظر عام پہ لائے گی۔

حیات پاک

مرتبہ سید محمود دید اللہی۔ سائز $\frac{1}{16}$ کراؤن صفحات ۲۵۶ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ ۵۷-۲-۱۶ عقب جدید بلڈنگ گورنمنٹ پریس چنچل گوڑہ حیدرآباد

پیش نظر تالیف حضرت سید محمد صاحب جونپوری (مہدی موعود علیہ السلام) کی سوانح عمری ہے۔ اس کو بارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب نویں صدی ہجری میں ہندوستان کی سیاسی اور تمدنی حالت پر ہے اور دوسرے باب میں بعثت مہدی پر احادیث جمع کی گئی ہیں۔ تیسرے باب میں بعثت کی ضرورت اور چوتھے میں مختلف کتب تاریخ سے دعویت مہدیت کے واقعات بحوالہ قلمبند کئے گئے ہیں۔ پانچویں باب تا آخر تک حضرت سید محمد صاحب کی ولادت سے لیکر ہجرت، حج، واپسی اور تبلیغ کے واقعات مستند حوالوں کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ مہدیت کی تعلیمات کو سمجھنے میں بھی یہ تالیف ممد ہو سکتی ہے۔ انداز بیان سلجھا ہوا اور زبان شستہ ہے۔ صاحب ذوق اس سے استفادہ کرکے حظ حاصل کریں گے۔ ۲۱۱۲۰ (لقی)

یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء جلد ۳۲ شمارہ ۳

ماہ مارچ سنہ ۱۹۷۶ء

ماہنامہ

سب رس

نگران

پروفیسر سید علی اکبر ایم۔اے (کینٹب)

مجلس مشاورت

[illegible] حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکسینہ

ڈاکٹر غلام عمر خاں، محمد منظور احمد

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

[illegible] منتظم

محمد جمال الدین وقار خلیل

سالانہ چھ روپے غیر ممالک سے دس روپے

ششماہی تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے

جواب کے لیے ۷۵ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ پرنٹر و پبلشر

[illegible]

[illegible] سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

فروری غالب صدی کا مہینہ تھا۔ غالب اگرچہ ہندوستان میں پیدا ہوئے لیکن ان شاعری اور خطوط نگاری نے ان کو عا
بنا دیا۔ امریکہ اور یورپ کے مختلف ملکوں میں بھی انھیں ایسی ہی شہرت حاصل ہوئی جیسی کہ ایشیا میں ہندوستان، پاکستان، روس، ایران، اور افغانستان میں
یاد میں کچھ نہ کچھ کیا گیا۔ کہیں ان کی تصانیف نئے سرے سے مرتب اور شائع ہوئیں کہیں ان پر کتابیں لکھی گئیں اور کہیں صرف ان کا نام اور شعری محفل
باعث ہوئے۔ اس میں سب سے زیادہ شاندار اور مستقل یادگار غالب اکیڈیمی کی وہ عمارت ہے جو حکیم عبدالحمید صاحب (ہمدرد دواخانہ) کے عطیہ اور ان
روز محنتوں کا نتیجہ ہے۔ اس عمارت میں غالبیات پر مشتمل ایک کتب خانہ، آڈی ٹوریم اور محققین کی سہولتوں کیلئے ہر قسم کا ساز و سامان رکھا
مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے نمائش اور مشاعرہ کے علاوہ علی گڈھ میگزین اور فکر و نظر کے غالب نمبر پیش کرنے کا پروگرام بنایا ہے اور انجمن ترقی ار
نیا ایڈیشن، فارسی خطوط غالب کا اردو ترجمہ اور غالب کے غیر متداول کلام کی شرح شائع کر رہی ہے۔ ہندوستان کے کئی رسائل غالب نمبر شائع کر
جن میں "شبستان" اور "ہما" کے شمارے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ حیدرآباد میں جناب ضیاء الدین شکیب کی مرتبہ کتاب "غالب اور حیدرآباد
شائع کر رہی ہے۔ پاکستان میں بھی کئی رسائل غالب نمبر شائع کر رہے ہیں جن میں نقوش، اردو، صحیفہ اور قومی زبان وغیرہ شامل ہیں۔ ماہنامہ کتاب
غالب بعید دیوان جو آغا طاہر کے مرتب کردہ نسخہ پر مبنی ہے نقد و حواشی کے ساتھ منظر عام پر آ چکا ہے۔ ان سب کے ساتھ اگر ہندوستان میں غالب کی زبان
پورے حقوق دیئے جاتے۔ یوپی اور آندھرا پردیش میں اس کو تعلیمی زبان تسلیم کر کے مدارس کی سہولتیں عام کی جاتیں تو یہ حکومت کا بڑا کار
اس یادگار موقع پر اگر ارباب غالب کمیٹی اور پرستاران غالب اردو زبان کے تحفظ کیلئے بھی جد و جہد کرنے کا پروگرام بنائیں تو شاید اردو
گریہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں ـــــ ادارۂ ادبیات اردو بارہ سال سے یوم محمد قلی قطب شاہ منا رہا ہے۔ اس یوم کے منانے کی
ڈالی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ریاست حیدرآباد (ممالکت آصفیہ) جب مرحوم ہو کر ٹکڑے ہوئی تو قطب شاہی عہد کی ریاست حیدرآباد (ممالکت
آگئی۔ یہ یوم ۲۲ اور ۲۳ فروری کو منایا گیا۔ اس کا انعقاد ایسے وقت ہوا جب کہ آج سے بارہ سال پہلے قطب شاہی دور کے حدود
ہوئی۔ عوام اب اس کو قبول کرنے سے ابا کر رہے ہیں اور ہر طرف اجنبی خود رستا خیز ہے۔ یوم قلی کی تقریب نے اپنے عوام کو ایک بار پھر یک جہتی
کا درس دیا ہے اور دوئی کے زہر کو امرت میں بدلنے کی کوشش کی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے جو اردو فارسی اور تلنگی کا شاعر تھا اپنے رس
منائے ہیں۔ یہ وہ پریم رس تھا جس سے سارا آندھرا سرشار تھا۔ اس کے طویل دور حکومت میں نہ کہیں جنگ ہوئی اور نہ کہیں خون کا
آج بھی اس کی روح شانتی اور سکون چاہتی ہے۔ اس یوم کی تفصیلات آئندہ کسی شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ یوم جمہوریہ کے موقع پر اس سال اردو
ہستیوں کو پدم بھوشن کا اعزاز ملا ہے ان میں کرشن چندر، پروفیسر مارون خاں شروانی اور ساغر نظامی شامل ہیں۔ پدم شری کا اعزاز
خواجہ احمد عباس اور امریتا پریتم کو ملا ہے۔ ہم سب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ حکیم احمد شجاع ایک ممتاز خاندان کے فرد تھے اور ڈرامہ نگار
کشمیری کے شاگرد تھے انھوں نے اردو کو بہت کچھ دیا۔ ڈرامے لکھے۔ افسانے لکھے۔ رپورتاژ لکھے "ہزار داستان" جاری کیا "نونہال" کے ایڈیٹر رہے
لکھیں۔ ہر صنف میں شعر کہے اور آخر عمر میں کلام پاک کی تفسیر لکھنی شروع کی تھی نقوش میں ان کے رپورتاژ "لاہور کا چیلسی"
افسوس کہ اردو کے دامن کو مالا مال کرنے والی ہستی ـــ ہم سے جدا ہو گئی۔ خدا مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ حمیدیہ کالج کے

ڈاکٹر وحید قریشی

تحقیقاتی کارنامے

(ایک جائزہ)

اردو میں ادبی تحقیق کا آغاز یوں تو دور سرمایہ [illegible]
تصحیح متن اور مقالات میں تحقیقی شعور کی کچھ جھلکیاں ملتی ہیں [illegible]
جنگ عظیم سے شروع ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زور، عبدالسلام ندوی، سید سلیمان ندوی [illegible]
ڈاکٹر مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، پروفیسر محمد اقبال اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے نام [illegible]
قابل ذکر ہیں۔ ان سے قبل مشرقی علوم میں تحقیق کی روایت بہت کچھ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ [illegible]
اور مستحکم ہو چکی تھی اور یہی لسانی اور تصحیح متن کی روایت پاک و ہند کی یونیورسٹیوں میں پروان چڑھی۔ [illegible]
کی تحقیق و تدقیق بھی اسی تحقیقی روایت کا حصہ ہے۔ جن بزرگوں کے نام ابھی اوپر لیے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے علمی
کارنامے اردو ادب کی حدود سے نکل کر عربی اور فارسی کے ذخیرے تک جاتے ہیں۔ متنوں کی ترتیب، تصحیح، تاریخ
ادب کے غیر معلوم گوشوں کی دریافت، زبان کے آغاز و ارتقا کی نشان دہی اور شعرا و ادبا کے حالات زندگی
کی تعیین کے علاوہ ان علوم کی بازیافت اُن لوگوں کا حصۂ خاص ہے جو مسلمانوں کے علوم اور مسلمانوں کی معاشرت
سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی کی [illegible] فائلوجی کے اصولوں اور زبانوں [illegible]
کا بہت شوق رکھتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر ادب کو تاریخ کے تناظر میں دیکھنے [illegible]
نمایاں ہے۔ اس سے ہماری تاریخ ادب کی تدوین [illegible]
آگے اُن کی تاویل و تشریح اور فلسفیانہ توجیہ تک لے جانے میں ان صاحبوں نے زیادہ توجہ نہیں کی۔

اس کا فوری یہ اثر ہوا کہ آئندہ کیلئے تحقیق اور تنقید الگ الگ خانوں میں بٹ گئی [illegible]
تنقید تحقیق سے ایک بڑی حد تک بے نیاز ہو کر چلنے لگی۔ اس سلسلے میں انفرادی تلاش و جستجو کے علاوہ دبستانی
سطح پر جو کام ہوا ہے۔ اس کے بڑے بڑے مرکز حیدر آباد دکن، اعظم گڑھ اور [illegible] قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ تحقیقی
اصولوں کے استعمال میں ان دبستانوں کے نظریات میں بین فرق ہے [illegible] تصحیح متن میں [illegible] نسخوں کے
اختلاف کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور [illegible]
کتابوں پر رکھتے ہیں اور تاریخ سے حاصل ہونے والی معلومات کو ادبی مواد سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں کرتے

تاہم اس سے دکنیات کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے آگیا۔ لسانی لحاظ سے دوسرے دبستانوں پر دکن کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہاں کے محققین زبان کے آغاز و ارتقا کے مسائل میں زبان کو فلالوجی کی حدوں سے نکال کر صوتیات کی منزل میں لے آئے۔ یہی توانا روایت دوسرے علاقوں کے محققین کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی چنانچہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں سے لے کر دور حاضر میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تک یہ صوتیاتی شعور ایک مستقل اور سائنٹیفک علم کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ تحقیق کا دوسرا دبستان جس کا دوسرا مرکز اعظم گڑھ ہے۔ اس لحاظ سے دکنی دبستان سے مختلف ہے کہ وہاں اردو کو صرف زبان کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی علمی زبان کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی گئی اور اس صورتِ حال کا علمی جائزہ مذہبی رجحانات اور مذہبی علوم کی روشنی میں لیا گیا۔ علامہ شبلی کی مورخانہ روایت ان لوگوں کیلئے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ متن کی ترتیب و تصحیح کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ اس کے مقابلے میں اردو ادب کے بنیادی مسائل کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔

تیسرا دبستان لاہور یا اورینٹل کالج لاہور کا دبستان ہے۔ یہ محققین مختلف علوم کے مطالعے کو زبان کے مطالعے کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں اس لیے انھوں نے ادب کو معاشرتی علوم کے حوالے سے دیکھنے کی سعی کی۔ خصوصاً تاریخ کو ان کے نظام تحقیق میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ لوگ بنیادی طور پر محققین ہیں اور ادب سے حاصل کردہ واقعات اور متن کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اردو تحقیق کی روایت میں انھوں نے احتیاط کا اعلیٰ معیار قائم کیا تحقیق میں سہل انگاری اور حوالے کی بے احتیاطی کا محاسبہ سختی سے کیا گیا۔ تحقیقی میدان میں ان محققین کا کارنامہ خاص یہ ہے کہ اردو تحقیق کی مخصوص زبان وضع کرنے کے علاوہ ان بزرگوں نے تحقیقی مقالات میں اسلوب کی اہمیت پر بہت زیادہ اصرار کیا اور کھرے کھوٹے کی تمیز میں بے رحمی اور بے لحاظی کے عناصر کو ضروری گردانا۔ بنیادی اور ثانوی ماخذ کے درمیان امتیاز، دلائل کی مختلف کڑیوں کی پوری چھان بین نسخوں کی قدامت کا تعین، رسم الخط کے عہد بہ عہد تغیرات کا احساس اور املا کے خصائص کے ادراک کے علاوہ حوالوں کے اندراج میں اخلاقی قدروں پر سختی سے عمل اس دبستان کی خصوصیات ہیں۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہ سالے میں ان مذکورہ دبستانوں کے علاوہ رام پور اور پٹنہ کے دبستان بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پٹنے کے دبستان میں قاضی عبدالودود، ڈاکٹر اختر اورینوی، ڈاکٹر مختارالدین آرزو کے علاوہ ایک خاصا بڑا گروہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان میں قاضی عبدالودود صاحب سرخیل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان ہی کے اصولوں اور قواعد کی پابندی باقی محققین کے ہاں نظر آتی ہے۔ قاضی صاحب نے ثانوی ماخذ سے بالعموم صرف نظر کیا اور اپنی تحقیق و تدقیق کو معاصر مواد تک محدود کر دیا۔ حوالے میں احتیاط کا عنصر قاضی صاحب کے

ہاں بہت ہے۔ دبستان لاہور کے مقابلے میں اس دبستان میں ایک کمی البتہ یہ نظر آتی ہے کہ مخففات کے بے دریغ استعمال سے تحریر کی روانی اور اسلوب کا حسن ماند پڑ گیا ہے۔ معام مواد سے مناسب حد تک نتائج اخذ کر کے حوالوں کو اپنی تحریر کا لازمی حصہ بنانے کا طریقہ ترک ہو گیا ہے۔ اور مواد کو خام صورت میں قارئین تک پہنچانے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ترتیب متن میں البتہ ان محققین نے بہت کام کیا ہے اور متن میں جو معیار پٹنے کی تصانیف میں ملتا ہے، وہ لاہور کے دبستان کی تصانیف سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

رام پور کے دبستان میں مولانا امتیاز علی صاحب عرشی کی ذاتِ گرامی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ عرشی صاحب نے متن کی تصحیح میں جو محنت اٹھائی ہے اُس کے قابل قدر نمونے مکاتیب غالب، سلک گوہر اور دستور الفصاحت ہیں دستور الفصاحت کی ترتیب اور تحشیے میں تذکروں کی ترتیب کا ایک نیا اسلوب نکالا گیا ہے جس سے حواشی اصل کتاب کے علاوہ معلومات کا ایک بڑا گنجینہ بن گئے ہیں۔

تقسیم برصغیر کے بعد اردو تحقیق اور تنقید کا سلسلہ ابتدائی چند برس میں ایک بڑی حد تک منتشر ہو گیا سیاسی حالات۔ اور آبادی کے نقل مکانی نے پاکستان اور بھارت دونوں جگہ سیاسی اور سماجی سطح پر کئی تبدیلیاں پیدا کیں تحقیق ایک صبر آزما عمل ہے۔ اس میں جن سہولتوں اور مواد کے ذخیروں کی ضرورت ہے۔ وہ تاریخ کے ایسے دور میں میسر نہ تھی۔ جب کہ ایک طرف مہاجرین کی بحالی اور دوسری طرف نوزائیدہ مملکت کی بقا کے مسائل درپیش تھے ذہنی سکون کے رخصت ہو جانے سے وہ فرصت اور علمی تگ و دو میں وہ انہماک باقی نہ رہا جو کسی اعلیٰ پائے کے علمی کام کیلئے ضروری ہے ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک ملک کی سیاسی حالت مسلسل اور متواتر بحران کا شکار رہی۔ حکومت اعلیٰ پیمانے پر تعلیمی منصوبہ بندی نہ کر پائی۔ اگرچہ انفرادی طور پر پاکستان میں تحقیق کی روایت کسی نہ کسی طرح زندہ رہی اور حکومت بھی بعض اداروں کی تشکیل اور مالی اعانت کسی نہ کسی حد تک کرتی رہی لیکن اعلیٰ تحقیقی کام کیلئے فضا تیار نہ ہو سکی۔ آخر کار پہلے پنج سالہ منصوبہ میں جو ۱۹۵۵ء سے لیکر ۱۹۶۰ء تک کے دور کو حاوی تھا۔ مختلف تعلیمی مدارج میں تحقیق کی اہمیت کو پیش نظر رکھا گیا۔ اس منصوبہ کے خالقین نے واشگاف الفاظ میں اس بات کا اقرار کیا کہ یونیورسٹی کی سطح پر تحقیقی کام کی تشکیل نواز نا ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا اقرار بھی کیا گیا کہ ہمارے ملک میں ابھی تحقیق کا وہ شعور پیدا نہیں ہوا جو علم اور حصول علم کو انقلاب آفریں بنا سکے۔

پاکستان میں تحقیقی کام کی رفتار سست رہی ہے۔ بھارت میں اردو دشمنی کی لہر اور حکومت کی معاندانہ روش کے باوجود اردو تحقیق میں جس معیار کا کام ہوا ہے۔ ہمارے علمی سرمایہ میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سبب شاید یہ ہے کہ وہاں اردو ادب اور زبان کی خدمت ایک مقدس فریضہ اور مجاہدانہ انہماک کا نتیجہ ہے۔ وہاں اردو کی تحقیق [illegible] اب اگر اردو زندہ رہے گی تو اس لئے کہ اردو زبان کی بقا کا تحفظ کا [illegible]

خود ان کی مرگ وحیات کا مسئلہ ہے۔ اس احساس کے تحت وہاں علمی سرگرمی کی رو زیادہ موثر اور متحرک ہے۔ [illegible] ہمارا [illegible] کو علمی [illegible] جو بہ لحاظ میسر ہیں ان کا سامان اس نو زائیدہ مملکت میں فی الحال ممکن [illegible] علمی [illegible] ہے۔ پاکستان میں تحقیق کے میدان میں پس [illegible] اس مذکورہ سبب کا احساس ہماری حکومت کو بھی ہے وہ اپنے وسائل کا ایک اہم حصہ [illegible] تحقیق کے لیے وقف کر رہی ہے۔ پاکستان کی یونیورسٹیوں میں جو اعلیٰ تعلیم کے علاوہ تحقیق کے بھی مراکز ہیں ہر سال کم و بیش ۲۰ لاکھ روپے کی مالی امداد صرف تحقیقی وسائل پر صرف ہو رہی ہے اور اس رقم کا ایک حصہ ان منصوبوں کیلئے وقف ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اردو زبان و ادب سے متعلق ہیں۔ علاوہ ازیں اردو زبان و ادب کے لئے حکومت ہر سال کم و بیش سولہ لاکھ روپے مختلف اداروں کی تحویل میں دیتی ہے۔ اس سے ہمارے ہاں تحقیقی کام کی اہمیت کا کچھ قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اس مرحلے پر لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کی اس امداد کے باوجود آخر ہمارے ہاں تحقیق کا معیار کیوں بلند نہیں ہو رہا؟ اس کے کچھ بنیادی اسباب ہیں۔

پاکستان ایک زرعی ملک ہے جو زرعی مدارج سے ترقی کرتے ہوئے صنعتی دور میں داخل ہو رہا ہے۔ نوزائیدہ مملکت کی حیثیت سے بھی اسے کئی دشواریوں کا سامنا ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں تو اُسے اپنی بقا کے لیے اپنے تمام ملکی و ملّی وسائل کو بروئے کار لانا پڑا۔ ایسے معاشرے میں جہاں اپنی بقا کا مسئلہ دیگر مسائل پر فوقیت رکھتا ہو اور قوم کا ہر فرد مادی اور منفعت بخش پیشوں کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ جہاں قومی فلاح و بہبود کے تقاضے صنعتی اور مشینی معاملات پر منحصر ہو جائیں وہاں اُن ادبی مشاغل کی اہمیت برقرار نہیں رہ سکتی۔ جو فوری طور پر سرمایہ کاری اور دولت اندوزی کا ذریعہ نہ ہوں۔ نئے صنعتی دور کے زیر اثر وجود میں آنے والا نیا طبقہ علوم و فنون کے تعمیری پہلوؤں کا محافظ تو ہو سکتا ہے لیکن اس سے سنجیدہ تحقیقی معاملات اور تہذیبی [illegible] کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حکومت کی بیش از بیش توجہ اور تحقیق کے لیے رقوم کی فراہمی کے باوجود [illegible] ترقی کی دوڑ میں وہی علوم و فنون پنپ سکتے ہیں جن سے کاروباری اور تجارتی مفادات وابستہ ہو سکیں اور ظاہر ہے تحقیق ادب ان افادی پہلوؤں سے ایک بڑی حد تک خالی ہے۔ تقسیم برصغیر کے وقت ہمارا علمی سرمایہ بھارت کی لائبریریوں میں رہ گیا۔ انڈیا آفس کی کتابوں کا مسئلہ ہنوز حل طلب ہے۔ تشکیل پاکستان [illegible] ہمارے پاس ڈھاکہ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی کی لائبریریوں کے علاوہ پنجاب پبلک لائبریری [illegible] حکومت [illegible] یونیورسٹیوں کے قیام کے ساتھ ساتھ [illegible] تہذیبی ورثے کا ایک اہم مرکز [illegible]

بس کی لائبریری آج اپنے مخطوطات کے سرمایے کے لحاظ سے پنجاب یونیورسٹی کے دوش بدوش پہنچ چکی ہے
کے علاوہ حکومت کی امداد سے قائم ہونے والے ادارے اور اکیڈمیاں بھی کتابوں کی جمع آوری میں
ن ہیں۔ لیکن ہمارا یہ علمی سرمایہ فی الحال اُن ذخائر کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو بھارت اور انگلستان میں
ے ہیں۔ محققین کو پاکستان میں موجود کتب خانوں سے استفادے کے پورے وسائل بھی میسر نہیں۔ نتیجہ
، کہ ایک تو یہ سرمایہ ہی قلیل ہے، دوسرے مختلف اداروں میں باہمی تعاون کی کمی کے سبب کتابوں سے
اده بھی آسان نہیں۔ اعلیٰ پائے کی تحقیق کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ ان میں مواد کی فراہمی، فرصت
ن اور مناسب مالی حوصلہ افزائی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ایک نو زائیدہ مملکت میں، جہاں قوم کا ہر فرد
منفعت کی دوڑ میں مصروف ہو۔ اُس فرصت اور اطمینان قلب کا میسر آنا ممکن نہیں جو تحقیق کے لیے
ری ہے۔ پھر ایک قباحت یہ بھی ہے کہ صنعتی ترقی کے بخار میں مبتلا معاشرہ، علمی کاموں کو بھی کاروباری
رز سے جانچتا ہے۔ تحقیقی کام کی رفتار کا اندازہ بھی مشینی ترازو میں کیا جائے تو پھر تحقیق میں معیار کا مسئلہ
سب ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ رجحان عام ہے کہ ہم ہر تحقیق کا نتیجہ فوری طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ شکر کے
انے جس طرح اپنی پیداوار (PRODUCTION) کا علمی ثبوت مہیا کرتے ہیں اور ہر سال جنس کے انبار
اپنی افادیت ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح تحقیق ادب میں بھی ہم معیار کے مقابلے میں مقدار کے پیچھے پڑے
ہیں۔ اس کی ادنیٰ سی مثال اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ تاریخ ادبیات اور اردو لغت جیسے
منصوبے ہیں ان اہم منصوبوں میں بھی ہم فوری نتیجے کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ تحقیق
الدین کا چراغ نہیں کہ اسے گھسا کر فوراً مطلب کی چیز برآمد کر لی جائے۔ اس صورتِ حال کا فوری اثر
کہ مختلف اداروں کو اپنے بچاؤ کے لیے خاصا وقت صرف کرنا پڑتا ہے جو بصورتِ دیگر وہ اپنے علمی کام
ن کرتے۔ دوسرے اپنے مال کو بازار میں لگا کر دوسروں پر سبقت لے جانے کی خواہش میں "محققین" کا تا
لے دوڑی" پر عمل کر کے تحقیق کے معیار کو پست سے پست تر کر بیٹھتے ہیں۔ جو محققین اس تیز رفتاری کا ساتھ
دیتے اور معیار کے پیچھے جاتے ہیں ان کے لیے علمی کام کے راستے مسدود ہونے کے امکانات بڑھتے ہیں۔
نے رفتہ رفتہ جاں کاوی اور محنت کا عنصر خارج ہونے لگا ہے اور یہ کوئی خوش آئند بات نہیں ہے۔

صنعت کاری کی عمومی رو نے جہاں دوسرے ممالک میں اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت کی ہے
ں پاکستان بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکا۔ اقدار کی شکست کا یہ عمل شعر و ادب کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں
سکا۔ محنت سے جی چرائے ہوئے، آسان راستوں کی تلاش ہمارے تحقیقی و ادبی کارناموں میں واضح نقش
رہا ہے۔ اس سہل انگاری کے کئی مظاہر ہیں۔

(الف) حوالوں میں جعل سازی، یعنی متاخر کتب سے مواد لے کر حوالہ معاصر کتب کا درج کرنے کی رسم

(ب) حوالوں کے قلم بند کرنے میں بے احتیاطی

(ج) دوسروں کے کیئے ہوئے علمی کام کو معمولی ردو بدل سے (بغیر حوالے کے) اپنے ہاں سمولینے کا رواج

(د) کتابیات کی ترتیب میں سائنٹیفک طریق کار سے غفلت۔

(۵) متن کی تصحیح میں عدم احتیاط، غیر معیاری نسخوں کو بنیادی نسخے قرار دینے کی غلطی، اختلاف نسخ کے قلم بند کرنے میں بے احتیاطی، پورے علمی ذخیرے کو سامنے رکھکر کام شروع کرنے کی بجائے ناقص ذرائع پر بھروسہ، چھپائی اور پروف ریڈنگ میں غفلت۔

ان خامیوں کے علاوہ اخلاقی قدروں سے صرف نظر کرنے کی وجہ سے بعض غلط رجحان بھی ہمارے ہاں فروغ پا رہے ہیں۔ ان میں دو کا ذکر ضروری ہے۔

اول یہ کہ پاک و ہند کے مختلف ادارے اور یونیورسٹیاں تقسیم کار کے اصول پر عمل پیرا نہیں۔ دس دس جگہ ایک ہی موضوع پہ کام ہو رہا ہے۔ محقق دوسرے پر سبقت لے جانے کی خواہش میں ناقص، ادھورا کام چھاپ کر مارکیٹ میں لانا یا پھر ٹائپ کر کے ڈگری کے لئے پیش کرنے میں کوشاں نظر آتا ہے

پاک و ہند میں تحقیقی کام کرنے والے گنے چنے لوگ ہیں۔ اگر وہ بھی یہ غیر علمی طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف چند موضوعات میں محصور کر لیں تو پھر تاریخ ادب کے غیر واضح گوشے اور مبہم حصے تحقیق کے محتاج ہی رہ جائیں گے۔ اس میں کچھ برائی نہیں کہ جس موضوع پر معیاری کام نہیں ہوا، اس پہ کوئی دوسرا محقق قلم اٹھا کر سواد کا اضافہ اور تاویل و توضیح کے بہتر نمونے پیش کرے اور اپنے پیش رو کی غلطیوں کی نشان دہی کر دے۔ یہ طریق کار بہت ضروری بھی ہے۔ لیکن بعد میں شائع ہونے والے تحقیقی کام میں اگر پیش رو کے مقالے کی خامیاں اسی طرح برقرار رہیں یا ان میں دس بیس کا اضافہ ہی ہو جائے تو پھر ایک دوسرے کے موضوع کی چھینا جھپٹی کا یہ عمل کسی طرح بھی قابل ستائش نہیں ہے۔

دوم یہ کہ مختلف ادارے اور یونیورسٹیاں اپنے ہاں ہونے والے تحقیقی کام کی مناسب رہنمائی اور باقاعدہ چھان بین نہیں کرتے۔ نوعمر محقق جلد سے جلد ڈگری حاصل کرنے کی آرزو میں اور فوری طور پر مصنف بن جانے کی تمنا میں کام پر مناسب توجہ نہیں کرتے۔ ایسے میں ہوتا یہ ہے کہ پیش رووں کے مال پر ہاتھ صاف کر لیا جاتا ہے۔

صورت حال کا اندازہ اس بات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ سرشار پر اس وقت آگرہ یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی اور لندن یونیورسٹی میں مقالے لکھے جا رہے تھے یا

پنجاب، علی گڑھ اور سری نگر میں بیک وقت کام ہوا اور ڈگریاں بھی مل چکی ہیں۔ طنز و مزاح پر پنجاب کے بعد لکھنؤ اور بمبئی میں تحقیقی کام ہوا۔ رسوا پر علی گڑھ بمبئی اور پنجاب میں ڈگریاں دی گئیں۔ اردو ادب کے سیاسی اور سماجی پہلو پر پنجاب اور سندھ میں۔ قائم پر علی گڑھ اور کراچی میں کام ہو رہا ہے۔ آزاد پر پنجاب سے اور اس کے بعد کراچی سے کام ہوا ہے۔ میر حسن پر پنجاب سے کام ہوا اور چھپ گیا اب کراچی یونیورسٹی اور پٹنہ میں بھی ہو رہا ہے۔ یونیورسٹیوں کے علاوہ ادارے بھی اس دوڑ میں مصروف ہیں۔ گلشن ہند از حیدر بخش حیدری کے متن کی اشاعت ڈاکٹر مختار الدین آرزو۔ ڈاکٹر اقتدا حسن اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے اپنے ذمے لی۔ آرزو کا متن آچکا ہے اور دوسرے ابھی مصروف ہیں "کربل کتھا" پر ڈاکٹر آرزو نے کام شروع کیا۔ اس کی خبر اہل دہلی کو بھی ہو گئی۔ چنانچہ دہلی یونیورسٹی کا متن فوراً چھپ گیا، پھر مالک رام اور آرزو نے بھی اپنا متن شائع کر دیا۔ مصحفی کے کلیات کی اشاعت کے سلسلے میں نثار احمد فاروقی اور نور الحسن نقوی کے درمیان دوڑ جاری ہے۔ نقوی نے دیوان مصحفی کی جلد اول دلی سے شائع کی، فاروقی جلد دوم چھاپ کر مارکیٹ میں لے آئے مصحفی کے آٹھ دیوان ہیں۔ دیکھئے یہ معرکہ کب تک جاری رہتا ہے لاہور سے دیوان زادے کا انتخاب چھپا اور فاضل مرتب پورا دیوان زادہ مرتب کر رہے تھے کہ یہی سلسلہ رامپور سے شروع ہو گیا۔ اب دونوں دیوان زادے گھوڑ دوڑ کے میدان میں اتر چکے ہیں۔

علمی و ادبی معاملات میں اس طرح کی تنگ نظری کسی اچھے معیار کا پیش خیمہ نہیں ہو سکتی۔ اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اب تک کہ باہمی آویزش سے جو سرمایۂ علمی سامنے آیا، اس کا زیادہ حصہ ناقص ہے.....

..کیونکہ بعض محققین گوئے سبقت لے جانے کی تگ و دو میں موضوع سے انصاف نہیں کر پاتے اور بعض نے دوسروں کی محنت کو بغیر حوالے کے اپنے ہاں سمو کر اخلاقی دیانت داری کا ثبوت نہیں دیا۔ اردو تحقیق کے لیۓ یہ صورت حال بہت تشویش ناک ہے۔

ہماری معاشرتی زندگی کا ایک اور رجحان بھی تحقیق کے لیۓ آزمائش کا حکم رکھتا ہے! اردو میں تحقیق کی روایت پہلی جنگ عظیم کے بعد تنقید سے الگ ہو گئی۔ ابتدائی محققین نے حقائق کی جمع آوری اور واقعات کی صحت کا خیال تو رکھا لیکن حقائق کی تعبیر، تاویل اور فلسفیانہ توجیہہ سے دامن کش رہے۔ تاریخ ادب کے لیۓ وہ خام مواد مہیا کر کے مطمئن ہو گئے اور ادب کے تخلیقی عمل اور تنقیدی شعور سے کنارہ کش رہے نقادوں نے تحقیق کو تنقید کے مقابلے میں گھٹیا ذہنی عمل گردانا اور تحقیق و تنقید کے فاصلے بڑھتے چلے گئے۔ تقسیم برصغیر کے بعد تنقید کو تحقیق کا دشمن قرار دے کر نقادوں نے یہ حقارت رویہ اپنا لیا۔ اس منافرت اور نفرت انگیز رویے نے تحقیق کے لیۓ تنقید کی اور تنقید کے لیے تحقیق کی ضرورت کا ادراک نہ ہونے دیا۔ محقق گلی سڑی ہڈیوں کے تاجر قرار پائے اور سماجی مرتبے کے ستحق [illegible] ہو [illegible] بہ صرف [illegible] کہ جلکہ [illegible] افرا لفظی [illegible] اردو ادب [illegible]

اہم محقق کھو دیے۔ بعض نے تحقیق سے توبہ کر کے تنقید کو اپنا لیا کیوں کہ تنقید کی مارکیٹ زیادہ بلند سماجی مرتبے کی ضامن تھی۔

گذشتہ بیس برس کے تحقیقی سرمایے کو نظر غایر سے دیکھا جائے تو اس میں سست روی کے باوجود ایک حصہ ایسا ضرور ہے جسے قابل قدر قرار دیا جا سکتا ہے۔ حکومت کی طرف سے تحقیق اور معیار کو بلند کرنے اور سہولت بہم پہنچانے کی کوششیں برابر جاری ہیں۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بعض ادارے قائم کئے گئے۔ ۱۹۵۸ء سے لیکر ۱۹۶۰ء تک کئی نئے ادارے اور نئے منصوبے اس میں شامل کئے گئے۔ انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، اقبال اکیڈمی کراچی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سندھی ادبی بورڈ، ترقی اردو بورڈ کراچی، اردو اکیڈمی بہاولپور، اردو اکیڈمی لاہور، مرکزی اردو بورڈ لاہور، پشتو اکیڈمی پشاور وہ چند ادارے ہیں جو مختلف مرحلوں میں حکومت کی مالی امداد سے ادب و فن کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان میں بیشتر نے اپنی توجہ اردو تحقیق پر صرف کی۔ جتنا تحقیقی سرمایہ اس سرکاری مدد سے میسر ہوا ہے قابل قدر ہے۔ ظاہر ہے کہ سب لکھنے والوں کا تحقیقی معیار ایک جیسا نہیں ہو سکتا اور معاشرے کے عام رجحانات سے محققوں کا دامن بچا نا بھی ممکن نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر مختلف ادارے باہمی تعاون اور مرکزی منصوبہ بندی کے تحت اپنی تحقیقی حدود مقرر کر لیں تو ہمارے ہاں انفرادی سرمایے اور مالی سرمایے دونوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جا سکتا ہے۔ موجودہ صورت میں ان اداروں نے جو کچھ کیا ہے اس کی رفتار کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک مذکورہ بالا اداروں میں سے بعض وجود میں نہیں آئے تھے اور جو موجود تھے ان کی پالیسی واضح نہ تھی، اس لئے اس دور میں کام کی رفتار بہت سست تھی۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک ان اداروں کی کارگزاری کی رفتار اور کام کی رفتار اور کام کی مقدار میں خاصا اضافہ ہوا۔ ان دس برس میں تحقیق کی سہولتوں کے بڑھ جانے اور مالی امداد کے اضافے سے ہمارا علمی سرمایہ بعض اعلیٰ درجے کی تحقیقی تصانیف سے مالا مال ہوا۔ اگر ہم مختلف اداروں پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں تو ہمیں اعلیٰ پایے کی تحقیقی تصانیف کا کچھ نہ کچھ سرمایہ مل جاتا ہے۔ انجمن ترقی اردو کے اہم منصوبوں میں سے قاموس الکتب کا منصوبہ بہت اہم ہے۔ اس کی پہلی جلد، جو اردو میں مذہبی کتابوں کی فہرست پر مشتمل ہے، بعض جزوی امور سے قطع نظر، اردو کے علمی سرمایے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ فہرست مخطوطات اردو کی جلد اول بھی انجمن کے علمی کام کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ انجمن ترقی اردو نے جو متن تصحیح کے بعد شائع کئے۔ ان میں پھول بن، من لگن اور گلشن عشق کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ چند مقالات کے مجموعے اور مونوگراف بھی انجمن کے علمی کام کا اچھا نمونہ ہیں، شمالی ہند کی نثری داستانیں، اردو تنقید، غالب فکر و فن، سرشار کی ناول نگاری، [illegible] انجمن کے معیار کی ضمانت ہیں۔ اسی طرح [illegible] قابل قدر ہے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے ہمارے تعلیمی نظام کے متعلق بعض کتابیں شائع کرکے اُردو کی علمی حیثیت کو مستحکم کیا ہے۔ سندھی ادبی بورڈ نے سابق سندھ کے علاقے میں فارسی اور سندھی سرمایے کے علاوہ کچھ کچھ اُردو کی طرف بھی نگاہ التفات کی۔ ترقی اُردو بورڈ نے متن شائع کرنے کا کام بھی اپنے ذمے لیا لیکن اس میدان میں باغ و بہار کے سوا وہ کوئی اہم خدمت انجام نہیں دے پائے۔ اُردو لغت کی اشاعت ان کا ایک اہم کارنامہ ہے، اور اب تک جو اجزا چھپ کر سامنے آئے ہیں ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اُردو میں لغت کی ضرورت کو یہ ادارہ بخوبی پورا کر رہا ہے۔ اُردو اکیڈمی بہاولپور کی کتابوں میں طبی لغت اور ڈاکٹر مہر عبدالحق کا تحقیقی مقالہ خاصے کی چیزیں ہیں۔ اردو اکیڈمی لاہور نے درسی ضروریات کے علاوہ اُردو کی قاموس شائع کرکے علمی سرمایے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ مرکزی اُردو بورڈ لاہور نے سائنسی کتابوں کے علاوہ اردو کو باثروت بنانے کیلئے تراجم کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی شائع کردہ کتابوں میں "بلوغ الارب" اور "الاخبار الطوال" تحقیقی اور علمی لحاظ سے اس ادارے کی دوسری کتابوں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ پنجابی ادبی اکیڈمی نے تحقیقات چشتی اور بعض دوسری کتابیں شائع کرکے اردو ادب کو فائدہ پہنچایا۔ پشتو اکیڈمی نے پشتو ادب کے علاوہ اردو اور پشتو کے تعلق پر ایک کتاب شائع کرکے اُردو کے لسانی جائزے میں ایک نئی منزل کا سراغ لگایا۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے بھی اپنی بساط کے مطابق اُردو ادب کی خدمت کی۔ مجلس ترقی ادب کے دائرۂ کار میں کلاسیکی ادب کی اشاعت اہم ہے۔ ادارے نے فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کو شائع کرنے میں خاصی محنت اٹھائی ہے۔ اس کے علاوہ تذکروں اور مصنفین پر کتابوں کے منصوبے بھی چل رہے ہیں۔

سرکاری اعانت سے چلنے والے اداروں کے علاوہ بعض ناشروں نے بھی اردو ادب کی طرف توجہ کی۔ گلشن بے خار کے دو ترجمے شائع ہوئے۔ خطوط غالب چھپے، حالی کا ذہنی ارتقا، انتخاب شاہ حاتم، ہفت گلشن داغ ناشرین کی مساعی کا نتیجہ ہیں۔ چند ایک اور کتابیں بھی ناشرین کی کوششوں سے شائع ہوئیں۔

تحقیق کا ایک اور مستقل حلقہ پاکستان کی یونیورسٹیاں ہیں۔ یونیورسٹیوں میں تحقیق کا کام خاصی مقدار میں ہوا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی، پشاور یونیورسٹی اور زرعی یونیورسٹی میں تحقیق کا کام برابر ہو رہا ہے۔ بعض یونیورسٹیوں میں ایم اے کی سطح پر اُردو کے بکثرت مقالے لکھے گئے۔ پشاور یونیورسٹی اور زرعی یونیورسٹی کے سوا پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے مقالے بھی شائع ہوئے۔

یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام محتاج تعارف نہیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد جتنے بھی تعلیمی کمیشن قائم ہوئے ان سب نے تحقیق پر زور دیا قومی تعلیمی کمیشن [illegible] میں تحقیقی کام کی اہمیت کا احساس بڑھ [illegible] کمیشنوں کی رپورٹ میں اعلیٰ سطحوں پر تحقیق [illegible]

زور دیا گیا کہ یونیورسٹی میں تحقیق کو اہم مقام دیا جائے، کیوں کہ تحقیق ایک استاد کو مستعد، متحرک، فعال اور جدید معلومات سے باخبر رکھنے کا وسیلہ ہے۔ چنانچہ سفارش کی گئی کہ ہر یونیورسٹی اپنے ہاں تحقیقی سہولتیں مہیا کرے اور تحقیقی شعبوں کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر کے استادوں کی تحقیقی کام کی بنیاد پر مناسب حوصلہ افزائی کرے۔ کمیشن کی رپورٹ کے تمام پہلوؤں پر اگرچہ عمل نہیں کیا جا سکا لیکن اس سے یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام میں سرگرمی پیدا ہوئی گزشتہ دس سال (یعنی ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء) میں یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام کی اہمیت پر خاصا اصرار کیا گیا ہے۔ مختلف یونیورسٹیاں اعلیٰ سطحوں پر تحقیق کے علمی کام پر خصوصی توجہ کر رہی ہیں۔

گذشتہ دس برس کے تحقیقی کام کو بغور دیکھا جائے تو چار اہم رجحان نظر آتے ہیں اور گمان غالب ہے کہ مستقبل میں تحقیقی کام انہی مرکزی نکات سے متعلق ہوگا۔

(الف) قدیم ادبی سرمایے کی بازیافت اور متن کی مناسب تصحیح۔

(ب) مغربی پاکستان کے قدیم اردو ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کی مناسب اشاعت۔

(ج) اردو زبان کے لسانی رشتوں کا مقامی عناصر سے تعلق۔

(د) تدوین لغت اور اصطلاحات سازی کی اہمیت۔

یہ رجحانات ابھی ابتدائی حالت میں ہیں اور آگے چل کر ان سے تحقیق کی ایک منظم اور مربوط روایت کی داغ بیل کی توقع ہے۔ اُمید ہے آئندہ چل کر پاکستانی شعور اور پاکستانیوں کے عزائم کی جھلک تحقیقی میدان میں بھی نظر آئے گی۔ (بہ شکریہ صحیفہ)

(بقیہ صفحہ ۱۷ سے آگے) حسن کو اور جلا دی اور مسرت کے خزانوں میں اضافہ کیا۔ اس نے نشہ بھی پیدا کیا اور نشہ ہرن بھی کیا اس نے آدمی کو بنایا بھی اور بگاڑا بھی اور خود بھی بنی بگڑی۔ اس نے سینکڑوں روپ بدلے کبھی شاہدِ حق کی گفتگو کرتی رہی کبھی بادہ و ساغر میں ڈوبی رہی کبھی تلوار سے کھیلی کبھی دلوں کے اندر ڈوب گئی مگر اس کی ہر مستی میں کوئی نہ کوئی ہشیاری ہر خواب میں کوئی نہ کوئی بیداری ہر جلوۂ بے رنگ میں کوئی نہ کوئی رنگینی ضرور رہی اور اس ہشیاری، بیداری اور رنگینی میں زندگی کا کوئی خاص تصور اور سانچہ بھی ملتا رہا (نئے اور پرانے چراغ ص ۹۷)

اور حالی کے نزدیک شاعری کائنات کی تمام اشیاء، خارجی و ذہنی کا نقشہ آ سکتی ہے۔ عالم محسوسات، دولت کے انقلابات، معاشرت نوع انسانی کی تمام چیزیں جو فی الحقیقت موجود ہیں اور تمام وہ چیزیں جن کا تصور مختلف اجزا کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جاتا ہے۔ شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں۔ شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلم رو اُسی قدر وسیع ہے جس قدر خیال کی قلم رو۔

دالاحد

شاعری اپنے مزاج کے آئینے میں

عری کی ماہیت

شاعری کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں لیکن کوئی تعریف بھی ایسی جامع نہیں ہے جس کا شاعری کے ہر پہلو پر اطلاق ہو سکے۔ ان سائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں ہے کہ انسانی جذبات کا منظوم و مقفیٰ عبارت میں اظہار شاعری کہلاتا ہے۔ کولرج نے بلیغ انداز میں کہا ہے کہ شاعری بہترین الفاظ ترین انداز میں استعمال کا نام ہے۔ شبلی نے شعر العجم میں لکھا ہے کہ جو جذبات الفاظ کے ذریعہ ادا ہوں شعر ہیں۔ حالی ل کے مطابق شاعری ایک خداداد ملکہ ہے جس کی مدد سے انسان حقائق تک پہنچ جاتا ہے۔ کاڈویل نے اسے انسانی کے اولین جمالیاتی عملوں میں سے ایک عمل کہا ہے۔

ان بیانات سے نہ صرف شاعری کی ماہیت کا اندازہ لگانے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے بلکہ بنیادی عناصر) (جذبہ، فکر و خیال، ہیئت وغیرہ) کا پتا بھی چل جاتا ہے۔ شاعری ایک فن ہے جس میں واقفیت، تخلیت اور ت کا ہم آہنگ ہو کر شگفتہ زبان میں ظاہر ہونا ضروری ہے۔ اس کے عناصر میں اہمیت کے لحاظ سے اولیت ہ کو حاصل ہے جو تمام چیزوں میں قوی تاثیر رکھتا ہے۔ یہی گویا اصل تخلیق کا محرک ہے۔ دوسرا درجہ فکر کا ہے تجرید پسند ہے اور جب اس پر تخیل کی زد پڑتی ہے تو شعریت جنم لیتی ہے۔ اسے اوروں تک پہنچنے کے قابل بننے ے زبان اور لفظوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ گویا شاعری کے اسلوب کی دونوں بنیادوں یعنی لفظ و خیال میں دامن کا ساتھ ٹھیرا "صحیح الفاظ صحیح مقام پر" والا اصول تو شعر میں معموری کے لئے نہایت ضروری ہے۔ محاکات یل ایسے عناصر ہیں جن میں جوش اور تاثیر کے راز پوشیدہ ہیں۔

کہا گیا ہے کہ شاعری کا تعلق جسم انسانی سے زیادہ فطرت انسانی کے موضوع سے ہے۔ حالی کے مطابق تو ن کے بطون کی سیر صرف شاعری ہی کے ذریعے کی جا سکتی ہے' یہ بیک وقت ہمارے تخیل کو گرماتی احساسات کو رتی اور جذبات کو تسکین دیتی اور بقول ڈارون تھکے ہوئے دماغ کو آسودگی بخشتی ہے لہذا شاعر کے لئے یہ شرط ہی قرار دی گئی کہ وہ فطرت اور حقیقت کا نباض ہو۔

ہر زبان کے ادب کی ابتدا شاعری ہی سے ہوئی ہے حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کوئی زبان ابھی ادبی ے نہیں پاتی بلکہ بول چال ہی کے مرحلے میں ہوتی ہے اس میں ایک آہنگ، جذبہ اور جوش کے ساتھ عوام کے دلوں کی

دھڑکنیں لیے لوک گیت موجود ہوتے ہیں۔ اس کو ہم شاعری کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں جب اس سلسلے میں شعور کوشش شروع ہوتی ہے تو انداز بیان میں زیادہ دلچسپی اور دل کشی آجاتی ہے یہیں سے اس کی ادبی اہمیت مانی جانے لگتی ہے۔

شاعری کی اہمیت

شاعری کو ہر زمانے میں کافی اہم مقام ملا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ انسان میں اظہاری ہے کہتے ہیں کہ شاعر بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے اسے ایک حساس دل ملتا ہے لیکن پر اثر انداز میں اپنے خیالات موزوں کرنے کی خداداد صلاحیت کو بروئے کار لانے یا اجاگر کرنے کے لئے اسے محنت بھی کرنی پڑتی ہے (اس حد تک شاعری کو اکتسابی بھی کہا جا سکتا ہے) اس کے اندر جب حقیقی قوت شعر کارفرما ہوتی ہے تو وہ پیغمبرانہ اوصاف کا حامل ہو جاتا ہے یعنی ہر جذبہ ہر واقعے اور ہر تجربے سے اس قدر صحت، اصلیت اور شدت سے متاثر ہوتا ہے کہ عامی اس کا تصور بھی نہ کر سکتے۔ چنانچہ صرف محسوسات بلکہ جذبات و کیفیات کو پیش کر کے دھندلی چیزوں کو چمکا دینا اس کے لئے مشکل بات نہیں۔ وہ کسی ایک موضوع، ایک مقصد، ایک تعلیم، ایک فلسفے اور حیات کے کسی ایک پہلو کا پابند نہیں اور بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت کا تقاضا کسی خاص موضوع کو اپنانے پر زور دیتا ہے اور دوسری چیزوں کی طرف سے توجہ ہٹا دیتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی شاعر کے لئے نفس انسانی کا مطالعہ اور اس کی سیر زندگی کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ بن جاتی ہے، کسی کو مناظر فطرت کا حسن اپنا دلدادہ بنا لیتا ہے، کوئی صحرائے عشق میں جا نکلتا ہے جہاں سے واپس آنا تمام عمر اسے نصیب نہیں ہوتا اور کسی پر اپنی قوم یا ملک خاص طبقے کی زبوں حالی کا اثر اتنا شدید پڑتا ہے کہ اس کی فلاح و بہبود کی فکر میں اسے دوسری چیزوں کا ہوش نہیں رہتا۔ انتادِ طبع کا یہ اختلاف بالکل قدرتی ہے شاعری کے علاوہ تمام علوم و فنون میں اس کی مثالیں کثرت سے نظر آتی ہیں۔

شاعر کا شدید تاثر جو بظاہر ایک بے نام کیفیت سے زیادہ نہیں اپنی قوت ایجاد یا "الہامی قوت" سے ایک متعین شکل میں پیش ہو کر ایک عجیب ہی پیکر تراشتا ہے۔ شاید اسی لئے شاعری کو "جزویست از پیغمبری" کہا گیا اور شعرا کو "تلامیذ الرحمٰن"۔

اس کے حیرت انگیز طور پر موثر ہونے کی بنا پر شاعری کو ساحری سے بھی نسبت دی گئی ہے۔ قرآن نے خود اعلان کیا کہ وہ الہامی ہے شاعری یا ساحری نہیں ہے۔ ایک جگہ یہ بھی ہے کہ اللہ نے پیغمبر کو شعر گوئی نہیں سکھائی اور نہ یہ آپ کے شایانِ شان ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے اس کے اثر کے گہرے اور دیرپا ہونے کی وجہ سے اس کی عظمت و ضرورت ہر زمانے میں محسوس کی گئی ہے۔

شاعری کی اثر پذیری

انسانی جذبات زمانے اور ماحول کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں چنانچہ یہ بات نہایت صحیح ہے کہ ہر دور اپنا ذوق اپنے ساتھ لاتا ہے۔ مثلاً جب کسی ملک کی آب و ہوا، مذہب، رسم و رواج، معاشی اسباب، سیاسی حالات وغیرہ وہاں کے لوگوں پر مستقل اثر ڈالتے ہیں تو یہ ذوق رفتہ رفتہ قومی مذاق کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان کی دلی کیفیات اور جذبات کے اظہار کا ایک خاص نہج پیدا ہو جاتا ہے جو دیگر حالات میں زندگی بسر کرنے والوں سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ خارجی تغیر کے اثرات تخیل پر پڑے بغیر نہیں رہتے اس لئے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مادی تبدیلی کے ساتھ داخلی کیفیتیں بدل جایا کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حالات کی تبدیلی خیالات و افکار میں انقلاب برپا کر دیتی ہے اور جذبہ و خیال متاثر ہو کر شعر و ادب کی دنیا کا رنگ بدل دیتے ہیں۔ یہی نہیں زبان اور انداز بیان یعنی لفظوں کے معنوں میں، ان کے صوتی علامتی انداز میں تبدیلیوں کے علاوہ تشبیہات، تلمیحات، تمثیلات وغیرہ کا زمانے کے مزاج کے مطابق بدلتے رہنا نہ غیر معمولی ہے۔ اور نہ غیر فطری۔ یہی بات اسلوب کے بارے میں صحیح ہے[1]۔ غرض ہر دور کے مخصوص سماجی ادراک کے بعد ہی کسی زبان کی شاعری سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

شاعرانہ تخیل

شاعری سماجی عمل ہونے کے علاوہ انفرادی اور شخصی ماحول بھی رکھتی ہے۔ شاعر کے احساسات جو خارجی حقائق کے شعور و ادراک کا نتیجہ ہوتے ہیں انفرادیت سے گزر کر اجتماعیت کے روپ میں آنے میں تخیل کے محتاج ہوتے ہیں۔ اسی تخیل کی وجہ سے شاعر اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔ یہ دنیا اتنی فرضی نہیں ہوتی جتنی عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ہماری حقیقی دنیا کا ایک پرتو ہوتی ہے شاعر یہ دعوا بھی نہیں کرتا کہ وہ مورخ یا سائنس داں کی طرح اصلیت اور واقعیت کا پابند ہے اور نہ ہی اس کے ذمے من و عن حقائق اور واقعات کو پیش کرنے کا فریضہ ہے۔ اس کے باوجود جو چیزیں وہ پیش کرتا ہے ان کا وجود زندگی سے پرے بھی نہیں ہوتا۔ یہ کون نہیں جانتا کہ شاعرانہ تاثرات زندگی ہی کے مختلف مراحل سے قبول کئے جاتے ہیں، ان میں مبالغہ، تصنع اور قرین قیاس باتوں پر ایمان ہی لیکن کیفیات کا صحیح اور پرخلوص تجزیہ ان کی جان ہے۔ واقعات کے جذباتی تصور کے اسی صداقت شعارانہ بیان کو شاعرانہ صداقت کہا جاتا ہے۔

مانا کہ یہ صداقت شاعر کے اندرونی تاثر اور تجربے سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور اسی وجہ سے سننے والا شاعر کے تخلیقی عمل میں شریک رہتا ہے اور بعض دفعہ کہہ اٹھتا ہے "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

---

[1] شلاً آج کل زندگی کی مصروفیات نے ہر معاملے میں تیزی اور روانی پیدا کر دی ہے۔ ناول کے بجائے افسانہ۔ مثنوی کے بجائے نظم، نظم کے بجائے غزل، لانگ ہینڈ کے بجائے شارٹ ہینڈ اسی لئے ہر دل عزیز بن گیا ہے۔

لیکن یہی بات یہ ہے کہ یہ صداقت منطق سے بے نیاز ہوتی ہے۔ تخیل اور اس صداقت کے امتزاج سے چیزوں کی صورتیں بدلتی بھی ہیں حتیٰ کہ خیالی امور تک اصلی اور واقعی معلوم ہونے لگتے ہیں۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شعر میں اکثر جھوٹ اور مبالغہ ہوتا ہے لیکن بقول ابو محمدؐ خازن جب یہ ثانیا (جھوٹ) شعر کے طلا سے مطلا کیا جاتا ہے تو ہم رنگِ زرِ خالص ہو جاتا ہے اور شعر کا حسن جھوٹ کی برائی پر غالب آجاتا ہے۔

مقصد شاعری

شاعر انسان ہے اور اپنے ماحول سے متاثر۔ شاعری ایک موثر سماجی عمل ہے اس طرح شعر و ادب اور انسانیت کے مقاصد ایک ہوئے۔ بعض لوگوں کے نزدیک شاعری ایک تفریح ہے اور بعض کے لئے تربیت اخلاق کا ایک ذریعہ لیکن سچ یہ ہے کہ اس کی جگہ بین بین ہے انسان کے شعور کو شاعری کی پہلی شرط کہا گیا ہے تو منفعت شعر کا مطمح نظر یا تو جمالیاتی ذوق کی تسکین ہوگا یا افادی شاعری چاہے کتنی ہی "خالص" کیوں نہ ہو کوئی نہ کوئی مقصد ضرور رکھتی ہے۔ غالباً افلاطون پہلا انسان تھا جس نے بے مقصد شاعری کی مذمت کی جس سے "برے اثرات" مرتب ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس کے نزدیک ہومر اس لئے مردود تھا کہ اس نے سماج کو کچھ نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی عینی ریاست سے ایسے شاعر اور شاعری کو ملک بدر کرنے کا مشورہ دیا۔ البتہ مدح والی شاعری اسے بھی گوارا تھی۔ مذہب اسلام نے بھی شاعری کو عمومی طور سے گمراہی قرار دیا لیکن اچھے شعرا اس کی نظر میں بھی مستحسن ٹھیرے۔ قرآن نے شاعروں کے بارے میں کہا کہ یہ بے راہ ہیں ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور وہ کرتے نہیں جو خود کہتے ہیں مگر ساتھ ہی حمد والے یا نیکی کی ترغیب دینے والے یا گناہ کی برائی ظاہر کرنے والے اشعار کو عیب نہیں ٹھیرایا چنانچہ آں حضورؐ نے جہاں امرا القیس جیسے عظیم شاعر کو غلط بیانی اور فحش نگاری کی بنا پر دوزخی شعراء کے سردار کا لقب دیا وہاں حسان بن ثابتؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کافروں کا جواب دو، روح القدس تمہارے ساتھ ہیں۔ ایک دفعہ شعر کا ذکر کرکے فرمایا کہ وہ ایک کلام ہے جس کا اچھا، اچھا ہے اور اس کا برا برا ہے اور کسی دوسرے موقع پر ارشاد ہوا کہ بعض اشعار حکمت ہوتے ہیں۔

اگر عالمی ادب پر نظر ڈالی جائے تو یہ جاننے میں بالکل دقت نہ ہوگی کہ قدیم زمانے سے شاعری کے سامنے کوئی نہ کوئی مقصد ضرور رہا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جو ادب مقصدی نہیں ہوتا وہ اعلا بھی نہیں کہلاتا چنانچہ سبھی قدیمی شہ کار ایک متعین نصب العین کے تحت وجود میں آئے۔ مصری، بابلی، چینی ادبیات کے علاوہ رامائن، مہابھارت، گیتا، زبور، انجیل، قرآن وغیرہ کی مذہبی اہمیت سے کس کو انکار ہے لیکن ان کی ادبی حیثیت بھی مسلم ہے۔ از منہ وسطیٰ تک شعر و ادب زیادہ تر مذہبی اور اخلاقی مقاصد کو فروغ دینے کے لئے استعمال

جاتا رہا لیکن صنعتی انقلاب کے بعد روحانی قدروں کے بجائے مادی رجحانات پر توجہ مرکوز ہو گئی۔ اظہار خیال کی آزادی کا غلط مطلب لے کر آزادروی کو شعار بنا لیا گیا اور بقول ملٹن حال یہ ہو گیا کہ آزادی کی آواز لگائی جاتی ہے۔ لیکن مقصد ہے کھل کھیلنا (LICENCE THEY MEAN WHEN THEY CRY FOR LIBERTY)

نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں مادی اور حیوانی عنصر کا غلبہ ہو گیا جیسے جیسے دن گزرتے گئے اس روئیے کی شدت میں کمی آتی چلی گئی اور پھر سے شاعری کو اپنے اصلی مقصد یعنی انسان کی اندرونی صلاحیتوں کو ابھارنے، تہذیب و اخلاق اور جمالیاتی ذوق کے نکھارنے کی طرف ڈھالنے کی کوشش شروع ہو گئی۔

حیات اور شاعری جمہوریت کی تعریف کی طرح شاعری کے سلسلے میں بھی یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ زندگی سے پیدا ہوتی ہے زندگی سے متعلق ہے اور زندگی ہی کے لیے ہے۔ بلکہ یہ زندگی کے لئے نہ ہو تو اس کی زندگی خود خطرے میں ہو گی۔ آرنالڈ نے اسی حقیقت کے پیش نظر شاعری کا اصل اصول زندگی کی ترجمانی بتایا ہے۔

شاعری کو بے کاری کی پیداوار کہنے والے اس کے مقابلے میں سائنس کو لاتے ہیں حالاں کہ دونوں کا میدان عمل الگ الگ ہے۔ سائنس حیات و کائنات کے حقائق پیش کرکے رہ جاتی ہے۔ شاعری انھیں گہرائی و گیرائی تک رسائی دلاتی ہے اور زندگی کی تعبیر و تنقید کرتی ہے۔ ایک سے مادی زندگی کی خوش حالی اور دوسری سے روح میں بالیدگی پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ تعقل اور تخیل ایک دوسرے سے متصادم نہ ہوں تو زندگی بھرپور ہو جاتی ہے۔ انسان محض گوشت پوست کی مشین نہیں بلکہ جذبات و احساسات کا مجموعہ بھی ہے۔ جو لوگ بیدار زندگی سے بیزار ہوتے ہیں ان کے لئے شعر و ادب کا مطالعہ فرصت کے اوقات کا صحیح استعمال ہی نہیں بلکہ بعض دفعہ متحرک زندگی بسر کرنے کا پیغام بھی بن جاتا ہے۔ اس کے ذریعے جذبات کی گہرائیوں اور پرپیچ معاملوں سے آگاہی ہوتی ہے جس کی بدولت منزل پر پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ زندگی کی یکسانی کو دور کرنے کے لئے جہاں اور دل چسپیاں موجود ہیں وہاں شاعری کا بھی ایک درجہ ہے۔ علامہ شبلی اسے ایک قوت سمجھتے تھے جس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ اس کا صحیح استعمال ہو۔

اس طرح ادب برائے زندگی کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا وجود زندگی کو سنوارے اور معاشرے کو آگے بڑھائے فن ابلاغ کا یہ عمل فطری اور بے ساختہ ہو نہ کہ اسے بر دگینڈا بر باد یا جائے۔ اس میں روحانی اور جذباتی پہلوؤں کو بہرحال اہمیت حاصل رہے ورنہ مادی جبریت اس کے حسن کو زائل کئے بغیر نہ رہے گی۔ شاعری کے دائرہ کار اس کی اچھی بری خصوصیات کے سلسلے میں پروفیسر سرور کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اس نے روتوں کو ہنسایا اور ہنستوں کو رلایا اس نے چاندنی سرے دریا کی روانی شفق کی سرخی کے

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

ادبی تنقید کا تاریخی نظریہ

تاریخ ایک ایسا ضروری اور بنیادی علم ہے جس تک سارے سماجی علوم پہونچ کر اپنا منتہی پا لیں یعنی سارے علوم کسی نہ کسی حیثیت سے تاریخ سے اپنا رشتہ رکھتے ہیں اور اس سلک میں منسلک ہو رہیں۔ گذشتہ ادوار میں تاریخ کو ادب میں یہ مقام متعین نہ تھا مگر دورِ جدید میں تاریخی شعور ادبی تصورات رُخ متعین کرنے میں ایک بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ جرمن فلسفہ دانوں نے تو اس موضوع پر خاص نظر قائم کئے کہ شاعری قومی تاریخ یا نسلی تاریخ کا ایک ترقی پذیر عمل ہے بعد میں ہیگل کے پیچیدہ فلسفہ کے بعد مارکس نے اس تصور تاریخ میں جدلیاتی نظریہ کو شامل کیا۔ جدید تصور یہ ہے کہ تاریخ عہد وحشت سے اب زندگی کے مختلف گوشوں میں تاریخی ترقی کی ایک مسلسل داستان ہے اور ادب اس داستان کا بہترین پیش کرتا ہے جو انسانی اذہان نے اس تدریجی ترقی کے ذریعہ بہترین سرمایہ سمجھ کر محفوظ رکھا ہے۔

ادب و تاریخ میں زمانہ، خطۂ ارض، جغرافیائی حدود اور لوگوں کے مذاق کا لحاظ نہایت ضروری انسانی فکر اور مذاق حالات کے سانچے میں ڈھلتا اور بدلتا ہے۔ ایک دور کے پیمانوں کو دوسرے دور چسپاں کرنا حقیقت سے اغماض برتنا ہے ہر دور کی اپنی خصوصیت ہے کہ ایک مستقل شخصیت ہوتی ہے اس سے اعراض کرنا ممکن نہیں۔ جس طرح ایک شخص کے کپڑے دوسرے کے جسم پر فٹ نہیں ہو سکتے بالکل اسی طرح ایک دور کا مذاقِ سخن بھی دوسرے دور سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی بنا پر وہ کلاسیکل ادب شائق جو اس کی عظمت میں تاریخ سے اغماض برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر صحت پر نہیں ہے۔ آب و ہوا، لوگوں کا رہن سہن اور سماجی زندگی اتنی مختلف ہوتی ہے کہ ایک ہی دور میں مصنف جو اہل یورپ کیلئے کوئی ادبی تصنیف کرتا ہے ممکن ہے کہ اس سے اہل عرب کوئی دلچسپی محسوس اس لئے کہ ان کا مذاق بالکل مختلف ہے۔ انسانی زندگی میں اختلاف کا تو یہ عالم ہے کہ قوموں اور ملکوں علاوہ خود باہم انسانوں کی منفرد شخصیات میں غیر معمولی اختلافات فکر و نظر اور ذوق و جستجو موجود۔ کسی دور کا ادب اس کی تمام نیرنگیوں کا آئینہ پیش کرتا ہے۔ اس آئینہ میں دوسرے ادوار کی تصویر ... پیش آئینہ تو ایک خوش فہمی میں مبتلا کرنا ہے۔ اسی بنا پر ایک مغربی ناقد کہتا ہے کہ اس ...

ادبی تخلیقات کا مطالعہ جو پہلے گذر چکا ہو اس وقت تک ناقد کو صحیح نتائج اخذ کرنے سے باز رکھے گا جب تک کہ وہ خود اپنے آپ کو اس دور میں نہ پہونچا دے اور اس طرز زندگی، مذاق فکر اور رسم و رواج اور حالات و واقعات کو نہ دیکھے جو مصنف کے دور میں تھے۔ تاریخ کے ذریعے ہم کو ادب کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔ اگر کوئی مصنف قعر گمنامی میں پڑا ہو اور اس کی زندگی کے بارے میں معتبر شہادتیں موجود نہ ہوں تو اس کے دور کی تاریخ ایک بہترین شہادت ہے جس میں مصنف نے اپنی زندگی گذاری تھی۔

مذاق اور زبان دونوں ہر دور میں تبدیلی کی منزل سے گذر کر ترقی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں مگر ان اختلافات اور تاریخی احوال کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ جو ادب کسی خاص دور میں تخلیق کیا گیا ہے وہ دوسرے ادوار کیلئے بیکار ہے حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ انسانی قدریں ہمیشہ زندگی، تابندگی اور روشنی کا پیام دیتی ہیں زمانہ کے امتداد سے ان کی رونق اور عظمت کے جوہر نکھرتے ہیں ایسے اعلیٰ ادبی شہ پاروں کو کبھی لونی نہیں لگتی اور ان پر کبھی زنگ نہیں چڑھتا۔ اعلیٰ ادبی کارناموں میں جو اخلاقی قدریں ہوتی ہیں ان سے انسانیت کو زندگی اور بلندی ملتی ہے وہ ہر سماج اور ہر دور میں انسانی قلوب کو اپنی جانب کھینچتی ہیں اس لئے کہ جن جذبات نے اس ادب پارہ کو زندگی بخشی ہے وہ محدود نہیں ہوتے البتہ جو چیز تاریخی حیثیت سے ناقد کے فرائض میں داخل ہے وہ یہ ہے کہ ناقد کو کسی اعلیٰ ادبی کارنامہ کو روشن کرنے کیلئے تاریخ کے اجالے میں آنا چاہیئے اس لئے کہ ناقد مفسر بھی ہے وہ عوام اور اعلیٰ ادبی تخلیقات کے درمیان واسطہ بھی ہے جو شعور فکر و نظر عام کرتا ہے۔

اردو ادب زیادہ قدیم نہیں، عربی ادب کی قدامت مسلم ہے۔ عہد جاہلیت کی شاعری عربوں کے شعری ادب کی پیشانی کا نور ہے۔ اگرچہ تاریخی حیثیت سے ہم کو اس دور کے شعراء کے مفصل حالات نہیں ملتے پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ عہد جاہلیت کے شعراء کے افکار میں جو سادگی اور انسانی قدریں ملتی ہیں وہ ان کو عظمت عطا کرتے ہیں اسی بنا پر دور جدید کی تہذیبی کیفیت سے قبل عہد وحشت کے ادبی سرمایہ کے بارے میں ایک مغربی ناقد لکھتا ہے کہ انسانی خیالات آزادی کے ساتھ نکل کر کبھی سامنے نہیں آئے سوا اس زمانے کے جس کو ہم عہد وحشت کہتے ہیں۔ دور جدید میں تہذیب نے ایک تصنع پیدا کر دیا ہے۔ انسانی جذبات چھپ گئے ہیں۔ جبکہ عہد وحشت کی غیر منظم زندگی میں ان کے اظہار کا عام رواج تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ کیفیت عہد جاہلیت کے ادبی سرمایہ پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ اس دور کی شاعری میں ان کے تاریخی و سماجی احوال کو پوری طرح دخل تھا۔ ان کی شاعری میں جو صداقت ملتی ہے وہ بعد میں نظر نہیں آتی۔

اردو ادب میں کبھی یہ دور آیا ہی نہیں اس لئے کہ فارسی سے ہم کو ایک روایتی و تہذیبی نظام شعری مل گیا جو مہذب زندگی سے آشنا اور روایتی طرز کا علمبردار تھا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے جس کو ابن رشیق نے اپنی مشہور کتاب "العمدہ" میں ذکر کیا ہے کہ کسی قوم کی شاعری اسکو پرکھنے کی میزان ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے شاعری کو کسی قوم کو پرکھنے کا معیار قرار دیا۔ کارلائل نے اس سلسلہ میں بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ کسی قوم کی تاریخ شاعری اس قوم کی تاریخ کا جوہر (ESSENCE) ہے۔ قوم کی شاعری کا تعلق اس کے سیاسی، علمی اور مذہبی رجحانات سے بہت قریبی ہوتا ہے۔ کسی قوم کے روحانی تدریجی ارتقا کا بیان، اس کے عزائم کی داستان اور مختلف زمانوں میں اس کی ارتقائی کیفیت کا بیان اور قوم کے اعلیٰ آدرشوں کی توضیح اگر دیکھنی ہو تو اس قوم کی شاعری کی تاریخ دیکھیے۔

تاریخ ان اسباب سے گرہ کشائی کرتی ہے جن کے دامن میں ادب پروان چڑھا ہے۔ وہ ان واقعات و احوال کی تصویر پیش کرتی ہے جس میں ادب نے زندگی حاصل کی ہے اور جنم لیا ہے۔ جذبات اور تعصبات کی آندھی میں صحیح علمی انداز سے تاریخی تحقیق صحیح نتائج تک ناقد کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ ادیب کی شخصیت پر اس نقطۂ نظر سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ان تمام معاشیاتی رجحانات جذبات، معاشی اور سیاسی محرکات جو قوموں کی زندگی میں آج پیش آ رہے ہیں یا ان سے کوئی فرد بھی محفوظ رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس نقطۂ نظر سے ادیب کی زندگی میں قوم کی زندگی کچھ اس طرح شامل ہو جاتی ہے کہ ہم اس کے بغیر ادیب کی شخصیت کا صحیح تصور کرنے سے قاصر ہیں۔ انھیں حقائق کی روشنی میں ٹین (TAINE) کہتا ہے کہ ادب ایک نظم قانون کی شق ہے اور ایک طرز فکر کا اعلان ہے۔ دراصل ایسے دستاویز ہیں جن میں شخصیت کا فرمان پوشیدہ ہے۔

ادبی تاریخ ہم کو اخلاقی اقدار کا سبق دیتی ہے اور ان کی انسانی معاشرہ میں تصویر کشی بھی کرتی ہے۔ ہم کسی ادیب کی تخلیقی کاوش سے آسانی کے ساتھ لطف اندوز ہو سکتے ہیں مگر اس کو جانچنے میں تمامی دقت محسوس ہو گی۔ اس لئے کہ اس وقت ہم کو ادب اور اس کی شخصیت کے درمیان ایک رشتہ قائم ہو گا اور راہ میں تاریخ کے اوراق سے حقائق کو تلاش کرنا ہو گا۔ اس بارے میں ہمیں بہت سے سوالات کے جوابات درکار ہوں گے۔

ان سوالات کا ایک نقشہ ایک ناقد نے یوں پیش کیا ہے کہ اس کو معلوم کرنا چاہیے کہ ادیب کا مذہبی عقیدہ کیا تھا۔ فطرت کے بارے میں اس کے کیا افکار تھے، عورتوں کے بارے میں [illegible]

کیا طرزِ عمل اختیار کیا، مالی معاملات میں اس نے کس طرح اپنے حالات پر قابو پایا اور اس بارے میں اس کا طرزِ فکر کیا تھا؛ وہ مالدار تھا یا غریب تھا؛ زندگی میں اس کے کیا اصول تھے جن کی اس نے پابندی کی؛ اس کا ... کا لائحہ عمل کیا تھا؛ اس کی بنیادی کمزوری کیا تھی؛ اس لئے کہ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خامی ہوتی ہے ان سوالات کے جوابات اسکی شخصیت اور کتاب کی اہمیت دونوں پر روشنی ڈال کر تصویر کو واضح کر دیں گے۔

یہ تمام امور درحقیقت تاریخ ہی سے متعلق ہیں اب تاریخ واقعات جنگ کا خزانہ نہیں رہی۔ اس میں سماجی، معاشی اور سیاسی محرکات پوری طرح شامل ہیں اور بغیر ان امور و حقائق پر دسترس حاصل کئے ہم ادیبوں اور شاعروں کی زندگی کے بارے میں بھی کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتے۔ ادب اور ادیب کی زندگی کے درمیان تاریخ ہی کے ذریعہ رشتہ قائم ہوتا ہے۔

آخر میں اس جانب بھی ناقد کو توجہ کرنی چاہیئے کہ جرمن ناقدوں کی طرح کہیں ادبی تنقید تاریخی تحقیقات کا خشک دفتر نہ بن جائے اس لئے کہ مقصد تاریخ نہیں بلکہ ادبی تنقید ہے۔ تاریخ ناقد کیلئے منزلِ مقصود نہیں بلکہ وہ مقصد کی راہ کی نشان دہی کیلئے ایک سنگِ منزل ہے منزل نہیں بن سکتی۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۱ سے آگے) گھر نہ مل سکا، اگرچہ پتہ آسانی سے مل جاتا ہے۔ بیتاب صاحب کا خط ملا ہے میرے پاس صرف کاروان ہمارا ہے۔ دوسرے ناول کچھ پاکستان سے کچھ ہندوستان سے شائع ہوئے ہیں۔ سب کا ملنا ممکن نہیں۔ میرا سلام زلماد کیجئے۔

کوثر چاندپوری

۴ دسمبر ۶۲ء کا عنایت نامہ مل گیا پیکٹ آپ کو وصول ہو گیا۔ راج پال نے ٹرنک کال پر بتا دیا تھا کہ انھوں نے آپ کو بھیج دیا ہے آپ کی رائے کا منتظر ہوں۔ فی الحال آپ اشاعت ہی سے افسانہ نقل کرلیں۔ ہندوستان میں کہیں چھپا نہیں ہے۔ خدا کرے ... صاحب اپنے عزائم میں کامیاب ہوں۔ پیسہ کی اُن کو یقیناً ضرورت نہ ہوگی۔ ایسی صورت میں اُن سے کہیئے کہ بہت ہی ... ماہنامہ نکالیں اور وقت کی پوری پابندی کریں پرچہ میں ہر ماہ ایک تصویر ہونی چاہیئے۔ ٹائیٹل کا ڈیزائن ... اور فن کا رانہ ہو ادبی پرچوں کی ہمارے ملک میں بہت ضرورت ہے۔ (کوثر چاندپوری)

کوثر صاحب کے بہت سارے دلکش ادبی خطوط ماہنامہ ... پر آچکے ہیں اور وہ اُن کی کتاب ... کی زینت ہیں۔ اس مضمون میں شامل خطوط اتنے دلکش اور جاذبِ نظر نہیں ہیں لیکن ان کے مطالعہ کے درمیان ... صاحب کی پرخلوص شخصیت کی جھلکیاں ضرور دکھیں گی۔

راما بانسی بیلی بھیتی۔ نائب مدیر تمنائے ادب سلطان پور

طیب انصاری

معراج العاشقین کا مصنف[1]

معراج العاشقین کا مصنف' استاد گرامی ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیقی کتاب ہے جو حال ہی شائع ہوئی ہے۔ معراج العاشقین کو پہلی بار ادبی حلقوں میں متعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحق نے مصنف اور سنہ تالیف کے بارے میں کہا تھا کہ :-

"ایک حد تک اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ حضرت بندہ نوازؒ ہی کی تصنیف ہے۔۔ اگر بالفرض یہ تسلیم نہ بھی کیا جائے تو کم از کم اس کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا کہ یہ سنہ ۹۰۶ھ سے قبل کی تصنیف ہے..... اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ حضرت کی نہیں تو ان کے کسی بھی ہم عصر یا اس سے قریب زمانے کی تصنیف ضرور ہے۔"

اتنا تو سبھی جانتے ہیں کہ معراج العاشقین کی ادبی اہمیت کچھ بھی نہیں ہے صرف لسانی ہے اور تا بھی۔ اور کل تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ معراج العاشقین اردو کے اولین نثری کارناموں میں سے ہے اور اس حیثیت سے حضرت بندہ نوازؒ' اردو کے اولین نثر نگار قرار پائے۔ حضرت بندہ نوازؒ کی روحانیت اور تقدس اپنی جگہ مسلّمہ ہے اور اس وجہ سے ان کی ذاتِ بابرکات قابلِ صد احترام بھی ہے لیکن عجیب یہ ہوئی کہ بعض لوگوں میں یہ غلط احساس بھی پیدا ہو گیا کہ اگر تحقیق و تدقیق کی کاٹ چھانٹ میں کوئی ثابت کر دے کہ معراج العاشقین حضرت بندگی مخدومؒ کی تصنیف نہیں ہے تو ان کے مقام میں خدانخواستہ کمی پیدا ہو جائے گی۔ مذہبی بزرگی کو لسانی اور ادبی تحقیق سے خلط ملط کرنے کا یہ رجحان لسانی اعتبار سے انتہائی خطرناک ہے۔ اس سے اردو تحقیق کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ تاہم "تاریخ اردو" اد متعلق ایک اہم تحریری دستاویز (ہماری زبان ۲۲ جون ۱۹۶۳ء) کی پیش کشی کے بعد معراج العاشقین زمانی اور تاریخی اہمیت گھٹ جاتی ہے کیونکہ حضرت کلمۃ اللہ انصاری عرف میاں محمود تا دم تحقیق پہلا مورخ اور مترجم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے کارنامے تاریخی' ادبی اور لسانی اعتبار سے اولین مد

---

[1] اس نام سے ایک کتاب جناب ڈاکٹر حفیظ قتیل استاذ شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے شائع کی ہے۔

حاصل کر لیتے ہیں اس لئے معراج العاشقین کو جو مولوی عبدالحق مرحوم کے لحاظ سے ۹۰۶ھ سے قبل کی تصنیف ہے اور ڈاکٹر حفیظ قتیل کے قیاس کے مطابق اواخر گیارھویں اور اوائل بارھویں صدی ہجری کی تصنیف ہے وہ تاریخی اہمیت حاصل نہیں رہی جو چند دنوں قبل تک تھی کیونکہ اس تاریخی تحریر کی رو سے میاں محمود الصاری کے تصانیف و تراجم کا زمانہ ۱۱۱۷ھ سے قبل کا ہے۔ اس بنیادی اہمیت کے ختم ہونے کے بعد معراج العاشقین کا ادب میں تقدم باقی نہیں رہتا اس لئے مصنف کے بارے میں مباحث بھی کم تر اہمیت کے حامل ہیں۔[1] البتہ لسانی لحاظ سے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ یہ بات واقعی دلچسپ ہے کہ ہم بحث کریں واقعی معراج العاشقین سنہ ۹۰۶ھ کی تصنیف ہے یا نہیں! اور اس کے مصنف حضرت بندہ نوازؒ ہی ہیں یا پھر کوئی دوسری شخصیت۔ میرے خیال میں اس قسم کی بحث بھی غیر افادی ہی ہے کیوں کہ موضوع کے اعتبار سے بھی یہ تصوف کی ایک کتاب ہے اور یہ تصوف صوفیائے کرام میں عام رہا ہے یعنی موضوع اور مواد کے اعتبار سے یہ کوئی شہ کار نہیں ہے۔

ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب لکھتے ہیں: —

> "پچھلے صفحات میں مختلف داخلی اور خارجی شہادتوں کی بنیاد پر واضح کیا گیا ہے کہ معراج العاشقین حضرت مخدوم سید محمد حسینی بندہ نوازؒ کی تصنیف نہیں بلکہ گیارھویں صدی کے آخر اور بارھویں صدی کے آغاز کے عہد کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے" ص ۱۰۴

اور پھر انھوں نے دکنی مخطوطات کی نقل کے دوران سنین کے غلط اندراج کی متعدد مثالیں پیش کرتے ہوئے قیاس آرائیاں کی ہیں ان کے خیال میں سنہ ۹۰۶ھ غلط درج کیا گیا ہے اپنے قیاس پر اصرار کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے: —

> "جب متعدد شہادتوں سے رسالہ معراج العاشقین گیارھویں صدی ہجری کے اواخر اور بارھویں صدی ہجری کے آغاز کے عہد کی ایک شخصیت کی تصنیف ثابت ہو گیا ہے تو سنہ ۹۰۶ھ کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ ایسی صورت میں سنہ کی غلط تاویل و توجیہ کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

---

[1] گو یہ مضمون "ہماری زبان" میں "اس کتاب معراج العاشقین کا مصنف" سے بہت پہلے شائع ہو چکا ہے لیکن استاد گرامی کے بیان کے مطابق ان کی نظر سے نہیں گذرا۔

دکھنی میں ثابت کرنے کے بعد یہ حکم بھی لگاتے ہیں کہ "جانم کا نثری رسالہ کلمۃ الحقائق ہی اُردو نثر کا پہلا مستند رسالہ ٹھہرتا ہے (رعنا) اور اس دعوے کے ثبوت میں فرماتے ہیں۔ معراج العاشقین کے جملوں کی صحیح نحوی ترکیب عبارت کا ربط و تسلسل اور اسلوب بیان کی وضاحت اور روانی بتاتی ہے کہ یہ نثری رسالہ کلمۃ الحقائق کے بہت بعد ضبط تحریر میں آیا ہے۔"

بہت ممکن ہے آئندہ تاریخ ادب اردو کا محقق ڈاکٹر حفیظ قتیل کی اس بات کو مان جائے کہ معراج العاشقین گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری کی درمیانی تصنیف ہے اور اس کے مصنف حضرت مخدوم شاہ حسینی ہیں۔ لیکن شاید یہ دعویٰ غلط ثابت ہو کہ کلمۃ الحقائق اردو نثر کا پہلا مستند رسالہ ہے ڈاکٹر صاحب نے معراج العاشقین کے مصنف کو پانے کی جتنی صبر آزما کوشش فرمائی ہے اتنی ہی جلد بازی جانم کو پہلا نثر نگار قرار دینے میں دکھائی ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ تحقیق کی دنیا امکانی دنیا ہے جو دعوے مولوی عبدالحق نے کیئے وہ آئندہ کی تحقیق میں غلط ثابت ہوئے چنانچہ بعد کے محققین نے مولوی عبدالحق اور نصیرالدین ہاشمی کی تحقیقی غلطیوں کو پیش کیا ہے حالانکہ یہ لوگ اپنے تئیں مطمئن تھے اور اپنی تحقیق پر خوش بھی لیکن بعد کی تحقیق نے حقیقت کے پردے چاک کئے۔ بہرحال زیر نظر تحقیق کے بعد ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ معراج العاشقین حضرت بندگی مخدوم بندہ نوازؒ کی تصنیف نہیں بلکہ یہ تلاوۃ الوجود کا خلاصہ ہے یا پھر تلاوۃ الوجود معراج العاشقین کی شرح ہے اور تلاوۃ الوجود کے دونوں نسخے الف و ب حضرت مخدوم شاہ کی تصانیف ہیں اور حضرت مخدوم شاہ حسینی کا زمانہ گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری کا ہے۔ معراج العاشقین کے تعلق سے اب صرف ایک ہی صورت یہ رہ گئی ہے کہ کوئی مخطوطہ یا نسخہ ایسا فراہم ہو جس میں واضح طور پر سنہ تالیف اور مصنف کا نام لکھا ہو جس کی شرح تلاوۃ الوجود کی شکل میں ہمیں ملتی ہے۔

احمد علی خاں ادیبؔ

حضرت صدق جائسی مرحوم

یادش بخیر استاذی مولوی مرزا تصدق حسین صاحب صدق جائسی جب اللہ کو پیارے ہوگئے تو حیدرآباد کے بیسوں اُمرا جاگیرداروں پچاسوں گزیٹیڈ افسروں اور جائسی صاحب کے ہزارہا عقیدت مند شاگردوں سے یہ توقع بندھی تھی کہ اخبار رہنمائے دکن اور رسالۂ سب رس حیدرآباد کے ذریعہ مرحوم کے کانپور میں انتقال پُرملال کی خبر پاکر بعض اللہ کے بندے اُن کے تعزیتی جلسے کریں گے ختم قرآن و ایصال ثواب کی مجلس برپا ہوں گی اور اُن کی یاد باقی رکھنے کے ایک آدھ منصوبے کو تو عملی جامہ پہنایا جائے گا کیونکہ مرحوم جہاں دنیائے شعر و ادب میں اپنے خداداد فضل و کمال کی بدولت عالمگیر شہرت کے مالک تھے وہاں حیدرآباد کی شائستہ ادبی محفلوں میں ہمیشہ زینتِ محفل بنے رہے طلبائے مدارس سے قطع نظر سررشتۂ تعلیم (جس سے اُن کا ملازمت کا تعلق رہا) کے تیسرے درجے کے کلرک سے لے کر صدر اعظم وقت تک بھی اُن کے مخلصانہ برتاؤ مشرقی وضعداری اور بے مثل "جادو بیانی" کے قائل تھے۔ بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی کا یہ عالم تھا کہ روزمرّہ گفتگو کرتے ہوئے بات میں بات پیدا کرنا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا جیسے بھکڑپن سے دور کا بھی واسطہ نہ ہوتا جبکہ ہجوگوئی میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اُن کی زندگی کا قابل لحاظ زمانہ دربارداری میں بسر ہوا۔ حیدرآباد کی سرکاری ملازمت ملنے سے پہلے شمالی ہند میں وہ غالبًا نواب صاحب رامپور یا نواں اور پھر کسی راجہ صاحب کے دربار سے منسلک رہے۔ حیدرآباد میں سرکاری ملازمت پر رجوع بہ کار ہوکر جب کئی سال گزر چکے تو حسنِ اتفاق سے شہزادۂ والاشان نواب معظم جاہ بہادر شجیعؔ نے انھیں باریابی کا موقع مرحمت فرمایا اور اپنی دوررس نگاہ سے فورًا اس جوہر قابل کو پرکھ لیا۔ پھر تو ایک دن آڑ اپنے شبینہ دربار میں برابر یاد فرمانے لگے۔ اس مستقل مہمان نے حیدرآباد کے اس نازک خیال شاعر اور نازک مزاج آصفی شہزادے کے رشکِ فردوس دربار میں مسلسل پانچ سال تک اعزازی مصاحبِ خاص کی حیثیت سے اپنی جودتِ طبع، فطری ذہانت و طبّاعی اور شہزادہ والاتبار سے دلی عقیدت و احترام کے ایسے گہرے نقوش چھوڑے جن کا صحیح اندازہ بجز شہزادہ موصوف کے اور کوئی

نہیں لگا سکتا۔ یہاں کے طبقۂ اُمرا میں وہ نواب تراب یار جنگ سعید اور نواب فخر نواز جنگ مرحوم کے خلوص اور مہاراجہ سر کشن پرشاد کی نجہاتی صدر اعظم وقت کی ذاتی شرافت اور ساتھ ہی اُنکی سخن فہمی کے دل سے قائل تھے۔ سخن فہمی کی حد تک سیر سر اصغر یار جنگ مرحوم (سابق جج ہائیکورٹ) اور بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو (سابق گورنر اُترپردیش) کے ذوق و وجدان کو بڑی وقعت دیتے تھے جوش ملیح آبادی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ابوالخیر مودودی، نواب علی یاور جنگ، پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا، حکیم محمد عباس لکھنوی، شوکت علی خاں فانی، نواب ذوالقدر جنگ، نواب مہدی یار جنگ، بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق وغیرہ۔ سے اُن کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ اخبار "پیام" کے سابق اڈیٹر قاضی عبدالغفار جب کبھی اُن کے گھر پہنچ کر مسلسل دو دو گھنٹے نجی گفتگو کرتے اور اُس موقع پر اتفاقاً میں وہاں موجود ہوتا تو دونوں بزرگوں کی باتیں بڑے شوق سے سُنتا اور حظ اُٹھاتا۔ قاضی صاحب یورپ میں بیس بائیس سال کا زمانہ گزار کے ہندوستان لوٹے تھے۔ انگریزی زبان پر اُنھیں ایسا عبور حاصل تھا کہ مولانا محمد علی کے مشہور و معروف اخبار "کامریڈ" کے جوائنٹ اڈیٹر کی حیثیت سے انھوں نے اپنی ذہانت طبع کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ اس کے باوجود وہ اپنی اردو بول چال میں انگریزی کا ایک لفظ نہ لاتے تھے اور صدق صاحب کا کمال یہ تھا کہ دو چار گھنٹے کی نشست میں خواہ متعدد موضوعات پر گفتگو کرتے یا خوش گپیوں میں وقت گزار دیتے، اُس صحبت میں جتنی دیر بولتے ایک دفعہ منہ سے نکلا ہوا لفظ آخر وقت تک کبھی نہ دُہراتے گویا میر انیس کے اس مصرع کے مصداق بنے رہتے کہ ع اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں صدق صاحب، خان فضل محمد خاں سابق ناظم تعلیمات اور میر خورشید علی سابق ناظم مال و ملکی سے ہر اٹھواڑے برابر ملا کرتے تھے۔ خان صاحب سے خواہ آدھ گھنٹے کی ملاقات ہوتی یا دو ہی منٹ کی وہ مقررہ وقت کے اندر مناسب تمہید باندھنے اور سلیقے سے اپنا مُدعا ظاہر کرنے پر پوری پوری قدرت رکھتے تھے اگر کسی عہدہ دار سے اپنے کسی معاملہ میں نفی میں جواب پاتے تو اس سے بددل نہ ہوتے بلکہ اُس عہدہ دار پر اپنی حاضر جوابی کا موثر حربہ چلانے سے چوکتے نہ تھے مثلاً اُن کی ایک کاروائی جب حیدر نواز جنگ (سر اکبر حیدری) سابق صدر المہام فینانس کے یہاں پیش ہوئی اور اتفاقاً فیصلہ اُن کے خلاف ہوا تو فوراً حیدری صاحب کے چیمبر میں جا ملے اور پھڑکتے وار باتیں شروع کر دیں انھوں نے کہا جالسی صاحب اب میں کیا کر سکتا ہوں جواب دیا آپ کیا نہیں کر سکتے اور اگر کچھ نہیں کر سکتے تو مجھے اجازت دیجیے کہ آج ہی شام کو جالسی کا ٹکٹ کٹوا کر واپس چلا جاؤں اور سر تیج بہادر سپرو سے ملاقات ہو تو یہ بات اُن کے

گوش گزار کر دوں کہ حیدری صاحب پر آپ کی تعارفی چٹھی کا الٹا اثر ہوا۔ یہہ سننا تھا کہ سراکبر نے بے ساختہ ایک قہقہہ لگایا پھر مددگار متعلقہ سے جانسی صاحب کی مثل طلب کر کے اُن کے موافق مرام تجویز لکھوائی اور فوراً دستخط ثبت کئے۔ تحت کے صیغوں سے لے کے آخری منزل تک اثر و رسوخ کے باوجود اگر کسی دفتری کارروائی میں صدق صاحب کو ناکامی کا منہہ دیکھنا پڑتا تو وہ اس سے ہرگز متاثر نہیں ہوتے تھے بلکہ یہہ کہہ کے اطمینان کا سانس لیتے تھے کہ میں نے پیروی میں تو اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی پھر بھی ناکامی ہوئی تو عجب نہیں کہ اس ناکامی میں مصلحت خداوندی مضمر ہو۔ اس سے ہم بہ آسانی اُن کے صبر و قناعت کا اندازہ لگا سکتے ہیں

میں ہر ہفتے مرحوم سے ایک یا دو مرتبہ بلاناغہ نیاز حاصل کرتا تھا۔ اتفاقاً ایک دفعہ ایک ہفتہ کے بعد جو اُن کے دولت کدے پہ پہنچا اور اپنی آمد کی اطلاع کرائی تو خلاف معمول مجھے زنانخانے میں ہی طلب فرما لیا۔ میں جو اندر داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھر کی ایک ایک چیز قرینے سے رکھی ہوئی ہے۔ خود دوپہر کا خاصہ تناول فرما کر ایک خوش نما قالین پر دراز ہیں اور حقہ پی رہے ہیں سامنے ننھی صاحبزادی اپنے کھلونوں کا جائزہ لینے میں مصروف ہے حسب عادت صاحب سلامت کے بعد میری خیر و عافیت پوچھی اور کچھ دیر بعد مجھ سے یہہ استفسار کیا کہ میرے یہاں جو سانحہ ہوا آپ کو اس کا علم ہے میں نے عرض کیا قطعاً نہیں فرمائے کیا بات ہوئی کہنے لگے آج نواں دن ہے کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا پھر اس کی تفصیلات بیان کیں کہ مرحومہ کی روح بدن سے اس طرح نکلی جیسے پھول سے خوشبو نکلتی ہے نہ ہچکی آئی نہ کوئی جھٹکا لگا۔ اسکول کے آٹھ سات سو طلبہ نے جنازے میں شرکت کی احباب اور مخلصین کی تعزیت اس پر مستزاد تھی یہہ ساری روداد انھوں نے جس اطمینان قلب سے سنائی وہ میرے لئے بالکل نیا تھا اس موقع پر میں اُن کے صبر و شکر اور مستقل مزاجی سے بڑا متاثر ہوا۔ حسن اتفاق سے وہ بڑی بڑی صحبتیں اٹھائے ہوئے تھے۔ تلاش معاش میں جب حیدرآباد آ نکلے تو مہینوں بیرسٹر عسکری حسن المخاطب بہ عسکر یار جنگ اور امام الفن حضرت فصاحت جنگ جلیل کے مہمان رہے۔ شمالی ہند میں عزیز لکھنوی سے اور حیدرآباد میں حضرت جلیل سے مشورہ سخن فرماتے تھے۔ موسم گرما میں جب عسکر یار جنگ ٹولی چوکی میں مقیم تھے اور صدق صاحب روزانہ بائسکل پر ٹولی چوکی سے شہر کا چکر کاٹتے تو اُن کا یہہ معمول دیکھ کر بیرسٹر صاحب نے کہا صدق صاحب آپ روزانہ اس چلچلاتی دھوپ میں شہر کا دورہ کر کے آتے ہیں مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کا رنگ نہ جل جائے جواب دیا عسکری صاحب ! میں اپنے رنگ کو دیکھوں یا دنیا کے رنگ کو۔ اگر میرا رنگ دھوپ سے جل گیا تو رفتہ رفتہ اپنی اصلی حالت پر آ جائے گا مگر دنیا کا رنگ ایسا نہیں ہے۔ ایک دن حضرت جلیل کو اپنی تازہ غزل سنا رہے تھے اس کے کسی شعر میں "کارگر" کا لفظ بند ہو گیا استاد نے فرمایا اردو میں "کارگر" رائج نہیں ہے اسے

"پر اثر" سے بدل دیجیئے۔ صدق صاحب نے فوراً سودا کا یہ مطلع سُنایا ؎

اے آہ کیا کروں نہیں بکتا اثر کہیں		جی تنگ تو دے کے لوں ہیں جو ہو کارگر کہیں

مطلع سنتے ہی جلیل صاحب نے ان کی حاضر جوابی کی تعریف کی۔

اب صدق مرحوم کے بعض چیدہ چیدہ اشعار جو اِس وقت میرے حافظے میں محفوظ ہیں ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے درج کرتا ہوں۔ حکیم مومن خاں مرحوم کی مشہور غزل جس کا پہلا مصرع ہے ؎

اب اور سے لو لگائینگے ہم

اس کی تضمین تو شائع ہو چکی ہے مجھے اس وقت مومن کے مقطع پر پہنچائے ہوئے مصرعے یاد رہ گئے جو یہ :- (۱) تجھ سا ہی حسین سہی ترا گھر (۲) فردوس بریں سہی ترا گھر (۳) خاتم میں نگیں سہی ترا گھر (۴) بت خانۂ چیں سہی ترا گھر (۵) مومن ہیں تو پھر نہ آئینگے ہم۔

داغ مرحوم اور دیگر اساتذۂ سخن کی سنگلاخ زمین میں کہا ہوا مطلع، شعر اور مقطع ملاحظہ فرمائیے ؎

انھیں نگاہوں کو ڈھونڈتا ہوں ترے تغافل سے تنگ ہو کر		جو بجلیاں بن کے دل پہ ٹوٹیں جگر پہ بیٹھیں خدنگ ہو کر

چھپائے سے خون کب چھپا ہے نہیں یہ شانِ خدا تو کیا ہے		کہ خونِ بلبل دمک رہا ہے گلوں کے چہرے کا رنگ ہو کر

اگر ہو بزمِ سخن میں تو بھی تو بیٹھنا دور زد سے ہٹ کر		یہ صدق کے شعر ہیں ستمگر چلیں گے ہر سو خدنگ ہو کر

ایک غزل کے مطلع اور مقطع میں شب وصل کی محاکاتی تصویر کے خط و خال بھرپور تغزل کے حامل ہیں

اُدھر تاروں کے جھرمٹ میں مہِ تاباں عیاں ہوگا		اِدھر پھولوں کی سیجوں پر ہمارا جانِ جاں ہوگا

سرور آنکھوں میں ساغر ہاتھ میں محبوب پہلو میں		زبانِ صدق پر شکرِ خدائے دو جہاں ہوگا

"نامۂ شوق" کے عنوان سے ایک مسلسل غزل کا یہ مطلع غضب کی اُٹھان کا حامل ہے ؎

پوچھے جو وہ نامہرباں کیسا ہے صدق ناتواں!!		کہنا تو اے قاصد کہ ہاں کل تک تو تھی آنکھوں میں جاں

بقول فانی مرحوم کے ایک حال زمین شعر ملاحظہ ہو جو حضرت شجیع با لقابہ کو بھی برسوں یاد رہا ؎

اُن کے لطفِ عام کو غیرت نہیں کرتی قبول		اور میں کمبخت لطفِ خاص کے قابل نہیں

مرحوم نے بشکل مکالمہ ایک غزل کہی تھی جس کے ہر مصرع اولیٰ میں سوال اور مصرع ثانی میں اُس کا جواب نظم کیا اُسی کا ایک شعر ہے ؎

کہا میں نے کہاں حسنِ خمِ ابرو کہاں خنجر		کہا یہ بھی پری بن جائے گا زیبِ کمر ہو کر

ایک غزل کا مطلع اور شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

جا گئے ہیں بخت عجز و نیاز و دعا کے بعد　　آئے ہیں راہ پہ وہ بڑی التجا کے بعد
تمہید التفات ہے اُن کی یہ بے رُخی　　شوخی کے دن بھی آئینگے شرم و حیا کے بعد

ایک اور غزل کے مطلع اور شعر کے مصرعوں کا باہمی ربط شاعر کی قادر الکلامی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ
تے ہیں سہ

دم اے ملک الموت ذرا بہر خدا لے　　واپس مرا قاصد در جاناں سے تو آلے
حسرت ہے کہ منہ سے بھی سنوں ناز کی باتیں　　اونچی نگاہوں سے مجھے دیکھنے والے

اب ایک غزل کا مطلع اور دوسری غزل کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے سہ

بھر دی ہے کوٹ کوٹ کے شوخی نگاہ میں　　اک برق کوندتی ہے تری جلوہ گاہ میں
ٹھیرے دلِ مضطر تو کریں وصل کی تدبیر　　سینے سے جدا ہوں تو اٹھیں ہاتھ دعا کو

آخر میں ایک قطعہ پر اکتفا کرتا ہوں سہ

ہم نے تو یہ ٹھانی تھی کہ بس آج کے دن سے　　بات اُس سے کبھی تا حدِ امکاں نہ کرینگے
لیکن وہی ملنے کو بڑھا آپ سے جس وقت　　پھر کہہ نہ سکے یہ تو مری جاں نہ کرینگے

یہ تمام اشعار میں نے محض اپنی یادداشت کی بنا پر یہاں درج کئے کوئی انتخاب پیش نہیں کیا گر
نہ یہ ہے کہ مرحوم کا ادبی ذوق اِس قدر نکھرا ہوا تھا کہ اُن کے منظومات کا ہر شعر نثر کا ہر جملہ اور روزمرہ
و کا ہر فقرہ زبان کی چاشنی خیال کی لطافت اور طرز ادا بانکپن کے لحاظ سے اپنی جگہ انتخاب ہی معلوم
ہے۔ مطالعۂ کتب کی چاٹ نے اُن کی علمی لیاقت کا رنگ اور چوکھا کر دیا تھا۔ جب انھوں نے عنوان
ب میں ادیب فاضل (پنجاب) کا امتحان دینا چاہا تو متعلقہ نصاب کی کوئی کتاب اُن کے لئے نئی نہ تھی
ںبا پورا نصاب ایک یا دو دفعہ نہیں سولہ مرتبہ تفننِ طبع کے طور پر اُن کی نظر سے گزر چکا تھا سترھویں
امتحان دینے کی غرض سے پھر اُس کا جائزہ لیا اور امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ ذہانت کے
ذ ساتھ حافظہ اِس غضب کا پایا تھا کہ فارسی اور اُردو کے اَن گنت اشعار باتوں باتوں میں برمحل سنانے
ادی ہو چکے تھے اسکول کے دورانِ درس میں بھی یہی عملدرآمد رہتا تھا جس سے اُن کی تدریس انتہائی
سپ اور معلوماتی ثابت ہوتی تھی ادبی تحقیق کا تو انھیں مرض تھا۔ غلط زبان بولنا کیسا وہ اپنے شاگردوں
لط الفاظ سننے تک کے روادار نہ تھے۔ تدریس کے دوران میں روزانہ یہ تماشا ہوتا تھا کہ اگر احیاناً
لڑکے کی زبان سے کوئی غلط لفظ نکل جاتا تو گھنٹہ بھر اُسے بنچ پر کھڑا ہونا پڑتا تھا تقریباً ساری کلاس
لیا پا استادہ نظر آتی تھی البتہ دو ایک خوش نصیب جو صحیح معنوں میں اُن سے زبان سیکھتے مزے سے

بیٹھے رہتے انھیں کے منجملہ یہ ہیچداں ہے جو برابر پانچ سال تک اسکول میں ان کے فیض صحبت سے استفادہ کرتا رہا۔ مجھے خوب یاد ہے جب مرحوم نے پہلے دن ہماری جماعت میں فارسی کے چند شعر ہم لوگوں سے پڑھوائے تو ہر ایک نے لفظ پلنگ پ کے زیر سے پڑھا اور اس کے معنی بتائے چیتا۔ صدق صاحب نے فرمایا کہ آپ لوگ نہ تو صحیح لفظ پڑھ سکتے ہیں نہ اس کے معنی بتا سکتے ہیں ایسی صورت میں اشعار کے ترجمہ کا جو حشر ہوگا وہ معلوم۔ لہٰذا ہر شعر کا با محاورہ ترجمہ میں خود تختۂ سیاہ پر لکھے دیتا ہوں اسے آپ نوٹ کر لیجئے اور کل مجھے لفظ بہ لفظ سنا دینا مگر شرط یہ ہے کہ اُسے سناتے وقت کوئی لفظ گھٹنے یا بڑھنے نہ پائے۔ پھر ہماری غلطی کی تصحیح فرمائی کہ پلنگ پ کے زبر سے ہے جس کے معنی ہیں تیندوا۔ فارسی کے ایک شعر کا ترجمہ جو مجھے آج تک یاد ہے یہاں اصل شعر کے ساتھ درج کرتا ہوں تاکہ اُن کی مہارت ترجمہ کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔ ملاحظہ ہو ؎

سخن ہر چہ گویم ہمہ گفتہ اند   بر باغ دانش ہمہ رفتہ اند

ترجمہ:۔ جو بات کہ میں کہتا ہوں سبھوں نے کہی ہے۔ عقل کے باغ کے پھل سبھوں نے سمیٹے ہیں۔

جس زمانے میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے حیدرآباد میں اردو لغت کی تدوین کا کام مختلف اہل قلم حضرات سے لیا تو صدق صاحب کے حصے میں یہ کام آیا کہ اُردو کے مایۂ ناز مرثیہ گو میر انیس اور مرزا دبیر وغیرہ کے مراثی کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے اردو الفاظ و محاورات کے تمام محل صرف یکجا کر لئے جائیں یہ کام اُن کے لئے ادبی سیر کی حیثیت رکھتا تھا جس کے ذریعے وہ ہر مہینے اپنی تنخواہ سے دونا معاوضہ حاصل کرتے تھے۔ اُن کی ذاتی استعداد اور بالخصوص تفہیم اشعار سے اُن کے شاگرد اس قدر متاثر رہتے تھے کہ ہائی اسکول کی تکمیل کے بعد جب وہ یونیورسٹی کی جماعت انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لے کے چند روز وہاں اردو پڑھتے تو رہ رہ کے صدق صاحب کو احسان مندی کے ساتھ یاد کیا کرتے تھے۔ پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا نظام کالج میں بی اے کے لڑکوں کو اُردو پڑھاتے تھے اُنھیں کے شاگردوں کے بقول اگرچہ آغا صاحب پڑھاتے کم تھے باتیں زیادہ کرتے تھے مگر اُن کی باتیں پڑھائی سے زیادہ کارآمد ثابت ہوتی تھیں۔ اسی طرح صدق صاحب کے لطیفے اور اُن کی برجستہ گوئی آپ اپنی مثال تھی۔ جس زمانے میں وہ ہاؤس ماسٹر بنائے گئے پرنس معظم جاہ بہادر نے دریافت فرمایا کہ صدق تم کو بورڈنگ ہاؤس میں کئے نوکر ملے عرض کیا تیرہ فرمایا تیرہ کا عدد تو منحوس ہے۔ جواب دیا سرکار چودھویں یہ فدوی ہے وہ بھی سرکار کے نوکر ہیں میں بھی سرکار کا نوکر ہوں۔

پرنس ہی کے دربار کا یہ واقعہ جو اُن کی شہرۂ آفاق تصنیف "دربار در بار" میں درج ہے ان کی غیر معمولی ذہانت پر دال ہے کہ اتفاقاً صدق صاحب نے میر شکوہ آبادی کا ایک شعر پرنس کو سنایا جو بظاہر مغلق تھا اس وقت کے حاضرین دربار اس شعر کا مطلب بیان کرنے سے عاجز نظر آئے اور قطعی فیصلہ کر بیٹھے کہ شعر مہمل ہے

صاحب نے کہا ہرگز مہمل نہیں ہے دماغ لڑایا جائے تو گوہر مقصود ہاتھ آ ہی جائے گا تین دن اسی حیص بیص میں رہ گئے۔ کوشش بسیار کے باوجود کوئی بھی اس گتھی کو نہ سلجھا سکا۔ فانی مرحوم تک نے کہا کہ ابھی تک اس شعر کا مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا آخر پرنس کے حکم کی تعمیل میں خود صدق جائسی نے اس کی ایسی تشفی بخش تشریح کی کہ دربار نے آفرین کی۔ افسوس ہے کہ اس وقت مجھے وہ شعر یاد نہیں رہا صدق مرحوم جیسے باکمال انسان کو یکسر بھلا دینا احسان فراموشی کے مترادف تھا غنیمت ہے کہ گورنمنٹ ہائی اسکول جیادر گھاٹ میں جہاں مرحوم اسکول کے ہیڈ اور ہاؤس ماسٹر رہ چکے تھے اُن کے ایک چہیتے شاگرد مسٹر مرزا سرفراز علی ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر حیدرآباد کی صدارت میں ۲۸ دسمبر ۱۹۶۵ء کی رات کو ایک طرحی مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ شعرا کی طبع آزمائی کے لئے مرحوم ہی کی غزل کا مصرع دیا گیا تھا۔ اس مشاعرے میں علامہ نجم آفندی نے بھی طرحی غزل سنائی منتظمین مشاعرہ نے بڑے سلیقے سے اس کے انتظامات کئے تھے کلام پاک کی تلاوت سے مشاعرے کا آغاز ہوا جس سے یقیناً مرحوم کی روح کو سکون ملا ہو گا۔

مرحوم کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ لے دے کے ایک لڑکی تھی جس کی انہوں نے سماں ہند میں شادی کر دی اولادِ معنوی کی حیثیت سے اُن کا کلام جو ہمایوں، ساقی، ادبی دنیا، عالمگیر، شانِ ہند وغیرہ جیسے ادبی رسائل میں برابر شائع ہوتا رہا اور مطبوعات میں غالباً پند نامہ، حدیثِ دوست، جواہر الصدق اور دربار دربار قابلِ ذکر کتاب کے چھپنے سے پہلے اُس کا مسودہ دیکھ کر بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے مصنف کو جو خط لکھا اس میں یہ تحریر فرمایا کہ آپ نے جس دربار کا تذکرہ کیا ہے وہ آخری دربار تھا اب نہ ایسے دربار ہوں گے کہ ایسے لکھنے والے ہونگے۔"

مضمون ہذا میں جتنے واقعات قلمبند ہوئے ہیں وہ یا تو میرے چشم دید ہیں یا خود صدق صاحب کی زبانی سنے ہوئے ہیں البتہ دربار دربار کے دوسرے حصے کی تفصیلات سے میں بالکل بے خبر اور اُسے مطبوعہ کتاب کی شکل میں دیکھنے کا کمال مشتاق ہوں۔ سردست جب کبھی "دربارِ دُربار" پڑھوں تو بے ساختہ منہ سے نکلے گا کہ کاش اسے صدق تو کار سے کرتی۔

ایک شعر اور جو میرے حافظے میں محفوظ ہے پیش ہے ـــ

تہیہ کرکے ان کے خواب میں آنے کا بیٹھا ہوں
جو میں سو جاؤں اے طالع تو تو بیدار ہو جانا

ضیاء حسنی

کوثر چاندپوری - فن اور شخصیت

میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے اردگرد کتابوں کے ذخائر پھیلے ہوئے تھے، دادیہال اور ننھیال دونوں گھروں میں میرے چچا اور ماموں دونوں کا مشغلہ درس و تدریس تھا۔ انھیں میں فرصت کے اوقات میں کتابوں کے عمیق سمندر میں ڈبکیاں لگاتے دیکھتا تھا۔ نگار پابندی سے آتا تھا اور مدیر نگار سے قربت تھی، اُن کے شوخ خطوط پڑھے جاتے اور مذہب کے باب میں اُن کی آزاد آراء پر تنقید ہوتی۔ میں زیادہ دنوں خاموش تماشائی بنا نہیں رہا اور جلد ہی نگار، ادبی دنیا، ادب لطیف، ساقی، ہمایوں، شاعر اور عالمگیر کے فائل دیکھنے لگا۔ دنیائے رسائل کی اسی بادیہ پیمائی کے دوران ایک دن کوثر چاندپوری مل گئے۔ انھوں نے ایک دلکش کہانی سنائی۔ عرصے کی بات ہے اس لیے اُس کا عنوان یاد نہیں رہا البتہ اُس کے سہارے میں جن رنگین اور پُرکیف فضاؤں میں پہنچ گیا تھا اُن کا تقاضہ تھا کہ میں رسائل کے گھنے جنگل میں انھیں برابر ڈھونڈتا رہوں جب وہ مل جاتے تو میرے دل کی کلی کھل جاتی اور میری خلوتیں جگمگا اٹھتی تھیں میں نے انھیں کئی روپ میں دیکھا ہے اور ہر روپ کافی دلکش دکھائی دیا لیکن افسانہ نگار کوثر میری توجہ کا ہمیشہ مرکز بنے رہے ہیں۔ وہ کوثر بھی میری نگاہوں کے سامنے ہیں جو منشی پریم چند کے بعد ابھر کر سامنے آئے تھے اور جو نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم، ل احمد، اور مجنوں گورکھپوری کے شانہ بہ شانہ چلتے رہے پھر وقت کا دھارا دوسری طرف مڑا تو وہ ہار تھک کر بیٹھ نہیں گئے۔ اُن کا قلم چلتا ہی رہا اس لئے کہ وہ چلتے ہی رہنے کو زندگی سمجھتے ہیں غرض کہ اُن کے اسلوب میں وقت، سماج اور اُس کے تقاضوں کی پرچھائیاں دکھائی دیتی رہیں۔ اُن کے بعض ساتھی نثر میں شعر کہہ رہے تھے اسلئے وہ خاموش ہو گئے لیکن حقیقت نگار کوثر کیسے چین سے بیٹھتے؟ کرب تخلیق برابر محسوس کرتے رہے اور لکھتے ہی رہے اور ابھی بھی وہ جدید افسانہ نگاروں کے درمیان پیش پیش ہیں۔ آج کوئی الجھا ہوا مسئلہ خواہ وہ ملکی ہو یا معاشرتی اُن کی بالغ نظر اور قومی مشاہدے سے بچتا نہیں، بجلی منزل، بابے کریم، چھوٹی آنکھیں، وراثت، کلثمیا، یادماضی، قلم [illegible] نقش قدم اور جنون کی موت ایسی لافانی کہانیاں ہیں جن سے کوثر چاندپوری کے بدلے ہوئے اسلوب کا پتہ [illegible] اس [illegible] عصری [illegible] زندگی کی تصویریں چلتی پھرتی دکھنے لگتا ہے۔ [illegible] نئے واقعات [illegible] [illegible] اُنھیں کہانی کی دلکش تکنیک میں پیش [illegible] [illegible] قادری کا دامن تھام لیتی ہے وہ [illegible]

زندگی بسر کرنے والے کو یہ تفصیلات کیسے حاصل ہوئیں ؟ اُس نے کلثمیا اور کرم الٰہی کی درد اور ٹیس سے بھری زندگیوں کو کس طرح جھانک کر دیکھا ؟ کوثر صاحب شاہ راہِ زندگی سے گزرتے ہوئے ہر واقعہ کو بغور دیکھتے ہیں ی ہوئی نظر ڈال کر آگے نہیں بڑھ جاتے وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اُسے من وعن پیش کر دیتے ہیں اور یہ تفصیلات دلکش بنا دیتی ہیں۔ ان تفصیلات کو بیان کرتے ہوئے وہ موضوع کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور میں نے ہمیشہ اس مشکل مرحلہ سے کامراں گزرتے دیکھا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے :۔

"چولھے کے قریب کلثمیا نے ردی کاغذوں اور چھیٹیوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ راکھ کرید کر اس نے دبے ہوئے ے نکالے اور اُن کے اوپر کاغذ ڈال دیئے پھر چھیٹیاں رکھ دیں اور پھونکنی سے دھونکنے لگی۔ چھیٹیاں وہ اس کاروں پر جما دیا کرتی تھی جیسے چڑیا انڈے دینے سے پہلے باریک تنکے جما کر گھونسلہ بنا لیا کرتی ہے" "کلثمیا"

"مولانا کی لمبی کھچڑی ڈاڑھی اور داہنے ہاتھ میں لٹکی ہوئی عقیق کی تسبیح بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ ٹخنوں سے اونچے پاجامہ میں کوئی دلکشی نہ تھی مگر اُسے یہ بھی اچھا لگتا رہا تھا۔ اُن کے لباس میں جو چیز سب سے زیادہ پسند آئی تھی وہ اُن کی خوبصورت صدری تھی۔" "نقشِ قدم"

"چار سال پہلے میں ادھر سے گزرا تھا۔ جب کبھی میں نے اُس کی آوازیں اپنے دل کی گہرائیوں میں اترتی ی تھیں۔ مجھے اُن میں محبت کی مٹھاس کھنکتی معلوم ہوتی تھی جو اس سندھی حلوے سے زیادہ میٹھی اور ں۔ اس کھنک میں سسی پنوں کے رومان کی گھلاوٹ تھی۔ وہ گرمی کا موسم تھا۔ خوب لو چل رہی تھی۔ بگولے ناچ رہے اور پلیٹ فارم چولھے پر رکھے ہوئے توے کی مانند تپ رہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں اسی گرم توے پر چل رہا تھا"

"ہوں۔ ہوں۔ ہوں گا"

"یہ بہت چھوٹی مگر خوبصورت بستی تھی ہر طرف آموں کے گھنے باغ، گیہوں اور ادھر کے بڑے بڑے کھیت، اونچے پیڑوں کی آغوش سے ابھرتی ہوئی رہٹ کی سریلی آوازیں، سڑکوں پر آگے پیچھے دوڑتے ہوئے آسمان میں دھنسی کبوتروں کی ٹکڑیاں اور اُن کے بیٹھنے کو جگہ جگہ پیڑوں پر بندھی ہوئی چھتریاں" "ادامی"

کوثر صاحب نے مشاقی سے چھوٹی چھوٹی باتوں کی وضاحت کی ہے اور اسقدر احتیاط سے کہ کہانی کی لہر کرانی ہی۔

کوثر صاحب نے ان گنت کہانیاں لکھی ہیں اور بقول اُن کے "بلا مبالغہ ہزاروں" ذرا اُن کے میلوں پھیلے چمن میں داخل ہو کر اُس کی لہلہاتی بہار کو دیکھیے، رنگین اور معطر پھولوں کی مسکان آپ کو آگے بڑھنے نہ دے گی پھر بھی کیسے جائیں گے ؟ باغبان کی ان تھک محنت اور طویل ریاضت کے بعد یہ چمن لہکا مہکا ہے۔ ہر ذی علم ان کے شاہکار افسانوں سے متاثر ہوا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نا قدروں کو کوثر صاحب کے سلسلہ میں

خاموشی زیادہ اچھی لگتی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ خلفشار سے الگ رہ کر خلوص اور لگن سے کہانی کی دلہن کے لب و رخسار نکھارتے سنوارتے رہتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی نے کہانی کے سلسلہ میں اچھی بات کہی ہے:۔

"کہانی ایک بنیادی فن ہے جو بڑی محنت اور ریاضت سے ہاتھ آتا ہے اور رفتہ رفتہ آپ کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ انسانی احساس بن جاتا ہے اور جب کہانی کا ترنم آپ کے جسم میں گھل مل جائے تو آپ سڑک پر، کوچے کوچے، کونے کھدروں میں کہانیاں پڑی ہوئیں ملیں گی۔ آپ کو کہانی تلاش کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ کہانی سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے آپ کو آئے گی۔"

بیدی نے جس منزل کا تذکرہ کیا ہے عرصہ ہوا کوثر صاحب نے اس کو چھو لیا ہے۔ کہانی کا ترنم ان کے جسم میں گھل مل گیا ہے۔ انھیں سوتے جاگتے چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے کہانیاں [illegible] یہ آن [illegible] ہے۔ ایسا فن کار جس کے فن کے پیچھے طویل ریاضت ہو اور وہ دلکش اور حسین بھی ہو اس سے کب تک ہم اپنی [illegible] بچاتے رہیں گے۔ ایک دن دیانت داری سے اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔

ناول ہو یا افسانہ، تنقید و تبصرہ ہو یا انشائیہ، رپورتاژ یا خاکہ ہیں کوثر صاحب کی ہر تخلیق میں زبان [illegible] صحیح اور واضح ملتی ہے۔ میں حضرت اعجاز صدیقی کی وقیع رائے سے متفق ہوں۔

"کوثر صاحب کے یہاں تجربات و مشاہدات کی پختگی کے علاوہ زبان، الفاظ اور محاوروں کی صحت [illegible] اتم ملتی ہے۔ عام طور پر اچھے اچھے افسانہ نگاروں کے یہاں یہ احتیاط نہیں ہوتی"

زبان اور طرز بیان کی دلکشی اور حسن کے ساتھ وہ دل کو چھو لینے کا انداز بھی خوب جانتے ہیں۔ [illegible] کہ وہ قاری کو دلکش زبان کی بھول بھلیوں میں بھٹکا کر آگے بڑھ جائیں وہ اپنی کہانیوں میں جگہ جگہ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو قاری کو لمحۂ فکر دیتی ہیں اور گھنٹوں اس کے دل میں کھٹکتی رہتی ہیں۔ اب میں چند مثالیں پیش کر رہا ہوں [illegible]

"غزل نہیں جی ایک قصیدہ لکھنا شروع کیا تھا ریو مینو منسٹر کے لئے۔ سال بھر سے جاگیر کے معاوضہ کی قسط رکی [illegible]"

"بچہ تم نیا نیا یہ پیشہ نہیں کر رہے تم نے جس ماں کی چھاتیوں سے دودھ پیا ہے وہ اکیلی گاؤں بھر کی صفائی کیا کرتی تھی اور تمہارا باپ آبادی کے باہر اتنا میلا اکٹھا کر دیا کرتا تھا اپنے سر پہ ڈھو کر کہ ایک ایک گڑھا چار چار روپے کو بکتا [illegible]"

"سڑی بسی چیز ہم تو سدا سے [illegible] ہی کو دیتے آئے ہیں"

"انھیں کمینوں سے خدا واسطے کا بیر تھا"　　(پچھلی منزل)

کوثر صاحب سماج کے گھناؤنے مناظر بخوبی قریب [illegible] یہ درست [illegible] میں انھوں نے جگہ جگہ [illegible] انداز [illegible] اختیار کئے ہیں۔

کوثر صاحب کی افسانوی [illegible] درمیان سے اُن کا عمیق مطالعہ جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ کلا[illegible]

ن ایسی بات بتا دیتے ہیں جو ان کے دماغ کے کسی کونے کھدرے میں پڑی ہوتی ہے لیکن وہ قاری کے لئے نادر اور بے بہا
ہو جاتی ہے اور اس کی معلومات میں اضافہ کرتی ہے اس سلسلہ میں اُن کی احتیاط قابل داد ہے۔ کہانی کی ہر کڑی ملتی ہی
ہی ہے ملاحظہ فرمائیے:۔

"جب کوٹ اور رینڈ پہن کر وہ دھوپ سے بچنے کے لئے ہیٹ لگا لیتے تو ایسا لگتا جیسے اسلام اور عیسائیت میں
صدیوں کی صلیبی لڑائی کے بعد بہت خوش گوار قسم کا سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ چہرہ مسلمان ہے باقی سارے جسم نے دینِ مسیحی قبول
کیا ہے وہ دل سے عیسیٰ کی صلح جوئی اور امن پسندی کے قائل تھے صرف ایک گال پر نہیں دونوں گالوں پر چپت کھا کر بھی
جھکا دینے کی پالیسی کو ہمیشہ انھوں نے سراہا تھا۔"

کوثر صاحب نے بے شمار موضوعات پر کہانیاں لکھی ہیں۔ اتحاد و اتفاق۔ بین الاقوام۔ مساوات' غریبی بھک مری
مسئلہ مہاجرین اور ان گنت الجھے ہوئے معاشرتی مسائل پر انھوں نے شاہکار افسانے لکھے ہیں" گنا ... ہوا ... موضوع
ناجا رحیت ہے "حیوان کی موت" میں فرقہ پرستی کی مذمت کی گئی ہے۔ کہانی "پہلی منزل" مساوات کا درس دیتی ہے اور
سان انسان کے درمیان جو تفریق چلی آرہی ہے اس کی مذمت کرتی ہے "چھوٹی آنکھیں" کا موضوع مسئلہ مکاں ہے۔
"تماشہ" میں مسلمانوں کے ایک مذہبی مسئلہ کو کامیابی کے ساتھ کہانی کی تکنیک میں پیش کیا گیا ہے۔ مہاجرین کے سلسلہ پ
رنا نے اپنی کہانی "ہوں ہوں ہوں گا" میں اچھی باتیں کہی ہیں۔
کوثر صاحب بھگوان سندھی کی بات درج بالا کہانی میں کر رہے ہیں لیکن باتوں باتوں میں اس حقیقت کا بھی اعتراف
بتے ہیں کہ پنجاب اور سندھ سے آنے والے افراد دست سوال پھیلانے کی بجائے جفاکشی سے کسب معاش کرنے پر عامل ہیں۔
"پہلے ہی دن اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ بھیک مانگ کر اپنا اور بدما کا پیٹ نہیں بھرے گا بلکہ کوئی دھندا شروع کر دیگا۔"
کوثر صاحب کے اس جملہ سے پوری قوم کا عمل سامنے آجاتا ہے۔ بھگوان پیر گھسیٹ کر چلتا ہے ۔۔۔۔۔۔
ن ... سردی اور تیز گرمی کے زمانے میں بھی اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔۔
"پلیٹ فارم چولھے پر رکھے ہوئے توے کی مانند تپ رہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں اسی گرم توے پر چل رہا تھا"
کوثر صاحب جب کسی کردار یا منظر کو اپنی کہانی میں پیش کرتے ہیں تو اس کی مکمل تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے
نا افسانہ پڑھ کر نہ صرف محو حیرت ہوتا ہے بلکہ افسانہ نگار کی قوی یادداشت کا معترف بھی ہو جاتا ہے۔
کوثر صاحب جتنی نادر و جاذب نظر تماثیل پیش کرتے ہیں اور انھیں اس سلسلہ میں جتنی مہارت حاصل ہے
وہ بات دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں کم ملتی ہے۔

"دونوں آنکھوں کی سفید پتلیاں دھوئے بادلوں کی طرح ... برساتی رہتی ہیں"
"ہوں ہوں ہوں گا"

وہ چاندی کے بھاری گہنوں سے یوں لدی ہوئی تھی جیسے گوندنی کا بوڑھا درخت پھلوں سے لدا کھڑا ہو۔

(نچلی منزل)

اس کا سر فتح مندی کے غرور سے اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ آم کی اس ٹہنی کی مانند جس پر سے کچا آم توڑ لیا گیا ہو اور وہ ہلکی ہو کر اوپر کو اٹھ رہی ہو۔

(چھوٹی آنکھیں)

اکثر کوثر صاحب اپنی کہانیوں میں انگریزی الفاظ لے آتے ہیں اور اُن کی کئی کہانیوں کے عنوان بھی انگریزی ہیں۔ جیسے ہونی ناور، ڈسٹ کور اور کال گرل وغیرہ اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے انگریزی الفاظ اردو میں مروج ہیں اور انھیں عام قاری بھی سمجھ لیتے ہیں، لیکن کہیں کہیں اُن کا استعمال مناسب نہیں ہوتا مثلاً:-

"میں چائے کی پیالی میں بھرے گرم پانی کو آہستہ آہستہ چمچہ ہلا کر اُسے اسٹرے لائیز کر رہا تھا"

یہاں اسٹرے لائیز کی بجائے اردو کا لفظ زیادہ سجتا

غرض کہ کوثر چاندپوری کی افسانہ نگاری کے طویل سفر کی روئیداد اس مختصر مضمون میں نہیں آ سکتی سمندر کو کوزہ میں کیسے بند کیا جا سکتا ہے، لیکن اس بحر جمیل میں غواصی ناگزیر ہے اس لئے کہ اس میں بے شمار در نایاب چھپے ہوئے ہیں اور انھیں نکال کر منظر عام پر لانا اشد ضروری ہے کوثر صاحب کے بارے میں حضرت اعجاز صدیقی کی رائے حق بجانب ہے

کوثر چاندپوری اردو کے بہت مشہور اور صاحب طرز ادیب ہیں اُن کا نہ صرف بحیثیت افسانہ نگار بلکہ ناول کے لکھنے والوں میں شمار ہوتا ہے بلکہ علمی و ادبی موضوعات میں بھی اُن کی بصیرت معتبر مانی جاتی ہے۔ کوثر چاندپوری کی افسانہ نگاری کا سفر بہت طویل ہے۔ پریم چند کے بعد اردو نے جو افسانہ نگار پیدا کئے اُن ہی میں ایک کوثر صاحب بھی ہیں

کوثر صاحب جتنے اچھے ادیب ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں" یہ بات کئی معروف ادبا نے بتائی تھی پھر کیا تھا اُن سے ملنے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی اور تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور ایک دن میں دھیرے سے اُن کے تنہا خلوت میں داخل ہو گیا۔ اُن دنوں مجھے اُن کی ضرورت بے حد محسوس ہوتی تھی۔ کئی سال پہلے ہی سے میں کہانیاں اور مضامین لکھنے لگا تھا۔ مضامین تو معیاری رسائل میں چھپ چکے تھے لیکن کہانیاں نہیں چھپی تھیں۔ فتحپور میں افسانہ نگار نہیں تھا صرف شاعر تھے اور جن کا میدان خالصتاً غزل گوئی تھا۔ یہ مجھے اپنی غزلیں سناتے اور میں اُنہیں سراہتا تھا لیکن اُنہیں میری کہانیاں سننا گوارا نہیں تھا۔ اس سلسلہ میں مجھے اپنے عزیز شاعر دوست اخلاق فتحپوری کی یہ بات ہمیشہ گدگداتی رہے گی۔ ایک دفعہ میں ساہتیہ سبھا کی ایک نشست میں اپنی کہانی سنانے جا رہا تھا۔ اخلاق صاحب بولے

"ضیا بھائی! کہانی آپ ضرور سنائیے لیکن سننے کے بعد میں نے کرم ارشاد کہہ دیا تو آپ کو کافی زحمت ہوگی

اُس زمانے کے میں تین دوستوں کو نہیں بھول سکتا پرنسپل اندر سروپ سریواستو، بیتاب بیلی بھیتی اور

یہ تینوں فراخ دلی سے میری کہانیاں سنتے تھے۔ پرنسپل صاحب اور ڈاکٹر صاحب غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہتے تھے اور اُن میں جدت ہوتی تھی۔ غرض کہ اُنھیں دنوں میں نے کوثر صاحب کو لرزتے ہوئے ہاتھوں سے خط لکھ ہی دیا۔ لیکن مجھے اُمید نہ تھی کہ وہ جلد جواب سے نوازیں گے پھر بھی میں مایوسیوں کے درمیان اُمید کی کرنیں دیکھ رہا تھا۔ آٹھویں دن کوثر صاحب کا عنایت نامہ آیا اور میرے لئے ڈھیر ساری مسرتیں لایا اُسے پڑھتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے ایک چلچلاتی صبح نمودار ہو گئی ہو پھر روشنی بڑھتی ہی گئی اور اب روز روشن نکل آیا ہے۔ خدا کرے ہمارے خوش گوار تعلقات کی شام کبھی نہ ہو۔ میں کافی خلوص و عقیدت سے اُنہیں خط لکھتا وہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود محبت کا جواب محبت سے دیتے میں اپنی کہانیوں پر اُن کی بیش قیمت آراء کا خواستگار بھی تھا اُنھوں نے میری کہانیاں دیکھیں لیکن سیاہ کو سپید نہ کہہ سکے اور جب کوئی اچھی بات دیکھی، تو اُس کے اظہار میں بخل نہیں کیا۔

میں نے برسوں اُنھیں اخلاق کی کسوٹی پر کسا اور وہ مجھے ہمیشہ کھرے ہی دکھائی دئے پرخلوص بے لوث اور دردمند۔ میں بھوپال تو نہیں جا سکا لیکن تین بار دہلی میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ پہلی ملاقات ہی میں اس طرح کشادہ دلی سے ملے جیسے ہم بارہا مل چکے ہوں۔ وہ معروف گفتگو تھے لیکن مجھے پر خلوص نگاہوں سے دیکھے جا رہے تھے۔ اُنہیں میرے بیمار اور مضمحل چہرے سے جتنی ہمدردی ہے وہ اُن کی آنکھوں سے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اُنھوں نے مجھے دودھ، مکھن اور پھلوں کے استعمال کی طرف راغب کیا اور یہ بھی فرمایا "سحر خیزی کے عادی بن جائیے"

اُنھیں دنوں نیاز فتحپوری کا انتقال ہوا تھا اُن کا تذکرہ خلوص و عقیدت سے کرتے رہے کوثر صاحب اُن فن کاروں میں سے نہیں ہیں جو صرف زندگی میں کسی ادیب یا شاعر کی شخصیت کو تسلیم کرتے ہیں اور پھر حرفِ غلط کی طرح اُسے بھلا دیتے ہیں۔ کوثر صاحب نے نیاز کو زندگی میں سراہا ہے اور تنقید بھی کی ہے لیکن اُس دن وہ نیاز کی موت سے جس طرح متاثر دکھائی دے رہے تھے وہ تاثر رہ رہ کے موضوعِ گفتگو بن رہا تھا۔

تیسری ملاقات گذشتہ ستمبر میں ہوئی۔ تازہ ناول "مرجھائی کلیاں" عنایت فرمایا پھر جدید افسانہ پر گفتگو ہوئی، میں نے اُن کی کئی تازہ کہانیاں پڑھی تھیں، میں نے وہی تاثرات پیش کئے جو اس مضمون میں لکھ چکا ہوں۔ اس دوران میں وہ معروف ہو گئے پھر چائے کا دور چلا۔ "پتھر کا گلاب" ایک ضخیم ناول زیرِ طباعت تھا اُس کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اجازت چاہی۔ کوثر صاحب نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا اور میں اپنے ذہن میں اُن کی پرخلوص شخصیت کے نقوش لئے ہوئے چلا آیا۔

کوثر صاحب دوسری اصناف کی طرح خط بھی دلکش لکھتے ہیں۔ خطوط کے آئینے میں اُن کی دلکش شخصیت کے خد و خال نمایاں طور پر دکھائی دیں گے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں مجھے کبھی نیک مشورے دیئے ہیں، کبھی میرے ڈوبتے ہوئے دل کو ابھارا ہے کسی موقع پر اظہارِ مسرت کیا ہے اور کبھی شریکِ غم ہوئے ہیں، اپنی باتیں لکھی ہیں میری باتیں

پوچھی ہیں۔ ان نجی خطوط میں سے بعض مفید اور اہم ہیں۔ ایسے خطوط کو میں نذر قارئین کر رہا ہوں۔ ہاں یہ مختصر ضرور ہیں لیکن ایک معروف ادیب نے میرے لیے اتنا وقت نکالا اسی کے لئے میں بے حد ممنون ہوں۔

برھوارہ - بھوپال ۱۵-۱۰-۶۳ء

مکرمی تسلیم - آپ پسند کریں یا نہ کریں کہانی میں ایک تجربہ ہے ممکن ہے خود آپ کا ہو اس کا تاثر اور شدید ہو سکتا تھا۔ آپ کوشش کر کے اپنی شخصیت کو اس میں اور شامل کر دیتے بہرحال آپ اچھا لکھ لیتے ہیں لکھنے کا سلسلہ جاری رکھیئے۔ ایک دن ہم سب کی جگہ آپ کو مل جائے گی۔ عنوان "سہارا" اچھا ہے۔ موتی کے لئے خواہ مخواہ ایک تکلف کرنا پڑے گا۔ نگار کون صاحب ہیں؟ کیا یہ فیروز نگار؟ ساحر نجمی کو میں جانتا ہوں۔

ہاں! زینت جو زبان بولتی ہے وہ بیگمات کی سی زبان ہے۔ ماحول کا اثر ہو یا وہ خود تعلیم یافتہ ہو اس کی ذرا سی صراحت ہونی چاہئے تھی۔

آپ نے جہاں میری کتاب "مسکراہٹیں" دیکھی ہے براہ کرم وہاں "جام جم" اور "داستانیں" اور دیکھیئے۔ جام جم میرے تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے۔ عالمگیر پریس لاہور میں چھپا تھا اور "داستانیں" باغ و بہار کا جدید افسانوی روپ ہے۔ انوار احمدی پریس الہ آباد میں شائع ہوئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں میرے پاس نہیں ہیں وہاں مل جائیں تو مطلع فرمائیے۔

نیاز کیش کوثر چاند پوری

اس خط سے کوثر صاحب کا خلوص نمایاں ہے اُن کی حوصلہ افزائی کے بعد میں تیزی سے لکھنے لگا اس مکتوب میں میرے دو شاعر دوستوں کا تذکرہ ہے۔ میں اپنے خطوط میں اُن با ذوق ساتھیوں کا تذکرہ کرتا رہتا تھا جن سے تبادلۂ خیالات کرتا تھا۔ میں تو شعلہ نہیں بن سکا لیکن کوثر صاحب کسی چنگاری کو شعلہ بنانا خوب جانتے ہیں۔ یہ اُن کا خلوص ہے کہ وہ جانے پہچانے فن کاروں سے زیادہ ابھرتے ہوئے فن کاروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ بھی خاموش خدمت ادب ہے۔

بھوپال ۱۲-۴-۶۴ء

مکرمی ضیاء صاحب! تسلیم۔ کارڈ مل گیا مجھے آپ کی کامیابی سے مسرت ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ مستقبل میں آپ ایک اچھے فن کار کی حیثیت سے روشناس ہوں گے۔ آدمی کی محنت اور صلاحیت کبھی رائیگاں نہیں جاتی بس خلوص کی ضرورت ہے شہرت کو مطمح نظر نہ بنائیے۔ استقلال اور ہمدردی سے لکھتے رہیے۔ شہرت ثانوی چیز ہے جو آپ ہی آپ حاصل ہو جاتی ہے۔ ساحر صاحب سے سلام فرمائیے۔

نیاز کیش کوثر چاند پوری

کوثر صاحب نے اس مکتوب میں اچھی باتیں لکھی ہیں یقیناً آدمی کی محنت اور صلاحیت رائیگاں نہیں جاتی اور جو کام ملو اور لگن سے کیا جاتا ہے اس میں کامیابی ہوتی ہے۔ کوثر صاحب کے خیالات و نظریات نے مجھے روشنی دکھائی۔

بھوپال ۳۰/۵/۶۲ء

ضیا صاحب! تسلیم۔ مخلصانہ اظہار رائے کا شکریہ۔ غالب اپنے عہد کا ترقی پسند شاعر ضرور تھا لیکن اس زمانہ کا ماحول بے حد قنوطی تھا اس کا اس پر اثر پڑا اس نے اس تاریکی سے نکلنے کی کوشش ضرور کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اس کے باوجود اس کے بڑے شاعر ہونے پر کلام نہیں کیا جا سکتا میں نے اس کی شاعری پر تجزیاتی تنقید کی ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے میں غالب کا دشمن ہرگز نہیں، حقیقت پسند ضرور ہوں۔

بابر بہ عیش کوش والا شعر خود بابر کا نہیں ہے کسی اور بابر کا ہے لیکن اس نے اس ... کو حوض پر لکھوا دیا تھا جس میں شراب بھری جاتی تھی۔ بابر میں یہ خاص بات تھی کہ وہ دوسرے شعراء کے اچھے اشعار کو بے حد پسند کرتا تھا۔ ساحر صاحب سے سلام فرما دیجئے۔

(نیاز لیس کوثر چاند پوری)

میں نے کوثر صاحب کے مضامین کا مجموعہ "دیدہ بینا" پڑھا تھا اور چند مضامین کے بارے میں اپنے تاثرات لکھے تھے۔ غالب کے سلسلے میں کچھ اختلاف کیا تھا یہ مکتوب اسی کے جواب میں آیا تھا۔

دہلی ۸/۶/۶۲ء

ضیا صاحب! خط کا جواب بہت دیر میں دے رہا ہوں بات یہ ہے کہ حکیم صاحب ایک ماہ سے باہر ہیں میں ہی کام کر رہا ہوں مصروفیت بہت زیادہ ہے آپ کی رائے صحیح ہے کہ نگار کے ملاحظات کا وہ رنگ نہیں ہونا بھی نہیں چاہیئے آفتاب اور چراغ کا سا فرق محسوس ہوتا ہے یہی نسبت نیاز صاحب اور زمان صاحب میں ہے۔ میرا معاملہ نیاز صاحب سے کچھ اور ہی تھا وہ مجھ پر بے حد مہربان تھے۔ میں نے انھیں کو پڑھ کر لکھنا سیکھا کبھی اصلاح نہیں لی لیکن ان کا اثر برابر قبول کرتا رہا کاروان ہمارا کی قیمت پروفیسر صاحب نے بھیج دی تھی۔

(نیاز کیش کوثر چاند پوری)

دہلی ۲۹/۶/۶۲ء

مکرمی ضیا صاحب تسلیم۔ جواب بہت دیر میں دے رہا ہوں۔ نادم ہوں ایک مدت کے لئے بھوپال چلا گیا تھا نگار کے جس قدر پرچے مل جائیں انھیں جمع کرتے رہیئے۔ نیاز تو اب ملنے سے رہے ان کی تحریر آنکھوں سے لگائے رکھئے نیاز صاحب! ایسا آدمی اٹھا ہے کہ کائنات اردو خالی ہو گئی ہے۔ آپ مجھے بہت اچھے مواقع پر یاد کرتے ہیں۔ آپ کی ایک غزل گذشتہ ماہ کسی رسالہ میں پڑھی تھی نام یاد نہیں رہا۔ مضمون بھی پڑھ لیا تھا۔ شمع ادب کا خاص نمبر ہنوز نہیں ملا۔ بیتاب صاحب سے فرما دیجئے کہ اس کی دو کاپیاں بھیج دیں۔ جہاں غالب کی دو تین جلدیں بڑی مشکل سے منگا سکا ہوں کسی طرح آپ کو بھی بھیجوں گا۔

(نیاز کیش کوثر چاند پوری)

درج بالا خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوثر صاحب کو نیاز صاحب سے کتنی دلی وابستگی ہے۔ ان کی زندگی میں جیسے خیالات کوثر صاحب کے تھے ان میں ذرا سی تبدیلی نہیں ہوئی اس کے برعکس اکثر ادباء اور شعراء نے نیاز کی موت کے بعد

انہیں بُرا کہنا شروع کر دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نیاز صاحب نے بھی اپنی زندگی میں بعضوں کے ساتھ بھلائی نہیں کی بہرحال کوثر صاحب کی وضع داری، خلوص اور محبت ان مکتوبات سے نمایاں ہے۔ انھوں نے کئی اور خطوط میں بھی نیاز صاحب کا بڑے خلوص و عقیدت سے تذکرہ کیا ہے۔

دہلی ۱۴/۳/۶۷

[illegible] صاحب! تسلیم۔ تازہ کارڈ ملا میں کانپور کے پتہ پر دو خط لکھ چکا تھا کیا وہ ڈائریکٹ ہو کر آپ کو نہیں ملے، دعا کرتے آپ جلد تندرست ہو جائیں شبیر الحسن صاحب کو میں خوب جانتا ہوں نہایت نیک سیرت آدمی ہیں اُن کا جدہ جانے کا علم مجھے نہیں تھا۔ اُن کی "محبت" ادبی نہیں مولویانہ ہے۔ میں نے کتاب پڑھی نہیں سنا ہے۔

مرزا حیرت دہلوی کا ترجمۂ کلام پاک شاید ہی کہیں مل سکے۔ دیکھئے کو یہاں کی لائبریوں میں ضرور مل جائے لیکن دستیاب ہونا دشوار ہے۔ بہرحال معلوم کر رہا ہوں۔ آج دو جگہ فون کیا تھا۔ پتہ نہیں چلا۔ مزاج واقعی اچھا نکل رہا

(کوثر چاندپوری)

دہلی ۱۴/۱/۶۷

میں اسی ہفتے میں سابقہ پتہ پر آپ کو خط لکھ چکا تھا معلوم نہیں ملا یا نہیں۔ بہت دنوں سے آپ کی خیریت نہ ہونے سے کچھ الجھن سی محسوس ہو رہی تھی کل کے کارڈ سے پتہ کی تبدیلی کا علم ہوا۔ براہ کرم پتہ ہر خط پر لکھ دیا کیجئے آپ کا شاعر والا مضمون پڑھ لیا تھا۔ فریدہ موہنی بیسویں صدی سے مل جائے گی۔ اطبائے عہد مغلیہ اور شعلۂ سنگ (افسانوی مجموعہ) کی جلدیں میرے پاس آگئی ہیں۔ مزاج شائع ہو چکا ہے، پتہ آپ کو لکھ چکا ہوں۔ بیتاب صاحب ملیں تو سلام کہئے رسالہ جب بھی شائع ہوا اس کی فکر نہیں میں نے اُن کے ارشاد کی تعمیل کر دی ہے۔۔

نیاز کیش کوثر چاندپوری

دہلی ۲۵/۳/۶۷

ضیا صاحب! تسلیم۔ ایک کارڈ دستی خط کے جواب میں فتحپور لکھ چکا تھا۔ اس کے بعد آپ کا یہ کارڈ کانپور لکھا ہوا ملا پتہ مکمل یاد نہیں۔ پھر بھی غالبًا مل جائے گا۔ قلم الہٰی کو آپ نے پسند کیا۔ شکریہ۔ ریڈیو پر میں نے کہانی پڑھی تھی اس پر ڈاکٹر نارنگ، رام لعل اور رفعت سروش نے تنقید کی آخر میں میں نے جوابات دیئے میرے لئے وقت کم بچا بہت سی باتیں رہ گئیں اس کے بعد ایک تھا کہ ۲/۴ کو اردو سروس سے براڈکاسٹ ہوا۔ کہانیاں آپ لکھتے رہیئے۔

نیاز کیش کوثر چاندپوری

بندہ نواز!

اُس رات کو آپ نہیں آئے، گھر پر گیارہ بجے تک منتظر رہا۔ نہ معلوم کیا غلط فہمی رہی ممکن ہے (باقی صفحہ نمبر ۲!

مرا ماہنامہ "مزاج" بھوپال

انوار ظہوری

تاریخ روز و شب ہوں زمانے کا بخت ہوں
بکھرا ہوا نہ جان اگر سخت سخت ہوں

وہ موم ہوں پگھل کے جو بہہ جائے آنچ سے
شیشہ کوئی اٹھائے تو فولاد سخت ہوں

لمحوں کا زہر مجھ کو پلا دے نچوڑ کر !
لیکن یہ جان لے کہ نہایت کرخت ہوں

وہ آسماں ہوں جو زمیں پر محیط ہے
جس پر حیات رقص میں گم ہے وہ تخت ہوں

پھیلی ہوئی ہیں جس کی جڑیں دور دور تک
اپنے معاشرہ کا وہ اونچا درخت ہوں

اب تک مسافروں کی نظر سے بچا ہوا
جس کو سفر میں بھول گیا تو وہ رخت ہوں

سب وسعتیں خلا کی مری دسترس میں ہیں
بلقیس کی نظر میں سلیماں کا تخت ہوں

بہتر ہے کر نہ میری پرستش قریب سے !
بت ہوں یہ سوچ لے صفتِ سنگ سخت ہوں

آئینہ ہوں جو ٹوٹ گیا اور بکھر گیا
مجھ کو نہ ڈھونڈ میں جگر لخت لخت ہوں

تو مجھ سے دور جا کے مرا جائزہ نہ لے
سایہ میں آکے بیٹھ، اکیلا درخت ہوں

چپ چاپ ہو گیا ہوں الگ اپنی ذات سے
میں بھی تو جس جگہ ہوں ظہوری دولخت ہوں

اقبال منہاس

غنچوں کے شاخ شاخ پہ ہیں لب سلے ہوئے
ہیں صحنِ گلستاں میں شرارے بچھے ہوئے

گزرا ہے کون چاک گریباں و اشکبار
دیکھے ہیں رہگزار پہ موتی گرے ہوئے

سانسوں میں بس گیا ہے وہ لمحات کی طرح
بیتا ہے اک برس جسے مجھ سے ملے ہوئے

مجھ کو خزاں کا غم نہ بہاروں سے واسطہ
پھولوں کی طرح زخم ہیں دل کے کھلے ہوئے

لہرا رہی ہو جیسے خیالوں کی چاندنی
دیکھے ہیں ہم نے کھڑکی کے پردے ہلے ہوئے

اقبال آج دل کی جگہ صرف داغ ہے !
مدت ہوئی ہے حرفِ تمنا مٹے ہوئے

نقد و نظر

(تبصرہ کیلئے دو کتابیں بھیجی جائیں۔ جن کتابوں پر تبصرہ ہو جاتا ہے وہ ادارہ کے کتب خانہ میں داخل ہو جاتی ہیں اور ان کا ادارہ کے اوقات میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے)

صریر خامہ | شعبہ اردو۔ جامعہ سندھ حیدرآباد پاکستان۔ سائز ¼ کراؤن صفحات ۲۷۰۔ خوبصورت ٹائیٹل لیکن کتابت قدرے بہتر اور طباعت ناقص۔ قیمت ندارد۔

زیر نظر رسالہ شعبہ اردو جامعہ سندھ کے طلبا کا ترجمان ہے۔ یہ خاص شمارہ شعر کی ایک صنف قصیدہ یا مدحیہ شاعری سے متعلق ہے۔ اس تعلق سے اساتذہ ادیبوں کے مضامین کے ساتھ ساتھ طلبا کے مضامین بھی موجود ہیں۔ شعبہ اردو ہر سال ادب کے مختلف پہلوؤں پر خاص نمبر شایع کرکے ادب کی اہم خدمت انجام دے رہا ہے گزشتہ سال اسے تنقیدی نمبر پر ہم تبصرہ کر چکے ہیں۔

بلحاظ مضامین رسالے کے چار حصے ہیں پہلے کا عنوان ہے "تازہ بہ تازہ نو بہ نو"۔ اس کے تحت تیرہ مقالے ہیں جو اہل علم حضرات سے اسی کے لئے لکھوائے گئے ہیں اس میں پہلا مقالہ "قصیدہ بانت سعاد" پروفیسر ابوالفتح محمد صغیرالدین کا ہے۔ اس قصیدے کے مصنف حضرت کعبؓ ہیں جنہوں نے عہد ضلالت میں آپ کی ہجو لکھی اور جب آنحضرت نے آپ کے قتل کو مباح قرار دیا تو آپ کو قصیدہ سنا کر ردائے مبارک بطور خلعت حاصل کی۔ ان کے والد زہیر سبع معلقات کے شعراء میں سے ایک ہیں۔ اس قصیدہ کا متن کے ساتھ ترجمہ دیا گیا ہے۔ دوسرا مقالہ سودا' ذوق اور انشاء کا موازنہ" انور علی (سید) کا ہے۔ تیسرا مقالہ قصیدے کا نفسیاتی تجزیہ پروفیسر جلیل آغا کا۔ اس کے بعد کا مقالہ نصرتی کے قصاید کے تعلق سے پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے تحریر فرمایا ہے۔ اس میں علی نامے میں شریک چھ قصاید کا ذکر ہے علی نامہ میں قصیدہ ۳ صفحہ ۱۰۱ بہ عنوان "بادشاہ غازی بیجاپور کو آنے کا" ہے جس کے مطلع کا پہلا مصرع ہے ؂

اے شہ توں ہم نام علی شاہاں پو تیری سروری

اس قصیدہ میں ایک ضمنی قصیدہ بھی آگیا ہے جو علی نامہ میں قصیدہ نمبر ۴ ہے اور صفحہ ۱۰۲ پر ہے اس کا مطلع ہے ؂

دے ہے زمستاں ٹوکری ڈونگا اچا دھند کار آج   سردار ہو یا دخزاں ٹھنڈ کار چیا ہے بھار آج

یہ بجائے خود ایک قصیدہ ہے جس کے تعلق سے خود نصرتی کہتا ہے ––

اس تھنڈ کی تعریف میں یو یک قصیدہ میں لکھیا یو شعر زک کر دئی پڑے پڑتا ہوں جیوں تیوں سرسری

" تھنڈ " کے ضمنی قصیدہ کا ذکر مقالے میں نہیں ہے۔

جس طرح علی نامہ کے عنوانات سے ایک قصیدہ بنتا ہے اسی طرح گلشن عشق کے عنوانات سے بھی ایک قصیدہ بنا ہے اس کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو۔

مطلع :۔ ثنا صانع کی ہے جن ہو کتاب عشق کا بانی دیا ہے حسن کوں خلقت کہ خلعت کی ہر اک تزیہ عنوانی

ہمایوں نانوسوں سنہ کے کیا ختم کتاب آخر یو تحفہ نصرتی کا ہے الٰہی شہ کوں ارزانی

نصرتی کے ایک اور قصیدے کا ذکر ہونے سے رہ گیا ہے۔ یہ قصیدہ معراج نبوی سے متعلق ہے جس کے ۱۳۴ اشعار ہیں اس کا تعلق جزئیات سے ہے اس لئے کہ اس کی تشبیب فلکیات سے متعلق ہے۔ اس کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو :۔

مطلع :۔ تخت پہ جب دن پتی سیج یہ کیتا گون نس کا سپہ دار تب گرم کرے انجمن

مقطع :۔ شہ کی ثنا نصرتی نغز نول یوں لکھے دہر کے دفتر اوپر سراپچھے ہر یک سخن

اس کے علاوہ جزئیات سے متعلق نصرتی کے اور بھی قصاید بابائے اردو کے کتب خانہ خاص میں ہوں گے۔ یہ بیجاپور کے بھی ایک کتب خانے میں محفوظ ہیں اور حیدرآباد کے بھی ایک خانگی کتب خانے میں ہیں کاش یہ ضائع ہونے سے پہلے منظر عام پر آجائیں پانچواں مقالہ پروفیسر سید یحیٰ احمد ہاشمی کا شبلی کے قصائد کا تاریخی جائزہ ہے۔ اس میں ابتدا، فارسی کے نعتیہ قصیدے سے ہوئی ہے۔ عربی قصیدہ کا بھی ذکر ہے اور دیگر فارسی قصائد کا ذکر مع شان نزول کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ظہور احمد صاحب نے حضرت عمر فاروق اور عربی کے قصیدہ گو شعرا پر ہے اور پھر ڈاکٹر عبدالسلام سندیلوی نے اردو قصاید میں منظر نگاری پر ہے۔

پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی نے میر نظام الدین ممنون کو بحیثیت ایک قصیدہ گو پیش کیا ہے۔ ممنون شاہ عالم کے درباری شاعر فخرالشعرا کے خطاب سے ممتاز اور پھر اکبر شاہ ثانی کے استاد اور درباری شاعر رہے ہیں اور اپنی قصیدہ گوئی میں سودا کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر محمد البدیع ندوی نے قصیدہ گوئی اور اسکا عربی میں مقام پر اپنا مقالہ لکھا ہے اور سودا کے قصائد پر پروفیسر شاہ محمد نعیم ندوی نے اظہار خیال کیا ہے پروفیسر نجم الاسلام نے بھوپال کے قصیدہ گو شعرا کا تعارف کرایا ہے۔ ان کا دوسرا مضمون دکھنی اردو میں مدحیہ شاعری (ابتدائی دور) پر ہے اور اس کے ماخذ ڈاکٹر زور، ہاشمی، سخاوت مرزا، مبارز الدین رفعت کی کلیات شاہی اور اردوئے قدیم ہیں۔ اصل مثنویوں تک جہاں مدح کے اشعار ہیں فاضل مضمون نگار کی رسائی نہ ہوسکی۔

البتہ نصرتی کے متعلق ہے موصوف نے پوری معلومات دی ہیں۔ اس حصہ کا آخری مقالہ "قصیدہ ماضی کی راکھ میں دبی چنگاری" افواہ احمد یوسف زئی کا ہے۔ حالات کا تقاضا بتاتا ہے یہ چنگاری شعلہ نہ بن سکے گی لیکن بجھے گی بھی نہیں۔ عوام اس صنف کا برابر مطالعہ کریں گے اور حظ حاصل کرتے رہیں گے۔

رسالے کا دوسرا حصہ تبرکات پر مشتمل ہے جس میں قصیدے کے تعلق سے کتابوں اور مضامین میں آیا ہوا مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ طلبا کے نقطۂ نظر ہی سے نہیں بلکہ محققین کیلئے بھی یہ مواد اہمیت رکھتا ہے۔

تیسرے حصے کا عنوان ہے " زمین سخن گل کھلاتی ہے کیا کیا" اس کے تحت بہت سا مواد اردو میں پہلی بار آیا ہے ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے بلوچستان کے فارسی گو شعرا کے قصائد کا تذکرہ کیا ہے۔ پروفیسر انور رومانی نے براہوی مدحیہ شاعری پر لکھا ہے۔ حافظ نذر احمد نے پنجابی ادبیات اور مدحیہ شاعری پر لکھا ہے سندھی قصیدہ اور قصیدہ نگاروں کا تعارف پروفیسر زیب حبشی نے کرایا ہے۔ ڈاکٹر شرف الدین سندھی کی مدحیہ شاعری پیش کی ہے اور عبدالرحمن براہوی نے براہوی اور اردو قصائد کا موازنہ کیا ہے۔ یہ حصہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اس سے ہم نئی زبانوں کی شاعری کی ایک صنف سے واقف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صدر شعبۂ اردو اور ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی نگران کا ممنون ہونا چاہیئے کہ صاحبانِ موصوف نے اردو میں متعدد زبانوں کی مدحیہ شاعری کا نمونہ پیش کیا اس سے اردو کی شعری تاریخ میں ایک اضافہ ہوا ہے۔

چوتھا عنوان ہے" اے گل بہ تو خورسندم" تو بوئے کسے داری" اس حصہ میں جامعہ میں زیرِ تعلیم متعلمین کے مضامین ہیں جن میں قصیدے کے تعلق سے مختلف عنوانوں کے تحت سودا، ذوق، حالی، امیر مینائی، محسن کاکوروی اور جوشش عظیم آبادی کی قصیدہ نگاری پر بھرپور تنقیدیں ہیں۔ ہر مضمون نگار نے اپنے متعلقہ مضمون کو خوش اسلوبی سے پیش کرنے کی سعی کی ہے جس سے طلباء کے گہرے مطالعہ، اچھے شعور اور عمدہ صلاحیت کا ثبوت ملتا ہے" تقریبات و تفریحات" کے تحت اردو شعبے کی سرگرمیوں کا ذکر ہے اور اعزازات کے تحت ایم اے ۶۸-۱۹۶۷ء کے یونیورسٹی کے تمام مقالہ نگار طلبار کا ان کے لئے ہوئے موضوع کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی تعداد ۷۰ ہے اور اکثریت طالبات کی ہے۔

ڈاکٹریٹ کے لیئے ایک ہی خاتون' ناسخ اور ان کے تلامذہ پر مقالہ تیار کر رہی ہیں۔ متعدد کتابوں پر تبصرے بھی اس میں شامل ہیں۔ مختصر یہ کہ مریرِ خامہ نے بہت جلد ادبی دنیا میں اپنے لئے ایک خاص مقام پیدا کر لیا ہے اور یہ شعبۂ اردو کے اساتذہ اور طلبار کی دلچسپیوں اور ان کی ان تھک مساعی جمیلہ کا ثمرہ ہے۔

قرآن اور انسان

طباعت معمولی - ضخامت (۴+۱۰۴) صفحے - قیمت تین روپے۔
ملنے کا پتہ : — ادارۂ علمیہ ۳۲۱ - جدید ملک پیٹ حیدرآباد اے۔پی ۳۶

یہ کتاب میر ولایت علی بانی ادارۂ علمیہ (جس کا نصب العین تمام مذہبوں کے عمدہ اصولوں کی صحت بخش انسانیت کی نشو و نما کی تبلیغ ہے) کے تفکر و تدبر قرآن سے متعلق دو مختلف مضامین کا مجموعہ ہے' جس میں انسان کی تخلیق آدم کی خلافت' اسلام' اتباع رسول اور معصیت' آخرت کے تین مفہوم' بعث بعد الموت کے دو مفہوم' جنت و جہنم کی حقیقت' رحمۃ اللعالمین' شفاعت کی حقیقت کے بارے میں قرآن کی روشنی میں دل نشین انداز میں بحث کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اوپر کے موضوعات ایسے ہیں کہ اکثر و بیشتر مسلمانوں کو ان کے سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اختلافات کے باعث صحیح طور پر انھیں حل کرتے نہیں پاتے۔ عمدہ تفہیم کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے میر صاحب کا پیرایہ بیان ایسا عام فہم ہے کہ ایک عامی آدمی ان کو بخوبی سمجھ جا سکتا ہے۔ امید ہے کہ اس قسم کے دینی مسائل کے سلجھانے میں یہ کتاب مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت ہو گی۔

سالنامہ پیام تعلیم

ایڈیٹر محمد حسین حسان - جامعہ ملیہ نئی دہلی ۲۵ - ۱۲۰ صفحات - قیمت دو روپے۔
سالانہ چندہ ۶/-

پیام تعلیم ہر سال اپنا سالنامہ پیش کرتا ہے۔ اس سال بھی ادارہ نے ایک خوبصورت اور گوناگوں دلچسپیوں سے بھرپور سالنامہ شائع کیا ہے۔ بچوں کیلئے نہایت دلچسپ' معلومات آفریں اور دلآویز نظمیں کہانیاں ڈرامے مضامین اور لطیفے بھی شامل ہیں۔ چھوٹے بچوں کی دلچسپی کا سامان بھی ہے اور بڑے لڑکوں کی دلچسپی کا بھی۔ سیدھے سادے مضامین بھی ہیں اور ہنسنے ہنسانے والے بھی نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ چند لکھنے والوں کی بھی تصویریں ہیں اور مضامین سے متعلقہ بھی۔ سائنس سے متعلق مضامین کی بھی کمی نہیں۔ بہر حال فاضل مدیر نے اس کو دلکش اور جاذب نظر بنانے میں سارا زور صرف کیا ہے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ جن گھروں میں اردو پڑھنے والے بچے موجود ہوں' جن اسکولوں میں اردو پڑھائی جا رہی ہو اور جن کتب خانوں میں لوگ اردو اخبار اور رسالے پڑھتے ہوں وہاں اس کو ضرور خریدا جائے سالانہ چندہ چھ روپے جس میں سالنامہ بھی شریک ہے۔ نہایت مناسب اور معقول ہے اس میں یقین ہے کہ ہمارے قارئین ضرور متوجہ ہوں گے۔

(مولوی) غلام رسول

بھوپال میں غزل

بھوپال اردو ادب کے ایک اہم مرکز کی حیثیت رکھتا ہے اور غزل ت اردو شاعری کی آبرو قرار ہے بھوپال میں غزل اسی ادبی مرکز میں ۱۹۵۰ء کے بعد اردو شاعری کی آ [illegible] کے تعین کی کامیاب کوشش [illegible] ماگری نے اس انتخاب

[illegible] بھوپال کی غزل کو ہندو پاک [illegible]

نئے خیالات و جدید رجحانات نے جگہ بنائی ہے اس کے اثرات کو بھوپال کی غزل نے کس حد تک قبول کیا ہے۔ اس کا تقابلی موازنہ قرار دیا ہے۔ گذشتہ چند سال سے اردو شاعری میں "جدیدیت" کے نام پر جو تجربے ہوتے ہیں وہ کسی حد تک موثر بھی ہیں اور مضحکہ خیز بھی۔ بھوپال کی غزل بھی ان تجربوں سے گذر رہی ہے چنانچہ اس مجموعہ میں جہاں غزل کے قدیم رنگ کی نمائندگی کرنے والے موجود ہیں جدیدیت کے نام لیوا بھی نظر آئیں گے مرتب نے شعراء اور ان کی غزلوں کا انتخاب اپنے طور پر کیا ہے۔ اگرچہ یہ انتخاب بھرپور معلوم ہوتا ہے لیکن زیادہ بہتر ہوتا کہ غزلوں کا انتخاب شاعروں پر چھوڑ دیا جاتا تا کہ منقیدی نقطۂ نظر داخلی سے زیادہ خارجی ہوتا اور تبصرہ میں بعض مقامات پر توازن کی جو کمی محسوس کی جا سکتی ہے وہ کم ہوتی!

جناب شمیم احمد نے اردو غزل کے تدریجی ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے بھوپال کے شاعروں اور ان کی غزلوں سے بحث کی ہے۔ لیکن انھوں نے جہاں مختلف شاعروں کے ضمن میں "سماجی شعور" "مسائل حیات" اور "تہذیبی و ثقافتی ورثہ" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ خود بھوپال کے سماجی پس منظر کو نمایاں نہیں کیا کہ جس پس منظر میں یہ شاعر خصوصاً نئی غزل کے شاعر ابھر رہے ہیں۔ اس کمی کے باوجود تبصرہ کے وقیع اور وزن و وقار کے حامل ہونے میں کلام نہیں۔ دو چار شعراء سے قطع نظر انھوں نے تقریباً تمام شاعروں کی مجموعہ میں شامل غزلوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ بعض شاعروں کے بارے میں تو تفصیلی طور پر کیا گیا ہے۔ جن میں اُن کے پسندیدہ کیف بھوپالی اور محمد علی تاج بھی شامل ہیں اور فضل تابش بھی جن سے انھوں نے سوال کیا ہے کہ ان کو شاعری کی کیا ضرورت ہے؛ فضل تابش کی شاعری ایسی بھی نہیں کہ اسکو دیس نکالا دیا جائے جبکہ خود تبصرہ نگار نے ان کی شاعری کے بعض پہلوؤں اور معنوی خوبیوں کو سراہا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان نئے تجربوں کی غزل اور نئے لب و لہجہ یا اس "جدیدیت" پر قطعی سند دینے اور حکم واقعی لگانے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ ابھی تو اس نئے رنگ کو پختہ اور بالغ ہونے دیا جائے تب کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تحریک فی الوقت بڑی حد تک منفی ہی سہی لیکن کون جانے آگے چل کر کعبۂ غزل کو ان صنم خانوں سے چند پاسبان بھی مل جائیں چند اور مقامات پر بھی تبصرہ نگار سے اختلاف رائے ممکن ہے۔ مقصود عرفان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان پر جوش کی طمطراق کا گہرا اثر ہے۔ ان کے اور کلام کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاید یہ فیصلہ کیا جا سکے۔ لیکن زیر نظر غزلوں کے مطالعہ کے بعد مقصود عرفان جوش کی بجائے سردار جعفری سے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ یوں کہنا ہے کہ اس رائے سے بھی اختلاف کیا جائے لیکن جوش کے اثر کی بات ہی نہیں۔ اسی طرح مقصود عمرانی کے ذہنی "شدید ہیجانات" اور "سوچ و فکر" کے الجھاؤ اور انتشار کا باعث صرف ان کی جنسی گھٹن اور ہیجان انگیز کیفیات ہی نہیں خود مارکسی ذہنیت بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ مارکسیت نے ہمارے ادب میں شدید ہیجانات الجھاؤ اور انتشار کو بھی ہوا دی ہے۔ تبصرہ نگار نے غزل کے قدیم رنگ و روپ کو جوتھی کے جوڑے اور نئے رنگ و روپ کو نائیلوں کی ساڑی سے تشبیہ دی ہے لیکن سارے تبصرہ میں جوتھی کے جوڑے اور نائیلوں کی ساڑی کی تکرار اس قدر زیادہ ہے کہ ناقابل برداشت ہو جاتی ہے یہی نہیں ان کی تشبیہات ... "ستارے گوٹے" "پانی کے چھینٹے" "درزی بڑی بہو اور چھوٹی بہو" کے الفاظ لکھنؤ کی شاعری کی رعایت لفظی کی یاد تازہ کرتے ہیں اور اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ مجموعی طور پر غزلوں کا انتخاب اور ان پر تبصرہ نہ صرف بھوپال بلکہ اردو شاعری میں بھی اس کے تمام کو ممتاز اور مستقبل کے بارے میں مطمئن کرنے کافی ہے۔ ادب میں اس دلکش اضافہ کیلئے دلکش ساگری مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اچھا کاغذ طباعت اوسط خوبصورت سرورق ضخامت (۱۹۲) صفحات۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے (۲/۵۰) ہے شرقی بک ڈپو ابراہیم پورہ بھوپال سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم
سنہ اجراء ۱۹۳۰ء جلد ۳۲ شمارہ ۴
اپریل ۱۹۶۹ء

ماہنامہ

سب رس

(نجیب اشرف ندوی نمبر)

نگران
پروفیسر سید علی اکبر ایم اے (کینٹب)
مجلس مشاورت
برجس، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکینہ
ڈاکٹر غلام عمر خاں - محمد منظور احمد
معتمد
محمد اکبر الدین صدیقی
مہتمم
محمد جمال الدین
منتظم
وفا ناصر خلیل
زر سالانہ چھ روپے غیر ممالک سے دس روپے
ششماہی تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے
نمونے کے پرچہ کے لیے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے
پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں
چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

ادارہ نے ندوی صاحب کے تعزیتی جلسہ میں طے کیا تھا کہ ندوی صاحب کی یاد میں سب رس کا ایک نمبر
شائع کیا جائے۔ اس سلسلے میں مضامین لکھنے کی دعوت دی گئی۔ مقامی حضرات نے وعدے کئے جو سبز باغ ثابت
ہوئے۔ میں اپنے کرم فرماؤں جناب ڈاکٹر عبدالستار دلوی جناب حامد اللہ ندوی اور جناب محمد ایوب صاحب واقف کا ممنون
ہوں کہ انھوں نے نہ صرف مضمون لکھنے کی دعوت ہی قبول کی بلکہ ہر طرح سے تعاون کرنے کا وعدہ فرمایا بھی اور وعدہ کی
تکمیل بھی کی۔

ڈاکٹر نظام الدین صاحب ایس گوریکر سے معذرت خواہ ہوں کہ طباعت کے مراحل میں داخل ہونے کے بعد مضمون ملا
اور ترتیب میں اس کو صحیح مقام نہ ملا۔

ندوی صاحب دلآویز شخصیت کے مالک تھے۔ تحقیق میں دقت نظر سے کام لیتے اور اپنے شاگردوں میں تحقیق کا
صحیح ذوق پیدا کرتے تھے۔ خود کام کرلینا اتنا زیادہ مشکل نہیں۔ جتنا اوروں سے کام لینا۔ مولوی عبدالحق (بابائے اردو)
معاوضہ دے کر کام لیتے تھے۔ یہ کوئی کمال نہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر زور اور پروفیسر ندوی نے اُردو کے لیے بلامعاوضہ
کام کرنے والے افراد پیدا کئے اور اس طرح اردو کے کام کو بہت آگے بڑھایا۔ خدا انھیں اپنے جوار رحمت میں
جگہ دے۔

محمد اکبرالدین صدیقی

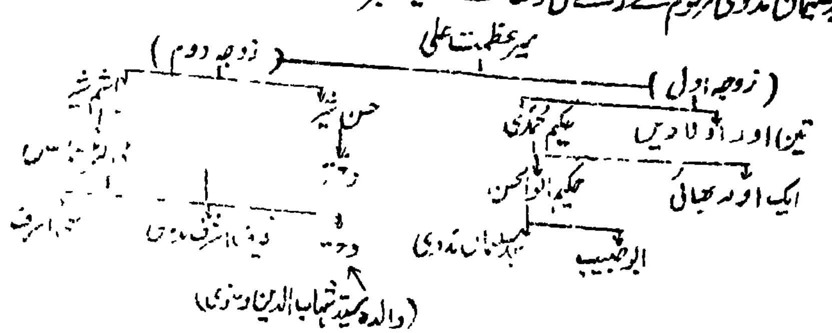
سید شہاب الدین دسنوی

سید نجیب اشرف ندوی اور اُن کا خاندان

سید نجیب اشرف ندوی کے والد سید محمد مبین ولد سید محمد ہاشم شیر پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ ان کا خاندان پدری اور مادری سلسلے میں میر صدر الدینؒ کے واسطے سے رضوی سادات کا تھا۔ بہار شریف سے دو میل مشرق میں ایک بستی ویسنہ نامی ہے، وہیں یہ خاندان آباد تھا۔

ڈاکٹر سید محمد مبین کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، اس کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم کلکتہ میڈیکل اسکول میں پائی۔ سرکاری ملازمت میں بیشتر زمانہ وسط ہندوستان (سابقاً سی پی) میں گذرا۔ وہ مدتوں ناگپور، آرموری، بھنڈارہ، بلودہ وغیرہ میں مقیم رہے۔ ۱۹۲۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر رائپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور نجی طور پر کام کرنے لگے۔ ۲۸ جولائی ۱۹۳۲ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مرحوم بلند قامت، گورے چٹے، نہایت وجیہ آدمی تھے۔ سر سید احمد خاں جیسی لمبی سپید داڑھی رکھتے تھے۔ وضعدار، شائستہ اور خوش اخلاق انسان تھے۔ ڈاکٹری کے پیشے کو جلبِ منفعت کے بجائے خدمتِ خلق کا ذریعہ سمجھتے تھے، چنانچہ سردی کے موسم میں بھی وہ باہر برآمدے میں سویا کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کوئی مریض رات کو آئے اور ملازم اُن کے آرام میں خلل انداز نہ ہونے کے خیال سے انہیں بیدار نہ کرے۔ اگر کوئی مریض ایک بار گھر پر بلاتا تو اس کے دوسرے تیسرے دن خود فیس لیے بغیر اس کے گھر جاتے اور دریافتِ حال کرتے۔ جہاں بھی رہے، انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ تصوف سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور اپنے چچازاد بھائی (مولانا سید سلیمان ندوی کے والد ماجد) حکیم ابوالحسن کے ہاتھ پر ابوالعلائی سلسلے میں مرید ہوئے۔

سید سلیمان ندوی مرحوم سے رشتے کی وضاحت کے لیے شجرہ درج ذیل ہے: —



ڈاکٹر محمد مبین کی سات اولادیں ہوئیں - ان میں سے چھوٹے بیٹے علی اشرف مرحوم کی شادی مولانا سید سلیمان ندوی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی -

نجیب اشرف ندوی ۶ر جون ۱۹۰۱ء کو آرودی (ضلع چاندہ سی پی) میں پیدا ہوئے تھے ابتدائی تعلیم اُردو، فارسی، عربی اپنے والد ماجد سے حاصل کی، پھر ایک مدرسہ سے مراٹھی پڑھی اور مراٹھی ہی کے پرائمری اسکول میں داخل ہو کر چوتھی جماعت میں کامیاب ہوئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے بھتیجے مولوی ابو ظفر ندوی (مصنف تاریخ گجرات وغیرہ) کی شادی کے موقع پر ڈاکٹر سید محمد مبین صاحب بھی اپنے خاندان سمیت دیسنہ گئے، نجیب اشرف بھی ساتھ تھے ان دنوں ندوۃ العلماء لکھنؤ کا بڑا چرچا تھا۔ دیسنہ کے تین طلبہ وہاں زیر تعلیم تھے، اور خود مولانا سید سلیمان وہاں مدرس تھے - ایک دن نجیب اشرف کو دیکھ کر انھوں نے ڈاکٹر سید محمد مبین سے کہا - نجیب اشرف کا کوئی بڑا بھائی نہیں ہے اور میرا کوئی چھوٹا بھائی نہیں ہے، انھیں آپ میرے ساتھ کر دیجئے - ڈاکٹر صاحب نے اسی وقت فرمایا "لے جاؤ" چنانچہ ۱۹۰۹ء میں نجیب اشرف ندوۃ العلماء کے دارالعلوم میں داخل ہوگئے اور ساڑھے تین سال تک وہاں تعلیم حاصل کی ۱۹۱۲ء میں سید صاحب ندوہ چھوڑ کر الہلال کلکتہ کے عملے میں چلے گئے ۱۹۱۳ء ہی میں مولانا شبلی مرحوم سکریٹری کے عہدے سے مستعفی ہو گئے، اور طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ نجیب اشرف بھی ندوہ چھوڑ کر پٹنے چلے گئے، اور وہاں انگریزی تعلیم ذاتی طور پر حاصل کر کے سکرٹ ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا - یہیں سے درجہ اوّل میں دسویں درجے کی سند پائی اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔ اسی طرح ۱۹۱۷ء میں انٹر میں بھی درجہ اوّل پایا - جب سیاسی تحریک کا آغاز ہوا تو وہ پٹنہ کالج میں بی اے کے طالب علم تھے - یہ بھی ترک موالات پر کاربند ہو کر کالج چھوڑ کر گھر چلے آئے - اس کے بعد فوراً تحریک کے سلسلے میں مختلف مقامات کا دورہ کرتے رہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی بھی تحریک میں پیش پیش تھے اور پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ ان سے بہت قربت رکھتے تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کی وفات کے بعد اعظم گڑھ آگئے تھے، اور وہاں انھوں نے دار المصنّفین قائم کر دیا تھا، نجیب اشرف کو بھی انھوں نے وہیں بلا لیا - یہاں انھوں نے خلافت اور کانگریس کے کام کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی شروع کر دیا - انھوں نے مہاتما گاندھی کی تصنیفات سوانح A GUIDE TO HEALTH (رہنمائے صحت) اور NON CO-OPERATION IN OTHER COUNTRIES کا ترجمہ اسی زمانہ میں کیا - جب سیاسی تحریک ۱۹۲۲ء میں ختم ہو گئی تو پھر انھیں اپنی تعلیم کے مکمل کرنے کا خیال آیا لیکن جب داخلے کیلئے پٹنہ کالج کے پرنسپل سے رجوع کیا تو انھوں نے شرط لگا دی کہ معافی نامہ لکھ کر دیں، جس سے انھوں نے انکار کر دیا - ان کے چھوٹے بھائی علی اشرف اس زمانے میں کلکتے میں تھے - انھوں نے انھیں کلکتے بلا لیا اور وہیں کالج میں داخلہ دلا دیا - چنانچہ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے بی اے فارسی آنرز میں فرسٹ کلاس لیا اور اس کے بعد ایم اے میں بھی یہی امتیاز قائم رکھا اور [illegible]

تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ مشہور مورخ سجاد وناتھ سرکار کی نگرانی میں رقعات عالمگیر کی ترتیب و تدوین کا کام کرتے رہے جو دارالمصنفین نے انھیں تفویض کیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ مستقلاً اعظم گڑھ چلے گئے اور سو روپے کے قلیل معاوضہ پر دارالمصنفین میں رفیق کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔

۱۹۳۰ء میں ان کی گجرات کالج احمدآباد میں لکچرر کے عہدے پر تقرری ہوئی۔ یہاں وہ سال ایک سے زیادہ نہیں رہے لیکن اس مختصر زمانے میں انھوں نے قدیم اُردو کے سلسلے میں جو تحقیقاتی کام کیا اُسے علمی حلقوں میں بہت دلچسپی اور احترام سے دیکھا گیا۔

۱۹۳۱ء میں حکومت نے بمبئی میں اسماعیل یوسف کالج قائم کیا تو وہ یہاں اُردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے ملازمت کا پورا زمانہ اسی کالج میں گذارا اور یہیں سے ۱۹۵۵ء میں سبکدوش ہوئے۔

مرحوم بمبئی میں ندوی صاحب کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ بمبئی یونیورسٹی کے فیلو، اس کے مختلف بورڈوں کے رکن، ایس ایس سی بورڈ کے ممبر، ٹکسٹ بک کمیٹی کے ممبر، ہندوستانی کمیٹی کے رکن کے علاوہ بیسیوں اور اداروں اور کمیٹیوں سے متعلق رہے۔

انجمن اسلام بمبئی نے ۱۹۳۸ء میں اُردو میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم اور ریسرچ کی غرض سے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا تو نجیب اشرف ندوی مرحوم اس کے اعزازی ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ جب ۱۹۵۵ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو اس سے باضابطہ وابستہ ہوگئے۔ وہ آخر تک اس انسٹی ٹیوٹ میں کام کرتے رہے۔ اس کا ماہی رسالہ "نوائے ادب" بھی انہی کی ادارت میں نکلتا رہا۔

ندوی صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز زمانہ (کانپور) میں ایک مضمون سے ۱۹۱۶ء میں ہوا۔ اس کا عنوان تھا شیرشاہ سوری۔ دارالمصنفین سے وابستگی کے بعد انھوں نے کئی تاریخی علمی اور ادبی موضوعات سے متعلق مضمون لکھے۔ انکے تبصرے اور بعض تنقیدی مضامین معارف اور بعض دوسرے رسالوں میں "سنان" کے قلمی نام سے بھی شائع ہوئے، معارف کے "الباب" "اخبارِ علمیہ" اور "تنقید و تبصرہ" بھی انھیں کے ذمے تھے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کی غیرحاضری میں شذرات بھی کبھی کبھی لکھتے رہے۔ ان کی تصنیفات میں رقعات عالمگیر اور مقدمہ رقعات عالمگیر بڑی وقیع کتابیں ہیں۔ افسوس کہ زمانے کی ناسازگاری نے انھیں مقدمے کی دوسری جلدوں کی تکمیل کا موقع نہ دیا۔ ابھی دو برس ہوئے انھوں نے گجری زبان کی لغات مرتب کرکے شائع کی تھی۔

پچھلے دو تین برس سے ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی بلکہ جب ان کی بیوی کا انتقال ہوا، تو اس کے بعد سے وہ بجھ سے گئے، لیکن اس کے باوجود ان کا چشمۂ فیض بدستور جاری رہا۔ طلبہ اور ضرورت مند حضرات ان کے پاس آتے اور روشنی حاصل کرتے۔

وہ ایک مہینے سے آپریشن کے لیے نرسنگ ہوم میں گئے تھے۔ اتوار یکم ستمبر کو آپریشن ہوا جو بظاہر بالکل کامیاب رہا۔ پیر، منگل اور بدھ تین دن بالکل ٹھیک رہے۔ جمعرات پانچ ستمبر ۱۹۶۸ء کو ٹھیک بارہ بجے دوپہر انھیں اینما دیا گیا اور اسی وقت حرکتِ قلب بند ہوگئی۔ ان کی وفات کی خبر آناً فاناً شہر میں پھیل گئی۔ دوست اور مداح بڑی تعداد میں جمع ہوگئے۔ اسی رات وہ اپنی مرحومہ بیوی کے پہلو میں ارلائے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

(بہ شکریہ "تحریر")

(بقیہ مضمون، صفحہ ۱۸ سے آگے) اردو خبرناموں سے متعلق مفصل معلومات ملتی ہے اور اردو سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع اور اردو کے ادبی اور علمی رسائل کی تلخیص اور اشاریئے کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے مدنی صاحب نے انسٹی ٹیوٹ کیلئے ولی گجراتی اور نور المعرفت کو شائع کرکے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ حامد اللہ ندوی صاحب نے انسٹی ٹیوٹ کے لائبریرین ہونے کے ناطے۔ اردو مخطوطات جامع مسجد بمبئی کو مرتب کرکے ایک زبردست کام کیا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ندوی صاحب مقامی سیاست یا معاصرانہ چشمک کی بنا پر اپنے آزاد خیال دوستوں کے ساتھ تعاون نہیں کرتے تھے اور نہ انھوں نے کبھی ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ندوی صاحب نے اپنے دور کار کے دوران میں صرف ایک طالب علم کو انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ڈاکٹریٹ کیلئے تیار کیا اگرچہ کئی طلبہ ان کی نگرانی میں کام کرنے کیلئے مشتاق تھے امید کی جاتی ہے کہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے کارپردازان کسی ایسی علمی و ادبی شخصیت کا انتخاب ناظم کی حیثیت سے کریں گے جو پختگی کے ساتھ ساتھ سنجیدگی و متانت کی حامل ہوگی تاکہ ندوی صاحب کی روایات پر عمل پیرا ہو کر انسٹی ٹیوٹ کی آزادانہ خدمت کر سکے۔

سید احتشام حسین

پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم

تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی اور ادب و آداب کی قدروں میں نمایاں تغیر کا شعور رکھنے کے باوجود بعض
کی دائمی جدائی شدید احساس زیاں پیدا کرتی ہے۔ پروفیسر ندوی کی موت نے بھی یہی احساس پیدا کیا کیونکہ علم وفضل کے
اق وشرافت، وضعداری اور دلداری کی وہ خوبیاں اُن میں تھیں جو ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ اُن کی شخصیت میں جاذبیت
انی زندہ دلی اور شگفتہ روی سے نہیں بلکہ اس دلجوئی سے پیدا ہوئی تھی جو اُن سے کم عمر کم علم کا آدمی اُن سے ملنے کے
ں کرتا تھا اور ذرا سا دیر میں اُن سے مانوس ہو کر انہیں اپنے ہی قبیلے کا انسان سمجھنے لگتا تھا۔ مجھ سے ہمیشہ اُن کا
ہ رہا جو ایک بڑے بھائی کا اپنے چھوٹے بھائی سے ہوتا ہے۔ اس کی ایک مختصر سی کہانی ہے۔ میں آعظم گڈھ کے ویسلی
ل کے ساتویں درجے میں پڑھتا تھا اور اپنے چند عزیزوں کے ساتھ شبلی منزل کے قریب ہی آصف گنج میں
اان عزیزوں میں سے اکثر اس وقت جارج اسکول (یعنی شبلی کالج) میں پڑھتے تھے اور دار المصنفین ایک طرح
ر کا ہوسٹل تھا۔ جہاں ہر بہانے چلے جاتے تھے۔ وہاں کے کچھ نوجوانوں سے ان لوگوں کا بھائی چارہ تھا اور اس توسط سے
ہان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبد السلام ندوی سے بھی شناسائی ہو گئی تھی۔ وہاں کوئی تقریب ہو کوئی ادبی نشست
نو یار ہو ان عزیزوں کے ساتھ تقریباً ہر موقع پر میں بھی جاتا تھا۔ ۱۹۲۷ء کی بات ہو گی کہ وہیں نجیب اشرف ندوی سے
ہوئی۔ انھوں نے فارسی میں ایم اے پاس کیا تھا اور دار المصنفین میں رقعاتِ عالمگیر پر کام کر رہے تھے۔ جہاں تک
ترکی ٹوپی اور ترکی وضع کا کوٹ اور پتلون پہنتے تھے۔ سرخ سفید چہرہ، چہرے میں شوخی اور شگفتگی کی جھلک آگے
جھکے ہوئے تیز تیز چلنے کا انداز فوراً متوجہ کرتا تھا۔ میری کوئی علمی ملاقات نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ بہت سے
دیکھنے اور خوش ہوتے تھے۔ میں اعظم گڈھ میں ۱۹۳۰ء تک رہا اور اس زمانے میں شاید وہ بھی دار المصنفین ہی سے
رہے۔ ان ملاقاتوں میں وہ بڑے بھائی تھے اور میں چھوٹا بھائی۔ اس وضع کو مرحوم نے آخر تک نبھایا۔

اب یہ یاد نہیں کہ درمیان میں کبھی ملنے کا موقع ملا یا نہیں۔ لیکن غالباً ۱۹۴۲ء میں ... اردو ... بہت
کے بعد ملنا نصیب ہوا۔ میں نے اس وقت جو تھوڑا بہت لکھا تھا اُس کے ذکر سے خوش ہوئے اور ہمت افزائی کی ... بات
سے ہی ساتھ نہ تھی، وہ ہر نئے لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے اور اگر وہ دیا ہے تو ... دکھاتے تھے ...

خط و کتابت ہو جاتی تھی یا کسی کانفرنس وغیرہ میں ملنے کی صورت نکل آتی تھی اور اُن کی باتوں سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ درمیانی وقفے میں بھی وہ بے خبر نہیں رہے ہیں بلکہ مشترک جاننے والوں سے حالات معلوم کرتے رہے ہیں، جو لوگ انھیں جانتے ہیں اُنہیں معلوم ہوگا کہ مرحوم کی شگفتہ مزاجی ہر شخص کے ماحول اور مزاج کے مطابق ہوتی تھی۔ اس زمانے میں اعظم گڈھ میں کچھ شیعہ سنّی کا مذاق چلتا تھا۔ وہ بھی اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ میں ایک دفعہ کسی جلسے میں شرکت کیلئے بمبئی گیا (سنہ ۱۹۵۳ء کی بات ہوگی) تو شاہد لطیف مرحوم اور عصمت چغتائی کے یہاں ٹھیر گیا۔ اس سے پہلے مرحوم مجھ سے کہہ چکے تھے کہ بمبئی آؤ تو میرے پاس ٹھہرنا۔ میں اُن کے ایک شاگرد اور ساتھی ڈاکٹر عالی جعفری کے ساتھ ملنے گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھیں خیال ہوا کہ میں عالی جعفری کے ساتھ ٹھہرا ہوں۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ جعفری کے ساتھ ٹھہرے ہونا' ہاں کیوں نہ ہو خون پانی سے بھاری ہوتا ہے۔ میں نے برجستہ کہا' نہیں پانی ہی کے ساتھ ٹھہرا ہوں' کہنے لگے یہ کیا' میں نے کہا جعفری صاحب کے یہاں نہیں' عصمت چغتائی اور شاہد لطیف کے یہاں قیام ہے۔ خوب ہنسے اور گلے لگا لیا۔ غالبًا اسی ملاقات میں مجھے اللہ دے جا کر ایک بیاض سے بہت سی نظمیں سنائیں' جن کی زبان تو اردو ہی تھی لیکن کوکنی ملی ہوئی بول چال کی اردو معلوم ہوتی تھی۔ مرحوم نے بتایا کہ یہاں ان نظموں کو 'دکھڑا' کہتے ہیں۔ ان کے کہنے والے معمولی پڑھے لکھے لوگ ہیں زیادہ تر اُردو رسم الخط میں تھیں۔ کچھ گجراتی میں تھیں۔ ان تمام نظموں کا موضوع تھا سماجی بے اعتدالی اور اُس سے پیدا ہونے والی عام تکلیفیں۔ مثلاً ایک شوہر کا دکھڑا تھا جس کی دو بیویاں تھیں۔ ایک بیوی کا تھا جس کا شوہر آوارہ تھا ایک بیوی کا تھا جو اپنی سوکن سے جلی بیٹھی تھی' ایک نوکر کا تھا جسے اُس کا مالک سزائیں دیتا تھا' ایک باپ کا تھا جس کا بیٹا نالائق تھا۔ اور ایک بیٹے کا تھا جس کا باپ قمار بازی کرتا تھا اور گھر سے بے خبر تھا۔ میں نے بہت اصرار کیا کہ اس پر کچھ لکھ کر شائع کرا دیجئے۔ کہنے لگے یہ کام تم کرو۔ میری دلچسپی کا نہیں ہے' یہیں آ جاؤ اور دونوں مل کر انہیں مرتب کر ڈالیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ آؤں گا۔ اتفاق سے پھر بمبئی گیا تو ایک ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا۔ ملنے گیا تو کہا۔ جب تک میرے پاس آکر نہیں رہو گے' نہیں دوں گا۔ خبر نہیں وہ کاغذات کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں۔ کاش مرحوم کے شاگردوں میں سے کوئی اس کو مرتب کر کے شائع کر سکے۔ اس سے کئی طرح کے ادبی اور لسانی مطالعہ کی راہیں کھلیں گی سنہ ۱۹۵۶ء یا سنہ ۱۹۵۷ء میں گجرات اُردو کانفرنس ہوئی۔ صدارت کی عزت مجھے بخشی گئی تھی۔ احمد آباد پہنچا تو معلوم ہوا کہ نجیب اشرف صاحب شہاب رضوی اور شہاب مالیر کوٹلوی بھی آ گئے ہیں۔ ملاقات ہوئی تو میں نے کہا مجھے شرم آتی ہے کہ آپ موجود ہیں اور میں صدارت کر رہا ہوں۔ بڑی محبت سے ڈانٹا اور کہا تمہاری ہی وجہ سے تو آ گیا ہوں حالانکہ میں جانتا تھا کہ انھیں گجرات اور خاص کر احمد آباد سے کتنی دلچسپی ہے اور انھوں نے گجرات میں اُردو کے متعلق کتنا سرمایہ جمع کیا ہے۔

سنہ ۱۹۵۶ء میں میں نے بمبئی کی ایک ادبی انجمن کی دعوت پر انجمن اسلام ہال میں مولانا حالی پر چند لکچر دیئے۔ تقریباً ہر روز اپنی علالت اور کمزوری کے باوجود پروفیسر نجیب اشرف تشریف لاتے تھے اور خوش ہوتے تھے ایک دن

مرحوم نے بھی صدارت کی اور میری محنت کی داد دیتے رہے۔ اس بار میں نے "دکھڑا دن" کے لئے پھر اصرار کیا تو پہلے ہنس کر اپنی شرط دہرائی کہ جب میرے یہاں قیام کروگے تو دوں گا پھر یہ کہا کہ کاغذات بہت بکھر گئے ہیں، ڈھونڈ کر تمہیں دیدوں گا۔ لیکن اُس وقت سے مرحوم کی صحت گرتی ہی گئی۔ الجھنیں بڑھتی ہی گئیں اور گو وہ علمی کاموں میں معروف رہے تحقیقی مقالات لکھواتے اور جانچتے رہے۔ لیکن چراغ کی لو مدھم ہی ہوتی گئی۔ دہلی میں اساتذۂ اُردو کی کانفرنس میں ملے تو ڈر معلوم ہوا کہ ایسی خراب صحت کے ساتھ کتنے دن چلیں گے۔ پھر ابھی ڈیڑھ دو سال پہلے حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک امتحان کے سلسلہ میں ملاقات ہوئی۔ اسی دن بمبئی واپس جانیوالے تھے، کہنے لگے، جتنی دیر وقت ملے ساتھ رہو۔ ساتھ ہی کئی جگہ گئے۔ "اخبار سیاست" کے دفتر بھی میرے کہنے پر میرے ساتھ ہی گئے اور وہاں ایک تصویر کھنچوانے پر آمادہ ہو گئے وہ تصویر چند دنوں کے بعد "سیاست" حیدرآباد میں چھپی۔ اِس دفعہ بے حد تھکے ہوئے اور کمزور معلوم ہوتے تھے میں نے کہا بھی کہ اب سفر نہ کیجئے۔ کہنے لگے دوستوں سے ملنے جلنے کیلئے نکل پڑتا ہوں، ورنہ اب طاقت نہیں ہے۔ بس یہ آخری ملاقات تھی۔

پروفیسر نجیب اشرف کا انتقال ہو گیا لیکن اُن کے تحقیقی کارنامے اور اُردو زبان کی خدمت کا جذبہ زندہ رہے گا۔ بہار کے بعد بمبئی مرحوم کا دوسرا وطن تھا۔ لیکن اُن کا غم ہر اُس مقام پر کیا جائیگا جہاں اُردو سے محبت کرنے والے موجود ہیں اور جہاں علمی کاموں کی قدر کیجاتی ہے۔ رقعات عالمگیری کی ترتیب اور اُس پر مقدمہ لغات گجری کی تدوین اور بہت سے علمی مضامین اُن کی زندگی کی ضمانت ہیں۔ آج اگر نسل اُن کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرے گی تو کل آنے والے اُنہیں یاد کریں گے

(بشکریہ "شاعر")

بقیہ مضمون صفحہ ۱۴ سے آگے) دھیما سا میٹھا احساس آج تک ہمارے ذہنوں پر جوں کا توں موجود ہے اور یہ احساس اس وقت مجروح ہوا جب میں نے یہ اندوہ ناک خبر سنی کہ نجیب اشرف صاحب انتقال فرما گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ ذہن میں ایک خاکہ ابھر رہا ہے۔ معتبر، قابل احترام، انتہا مسکراتا چہرہ، باتوں میں حلاوت اور رنگینی، جذبہ پر خلوص، محبت آمیز۔ ہم لوگوں کے ساتھ چہک چہک کر مہک مہک کر باتیں کر رہے ہیں۔ دوستوں کی طرح۔ جب تک وہ ہمارے ساتھ کار میں تھے وہ دوستوں کی طرح تھے بے لوث، بے تکلف لیکن جیسے ہی وہ ہاشمی صاحب کے مکان پر اترے وہ محترم بھی تھے اور بزرگ بھی۔ ان کے چہرے پر بزرگی کے آثار نمودار ہوئے۔ گو آنکھیں بدستور مسکرا رہی تھیں اور انھوں نے مسکراتے ہوئے میرے دوست کو دعا دی۔ اللہ تمہیں ترقی دے؛

جو انسان ہماری محفل سے اٹھ کر گیا وہ دوست تھا، میں نے کہا لیکن میرے دوست نے کہا

"نہیں وہ بزرگ تھا، قابل صد احترام!

پتہ نہیں آپ کا کیا تاثر ہے،!

عبدالقوی دسنوی

نجیب اشرف ندوی اور انکے نام چند خطوط

دسنہ صوبہ بہار کے ضلع عظیم آباد کا ایک مختصر سی آبادی پر مشتمل گاؤں ہے۔ جہاں کے رہنے والوں نے اپنی کوشش اور لگن سے ایک کتب خانے کی بنیاد ڈالی تھی جس میں چند سالوں میں محدود وسائل کے باوجود اچھی کتابوں اور نایاب رسالوں کا ایک عمدہ ذخیرہ فراہم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے دور دور سے اہل علم حضرات کی آمد کا سلسلہ بندھا رہتا تھا۔ میں نے ابھی اچھی طرح ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ اپنے بزرگوں کے ساتھ وہاں آنا جانا شروع کر دیا تھا جہاں ندوی صاحب سے سب سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی ایک شیشے کے فریم میں "بی اماں" والدہ مولانا محمد علی کے ساتھ، قد نکلتا ہوا، لیکن دبلے پتلے لمبے کرتے میں ملبوس گردن میں ایک تھیلی لٹکی ہوئی جس پر "خلافت" تحریر تھا۔

بی اماں سے میں واقف اس طرح تھا کہ والدہ محترمہ اکثر ؎

جان بیٹا خلافت میں دے دو بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا

گنگنایا کرتی تھیں، اور میں نے اس شعر کو بار بار سن کر یاد کر لیا تھا۔ شاید یہ گاؤں "خلافت تحریک" سے بے حد متاثر تھا اور ندوی صاحب ان متاثر لوگوں میں سے ایک تھے۔

وہ ۶ جون سنہ ۱۹۰۱ء کو وطن سے دور آرموری ضلع چاندہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد سید محمد مبین سرکاری ڈاکٹر تھے، قرآن شریف اور فارسی اردو کی تعلیم گھر ہی پر اپنے والد صاحب سے حاصل کی اسکول کی تعلیم مرہٹی زبان میں ہوئی ۹ سال کی عمر میں سید سلیمان ندوی کی خواہش سے ندوہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے۔ جہاں سید صاحب ان کے سرپرست رہے ندوی صاحب لکھتے ہیں۔

"خاکسار کو سنہ ۱۹۱۰ء سے ان کے آخری وقت تک ان کی محبت، شفقت، ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی سعادت رہی ہے"

جولائی سنہ ۱۹۵۵ء کے شذرات میں بھی وہ تحریر کرتے ہیں کہ:—

"خاکسار جس سال ندوہ میں داخل ہوا تو برادر محترم سید سلیمان ندوی نے مجھے انھیں (سید ابوظفر ندوی) کی

نگرانی میں دے دیا اور اس وقت سے لیکر آخر وقت تک ان کی شفقت و عنایت روز بروز بڑھتی گئی۔۔۔۔ "

علامہ شبلی نعمانی اس زمانے میں سیرت النبی کی ترتیب میں مشغول تھے ندوی صاحب کو ان سے "بلوغ المرام" پڑھنے کا موقع ملا لیکن ندوہ میں ابتدائی تعلیم کے بعد ہی وہ وہاں سے چلے گئے۔

سنہ ۱۹۱۲ء سے ان کی انگریزی تعلیم کا دور شروع ہوتا ہے۔ وہ پٹنہ چلے آئے اور یہیں سے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات میں درجہ اول سے کامیابی حاصل کی اور وظیفہ ملے۔ بی اے کی تیاری میں مصروف تھے کہ خلافت اور ترک موالات" کی تحریک سے متاثر ہو کر تعلیم چھوڑ دی۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ سے وابستہ ہو گئے۔ جب ترک موالات کا زور کم ہوا تو پٹنہ واپس آئے اور بی اے کا امتحان پٹنہ کالج سے دینا چاہا۔ کالج کے پرنسپل نے اس شرط پر امتحان دینے کی اجازت دینے کا وعدہ کیا کہ وہ معافی نامہ پیش کریں۔ ندوی صاحب اس شرط کو پورا کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ انھیں دنوں ان کے چھوٹے بھائی علی اشرف کلکتہ میں تھے انھوں نے ندوی صاحب کو وہاں بلا لیا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان دیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ جس کی وجہ سے انھیں پچہتر روپے کا وظیفہ ملا سنہ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے اسی یونیورسٹی سے ام۔ اے کا امتحان دیا اور درجہ اول سے اس میں بھی کامیابی حاصل کی۔ طلائی تمغہ اور دو سو روپے کی کتابیں انعام میں ملیں۔

دار المصنفین میں مولانا ابو الحسنات ندوی "رقعات عالمگیر" مرتب کر رہے تھے لیکن ان کی اچانک وفات کی وجہ سے یہ کام ندوی صاحب کے سپرد ہوا۔ انھوں نے اس سے پوری دلچسپی لی اور خوب محنت کی اس سلسلے میں مشہور مورخ جادو ناتھ سرکار سے بھی بہت کافی مدد لی۔ شاہ معین الدین ندوی صاحب لکھتے ہیں: ۔

"چنانچہ کلکتہ کے قیام کے زمانہ میں سر جادو ناتھ سرکار کی زیر نگرانی اورنگ زیب کے رقعات جمع اور مرتب کیئے۔ اور اس پر ایک مبسوط اور ضخیم مقدمہ لکھا جو مقدمہ رقعات عالمگیر کے نام سے ایک مستقل جلد میں شائع ہوا۔ اس میں فن انشاء اور شاہانہ احکام و مراسلات کی تاریخ اور عالمگیر کی انشا کی خصوصیات وغیرہ پر روشنی اور اس کی شہزادگی سے لیکر برادرانہ جنگ کے زمانہ تک کے واقعات و سوانح پر ان مکاتیب کی روشنی میں تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے اس لیئے یہ مقدمہ اس دور کی اورنگ زیب کی مستند ترین تاریخ ہے اس کے بعد اصل کتاب رقعات کا پہلا حصہ " رقعات عالمگیر جلد اوّل" کے نام سے شائع ہوا۔ "

اختتام تعلیم کے بعد دار المصنفین میں بحیثیت رفیق رہے۔ اس دوران بہت سے تحقیقی مضامین لکھے جس سے

¹ شذرات معارف ستمبر سنہ ۱۹۶۸ء

انھیں تحقیقی سلیقہ آیا۔ کچھ دنوں تک معارف کے سب اڈیٹر بھی رہے۔

۱۹۳۰ء میں گجرات کالج احمد آباد میں فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں اسمٰعیل یوسف کالج بمبئی کے شعبۂ اُردو میں استاد کی حیثیت سے کام شروع کیا اور یہیں ۱۹۵۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ بمبئی میں اُردو کی ترویج و اشاعت کا انھوں نے خوب کام کیا ۱۹۳۱ء میں مولوی عبدالحق صاحب جب بمبئی آئے تو انھوں نے ریاستی انجمن ترقی اردو کا کام ندوی صاحب کے سپرد کیا چنانچہ انھوں نے صوبہ کے مختلف مقامات میں انجمن ترقی اُردو کی آواز پہنچائی۔ مولوی عبدالحق، پنڈت سندر لال، پنڈت دتاتریہ کیفی وغیرہ اصحاب سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ گاندھی جی سے بھی ذہنی طور پر بہت قربت تھی۔ ان کی کتاب "سوراج" کا ترجمہ شاید اسی قربت کا نتیجہ ہے۔

فروری ۱۹۴۷ء میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کا قیام عمل میں آیا اور ندوی صاحب اس کے اعزازی ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ اس ادارے سے ایک سہ ماہی تحقیقی رسالہ "نوائے ادب" ندوی صاحب کی نگرانی اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کی ادارت میں جنوری ۱۹۵۰ء سے نکلنا شروع ہوا۔ مدنی صاحب جون ۱۹۵۱ء میں اسمٰعیل یوسف کالج واپس چلے گئے اور جولائی ۱۹۵۱ء سے ندوی صاحب نے اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور زندگی کی آخری سانس تک اس ذمہ داری کو سنبھالے رہے۔

اس ادارے سے متعلق ہونے کے بعد انھوں نے "تعاب نامہ" مرتب کیا جس کا ذکر جنوری ۱۹۵۰ء کے "نوائے ادب" میں کیا گیا ہے۔ ابھی چند سال پیشتر "لغات گجری" کی اشاعت ہوئی ہے جس نے بہت مقبولیت حاصل کی۔

"علی گڑھ تاریخ اُردو" کے سلسلے میں ۱۹۵۴ء میں پہلی مجلس مشاورت میں شریک ہوئے اسکی پہلی جلد میں ان کا کچھ حصہ لکھا ہوا ہے نوائے ادب کا آخری پرچہ اپریل ۱۹۶۸ء کا ہے جسے ندوی صاحب نے مرتب کیا ویسے شذرات جنوری ۱۹۶۲ء کے بعد عبدالرزاق قریشی صاحب رفیق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھتے رہے ندوی صاحب جس زمانے میں ادارے سے متعلق ہوئے مضامین لکھنا تقریباً چھوڑ چکے تھے (ورنہ ایک زمانہ ان کا وہ بھی تھا کہ ملک کے ہر اچھے رسالے اور ان کے خاص نمبروں میں ان کا مضمون ضرور شائع ہوا کرتا تھا) - اس لئے نوائے ادب کے ادارے سے تقریباً اٹھارہ سال کے تعلق کے بعد بھی انھوں نے شذرات کے علاوہ کل سات مضامین تحریر کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں: —

ایک کہانی چار شاعروں کی زبانی	نوائے ادب اکتوبر ۱۹۵۰ء
خواجہ حسن نظامی	نوائے ادب اکتوبر ۱۹۵۵ء
اودھ ریویو	نوائے ادب اکتوبر ۱۹۵۵ء
کوکن کے اربعہ عناصر	نوائے ادب اپریل ۱۹۵۸ء
بمبئی سے متعلق دو قدیم مثنویاں	نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۰ء

مراثی جواد　　　نوائے ادب جنوری ۱۹۶۱ء

ہندوستانی سلکشن　　　نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۱ء

یہ بات بالکل درست ہے کہ ان کے تحقیقی مضامین نے ایک خاص وقار پیدا کر لیا تھا اور اس وقت اہل نظر کی نظر ان پر پڑنے لگی تھی لیکن انھوں نے کبھی اسے طرۂ امتیاز نہیں سمجھا۔ وہ تحقیق کرنے کیلئے لکھتے تھے لکھنے کیلئے تحقیق نہیں کرتے تھے اس لئے تحقیق کا حق ادا کرتے تھے لیکن نہ اس پر ناز تھا نہ فخر بلکہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو تحقیق کا طالب علم سمجھتے رہے اور بس ان کی علمی تحقیق و تجسس کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں: ۔

"...نجیب اشرف صاحب مجھے مٹنگ سے کھینچ کر لے آئے اور کہنے لگے کہ علی گڑھ لے آنے کا ایک باعث یہ بھی تھا کہ آپ سے استفادہ مقصود تھا۔ اس کے بعد اپنی تالیف لغات گجری کا قلمی نسخہ اور مسودہ نکالا اور بعض الفاظ کی تحقیق و تلاش میں منہمک ہو گئے میں ان کے ساتھ علمی مباحث میں ڈوب تو گیا لیکن رہ رہ کر میرے ذہن میں استفادہ کا لفظ کھٹکتا رہا اور میں سوچتا رہا کہ جو شخص تاریخ، قدیم ادب اور اسلامیات میں خود اس قدر شہرت رکھتا ہے اور جس کی تصانیف اور تحریروں سے میں خود استفادہ کرتا رہا ہوں وہ کس تکلف برطرف انداز میں ایک ایسے شخص سے جس نے اساتذہ اُردو کی صف میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے ایسی نیاز مندی کے الفاظ استعمال کر رہا ہے۔[1]"

ندوی صاحب کی یہی سادگی اور علمی تجسس اور تحقیق کا مادہ تھا کہ ایک زمانہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا سارے ہندوستان کے اہل علم سے ان کے تعلقات تھے لیکن انھیں نہ تو شہرت کی ہوس تھی اور نہ غلط طریقوں سے آگے بڑھنے کی خواہش اسی لئے بقول آل احمد سرور صاحب: ۔

"نجیب اشرف صاحب نے کوئی ادبی گروہ نہیں بنایا انھوں نے کوئی سیاست نہیں چلائی[2]"

اس وجہ سے ہر طرح اور ہر جماعت کے لوگوں سے ان کا تعلق رہا اور ان سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا میں جب تعلیم کی غرض سے بمبئی پہنچا اور اندھیری جانے کا اتفاق ہوا تو اس وقت بھی ان کے پاس ایسے اہل علم حضرات کے خطوط کے ڈھیر تھے۔ لیکن بمبئی نے انھیں ہر چیز سے بے نیاز کر دیا تھا یہ خطوط بھی اسی بے نیازی کی نذر ہوئے۔ مولوی عبدالحق، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا بادی اور نہ جانے کتنے اہل علم کے خطوط تھے جو اگر محفوظ رہ جاتے تو ان سے ادب کی بہت بڑی خدمت ہوتی۔

مل[1] "ایک خط چند یادیں" آج کل نومبر ۱۹۶۸ء　　　مل[2] ہماری زبان ۱۵ ستمبر ۱۹۶۸ء

ایک دن میں اتفاق سے انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ گیا ہوا تھا۔ ندوی صاحب موجود تھے انھوں نے میز کی دراز سے کچھ نکالنے کیلئے کہا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ اس میں کچھ خطوط پڑے ہیں ندوی صاحب کو دکھایا اور پھر یہ کہکر ان سے مانگ لئے کہ انھیں اپنے پاس محفوظ رکھوں گا۔ چنانچہ اکثر انسٹی ٹیوٹ سے خطوط لے آتا۔ اس طرح کچھ خطوط میرے پاس محفوظ ہوگئے ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

(۱)

انجمن ترقی اردو ہند دریا گنج دہلی ۷ مئی ۱۹۳۹ء

مشفقی و کرمی تسلیم۔

کئی روز سے آپ کے خط کا انتظار کر رہا تھا اور تشویش تھی کہ خط کیوں نہیں آیا میں سمجھا کہ پٹنے میں چند روز زیادہ رہ گئے آج کے خط سے اصل حال معلوم ہوا۔ بھولے سے گر پڑے یا جوانی کی ترنگ تھی۔ بہت افسوس ہوا۔ یہ تعطیلات کے دن تھے خیال تھا کہ خوب کام ہوگا۔ یہاں دوسرا ہی کام ہوگیا۔ اب لکھئے کہ مزاج کیسا ہے۔ کچھ افاقہ ہوا یا نہیں اور کب تک خوش خرامی کی امید ہے۔ ساٹھ روپے کا چک پہنچا۔ بہت بہت شکریہ۔ کبھی کبھی ادھر کے حالات لکھتے رہئے میں اس عرصہ میں حیدرآباد کا ایک چکر اور لگا آیا۔ مجبوراً پکڑا گیا تھا۔

عبدالحق

(۲)

کل پاکستان انجمن ترقی اُردو
اُردو روڈ۔ کراچی

مورخہ ۱۹/ نومبر ۱۹۵۷ء

مشفق بندہ السلام علیکم

عنایت نامہ پہنچا۔ آپ کی فرمائش کی تعمیل بسر و چشم کی جائیگی۔ دفتر کو ہدایت کردی گئی ہے۔ آپ کی تجویز نہایت معقول ہے اگر نوائے ادب میں پی۔ ایچ ڈی والے طلبہ کے مقالات کی اطلاع چھپتی رہے گی تو اس سے یہ ہوگا کہ ایک ہی موضوع پر جو مختلف اشخاص مختلف یونیورسٹیوں میں کام کرنا شروع کردیتے ہیں اس سے بچ جائینگے۔ میرے کتب خانہ میں فورٹ ولیم کالج کے متعلق کوئی مزید معلومات نہیں۔ اب آپ کی صحت کا کیا حال ہے۔ بہار کا بھی ایک آدھ پھیرا ہوتا رہتا ہوگا۔ آپ کی وجہ سے بمبئی میں اُردو کے کام کو فروغ ہے۔ یہ اُردو کی خوش نصیبی ہے۔

عبدالحق

(۳)

ادبستان۔ دین دیال روڈ لکھنو

۲۸/ ستمبر ۱۹۵۲ء

مکرمی تسلیم! کارڈ پہنچا۔ خدا کا شکر ہے کہ صاحب زادیوں کو صحت حاصل ہوئی اور آپ کو پریشانیوں سے نجات۔ مقالات مظہری میرے پاس موجود ہے۔ معمولات مظہری کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں اگر آپ اس کو ایک ہفتہ کیلئے میرے نام بھیج دیں تو میں بہت شکر گزار ہوں گا اور سات آٹھ دن میں حتماً واپس کردوں گا اس سے زیادہ تاخیر نہ ہوگی۔

۲ اپریل ۱۹۷۶ء

عزیزی مسیح الزماں پرسوں تک یہیں موجود تھے۔ اب اپنے وطن جائس چلے گئے ہیں اور وہیں سے ۱۱ اکتوبر کو الہ آباد چلے جائیںگے آپ کا یہ کارڈ میں اُن کو بھیج دوں گا۔ آپ کی مطلوبہ کتابوں کی فہرست جلد بھجوانے کی کوشش کی جائیگی امید ہے کہ مزاج مع الخیر ہوگا۔ والسلام

اخلاص آئین

سیّد مسعود حسن رضوی

(۴)

رفعت منزل۔ خیرت آباد

محب مکرم۔ تسلیم! کرم نامہ مورخہ ۲۶ نومبر کے لیۓ شکر گزار اور معذرت خواہ ہوں کہ جواب دیر سے جا رہا ہے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ انسٹی ٹیوٹ میں آپ کی مرضی کے مطابق کام ہو رہا ہے اور اُردو اور فارسی دونوں کام آپ ہی کی نگرانی میں ہو رہے ہے۔ محمد بن عمر صاحب بھی آپ سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو یہاں سے تقریباً مایوسی ہو چکی ہے۔ نوائے ادب کیلئے انشا اللہ جلد کوئی مضمون بھیجوں گا۔ اس وقت کوئی تیار نہیں ہے۔ خواجہ صاحب آجکل دلی گئے ہوئے ہیں۔ کالج کے طلبہ کے ساتھ وہ بھی حالات سے متاثر ہو کر دل برداشتہ سے ہیں مگر کام شاید جولائی تک مکمل کر لینگے۔ آپ کی بیگم صاحبہ کی طبیعت اب کیسی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ان کو صحت و عافیت اور آپ کو اطمینان نصیب ہو۔ اہل خانہ کی صحت اور اعانت بڑی تقویت کا باعث ہوتی ہے۔ اورنٹیل کانفرنس میں جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ سروری صاحب نے آج ہی کہا ہے کہ وہ جا رہے ہیں ادارے کی عمارت کے بارے میں تفصیلات "سب رس" میں شائع ہوئی ہیں جو اس وقت تک آپ کے ملاحظے سے گزر چکا ہوگا

مخلص

سید محی الدین زور (۳۰ دسمبر ۱۹۶۵ء)

(۵)

CAVALRY LANE
DELHI UNIVERSITY
DELHI-8
(۱۹۵۷) ۳/۴

مخدوم مکرم! میں انشاءاللہ یکم اپریل کو پابوسی کی سعادت حاصل کروں گا۔ اندھیری میں ضرور ٹھہرتا لیکن وہاں ٹھیرنے کے معنی ہیں کہ ہر چیز سے دور ہو جاؤں گا اور نجد اور غزالان نجد کی دوری کسی طرح گوارا نہیں۔ میں نے دستوی صاحب کو لکھا ہے۔ حسب دستور سابق مجھے انجمن کے بورڈنگ میں پناہ دے دیں۔ خدا کرے مزاج بخیر ہو اور آپ کی جوانی اور جولانی بدستور ہو۔ اپنے یہاں سب سے سلام و دعا۔

آپ کا

خواجہ احمد فاروقی

(۶)

بھائی صاحب محترم، سلام مسنون!

کل آپ کا ۳/۱۲ کا کرم نامہ اور اس کے پہلے ایک کارڈ وصول ہوا۔ کیفیت مندرجہ سے آگاہی ہوئی۔ بھابھی صاحبہ کی علالت کی کیفیت سے پریشانی ہے خدا جلد صحت کلّی عطا کرے بمبئی میں جس طرح ماہر ڈاکٹر موجود ہیں اس کے مدنظر قوی امید ہے جلد مزاج کی حالت درست ہو جائیگی۔ خدا ان کو عرصہ دراز تک صحت اور سلامتی سے رکھے۔ میری طرف سے سلام اور مزاج پرسی کی جائے۔ جو صاحب بیجاپور کے متعلق ریسرچ کر رہے ہیں ان کے نام سے مطلع فرمایا جائے تو مناسب ہوگا تاکہ کتب خانہ میں ان کا داخلہ رہے۔ موصوف کا خط آنے پر ہر ممکن امداد سے دریغ نہ کروں گا۔ میرے مضمون کے متعلق آپ کو پورا اختیار ہے جیساکہ اس کے پہلے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں آپ اس کی ترمیم اور اصلاح جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ "سفرنامہ آسٹریلیا کی جھلک" پر جنوری کے نوائے ادب میں ضرور ریویو ہو جانا چاہیئے ... ... امید ہے آپ خیریت سے ہونگے۔

والسلام

نصیرالدین ہاشمی

(۷)

نئی دہلی۔ ۲۰ اگست ۱۹۵۶ء

مخدومی حضرت دام مجدکم! اداب و تسلیمات۔

گرامی نامہ کا شکریہ جو کل سہ پہر کو ملا۔ میں نے مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی سے تصدیق کر لی ہے آپ انھیں کے یہاں قیام فرمائنگے۔ انشا اللہ۔

میں حسب الحکم اتوار کی شام کو فرنٹیر میل پر ریلوے اسٹیشن پہنچ جاؤنگا۔ دعا ہے کہ بیگم صاحبہ کی طبیعت درست رہے تاکہ آپ مجوزہ سفر کر سکیں اور اپنے نیازمندوں کو مایوس نہ فرمائیں۔

آپ مہربانی فرماکر کتب خانے سے اور سید جمیل صاحب سے یہ دریافت فرمائیے کہ کیا ان میں سے کسی جگہ غالب کے اردو دیوان کا مطبع احمدی ایڈیشن (۱۸۶۱ء) ہے اگر ہو تو اسے ساتھ لیتے آیئے۔ یہ بہت ضروری ہے اگرچہ وقت تنگ ہے لیکن اگر آپ جمیل صاحب کو پیغام بھیج دینگے کہ کتاب ان کے ذخیرہ میں ہو تو ریلوے اسٹیشن پر ہی پہنچا دی جائے تو انشاء اللہ آپ اسے ساتھ لا سکیں گے۔ یوں میں احتیاطاً انھیں بھی لکھ رہا ہوں۔

امید ہے کہ آپ بھی ہمہ نوع بخیر ہونگے اور بیگم صاحبہ مدظلہا بھی۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

(۸)

۳-۱-۱۹۵۷

پانسگاہ - دانشگاہ - تہران (ایران)

محترم و مکرم من - سلام مسنون : میں یکم نومبر کو تہران آگیا اور تہران یونیورسٹی میں فارسی جدید پڑھتا ہوں۔ اسکے ساتھ پہلوی اور فارسی جاستان کے لکچرز میں چلا جایا کرتا ہوں۔ خالی وقت میں یہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ملتا ہوں تاکہ ایران کی ادبی تحریکوں کے مطالعہ میں مدد ملے۔ یہاں کے کتاب خانے بہت عمدہ ہیں۔ بعض کمیاب اور نادر کتابیں مل جاتی ہیں۔ ان کا مطالعہ میری دلچسپی کا سبب ہے۔ یہی یہاں کی مصروفیات ہیں۔

خدا کرے بیگم صاحبہ اب اچھی ہوں تاکہ آپ زیادہ سے زیادہ توجہ علمی و ادبی کاموں کی طرف دے سکیں۔ اورینٹل کانفرنس کی روداد معلوم نہ ہو سکی۔ ایک مضمون روانہ کیا تھا۔ اس کی رسید بھی نہیں ملی۔

ایران میں سردی بہت زوروں پر ہے مگر ہم لوگوں کی جائے رہائش بڑی آرام دہ ہے۔ اس کو گرم رکھا جاتا ہے۔ البتہ باہر نکلنے پر سردی کا احساس ہوتا ہے۔ مگر ایک اچھائی یہ ہے کہ سواریوں کا بڑا معقول انتظام ہے۔ ارزانی اور فراوانی دونوں ہے اس لئے کہیں جانے میں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔

اس پانسگاہ میں صرف غیر ملکی طلبا ہیں جو تقریبًا ۲۵ کی تعداد میں ہیں اور سب یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں تحصیل علم کر رہے ہیں۔ پانسگاہ سے دانشکدہ جہاں ہم لوگ پڑھنے جاتے ہیں کافی دور ہے لیکن ذرائع آمد و رفت کی آسانی کی وجہ سے ہر روز دو بار آنے جانے میں بھی زیادہ زحمت نہیں ہوتی۔

تہران بہت اچھا شہر ہے مگر گرانی زیادہ ہے۔ پانی پہاڑی چشمے کا استعمال ہوتا ہے وہیں سے نالیاں شہر تک گئی ہیں اور ان میں پانی بہا کرتا ہے۔ پینے کا پانی دوسری جگہ سے لاتے ہیں۔ جس کو گاڑی والے بیچا کرتے ہیں۔ خدا کرے سال نو آپ کے لئے خوشی اور اطمینان کا پیغام لائے اور ملک اور قوم کو آپ کی رہنمائی سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔

نیازمند

نذیر احمد

(۹)

اسلم منزل - میرس روڈ علی گڑھ

۱۸ مارچ ۱۹۵۷ء

مخدوم و مکرم - سلام نیاز! آپ کے دونوں خطوط ملے تھے۔ یہ تحریروں کے متعلق عام طور سے تعریفی خطوط تھے لیکن آپ جیسے اہل علم کا ان کی طرف متوجہ ہونا میرے لئے باعث فخر ہے۔ امید ہے وقتاً فوقتاً اپنے مشوروں سے مستفید فرماتے رہیں گے۔ "ہماری زبان" میں جو مستقل کالم میں لکھ رہا ہوں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تنقید کو ہماری [illegible]

بنانے کے بجائے عام آدمیوں کے لیئے دلچسپ اور کارآمد بنایا جائے نیز ادب میں مصلحت اندیشی اور بد دیانتی کے خلاف آواز اٹھا کر آزادیٔ خیال کو عام کیا جائے۔ بہت سے لوگ ادبی مسائل پر اسی طرح سوچتے ہیں لیکن کہنے کی ہمت نہیں رکھتے جس کا اثر ادب پر پڑتا ہے اور غلط رجحانات کو راہ ملتی ہے۔

پرانے رسائل کی ببلیو گرافی کی اسکیم بہت اچھی ہے آپ لوگوں نے "نوائے ادب" میں جو سلسلہ شروع کیا ہے نہایت کارآمد ہے لیکن علی گڑھ میں یہ کام کون کریگا۔ یہ کام شعبہ اُردو کے کرنے کا تھا لیکن اس وقت اردو کے حلقے آرہے ہیں وہ ذوق ادب سے عاری ہیں اور کام کرنے کا انھیں شوق بھی نہیں ہے بہرحال سرور صاحب سے میں کہونگا کہ چاہے اس کام پر کچھ رقم کیوں نہ صرف کرنی پڑے اس کی تکمیل ہو جائے تو تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والوں کے لیئے ایک مفید کام ہو جائے گا۔ آپ علی گڑھ ضرور تشریف لائیں اور میرے ساتھ ہی قیام کریں علی گڑھ یوں بھی آپ کا کبھی آنا نہیں ہوتا۔ کتب خانے کے بہانے سہی۔

امید ہے آپ میری دونوں کتابوں سے متعلق اپنی تفصیلی رائے اور مفید مشوروں سے نوازینگے۔

آپ کا

خلیل الرحمٰن اعظمی

(۱۰)

3-6-688 HIMAYATNAGAR
HYDERABAD - DN.
مورخہ ۲ راپریل ۱۹۵۷ء

محبِ محترم! آپ پٹنہ سے لوٹ چکے ہونگے۔ میں اور قاضی صاحب ۲۶ رمارچ کی صبح کو علی گڑھ سے روانہ ہو کر دوپہر کو دہلی پہنچے وہاں ہم ریٹائرنگ روم میں دو دن مقیم رہے اس کے بعد قاضی صاحب اپنے ایک دوست کے یہاں منتقل ہو گئے اور میں گوالیر، بھوپال، اور ناگپور ٹھہرتا ہوا پرسوں صبح حیدرآباد واپس ہوا۔ سب حالات بفضل تعالیٰ بخیر ہیں۔ چار چھ دن جو آپ کے ساتھ گزرے بڑے لطف کے تھے۔ خدا کرے ایسے موقع اور آئیں۔

یہاں میں نے اپنی بیوی کو بیگم ندوی کی صحت کی خبر سنائی۔ وہ متردد تھیں۔ خدا کرے ان کو جلد آرام ہو اور آپ کی اور بچوں کی پریشانی رفع ہو۔

آپ کی کتاب "اُردو زبان کا ارتقا" میرے پاس ہی رہ گئی آپ مناسب سمجھیں تو ڈاک سے بھجواتا ہوں۔ اپوویم والوں نے چک بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ زحمت نہ ہو تو یاد دہی فرما دیجئے۔

مخلص

عبدالقادر سروری

(۱۱)

۵ر اکتوبر ۱۹۵۷ء

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سید صاحب مکرم تسلیم ! ۳۱ر دسمبر کی تاریخ قریب آرہی ہے آپ کا مقالہ کس منزل میں ہے؟ بڑی آرزو ہے معینہ مدت کے اندر ہی پہلی جلد کا کام مکمل ہو جائے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ساتھی کام کرنے والے مدد فرمائیں (عریضہ کو میری) ذاتی درخواست تصور فرمائیے۔ خدا کرے آپ کی پریشانیاں دور ہو گئی ہوں۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

(۱۲)

رضا کلب نینی تال

۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۵ء

مکرمی و محترمی : نامہ والا نے عزت بخشی یہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ آپ اور آپ کی اہلیہ دونوں علیل ہیں اللہ تعالیٰ دونوں کو شفائے کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے لیکن میں بھی تقریبًا دو سال سے ضعف اعصاب، کمی خون، اور لڈپریشر میں مبتلا ہوں۔ تبدیل آب و ہوا کے لئے یہاں آیا ہوا ہوں۔ موسم بہت خوشگوار ہے اور صحت ترقی کرتی معلوم تی ہے۔ میرے لئے بھی دعا فرمائیے۔

یہاں سے ۱۴ر کو واپسی کا ارادہ ہے انشا اللہ واپس پہنچ کر مقالہ پیش کر دوں گا۔ یہ عرض کر دوں کہ وہ کوئی ی کاوش کی چیز نہیں ہے پہلے آپ ملاحظہ فرمالیں اگر معیار کے مطابق ہو تو نذر ہے ورنہ بے تکلف واپس کر دیا جائے کہ آپ کے خط میں آپ کے افکار کی کمی کا ذکر ہو۔ والسلام مع الاکرام۔

مخلص

عرشی (امتیاز علی عرشی)

(۱۳)

۱۲ نومبر ۱۹۵۵ء

ماموں صاحب، تسلیم : نوازش نامہ ملا بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے بہت جلد براہ راست یاد فرمایا دارالمصنفین خوشی سے مقدمہ رقعات عالمگیری کی دوسری جلد شائع کریگا۔ حضرت سید صاحب کی گفتگو ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے آپ کے مقدمہ رقعات عالمگیر کو دارالمصنفین کی بہترین کتابوں میں شمار کرتے تھے اور بار بار فرماتے تھے کہ "نجیب کا ان غضب کا تھا، وہ اس لائن میں ہوتے تو خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ جاتے" میں بھی آپ کی کتاب بار بار پڑھتا ہوں تو نئی لذت محسوس ہوتی ہے اور مجھ کو حیرت ہوتی ہے کہ آپ نے ... ابتدائی ... میں اس

کتاب کو کس بالغ نظری کے ساتھ لکھا ہے۔ اس کمسنی میں فکر و نظر کی ایسی مثال کم ملیگی۔ مجھکو افسوس رہا کہ اس اور جلدیں آپ نے کیوں نہیں لکھیں۔ اب خوش ہوں کہ آپ اس کی تکمیل کر رہے ہیں۔ آپ اپنے مسودات بھیج : یہاں صاف کرا لیئے جائینگے اور دارالمصنفین کی طرف سے تاریخ ہند کا بڑا کام شروع ہونے والا ہے اسی سلسلہ یہ کتاب بھی ضرور شائع ہوجائیگی۔ دارالمصنفین ہمیشہ آپ کو اپنا ہی سمجھتا رہا ہے۔ . . . .

. . . .

والسلام احقر صباح الدین عبدالرحمن

(۱۴)

شعبۂ اُردو

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مورخہ ۲ جنوری ۱۹۵۸ء

مخدوم و محترم۔ آداب و نیاز ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ دہلی اورینٹل کانفرنس میں تشریف لائے اس کا بھی علم ہوا کہ آپ کے نشر اک میں حضرت امیر دستھے۔ میں کتنا بے آبرو اور نامسعود ہوں کہ دہلی تک پہونچ سکا۔

خیر اب ایک اور صورت رسائی نکل آئی ہے۔ ۶ جنوری کی شام کو لسانیات کا ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کیلئے مجھے پونا پہنچنا ہے اس طرح ۶ جنوری کی صبح کو پٹھان کوٹ ایکسپریس سے بمبئی پہنچ جاؤں گا۔ انسٹی ٹیوٹ دفتر پر دھاوا رہیگا۔ زہے قسمت! اگر یہ میرا خط آپ کو مل گیا تو وہاں ملاقات ہوجائیگی۔ اس میں ناکام رہا تو واپسی پر کوشش مزید رہیگی۔ پونا سے واپسی ۹ یا ۱۰ جنوری کو ہوگی۔ ہر دو صورتوں میں بمبئی چند گھنٹے قیام۔ اسی لیئے آپ سے اگر انجمن اسلام انسٹی ٹیوٹ کے دفتر میں ملاقات ہوجائے تو خوب ہو۔ ایک آدھ مسئلہ اور بھی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

. . . .

اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

نیازمند

مسعود حسین

حامد اللہ ندوی

دکھنیات سے ندوی صاحب کی دلچسپی

ندوی صاحب نے اپنے جاننے والوں پر جو دور رس اثرات چھوڑے ہیں، انھیں دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے، ایک وہ جو ان کی ظاہری شخصیت سے متعلق ہے اور دوسرا وہ جو ان کی باطنی شخصیت سے متعلق ہے، ظاہری شخصیت سے میری مراد ان کی وہ وجاہت، خوش خلقی، وضع داری اور شگفتہ مزاجی ہے جس نے انھیں ہر خاص و عام میں ہردلعزیز بنادیا تھا اور باطنی شخصیت سے میرا مطلب ان کے علاوہ علمی ادبی کارنامے ہیں جو انھیں دوسروں سے ممیز کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔

ان کی ظاہری شخصیت بڑی رنگین، بڑی دلکش اور بڑی دل نواز تھی، ہر ملنے والے نے انھیں ایک جدا رنگ میں دیکھا ہے اور تقریباً ہر شخص کے دل پر ان کا کوئی نہ کوئی نقش باقی ہے اس رنگا رنگ شخصیت کے دل کش نقوش کو ایک جا کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں، یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب ان کا ہر جاننے والا اپنے دل کے نہاں خانے سے ان کی تصویر نکال کر سب کے سامنے رکھدے اور کوئی فن کار قلم ان سب کے امتزاج سے ان کا ایک جامع اور ہمہ رنگی خاکہ بنا دے۔

لیکن ان کی باطنی شخصیت میں وہ تنوع اور وہ رنگا رنگی نہ تھی بلکہ اس کے سب گوشے مخصوص اور متعین تھے ہر کوئی بڑی آسانی سے اس پر روشنی ڈال کر اس کے حسن و قبح کو عیاں کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی ایک بالخصوصیت دکھنیات سے ان کی دلچسپی بھی ہے، یہ بتانا تو مشکل ہے کہ ندوی صاحب میں یہ دلچسپی کب اور کیسے پیدا ہوئی لیکن ان کے ذاتی تعلقات کی روشنی میں یہ ضرور اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دلچسپی کے پیچھے کن محرکات سرگرم عمل تھے یا کن بزرگوں کی صحبت نے عمل یا ردِ عمل کے طور پر ان میں یہ دلچسپی پیدا کی اس سلسلے میں صرف چند نام یہاں گنوانا چاہتا ہوں۔

حافظ محمود خاں شیرانی:— ندوی صاحب کی علمی و عملی زندگی کا آغاز دار المصنفین سے ہوا جس زمانہ میں وہ دار المصنفین سے متعلق تھے انھیں دنوں شیرانی کی پنجاب میں اردو شائع ہوئی، یہ اردو زبان و ادب کی تذکرہ آبحیات کے بعد دوسری اہم کتاب تھی، اس میں شیرانی نے اردو زبان کے آغاز سے متعلق محمد حسین آزاد کے نظریہ سے اختلاف کرتے ہوئے پنجابی کو اردو کی ماں بتایا تھا اور پھر پنجابی و دکنی کا مقابلہ کر کے پہلی بار یہ ثابت

کرنے کی کوشش کی تھی کہ یہ دونوں ایک ہی پودے کی دو ٹہنیاں ہیں۔

اِس اہم کتاب پر تبصرہ کرنے کی ذمہ داری دارالمصنفین کی طرف سے ندوی صاحب پر عائد کی گئی ندوی صاحب نے ایک طویل تبصرہ سپرد قلم کیا جو شیرانی کے حق میں نہ تھا لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ شیرانی کی تنقید شعرالعجم کا جواب ہے اور ایک تلخ بحث چھڑ گئی اس کا ردِ عمل اوروں پر جو کچھ ہوا ہو لیکن خود ندوی صاحب غیر شعوری طور پر شیرانی کے نظریات سے مرعوب و متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اِس طرح دکھنی سے اِن کی دلچسپی کا آغاز ہو گیا خود ندوی صاحب نے "لغات گجری" کے دیباچہ میں کھلے دِل کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے

مولوی عبدالحق :

... بمبئی آنے کے بعد ندوی صاحب نے جہاں اور بہت ساری علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا وہاں وہ انجمن ترقی اردو شاخ بمبئی سے بھی منسلک ہو گئے اور کچھ سال اس کے سکریٹری بھی رہے اس تعلق نے انھیں مولوی عبدالحق سے بہت زیادہ قریب کر دیا جب بھی عبدالحق دورے پر آتے ندوی صاحب ہی کے مہمان رہتے اور انھیں کے ساتھ بمبئی اور آس پاس کے علاقوں کا دورہ کر کے یہ معلوم کرتے کہ یہاں اُردو کی ترقی کا رفتار کیا ہے۔

اُردو زبان و ادب پر عبدالحق کے جو احسانات ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں سرزمین دکن ان کی سرگرمیوں کا مرکز تھی انھوں نے اُردو زبان و ادب سے متعلق قواعد لغت تذکرے تراجم اور قدیم ادب کا جو ذخیرہ شائع کیا اس میں دکھنیات کا حصہ بڑا اہم ہے وہ دکھنیات کے ماہر تھے اِس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دکھنی سے ندوی صاحب کی دلچسپی کو بڑھانے میں ان دونوں کے قریبی تعلقات کو بھی بڑا دخل ہے یہ بات ان مشوروں سے بھی ظاہر ہے جو ندوی صاحب نے دکھنیات کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً عبدالحق سے لئے اور جن کا حوالہ انھوں نے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ دیا ہے۔

نصیرالدین ہاشمی :

۔ دکھنیات کے عالموں میں ہاشمی صاحب کا نام سرِ فہرست ہے دکنی ادب اور دکنی کلچر سے متعلق کتابوں اور مضمونوں کا ایک بڑا ذخیرہ انھوں نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے بلکہ کہنا چاہیئے کہ قیس کی طرح انھوں نے اپنی ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذار دی۔

ندوی صاحب کا ان سے تعلق بھی برادرانہ رہا ہاشمی صاحب جب بھی بمبئی آئے ندوی صاحب ہی کے ہاں قیام فرماتے۔ اسی طرح ندوی صاحب کا بھی جب کبھی حیدرآباد جانا ہوتا ہاشمی صاحب کے علاوہ کسی اور کے گھر قیام کرنا ان کیلئے ناممکن تھا یہاں تک کہ ہاشمی صاحب کی موت کے بعد خود اپنی موت سے کچھ ماہ بیشتر جب ان کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ پیش آیا تو اس بھری دنیا میں انھیں کوئی اپنا دکھائی نہ دیا وہ بمبئی چھوڑ کر حیدرآباد چلے گئے اور ہاشمی صاحب کے ہی گھر رہ کر ان کی محبت آمیز یادوں سے اپنے غم کا بوجھ ہلکا کیا ہاشمی صاحب کو دکھنیات

جو والہانہ شغف تھا اس کی وجہ سے ندوی صاحب ہمیشہ انھیں کوہکن و فرہاد سے تشبیہ دیتے تھے۔ اس لئے یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ ندوی صاحب کی دکھنیات سے دلچسپی میں اس قربت کا بھی ہاتھ ہے۔

پروفیسر محمد ابراہیم ڈار : ۔ ندوی صاحب کی بمبئی کی زندگی کا ایک اہم حصہ اسمٰعیل یوسف کالج کی ملازمت میں گذرا جن دنوں ندوی صاحب اِس کالج میں استاذ ہوکر آئے ان دنوں پرنسپل بدل الرحمن کی جوہر شناس نظروں نے بہت سے قابل لوگوں کو چن چن کر وہاں جمع کر لیا تھا ان میں ایک پروفیسر محمد ابراہیم ڈار بھی تھے۔ ڈار صاحب پنجابی تھے اور حافظ محمود خان شیرانی کے شاگرد رشید، استاد کی ساری خوبیاں ان میں جمع تھیں، وہ نہ صرف یہ کہ ایک مشفق استاد اور ہمدرد دوست تھے بلکہ ایک عالم اور محقق بھی تھے، ان کا علمی اور تحقیقی فیض اس قدر عام تھا کہ بہت تھوڑی مدت میں ان کا ایک اچھا خاصا حلقہ اسمٰعیل کالج میں قائم ہوگیا، اس حلقہ پر شیرانی کی ایک ہلکی سی چھاپ بھی تھی۔

اِس کالج میں ندوی صاحب کی بھی اپنی ایک منفرد شخصیت تھی وہ ندوہ اور دارالمصنفین کی ایک شاندار روایت اپنے ساتھ لے کر یہاں آئے تھے لوگوں کو توقع تھی کہ وہ اپنے اس شاندار ماضی کی علمی عظمت کو یہاں بھی برقرار رکھیں گے، خود بھی علمی کام کریں گے اور دوسروں سے بھی کروائیں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا، وہ یہاں آکر یہاں کے ہنگاموں میں کھو گئے اور لکھنا پڑھنا بند سا کر دیا ایسے میں وہ اپنی دھاک باقی رکھیں تو کیسے؟ ڈار صاحب کی موجودگی نے شیرانی کی یاد کو تازہ کیا اور شیرانی کی یاد نے دکھنی سے دلچسپی کو، اسی طرح لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کا ایک راستہ مل گیا۔

دیگر شخصیتیں :۔ بمبئی آنے کے بعد ندوی صاحب شمال والوں کی بہ نسبت جنوب والوں سے زیادہ قریب ہوگئے۔ مہاراشٹرا سمیت جنوب کا کوئی ایسا تعلیمی ادارہ اور کوئی ایسی یونیورسٹی نہ تھی جس سے وہ کسی نہ کسی صورت متعلق نہ رہے ہوں، اور جہاں کی اہم شخصیتوں کے دِل میں انھوں نے اپنا گھر نہ بنایا ہو۔

حیدرآباد میں نصیر الدین ہاشمی کے علاوہ ابو محمد یافعی، ڈاکٹر زور، پروفیسر سید محمد، محمد اکبر الدین صدیقی، پروفیسر سروری، مولوی سخاوت مرزا، پروفیسر مبارز الدین رفعت، ڈاکٹر مسعود حسین خان، مدراس میں افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق، افضل العلماء پروفیسر عبدالوہاب بخاری، افضل العلماء پروفیسر یوسف کوکن، میسور میں ڈاکٹر آمنہ خاتون، ڈاکٹر حیات خان اور نہ معلوم ایسے اور کتنے دکھنیات کے ادیب، محقق اور دانشور جن کے نام سے دکن اور جنوب کی علمی ادبی فضا روشن ہے، ان کے حلقہ ارادت میں شامل تھے، وہ ندوی صاحب سے محبت کرتے تھے اور انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے، ندوی صاحب کا ان تعلقات سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا، چنانچہ اس تعلق کو بھی دکھنیات سے ان کی دلچسپی میں ایک محرک کی حیثیت سے شمار کرنا چاہیئے۔

(۲)

ندوی صاحب کو واقعی دکھنیات سے دلچسپی تھی اس کا حال ہمیں تین ذریعوں سے معلوم ہوا ہے، پہلا ذریعہ تو خود ان کا اپنا نجی کتب خانہ ہے جس میں اور بہت سی نایاب چیزوں کے علاوہ مخطوطات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ بھی ہے، اس کی کوئی فہرست شائع تو نہ ہو سکی مگر جن لوگوں کو یہ کتب خانہ دیکھنے یا اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس ذخیرۂ مخطوطات کا بیشتر حصہ دکھنیات پر مشتمل ہے جس میں امین گجراتی کی یوسف زلیخا اور تولدنامہ جیسے مخطوطات بھی شامل ہیں جو نایاب سمجھے جاتے ہیں۔

دوسرا ذریعہ وہ حوالے ہیں جو اِس کتب خانے سے استفادہ کرنے والوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مضامین اور مقالات میں دیئے۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی اور دیگر بہت سے صاحبِ علم حضرات کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جن کے اکثر مضامین میں ندوی صاحب کے مملوکہ دکھنی مخطوطات کے حوالے ملتے ہیں۔

تیسرا ذریعہ خود ان کے اپنے مضامین ہیں جو انھوں نے بمبئی کی زندگی میں لکھے اور وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔

(۳)

ندوی صاحب نے اپنے آخری ایام میں اپنے متعلق ایک یادداشت تیار کی تھی جس کی ایک نقل ان کے شاگرد محمد ایوب واقف کے پاس اب بھی محفوظ ہے، اس میں انھوں نے اپنی پیدائش، اپنی تعلیم اور اپنی تمام علمی ادبی مصروفیات کا ذکر کرنے کے علاوہ اپنی اُن کتابوں، ترجموں اور مقالوں کے نام بھی دیدیئے ہیں جو وقتاً فوقتاً منصۂ شہود پر آئے۔

اس یادداشت کو ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر علمی کام انھوں نے دارالمصنفین میں انجام دیئے ہیں اور تاریخ ان کا موضوع ہے، بمبئی آنے کے بعد معدودے چند مضامین کے علاوہ کچھ نہیں لکھا اور یہ مضامین بھی زیادہ تر نوائے ادب بمبئی، اردو ادب علی گڑھ اور اردو کراچی میں چھپے ہیں، اردو ادب علی گڑھ اور اردو کراچی میں جو مضمون چھپے ان کی تعداد تین چار سے زیادہ نہیں اور ان کا موضوع بھی دکھنی کم اور اردو زیادہ ہے۔ صرف ایک مضمون "بمبئی میں اردو" دکھنیات سے متعلق ہے۔

اسی طرح نوائے ادب میں ان کے جو مضمون مختلف اوقات میں مختلف موضوعات پر شائع ہوئے ان میں "حسن نظامی" "اودھ ریویو" اور "مرأتِ جواد" کا تعلق دکھنیات سے نہیں ہے البتہ تین اور مضمون "ایک کہانی چار شاعروں کی زبانی" "کوکن کے اربعہ عناصر" "بمبئی سے متعلق دو قدیم مثنویاں" ایسے ہیں جن کا شمار دکھنیات میں ہو سکتا ہے۔

"ایک کہانی چار شاعروں کی زبانی" یہ مضمون نوائے ادب بابتہ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا، بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس میں قصۂ ابوشحمہ کو منظوم کرنے والے چار دکنی شاعر نامی، عاصم، قاضی، صالح اور ان کی مثنویوں کا تعارف ہے۔

"کوکن کے اربعہ عناصر" یہ مضمون نوائے ادب بابتہ اپریل ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا، بیس صفحات پر شتمل ہے اس میں قاضی غلام قاسم مہری متخلص بہ قاسم، باپو میاں اوندبر کر متخلص بہ فقیہ، قاضی غلام علی مہری خلص بہ علی اور قاضی محمد یوسف مرگھے متخلص بہ یوسف اور ان کی تصانیف مصباح المجالس تحفۂ اعظم، زینت مجالس اور کفایت الاسلام کا تعارف ہے جو مطبوعہ ہیں مگر کم یاب۔

"بمبئی سے متعلق دو قدیم مثنویاں" یہ مضمون نوائے ادب بابتہ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا اور بارہ صفحات پر تمل ہے۔ مضمون میں باپو میاں فقیہ کی ان دو مثنویوں کا تعارف ہے جو انھوں نے سنہ ۱۸۰۲ء کی بمبئی کی آتش زدگی سے ا ثر ہو کر لکھی تھیں۔ اردو کراچی، اردو ادب علی گڑھ اور نوائے ادب بمبئی سے ہٹ کر دکھنیات سے متعلق ان کی جو دایک اور چیزیں شائع ہوئی ہیں یہ ہیں۔

"گجرات میں اردو عہد ولی سے پہلے" یہ مقالہ دوسرے باب کی حیثیت سے علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں ال ہے اور بیالیس صفحات پر مشتمل ہے، ابتدائی پندرہ صفحات میں گجرات کی تاریخی اور لسانی اہمیت کا ذکر ہے ر باقی صفحات میں وہاں کی صوفیانہ اور عوامی شاعری اور اس سلسلہ کے چند ممتاز شعرا کا تعارف ہے۔

"لغات گجری" یہ خالق باری" کی طرز پر لکھا ہوا ایک نامعلوم الاسم مصنف کا لغت ہے جس کو ندوی ماحب نے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے، مقدمہ پچاس صفحات کا ہے، اور اس میں ندوی صاحب نے ت نویسی کی ضرورت، اردو کے ابتدائی نصاب ناموں کی تفصیلات اور خود اس لغت کی خصوصیات سے شا کی ہے، متن اپنے عربی حواشی کے ساتھ دو سو بیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

(۴)

ندوی صاحب کا یہی وہ کل تحریری سرمایہ ہے جو دکھنیات سے ان کی دلچسپی کے نتیجہ میں ہم تک پہنچا ہے ہم تنقیدی نقطۂ نظر سے اِن کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضامین محض تعارفی ہیں، اکثر مضمونوں میں چار سطروں کی ایک مختصر سی تمہید ہے اور پھر متن نقل کر دیا گیا ہے۔ تمہید کی معلومات بھی زیادہ تر وہی ہیں جو د تو تصانیف کے اندر ہی مل گئیں، بیرونی ذرائع سے فائدہ اٹھا کر ان معلومات میں اضافہ کرنے کی کم کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں ادبی اور لسانی اعتبار سے بھی ان مضامین میں ندوی صاحب کی اپنی رائے، اُن کی اپنی بق اور ان کے اپنے نتائج فکر کا دور دور تک پتہ نہیں

یہی کچھ حال ندوی صاحب کے اس مقالہ کا بھی ہے جو گجری ادب پہ سٹی لڈ تھ تاریخ ادب اردو میں شامل کیا گیا ہے اس میں جو معلومات ہیں انہیں پیش کرنے کے لیئے کسی ادیب اور محقق کا دکنی داں ہونا ضروری نہیں، ایک غیر دکنی داں بھی بڑی آسانی کے ساتھ مختلف تاریخوں کی مدد سے ایسا مواد اکٹھا کر سکتا ہے بلکہ کہنا چاہیئے کہ "سخنوران گجرات" میں جو ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے اور ندوی صاحب ہی کے زیر ہدایت مکمل ہوا ہے اس انداز کا مواد اکٹھا موجود ہے۔

ان کی "لغات گجری" میں بھی متن ندوی صاحب کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا تیار کیا ہوا ہے جن کا شکریہ ندوی صاحب نے اپنی اس کتاب کے دیباچے میں ادا کیا ہے، ندوی صاحب نے صرف مقدمہ لکھا ہے، متن کی اہمیت کے مقابلہ میں سرسری سا ہے اور اس میں جو معلومات ہیں وہ شیرانی کی مرتب کردہ "خالق باری" اور ان کے مقالے اردو کے نصاب نامے میں زیادہ تر موجود ہیں اور خود ندوی صاحب نے بھی انہیں حوالوں سے اپنا یہ مقدمہ مکمل کیا ہے۔

اس طرح جب ہم ایک طرف یہ دیکھتے ہیں کہ بمبئی میں ندوی صاحب کی علمی و ادبی زندگی کا زمانہ کس قدر طویل تھا اور دکنی سے ان کی دلچسپی کی داستانیں کس قدر زبان زد عام تھیں اور دوسری طرف ہماری نظر ان کے اس کام کی طرف جاتی ہے جو ان کی اس شہرت کا جواز نہیں پیش کرتا تو ہمارے ذہنوں میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ندوی صاحب کو واقعی دکھنیات سے دلچسپی تھی؟

اس سوال کا جواب آسان تو نہیں مگر اس کی وضاحت صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ ندوی صاحب دارالمصنفین سے بمبئی آئے تھے، دارالمصنفین کی فضا اور بمبئی کی فضا میں بڑا فرق ہے، دارالمصنفین ایک علمی اور ثقافتی ادارہ ہے، اس کی اپنی مخصوص قدریں ہیں اور اس کے اپنے بندھے ہوئے معیار، وہاں رہ کر ایک آدمی عالم و محقق ہی بن سکتا ہے۔ اس کے برعکس بمبئی کی فضا رنگینیوں سے معمور رہتی ہے، بڑے بڑے زاہد شب زندہ دار یہاں آکر اپنی تسبیح بھول جاتے ہیں، عبا و قبا اور جبہ و دستار کی حقیقت ہی کیا ہے۔

ندوی صاحب بھی بمبئی آئے تو اس کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے، ان کی ساری زندگی ظاہری رکھ رکھاؤ اور مجلسی زندگی کے لایعنی تکلفات کی نذر ہو کے رہ گئی، وہ تھے شمع تھی، محفل تھی، اگر کچھ نہ تھا تو بس یہ کہ سنجیدہ زندگی نہ تھی۔ ایسے میں ان کے لئے دارالمصنفین میں پیدا کئے ہوئے نام پر جینا مشکل تھا، کرتے تو کیا کرتے، کسی ایسے سہارے کی تلاش تھی جس سے وہ اپنے ماضی کی نیک نامی کو بغیر کچھ نقصان اٹھائے باقی رکھ سکیں، دکھنیات سے دلچسپی کی شکل میں انہیں وہ ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ اس لئے کہ بمبئی دکن کا ایک حصہ ہے اور یہاں دکھنیات کا کوئی عالم موجود نہ تھا۔ لہٰذا اردو دنیا میں ان کی شہرت کا راز تو اس کی وجہ سر تا سر ان کی ظاہری شخصیت کی دلکشی ہے جس کو دارالمصنفین کے پس منظر نے باوقار بنا دیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی

ندوی صاحب!
شخصیت اور کردار

ادب اور شاعری میں صنعت تضاد کے استعمال سے ادبی حسن اور شاعرانہ دلکشی پیدا کی جاتی ہے بالکل اسی طرح بعض شخصیتیں مجموعۂ اضداد ہو کر احباب، اہلِ خاندان اور طلباء میں اپنی فطرت کے اسی صنعتِ تضاد کے رچاؤ سے دلکش اور من موہنی بن جاتی ہیں۔ ندوی صاحب کی شخصیت اسی قسم کی مجموعۂ اضداد شخصیتوں میں سے ایک تھی۔

ندوی صاحب کی مجموعۂ اضداد شخصیت کی تعمیر جن سیاسی، مذہبی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی حالات میں ہوئی اس کا سرسری جائزہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس مختصر سے مضمون میں ندوی صاحب کی شخصیت اور سیرت کے اسی نفسیاتی مطالعہ کی کوشش مقصود ہے جو اُن کے احباب اور طلباء کیلئے قلب و نظر کی زندگی کا باعث تھی۔

ندوی صاحب کی پیدائش انیسویں صدی کے آخری سال کے آخری مہینوں میں ہوئی۔ انیسویں صدی کی ہندوستان کی سیاسی، تہذیبی اور علمی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جو دراصل دو تہذیبوں کی جنگ تھی۔ ہندوستانیوں کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اب مشرق اور مغرب میں مفاہمت، دوستی اور رفاقت ضروری ہے۔ مغربی علوم، زبان، طرزِ فکر، طریقۂ تعلیم کا بے پایاں تند و تیز سیلاب ہندوستان کے پرانے جاگیردارانہ نظام، طریقۂ تعلیم، طرزِ فکر، زبان و ادب اور اخلاقی قدروں پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ ہندوستان کی خالصتاً مشرقی "ہندایرانی" تہذیب نے آخری مرتبہ جب ۱۸۵۷ء میں جنگ اور بغاوت کے ذریعے پہنچنے کی کوشش کی تو اُسے ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی سے شکست خوردگی کے جو آثار پیدا ہو رہے تھے اور جن کے واسطے سے سارا ملک احساس کمتری کا شکار ہو رہا تھا۔ ایسے نازک وقت میں ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے اور اسی قبیل کے چند اور مصلح پیدا ہوئے اور مسلمانوں میں سرسید اور ان کے رفقا نے قوم کی ذہنی تربیت اپنے ہاتھ میں لیکر اس میں بلند حوصلگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سرسید کے ان رفقاء میں حالی، شبلی، نذیر احمد، وقارالملک اور محسن الملک کے نام خصوصیت کے ساتھ لئے جا سکتے ہیں جن کے علم، تجربے اور تاریخ کے گہرے شعور نے مسلمانوں کے لئے خصوصاً اور ہندوؤں کے لئے عموماً نئی تہذیب، نئے علوم اور نئی سیاسی بساط سے فکری

نفسیاتی مفاہمت پیدا کرنے میں مدد کی اور نئی اور پرانی تعلیم اور قدیم و جدید اقدارِ زندگی کو آپس میں ملائے رکھنے پر
ور دیا، یہی وجہ ہے کہ اس دور کے بزرگوں، ادیبوں، شاعروں اور عالموں کے یہاں آپ کو نئی اور پرانی قدریں، جدید و قدیم
سن اخلاق کی وضعداریاں، علم، اخلاق، مجلسی زندگی سب میں ایک ربط اور باہمی تعلق کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں، ان
سیاسی و معاشی حالات سے نئی نسل بھی بڑی حد تک متاثر ہوئی، ندوی صاحب بھی اسی نئی نسل سے تھے جو ان مخصوص حالا
ور سر سید و شبلی کی پروردہ ہے۔

ندوی صاحب کی ابتدائی تعلیم ندوۃ العلماء میں علوم مشرقیہ سے ہوئی بقول خود "بلوغ المرام" کا انھوں نے
شبلی سے درس لیا اور بعد میں انگریزی طرزِ تعلیم سے نہ صرف آشنا ہوئے بلکہ ۱۹۱۷ء میں میٹرکولیشن کے بعد ۱۹۲۲ء اور
۱۹۲۴ء میں بالترتیب بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانات بھی پاس کئے۔ اس طرح گویا ان کے فکری پس منظر پر مشرق
ور مغرب دونوں کی گہری چھاپ تھی۔ اسلام کی محبت اور اس سے جذباتی لگاؤ کے ساتھ ان میں مغرب کی عقلیت اور
س کی روشنی علم و ہنر سے دلبستگی بھی تھی یہی وجہ تھی کہ جب اسلام، اسلامی علوم اور تہذیب اور تاریخ کا ذکر آتا تو جذباتی
ر نفسیاتی اعتبار سے ان سے زیادہ مسلمان بلکہ مومن مفقود تھا اور عملی اعتبار سے رہن سہن، بود و باش، طور و طریق کے
عتبار سے جبہ و دستار کی بجائے سوٹ اور ٹائی ان کے زیبِ تن رہی، ان کا ڈائننگ روم مشرقی دسترخوان کی بجائے
بل کرسی، چھری کانٹے سے مزین ہوا۔ اور بچے اردو اور عربی و فارسی تعلیم کی بجائے کنوینٹ کے تعلیم یافتہ تھے جو
ں یا ابا کی بجائے ممی اور ڈیڈی کہنا پسند کرتے تھے، اقبال کے الفاظ میں ان کا دل مومن اور دماغ کافر تھا۔

ندوی صاحب کی مذہبیت جس کا میں نے ذکر کیا ان کے افعال میں کم اور اقوال میں زیادہ تھی۔ میں نے
نھیں اسمٰعیل کالج کی پروفیسری کے دوران کالج کی مسجد میں صرف جمعہ کی نماز پڑھتے دیکھا لیکن ندوہ کے فارغ التحصیل اور
بلی کے شاگرد ندوی صاحب کو کسی دوسری نماز میں شریک نہ دیکھ سکا، لیکن اس سے ان کی مذہبیت کے بارے میں
جہ پر آنے میں کسی قسم کی عجلت سے کام نہیں لیا جا سکتا، ظاہراً وہ بہت کم مذہبی رہے ہوں ممکن ہے میری طرح اوروں
ے نزدیک بھی وہ پابند صوم و صلوٰۃ نہ رہے ہوں۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اپنی فکر کے اعتبار سے ان سے زیادہ
حد اور مومن بھی کوئی نہ تھا۔ مقدمۂ رقعات عالمگیر جو ندوی صاحب کا اعلیٰ ترین تحقیقی کارنامہ ہے، اس سے جہاں
لمگیر کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے اور تاریخی تحقیق کے لحاظ سے لاثانی ہے وہیں "مقدمہ" کی روشنی میں یہ کہے بغیر
ادہ نہیں کہ سارے مقدمہ پر تاریخی حقائق کے ساتھ ندوی صاحب کی مذہبیت چھائی ہوئی ہے۔ عالمگیر جیسے مذہبی
وفی منش اور روادار بادشاہ ندوی صاحب کی عقیدت اور شیفتگی کا باعث بھی دراصل ان کی مذہبیت ہی ہے
رنگ زیب پر تنگ دل اور متعصب مورخین نے جو زہر اگلا ہے اس کے لئے مقدمہ تریاق کا کام کرتا ہے۔
دوی صاحب اس سلسلے میں نہ صرف اورنگ زیب کے عقیدت مند ہیں بلکہ پرستار بھی اور مقدمہ اورنگ زیب کے

بے داغ مذہبی کردار کا مورخانہ مقدمہ ہے۔ یہ مقدمہ جس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ تاریخی حقائق کی جانکاری کے ساتھ ہیرو کے ساتھ مذہبی عقیدت اور ایمان کی حرارت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

ندوی صاحب کی مذہبیت کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ جب انھوں نے ادبی تحقیق کو ہاتھ لگایا تو اُن کی ساری توجہ اردو ادب کے تشکیلی دور کے اس عہد پر مرکوز رہی جسے صوفیا کے دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ قدیم گجرات اور دکن کے سلاطین کے ساتھ ہی اس عہد کے صوفیانہ ادب اور ملفوظات پر ندوی صاحب کی خصوصی نظر تھی اور صوفیا کی تاریخ اور ان تمام سلسلوں سے واقفیت نہ صرف ادبی لحاظ سے بلکہ مذہبی و فکری لحاظ سے بھی وہ اپنے طالبِ علموں کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

ندوی صاحب عام طور سے اپنے طلبا سے اسلامی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر سوالات کرتے۔ سیرتِ رسول اور سیرتِ صحابہؓ بھی ان کا دلچسپ موضوع تھا اور ایسے سوالات پر مسلم طلبا کی خاموشی ان کو بری طرح کھلتی تھی اور اسلام کی محبت کے جوش میں اس کی تاریخ اور فلسفے سے عدم واقفیت سے ندوی صاحب بہت زیادہ خفا ہوتے یہاں تک کہ تیر و نشتر کی خوب بارش ہوتی۔

سنہ ۱۹۵۸ء میں جب ندوی صاحب اسمٰعیل کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو اُن کے اعزاز میں کالج کے اساتذہ اور طلبا نے ایک تقریب منعقد کی۔ اس تقریب کے موقع پر حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے ڈاکٹر مدنی نے کہا تھا کہ "ندوی صاحب دودھاری تلوار ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ آپ کسی بھی موضوع پر ندوی صاحب سے گفتگو کر رہے ہوں وہ آپ کے خلاف ہی باتیں کرتے اگر آپ یہ کہتے کہ یہ دن ہے تو وہ رات ثابت کرتے اور رات کو دن۔ بحث اور گفتگو میں ان سے بازی بیجا ناکارے دارد کے مصداق تھا۔ ان کی اس قسم کی گفتگو عام طور سے ان کے طلبا سے ہوتی اور جب بحث ہو چکتی اور طلبا خاموش ہو جاتے یا یوں سمجھئے کہ شکست قبول کرتے تو پھر ندوی صاحب مسکراتے ہوئے ہمت بندھاتے اور کہتے کہ بیٹے تمہارا خیال اور تمہارا کہنا ہی صحیح تھا، میں دراصل تم میں خود اعتمادی پیدا کرنا چاہتا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کو اپنی زبان، قلم اور خیال پر کتنا بھروسہ ہے تو دراصل ندوی صاحب کی دودھاری تلوار اور تیر و نشتر میں شخصیت کی تعمیر کا نیک اور پر خلوص مقصد پوشیدہ رہتا تھا وہ سچائی، محنت اور لگن سے بہت خوش ہوتے تھے اور ایسے میں بھرپور ساتھ دیتے تھے اور جہاں کہیں کذب اور افترا تھا ڈٹ کر مقابلہ کرتے، ایسے مواقع پر بھی ان میں مومن کی شان پیدا ہوتی جس کا ذکر اقبال نے اپنے اس مندرجہ ذیل شعر میں کیا ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ندوی صاحب کو دنیا ایک عالم اور محقق کی حیثیت سے جانتی ہے تاہم مزاج کے اعتبار سے وہ اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے گو انھوں نے باقاعدہ ردیف اور قافیہ میں شاعری نہیں کی۔ میر اس بیان کی تصدیق مقدمہ تعمیر کے

صفحات کریں گے جہاں پر ان کے اسلوب کی چاندنی بکھری ہوئی ہے اور اس کا اندازہ وہ لوگ لگائیں گے جنھیں ندوی صاحب کی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہو، مزاج کی شعریت اور اسلوب کی چھٹکی ہوئی چاندنی کے لئے نمونتاً "شبلی اور بمبئی" کا یہ ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے اور ندوی صاحب کے شاعرانہ مزاج مشاہدہ اور اسلوب کی داد دیجئے۔

"یہاں کی ہر گلی رشکِ فردوس اور ہر شاہراہ ایک طرفہ رنگ و بو ہے۔ ہر لوکل ٹرین ایک چھوٹا سا کوہ قاف اور ہر ٹرام ایک محدود پرستان ہے، پھر وہ کونسا کافر دل ہوگا جو اس جگہ پہنچ کر اپنے اندر فدایت و قربانی کے جذبات کا ایک طوفان موجزن نہ پائیگا اور وہ کونسی زخمی روح ہوگی جس کو یہاں کی حسین پریوں اور جمیل حوروں کی قوس و قزح جیسی رنگین ساریوں کا نغمۂ مرتعش تڑپا نہ دیگا۔"[1]

اورنگ زیب کے دلی سے آگرہ جانے کے واقعے کو اس طرح لکھتے ہیں:۔

"دہلی سے چل کر وہ آگرہ پہنچتا ہے، وہاں اسکی پیاری ماں کا وہ مشہور عالم بے مثال مقبرہ ہے، جسے دنیا "تاج" کے نام سے یاد کرتی ہے، ماں کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے کے لئے حاضر ہوتا ہے۔ ماں کی محبت اور اس کے احترام نے اس کے لئے تاج کو صرف دنیا کی عجیب ترین عمارت ہی کی حیثیت نہیں دے رکھی ہے بلکہ وہ مادرانہ شفقت کا مقدس گوشہ اور پسرانہ طاعت کا پاک زاویہ بھی ہے"[2]

ندوی صاحب گو شاعرانہ مزاج اور بلند فکر رکھتے تھے لیکن شاعری کے لئے انھیں وہ فراغت نصیب ہوئی اور نہ ہی حالات نے انھیں اس کا موقع دیا کہ وہ اپنا کوئی شعری مجموعہ یادگار چھوڑتے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ہمیشہ اپنی نثر اور تقریر کو شاعرانہ حسن کا مرقع بنا دیا جہاں پر لفظ و معنی کے قافیے اور ردیفیں فرزانی تھیں اور شعر کی نرمی اور نفاست ان کی وضع قطع اور لباس میں سماگئی تھی۔ یہاں تک کہ ندوی صاحب کا دسترخوان بھی اس شاعرانہ تکلف اور نفاست کا نمونہ بن گیا تھا۔

ندوی صاحب کی شخصیت زنگارنگ شخصیت تھی، ان کے ملنے والوں کا حلقہ بہت زیادہ وسیع تھا اور ہر مکتب خیال کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، اُن کی بزم خیال میں جو حسن، جو نزاکت، جو پاکی، جو نفاست تھی اس کی ساری آب، اس کا سارا پرتو ان کی ظاہری شخصیت میں جھلک رہا تھا، تاہم ان کی بزم رندانہ میں چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں، حسین جمیل عورتوں، اساتذہ، مزدور، کلرک، مسٹر، مولوی اور پنڈت ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگوں کا گذر تھا، طلبا اور طالبات تو ان کی عمر بھر کی کمائی تھے اور وہ ان سب سے خندہ پیشانی، محبت، خلوص سے ملتے وہ اپنے آپ کو مولوی کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے۔ تاہم کوئی بارشیں جبہ و دستار کا عاشق از قسم مولوی کوئی شخص ان سے ملاقات کیلئے

---

[1] پامز (مجلہ اسمٰعیل کالج) مضمون "شبلی اور بمبئی" از پروفیسر نجیب اشرف ندوی [2] نجیب اشرف ندوی۔ مقدمہ رقعات عالمگیر

آتا تو ایسے لگتا کہ گویا ندوی صاحب اس کے حلقۂ عقیدت منداں میں شامل ہوگئے ہوں، یہ ان کے اخلاق کی بہت بڑی خوبی تھی۔ یہی حال ان کی مغربیت کا بھی تھا۔ جب کوئی مغربی انداز مزاج اور تہذیب کا پروردہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو ان سے زیادہ "مغرب زدہ" کوئی نہ ہوتا۔

طبیعت کی یہ رنگا رنگی اُن کے ذوق و شوق اور مطالعے میں بھی تھی، وہ اگر ایک طرف مشرقی علوم اور زبان و ادب کے عاشق تھے تو وہیں پر مغربی ادبیات سے بھی انھیں خاصہ شوق تھا۔ جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہوچکا ہے انھوں نے ابتداً شبلی سے بلوغ المرام پڑھی، ظاہر ہے اس کے بعد بھی انھوں نے بیشمار فقہ و حدیث کی کتابیں مطالعہ کیں۔ اسلامی تاریخ اور سیرت رسولؐ و صحابہؓ کا غائر نظر سے مطالعہ کیا لیکن دوسری طرف وہ مولوی بن کر نہ رہے۔ بلکہ انھوں نے مغربی فلسفہ، تاریخ اور ادب سے بھی استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ افسانوی ادب میں منٹو کی کالی شلوار، دھواں اور ٹھنڈا گوشت، عصمت کا لحاف، کرشن چندر کا مہالکشمی کا پل اور ڈی۔ایچ لارنس کا "لیڈی چیٹرلیز لورز" اور "لولیتا" کو بھی نہایت دلچسپی سے پڑھتے جس سے ثقہ لوگ احتراز کرتے ہیں۔

ندوی صاحب کی طبیعت میں طنز و ظرافت کا مادّہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا، خاص طور سے طنز ان کے مزاج میں اس قدر رچ بس گیا تھا کہ آپ نے کچھ کہا نہیں اور ندوی صاحب نے اسے وسیلۂ طنز بنا دیا۔ ندوی صاحب کا یہ طنزیہ انداز اکثر اوقات ان کے شاگردوں اور دوستوں کے لئے سوہانِ روح بنتا، یہاں تک کہ اس کی وجہ سے وہ اپنے طلبا اور احباب میں غیر مقبول رہے لیکن اکثر اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ اُن کی ظریفانہ طبیعت نے ان کے ان طنزیہ نشتروں کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی پیدا کر دیا۔ اپنی اس ظریفانہ طبیعت کی وجہ سے وہ اکثر اپنے شاگردوں سے مزاحیہ مضامین لکھنے کی فرمائش بھی کرتے۔ کالج کی ملازمت کے دوران میں اکثر انھوں نے طلبا کو مضمون نویسی کے لئے مزاحیہ مضامین لکھنے کے لئے ہی عنوانات تجویز کئے یہی نہیں بلکہ راقم سے ایم۔اے کی تعلیم کے دوران میں مزاحیہ مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی اور مزاحیہ مضمون کیلئے معذرت پر ندوی صاحب نے کہا تھا "بیٹا رونا تو سب کو آتا ہے ہنسنا سیکھو" اور عجیب اتفاق ہے کہ ندوی صاحب کے انتقال سے تقریباً پندرہ بیس روز قبل جب بمبئی یونیورسٹی میں میری اور حامد اللہ ندوی صاحب کی ملاقات ندوی صاحب سے ہوئی تو انھوں نے اس موقع پر پروفیسر ڈی این مارشل (لائبریرین بمبئی یونیورسٹی) سے مطالعہ کے لئے کتاب کی درخواست کی تھی۔ جس پر انھوں نے فلسفہ پر وہ کتاب تجویز کی اور کہا کہ اُسے وہ جلد بھجوا دیں گے۔ ندوی صاحب نے فوراً مارشل صاحب کو منع کیا اور کہا میرے لیے کوئی مزاحیہ کتاب بھیجو تاکہ وہ میرے لئے تفریح کا باعث بنے تو دراصل کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ندوی صاحب نرے خشک مولوی عالم یا پروفیسر نہ تھے بلکہ ان کی زندگی رعنائی خیال سے عبارت تھی وہ نہ صرف طنز اور مزاح سے کام لیتے تھے بلکہ خود تفریحی ادب کا بہت شوق سے مطالعہ بھی کرتے تھے، یہاں تک کہ "جاسوسی" اور "رومانی" ناول تک بھی وہ دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ ندوی صاحب کی

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

محمد ایوب واقف

ندوی صاحب! چند یادیں

شمع کی طرح جئیں بزم گہہ عالم میں　　　خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

رات کے ۹ بج چکے ہیں۔ دار المصنفین کی گولڈن جوبلی کا پہلا اجلاس شروع ہونے والا ہے۔ اسٹیج پر ہندوستان کے موجودہ صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب رونق افروز ہیں ان کے دائیں طرف بیگم بھوپال محترمہ ساجدہ صاحبہ زینتِ محفل بنی بیٹھی ہیں، ڈاکٹر ذاکر صاحب کے بائیں ڈاکٹر سید محمود صاحب تشریف فرما ہیں۔ اسٹیج پر متحدہ عرب کے دو سفیر بھی نظر آرہے ہیں نیچے پہلی صف میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر افضل اقبال، ساہتیہ اکیڈمی کے صدر مالک رام، جامعہ ملیہ یونیورسٹی کے لائق وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب، شبیر حسن خاں غوری، قومی آواز لکھنؤ کے اڈیٹر حیات اللہ انصاری، کل ہند مسلم مجلس مشاورت شاخ اترپردیش کے صدر عبدالجلیل فریدی، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم ابوالحسن علی میاں ندوی، رشید صدیقی اور جگن ناتھ آزاد وغیرہ بیٹھے ہیں۔ دوسری صف میں بھی تقریباً اسی طرح کے لوگ ہیں اسی صف میں میں بھی اپنے چند ملاقاتیوں کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ مہمانوں کا پنڈال میں داخل ہونے کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اچانک میری نظر سامنے سے آتے ہوئے ایک بزرگ پر پڑی جنکی عمر کوئی ۶۴ یا ۶۵ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ قد لمبا، چہرہ گندمی، مونچھیں ترشی، داڑھی صاف، سر پر لہرائے ہوئے سفید ریشمی بال، لانگ کوٹ اور سفید پائجامے میں ملبوس شکل صورت سے ادیب ہونے کا گمان گذرتا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا میں نے اپنے بازو میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے دریافت کیا "کیوں بھئی آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کون صاحب ہیں جو سامنے سے آرہے ہیں؟ انھوں نے متعجب ہو کر کہا "حیرت ہے کہ آپ اردو سے دلچسپی رکھنے کے باوجود اتنی عظیم شخصیت کو نہیں جانتے" میں نے کہا "جناب صورت سے آشنا تو کم ہی لوگ ہوتے ہیں ہاں نام سے ناواقف ہونے کی صورت میں آپ تعجب کر سکتے ہیں" پھر انھوں نے کہا "یہ سید نجیب اشرف ندوی صاحب ہیں" اچھا اچھا تو یہی وہ شخصیت ہے جس نے ۲۵ سال کی عمر میں مقدمہ رقعات عالمگیر جیسی تاریخی کتاب لکھی تھی اور جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ سر جادو ناتھ سرکار جیسے مورخ نے جسے ماہر عالمگیریات سمجھا جاتا ہے دل کھول کر اس کی تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ اورنگ زیبؒ کی شخصیت اور فن پر یوں تو بہت سے مورخین نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے لیکن نجیب اشرف ندوی کی کتاب "رقعات عالمگیر" اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے ان سب میں اہم ہے اور اس کے لئے نجیب اشرف قابلِ مبارکباد ہیں۔ اس زمانے میں مقدمہ رقعات عالمگیر کے علاوہ ان کے بعض تراجم جو انھوں نے انگریزی سے اردو

گئے تھے اور چند تحقیقی و تنقیدی مضامین "معارف" اور ایسے ہی کچھ دوسرے معتبر رسائل کی پرانی فائلوں میں میری نظر سے گذر چکے تھے جو موضوع اور مواد کے اعتبار سے مجھے بڑے اہم معلوم ہوئے۔ اس طرح ان کی بھرپور شخصیت کا میں پہلے ہی قائل تھا لیکن صورت سے آشنا ہونے کا یہ پہلا اتفاق تھا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ ندوی صاحب اپنی تحریروں میں جتنے خوبصورت اور جاذبِ توجہ نظر آتے ہیں۔ اتنے ہی شکل و صورت میں بھی ہیں۔ اسی اثنا میں کوئی ایک بجے جلسے کی کارروائی اختتام کو پہنچی۔ دارالمصنفین کے جن مہمانوں کی میزبانی میرے سپرد تھی انھیں ان کی جائے قیام پر چھوڑ کر میں بھی اپنے کمرے پر چلا گیا۔ رات ہی میں میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ کل کسی نہ کسی طرح کوئی صورت نکال کر ندوی صاحب سے ملوں گا۔ علی الصباح میں دارالمصنفین گیا۔ ساڑھے سات بجے تک ناشتہ وغیرہ کر کرا کے ہم لوگ بے فکر ہو گئے تھے۔ اعلان کے مطابق دن کا پہلا اجلاس ساڑھے آٹھ بجے شروع ہونے والا تھا۔ درمیان میں تقریباً آدھ گھنٹے کی فرصت تھی میں نے سوچا کہ ندوی صاحب سے ملنے کا اس سے اچھا موقع پھر شاید ہی ملے اس لئے کہ وہ یہاں صرف دو ایک روز کے لئے ہیں پتہ چلایا تو معلوم ہوا کہ قبلہ دارالمصنفین کی لائبریری میں موجود ہیں۔ خوف تو مجھ پر طاری تھا کہ ایک ایسے جید عالم سے ملاقات کرنے جاؤں بھی تو کیسے ان کے سامنے میرے منھ سے بات کیسے نکلے گی اگر انھوں نے کچھ پوچھا تو اس کا جواب کیسے دے پاؤں گا لیکن نہ جانے اس وقت کہاں سے میرے دل میں اتنی ہمت پیدا ہو گئی تھی کہ میں بغیر کسی کو ساتھ لئے ان کے پاس اکیلا پہنچ گیا۔ ان کے پاس دوسرے چند لوگ اس وقت بیٹھے تھے وہ ان سے باتیں کرنے میں مصروف تھے میں چپ چاپ ایک طرف کھڑا ہو گیا ابھی چند منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ وہ خود پوچھ بیٹھے "آپ کسی کام سے آئے ہیں؟" "جی ہاں۔ آپ ہی سے ملنے کا اشتیاق تھا" میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ اتنا کہنا تھا کہ ندوی صاحب فوراً کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اس سے پہلے کہ میں اپنا ہاتھ مصافحہ کیلئے بڑھاتا انھوں نے جھٹ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایسا سن رسیدہ انسان جس کے اعضائے رئیسہ کمزور ہو چکے ہوں چلنے کی زیادہ سکت باقی نہ ہو اپنے فعل میں کس قدر تیز اور اپنے عمل میں کس قدر گرم ہے۔ پھر ندوی صاحب نے مجھے سامنے کی کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا میں نے حکم کی تکمیل کی۔ اب انھوں نے یکے بعد دیگرے سوالات کرنا شروع کر دیئے۔ "آپ کا اسم شریف؟" "حضور مجھے محمد ایوب واقف کہتے ہیں" "اچھا تو شاعر بھی ہیں کوئی تازہ غزل تو نہیں ہو گئی ہے جسے ہم لوگوں کو سنانے آ گئے؟" "جی نہیں میں صرف آپ سے نیاز حاصل کرنے آیا ہوں" "کہاں کے رہنے والے ہیں؟" "اسی اعظم گڈھ ضلع کی تحصیل پھولپور میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے پورہ نورم بس میں وہاں کا رہنے والا ہوں" "کیا شغل ہے؟" "میں شبلی کالج میں بی۔اے کا طالب علم ہوں" جب انھوں نے یہ سنا کہ میں طالب علم ہوں تو انھیں انتہائی مسرت ہوئی ان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی انھوں نے بتایا کہ میری آدھی سے زیادہ عمر استاد کی حیثیت سے گذری ہے اور آج بھی میں ایک معلم ہی ہوں اور میری زندگی کا سرمایہ ذہین طلباء ہیں جن پر میں فخر کرتا ہوں ان سے ملکر ان کے بیچ رہکر خوشی محسوس کرتا ہوں" ہمارا سلسلۂ گفتگو ابھی جاری [illegible] ندوی صاحب

شاید کچھ جلدی میں تھے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "قسمت کبھی بمبئی لائے تو اس حقیر کو بھی خدمت کا موقع دیجیے گا"۔ میں نے کہا خواہش کہ میری زندگی میں ایسا کوئی وقت آتا کہ میں آپ کی رہائش گاہ پر بھی آپ سے نیاز حاصل کرتا۔ پھر ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے لیکن ان کی ہمہ گیر شخصیت جو سراپا خلوص محبت اور انسانیت تھی ہمیشہ کیلئے میرے دل میں گھر کر گئی۔

میں نے ۱۹۶۵ء کے وسط میں بی اے کا امتحان پاس کر لیا۔ ایم اے کرنے کے لئے میں نے اپنے گھر والوں سے مشورہ کر کے یہ طے کر لیا کہ بمبئی جا کر کسی کالج میں داخلہ لے لوں یہ فیصلہ میں نے اس مقصد کے تحت کیا کہ بمبئی میں ندوی صاحب کی شخصیت سے براہِ راست استفادہ کرنے کا موقع ملے گا۔ چنانچہ مئی ۱۹۶۵ء میں میں بمبئی آ گیا۔ بمبئی پہنچنے کے دو روز بعد میں ندوی صاحب سے ملنے انجمن اسلام گیا۔ غالباً یہ چار بجے شام کا وقت تھا آتے وقت دارالمصنفین کے ایک [illegible] بزرگ، یحییٰ اعظمی صاحب نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کے نام مجھے خطوط لکھ دیئے تھے۔ ان میں سے ایک خط ان کے ایک عزیز شعیب اعظمی کے نام تھا جو ان دنوں انجمن اسلام ہائی اسکول میں معلم تھے۔ میں ان سے ملا اور ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے ندوی صاحب کے دفتر تک چھوڑ دیں۔ ندوی صاحب کا دفتر اس وقت انجمن اسلام کی پرانی عمارت کی تیسری منزل پر تھا شعیب صاحب اپنے ہمراہ ہی وہاں تک لے کر گئے۔ میں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ اگرچہ ندوی صاحب سے ایک بار ملاقات ہو چکی ہے لیکن ضروری نہیں کہ انھیں یاد بھی ہو اس لئے کہ بڑے لوگ ایسی چھوٹی چھوٹی ملاقاتیں عموماً بھول جایا کرتے ہیں۔ لیکن ندوی صاحب سے دوسری بار جب میں ملا تو میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ میں ان کے کمرے میں جیوں ہی داخل ہوا اور سوچا کہ اپنے بارے میں کچھ کہوں اور پچھلی ملاقات کی بھی یاد دلاؤں وہ بول پڑے "کہئے صاحبزادے آخر آ ہی گئے بمبئی۔ کیا حال ہے۔ دارالمصنفین کا؟ صباح الدین صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟ شاہ صاحب کیسے ہیں؟ اس وقت تمہارے یہاں کسانوں کی کون سی فصل تیار ہو گئی ہو گی؟ کسان کو گھاٹا ہوگا یا نفع؟ ؟ بھئی اتر پردیش میں تو دھاندلی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے پتہ نہیں تم لوگ کیسے رہتے ہو۔ وغیرہ وغیرہ باتیں پوچھتے چلے گئے۔ میری غلط فہمی دور ہو گئی جیسا کہ میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ وہ پرانی ملاقات کو بھول گئے ہوں گے اور اس بات کا بھی احساس ہوا کہ ندوی صاحب ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنھیں علم کا غرور ہوتا ہے اور جو آسمان کے تاروں پر نظر رکھنے کے عادی ہوتے ہیں زمین کے ذروں کی اہمیت جن کی نظر میں کچھ نہیں ہوتی بلکہ وہ ان مستثنیٰ اشخاص میں سے ہیں جو عالمانہ شان کے ساتھ ساتھ انکساری بھی رکھتے ہیں۔ ندوی صاحب ہر انسان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ چھوٹے اور بڑے کی تمیز جانتے ہی نہیں تھے۔ ان کے ملنے والوں میں ہر فرقے اور ہر جماعت سے تعلق رکھنے والے ہوتے تھے۔ [illegible] ان کے خلوص اور محبت کی یک رنگی سے سب یکساں طور پر متاثر ہوتے تھے یہ ان کی شخصیت کی ہمہ گیری کی [illegible] دلیل ہے۔ ہاں تو میں ان کے دفتر میں ان سے اپنی دوسری ملاقات کا ذکر کر رہا تھا۔

ندوی صاحب سے بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ وہ چائے بغیر دودھ کی پیتے تھے جب کوئی
ی کی ملاقات کو آجاتا تو دودھ اور شکر منگوا کر چائے بنواتے۔ چنانچہ اس روز بھی انھوں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے
صاحب آپ کیوں اتنی زیادہ تکلیف اٹھا رہے ہیں تو فرمایا "تکلیف، تو اس وقت ہوگی جب آپ
یہاں سے چلے جائیں" شام کے ۶ بج چکے تھے میں نے ان سے اجازت مانگی تو فرمایا "بس اب میں بھی
گھر پر میرے ساتھ کھاؤ اور تھوڑی دیر باتیں کرو پھر اجازت مل جائیگی" میں نے ان سے دریافت کیا کہ
رہتے کہاں ہیں بمبئی میں تو انھوں نے کہا "رہتا تو ہوں اندھیری میں لیکن آپ جیسے لوگوں کے قدم پڑتے
اجالا ہو جاتا ہے" میں جھینپ گیا دراصل یہ ان کی خاص عادت تھی کہ اپنی حاضر جوابی اور طنز و مزاح سے
ان دوستوں اور شاگردوں کو شرمندہ کر دیا کرتے تھے اور اس میں ان کو بڑا لطف ملتا تھا بعض وقت
ہوتا تھا کہ ان کے شاگرد اور دوست ان سے کترا کر نکل بھی جاتے تھے صرف اسی خوف سے کہ ان کے طنزیہ
انھیں شرمندہ ہونا پڑیگا لیکن ندوی صاحب پر اس کا غلط اثر پڑتا تھا بہرحال اس رات کا کھانا میں نے
ان کے ساتھ کھایا۔ انھوں نے اپنا ذاتی کتب خانہ دکھایا اور کہا کہ ایسی ایسی نادر اور کمیاب کتابیں
اس لئے جمع کر رکھی ہیں کہ طلبا یہاں آئیں ان کا مطالعہ کریں اور خود میرے ذہن و دماغ میں جو کچھ ہے
یں ورنہ کل کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں گا تو میرے جسم کے ساتھ ساتھ وہ سرمایہ بھی سپرد خاک کر دیا
واقف میاں ایسا لگتا ہے جیسے جوں جوں میرے مرنے کا دن قریب آتا جا رہا ہے لوگ مجھ سے
ملنا جلنا بھی کم کرتے جا رہے ہیں ان کے چہرے پر ایک طرح کی اداسی و مایوسی سی چھا گئی تھی میری
بھرائیں میں نے موضوع بدل دینا ہی مناسب سمجھا ان کی رہائش گاہ سے متعلق میں نے کہا۔ صاحب سنا
رہنے کی سب سے بڑی دشواری ہوتی ہے لیکن خدا کا فضل و کرم ہے کہ آپ نے رہنے کے لئے بڑا
بنا لیا ہے۔ اس پر انھوں نے کہا "ہاں آرام دہ کبھی تھا لیکن اب تو میری تنہائیوں نے اسے بڑی ڈراؤنی
بنا دی ہے۔ اس گھر میں میری ساتھی صرف کتابیں ہیں لیکن کتابیں کب تک پڑھوں آنکھیں بھی تو
دیتی ہیں یہ موضوع بھی اس وقت کے لئے مجھے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوا پھر میں نے بمبئی میں
اردو ترقی سے متعلق باتیں شروع کر دیں۔

جوں جوں دن گزرتے گئے ندوی صاحب سے میرے تعلقات وسیع تر ہوتے گئے میں نے انھیں
کی جگہ "بابا" کہنا شروع کیا اور انھوں نے بھی "ایوب" یا "واقف" کی جگہ "بیٹے" کہنا شروع کیا۔ ایک
طرح وہ ہر وقت میری کھوج خبر لیتے رہے۔ میرے مسائل کو سلجھانے کی حتی المقدور کوشش کرتے رہے
والد سے ان کے تعلقات ایسے ہوتے تھے جیسے ایک باپ اور بیٹے کے ندوی صاحب کے ساتھ

میں نے اپنے چند سال گذارے اور نجوسے جہاں تک ہوسکا ان سے قریب ہوکر میں نے ان کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ اُن کی علمی وادبی خوبیوں کے علاوہ مجھے ان کی دوسری جس خوبی نے متاثر کیا وہ ان کی طبیعت کی شوخی و رنگینی تھی اور اگر قارئین اسے میری غلط بیانی نہ سمجھیں اور نہ ہی ندوی صاحب کا عیب تو میں ان کی طبیعت کی شوخی و رنگینی کو دوسرے لفظوں میں ان کی عاشق مزاجی کہوں جن اصحاب کو ندوی صاحب سے قریب رہنے کا موقع ملا ہوگا وہ اس خیال سے اتفاق کریں گے کبھی کبھی باتوں ہی باتوں میں وہ اس طرح کی باتیں کر جاتے تھے جو صرف نوجوانوں اور وہ بھی رومانس پسند نوجوانوں کے منہ سے سنی جاسکتی ہیں۔ ایک بار میں ان کے دفتر میں بیٹھا تھا وہ خطوط لکھنے میں مصروف تھے کام کے ختم پر فرمایا "واقف! تم ایک دن میں کتنے شعر کہہ لیتے ہو" میں نے کہا "میں نے شاعری بالکل کم کردی ہے سارا زور مضمون نویسی پر صرف کر رہا ہوں" اس پر انھوں نے جواب دیا "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ محبوبہ نے ساتھ چھوڑ دیا ہے اور پھر مسکرانے لگے" ایسی تھی ندوی صاحب کی باغ و بہار شخصیت سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی کن کن باتوں کا ذکر کروں اور کن کن باتوں کو نظر انداز کردوں مجھے تو ان کی ہر بات پیاری لگتی تھی۔

ندوی صاحب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ خالص علمی وادبی تھا اور اسی ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ان کا ذوق و شعور یہ وان چڑھا۔ سید سلیمان ندوی جیسے جید عالم کی زیر نگرانی مشق تحریر کی۔ ان کے گراں قدر مشوروں سے استفادہ کیا نتیجہ یہ ہوا کہ علمی وادبی دنیا میں بہت جلد شہرت حاصل کرلی۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین برصغیر ہند و پاک کے بیشتر رسائل کی زینت بنے۔ اردو کے کلاسیکل ادب پر وہ بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ افسوس کہ ایسی عظیم المرتبت شخصیت ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہوگئی۔ ؏

اب کہاں دنیا میں ایسی ہستیاں!

لیکن مرنے والا اپنا جوش و خروش، جذبۂ ایثار و قربانی، سعی و عمل، خوش نظری و خوش فکری اور نیکی و شرافت ہمیں ورثے میں چھوڑ گیا ہے۔ اگر ہم نے ان کو اپنایا اور ان پر عمل کیا تو یقیناً ہمیں اپنے اغراض و مقاصد میں کامیابی حاصل ہوگی۔ مرحوم انجمن ساز تو نہ تھے لیکن ان کی ذات کسی انجمن سے کم نہ تھی۔ ان کے افکار و کردار میں ایک عالمانہ و مدبرانہ شان تھی جس سے اس دور کا علمی وقار قائم تھا۔ وہ بمبئی آنے کے بعد اگرچہ اپنا تصنیفی تالیفی کام مستقل طور پر جاری نہ رکھ سکے تھے لیکن یہی کیا کم تھا کہ وہ بزم رفتہ کی یادگار تھے اور بمبئی جیسے ترقی یافتہ شہر میں بابائے اردو کا مرتبہ رکھتے تھے۔ اپنے کردار و گفتار کے عمل سے ہر محفل میں جان محفل کی حیثیت رکھتے تھے وہ یہاں کے مشہور علمی و تحقیقی رسالہ "نوائے ادب" کے مدیر تھے۔ اپنے دور ادارت میں وہ اعلیٰ تحقیقی و تنقیدی مضامین سے نوائے ادب کو مزین کرتے رہے کبھی کبھار وہ خود بھی تحقیقی موضوعات پر اس رسالہ میں لکھتے رہے۔ "نوائے ادب" کے ذریعہ انھوں نے لکھنے والوں کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا کی۔ دراصل اردو زبان و ادب پر ان کا یہ بہت بڑا احسان ہے

جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ندوی صاحب ان چند بزرگوں میں تھے جو چپ چاپ اردو کی خدمت کرتے رہے مدح و ستائش کی انھوں نے کبھی پرواہ نہیں کی اور اگر ان کا کوئی مداح ان کے سامنے ان کی تعریف کرتا یا ان کے کاموں کو سراہتا تو وہ خفگی کا اظہار کرتے۔ انتقال سے تقریباً ۱۵ روز قبل علی جواد زیدی ان سے ملنے آئے۔ ندوی صاحب مولانا رزاق قریشی صاحب کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ راقم الحروف بھی وہاں موجود تھا اثنائے گفتگو میں علی جواد زیدی صاحب نے ندوی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا "صاحب میں سوچتا ہوں کہ آپ پر بھی کچھ لکھوں" ندوی صاحب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے کہنے لگے "چلو میاں واقف! یہ لوگ بیٹھنے نہ دیں گے"۔ ندوی صاحب کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ وہ سیاست و پارٹی بندی سے ہمیشہ دور رہتے تھے اور نہ ہی وہ ادب کو سیاست و پارٹی بندی سے قریب لانے کے حق میں تھے ان کے نزدیک ادب کو سیاست کا ہتھکنڈہ بنانا ادب کی توہین ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ سیاسی مفاد میں لکھی جانے والی چیزیں سیاسی نقطۂ نظر سے اہم ہو سکتی ہیں لیکن ادبی نقطۂ نگاہ سے انکی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہو سکتی ندوی صاحب حقیقت پسند تھے اور ہر بات کو صاف صاف اور واضح طور پر کہہ جاتے تھے جو بعض اوقات ان کیلئے بڑی مضر ثابت ہوتی تھیں جسے وہ خود بھی محسوس کرتے تھے لیکن ایک بیدار مغز اور روشن ضمیر رکھنے والا انسان مخالفت کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ ہزاروں میں اکیلا ہوتا ہے لیکن آواز بلند کرنے سے گھبراتا نہیں۔ ندوی صاحب نے نوجوانوں سے ہمیشہ ہمدردی برتی ان کی ہمت افزائی کی اس لئے کہ انھیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ہمارے ملک و قوم اور زبان و ادب کا مستقبل صرف انھیں نوجوانوں کی ذات پر منحصر ہے اس لئے ان کے ذہن کی تربیت میں کسی طرح کا کھوٹ نہیں ہونا چاہیئے اور شاید یہی وجہ تھی کہ ندوی صاحب نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ نوجوانوں کے لئے وقف کر دیا تھا اور اقبال کے الفاظ میں وہ ہمیشہ یہی دعا کرتے تھے کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے!

(بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر ۳ سے آگے) طبیعت اور ذوق و شوق کی یہ متضاد کیفیتیں در اصل ان کی ذہنی کشمکش کا نتیجہ تھیں جو انھیں اپنے زمانے، حالات اور ماحول سے ترکہ میں ملی تھی۔ زندگی بھی انتشار، دکھ، درد سے بھری ہوئی تھی، اس دکھ، درد اور بے رنگی زندگی سے پیدا ہونے والی تکالیف سے نبرد آزما ہونے کے لئے کبھی طنز و مزاح سے کام لیا کبھی فلسفہ، تاریخ تو کبھی تفریحی ادب کا سہارا لیا۔ کبھی شرقیت اور مذہب کا سہارا لیکر اپنی روح کی تسکین کا سامان فراہم کرتے رہے اور کبھی مغربی تہذیب سے تعلق پیدا کر کے زمانہ کی موجودہ روش سے مفاہمت کرنے کی کوشش کرتے۔ ابھی جبکہ میں ندوی صاحب کی زندگی کی یہ مختصر کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں، ایسے لگتا ہے کہ ندوی صاحب میرے سامنے بیٹھے مسکرا رہے ہیں اور "گڈ بائی" کہتے ہوئے مجھے دیکھ کر کہہ رہے ہوں

میری حیات کا افسانہ دیکھنے والے — نہیں کہ جب یہ قصہ پڑھا نہیں جاتا

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

تقریب بہر ملاقات

میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں ریسرچ کر رہا تھا۔ اتفاق سے ایک بار مجھے بمبئی جانا پڑا
بڑا خوشگوار و پر کیف تھا۔ مجھے پروفیسر نجیب اشرف ندوی سے تعارف حاصل نہ تھا۔ ہاں نوائے ادب
بے شک ان کو اچھی طرح جانتا تھا ان کے نام و کام سے بھی واقف تھا مگر شرف ملاقات اس وقت تک
ندوہ کے تعلق سے دل ہی دل میں ایک تعلق ضرور محسوس کرتا تھا میں بمبئی میں اپنے ایک ندوی دو
ٹھہرا۔ اتفاق دیکھئے ایک اور دوست قاہرہ کیلئے پا بہ رکاب تھے اور بالکل سمندر کے کنارے مقیم تھے
سمندر کی لہریں چاندنی سے تمنا و تماشا میں مشغول تھیں مد و جزر کا عجب عالم تھا نور کی ایک چادر تھی جس کا جلوہ
ہم تین ندوہ کے ساتھی جمع ہوئے تو ذکر پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا نکلا۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ بڑ
بڑے اثرات ہیں دوسرے نے کہا کہ وہ بہت ماڈرن ہیں پھر ان کے حسن اخلاق کی تعریف کی۔ دو
میں نے پروفیسر ندوی سے ملاقات کیلئے پہلے سے دل میں سوچ لیا تھا۔

دراصل میں بمبئی یونیورسٹی میں ایک انٹرویو کیلئے گیا تھا جس میں خود پروفیسر سید نجیب
بحیثیت ایک رکن کے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ہم تین چار امیدوار پہونچ گئے ماہرین کرام بھی آگئے مگر انٹرو
تھا۔ دیکھا تو وقت مقررہ پر پروفیسر عبدالمعید خاں پروفیسر سید احمد اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی
بڑھے ملاقات ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ میرا نام احتشام ہے بولے جی ہاں میں آپ سے واقف ہوں
جب انٹرویو کی تاریخ ملتوی ہوگئی تو پھر ہم لوگوں سے بیٹھنے اور انٹرویو دینے کو کیوں کہا گیا ہے اس
انھوں نے نہایت لطیف و دلچسپ دیا۔ ہنس کر فرمایا "تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے اس بنا پر منا
کہ اس مضمون کا عنوان یہی رکھا جائے۔ جب یہ تقریب بہر ملاقات ختم ہوئی تو میرے پاس آکر فرمایا کہ آپ
میں دوسرے دن صبح انجمن اسلام کی شاندار عمارت میں پہونچا وہاں معلوم ہوا کہ ابھی
ڈائرکٹر کے آفس کے قریب ایک کمرہ تھا وہاں داخل ہوا دیکھا تو کتابیں اور رسالوں کے فائل بڑے
رکھے تھے وہاں پہلے جناب عبدالرزاق قریشی سے ملاقات ہوئی پھر مولانا قاضی اطہر مبارک پوری
حاصل ہوا۔ ذرا دیر بعد معلوم ہوا کہ پروفیسر ندوی صاحب آگئے ہیں میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔

میں نے بھی موقع کو غنیمت جانا اور دل بھر کر گفتگو کی۔ دل چاہتا ہے کہ جو اہم باتیں ان سے ہوئیں ان کو ناظرین کے سامنے پیش کروں۔

دیکھا تو وہ کرسی پر بیٹھے تھے دھاری دار صوفیانہ رنگ کی بوشرٹ زیب تن تھی۔ گورا چٹا رنگ، لمبا قد، چہرہ پر ضعیفی کے نشانات کے ساتھ مسکراہٹ و مسرت کے آثار نمایاں تھے اپنے قریب کرسی پر بٹھایا بڑے پرتپاک انداز سے ملے اتنی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے کہ جیسے برسوں سے شناسا ہوں۔ فرمایا کہ میں دارالمصنفین میں کافی دن رہا۔ اس زمانہ میں علامہ سید سلیمان ندوی موجود تھے اور مولانا عبدالماجد دریابادی اور فلاں فلاں رہتے تھے ایک بار میں نے ان سے عرض کیا کہ میرے کمرے میں بھی تشریف لائیں۔ بت پرستی کیلئے نہیں مت آئیے گا (اس لئے کہ انھوں نے کچھ تصویریں اپنے کمرے میں چسپاں کر رکھی تھیں)۔ فرمایا کہ مولانا میرے بزرگ ہیں اور میں ان کا احترام کرتا ہوں۔ اسی دوران مکاتیب سلیمان شائع ہوئی تھی ذکر اسی کا تھا میں نے عرض کیا کہ سید صاحب تو آپ کے قریبی عزیز تھے آپ کے پاس بھی خطوط کافی ہوں گے فرمایا ہاں میرے پاس سید صاحب کے اور دوسرے اہل علم بہت سے خطوط کے مجموعے تھے مگر جب نیا مکان بنوایا اور کاغذات پرانے مکان سے نئی رہائش گاہ منتقل ہوئے ملازموں نے اس بکس کے کاغذات ضائع کر دیئے یا جلا ڈالے جس میں یہ ذخیرہ تھا میں نے کہا تو گویا نادانوں نے مدینۃ العلم جلا ڈالا۔

میں نے دوران گفتگو میں کہا کہ آپ نے رقعات عالمگیر کے بعد کوئی کام نہیں کیا۔ انھوں نے فوراً مجھے لغات گجری دی اور فرمایا کہ میں نے بمبئی آنے کے بعد صرف ایک کام کیا ہے یعنی اہل علم و ادب کی ایک جماعت تیار کر رہے ہوں اور بس۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ بھی ایک بڑا کام ہے مگر اس کی توفیق کم لوگوں کو ملتی ہے اور جن کو ملتی ہے تو شاذ و نادر ہی لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

میں نے عرض کیا کہ اب گھر میں کون کون افراد خاندان ہیں فرمایا کہ اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ بچیاں اپنے اپنے گھر ہیں۔ ایک لڑکا امریکہ میں ہے دوسرا بمبئی کے قریب کہیں ملازم ہے میں نے کہا پھر آپ تنہا رہتے ہیں فرمایا جی ہاں۔

میں نے پوچھا کہ آپ علامہ سید سلیمان کے اس تعزیتی جلسے میں تشریف نہیں لائے تھے جو ندوہ میں منعقد ہوا تھا۔ فرمایا کہ میں جنت سے نکالا ہوا انسان ہوں۔

آنے لگا تو کہا کہ یہاں ایک ریسرچ اسکالر ہیں وہ آپ کی مدد کے محتاج ہیں میں نے عرض کیا جو آپ فرمائیں میں حاضر ہوں کہنے لگے آپ فتنۂ دجال سے متعلق جتنا لٹریچر ہو اس کو مع مصنف اور کتاب کے اسماء کے ساتھ مجھے روانہ کر دیجئے۔

میں نے علیگڈھ پہونچ کر مواد جمع کر کے ان کی خدمت میں روانہ کیا مگر وہ ان سے کہیں گم ہو گیا تو مجھکو دوبارہ لکھا "نقشہ دیال پر مواد پھر روانہ کر دیجئے امید کہ نقش اول سے نقش ثانی بہتر ہو گا۔ میں نے حکم کی تعمیل کر دی۔

مجھے اندھیری آنے اور شام کو کھانے کی دعوت دی مگر میں نہ جا سکا۔ دوسرے دن پھر گیا تو کہا کہ ابھی ایک صاحب آئے تھے بالکل آپ ہی جیسے تھے مگر میں نے کہا بہرحال میں تو ابھی آ رہا ہوں۔ اس ملاقات کے بعد برابر خط و کتابت جاری رہی میرے پاس ان کے کئی خطوط محفوظ ہیں۔ ہر خط محبت و خلوص اور ادب و انشا کا آئینہ ہے۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ آپ اپنے کو تنہا نہ سمجھئے آپ ایک اہم علمی برادری کے رکن ہیں غالباً ان کی مراد شبلی اسکول اور ندوۃ العلماء سے تھی۔

حسن اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے جو ان سے ذرا دیر کیلئے بھی ملتا ان کی عظمت و علمیت سے متاثر ہوتا۔ میں بھی ان کے حسن اخلاق، بے تکلفی اور خلوص و تعلق کے جذبات سے متاثر ہوا۔

شبلی اسکول میں بلاشبہ اب بھی اردو ادب پر برصغیر میں کام کرنے والے موجود ہیں مگر خالص اردو میں مولانا عبدالماجد دریا بادی مدظلہ العالی کو مستثنیٰ کر کے اس عظمت کے حامل شاذ و نادر ہی کوئی نظر آتے ہیں۔ پروفیسر اکبرالدین صدیقی صاحب نے اُردو کے بارے میں ان کی اہمیت و عظمت کو بڑے اچھے انداز سے ظاہر کیا ہے کہ بمبئی میں بابائے اُردو بنے ہوئے تھے۔ ان کی وفات سے ہر حلقہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی متاعِ گراں مایہ گم ہو گئی ہے۔ عرب شاعر نے شاید اسی موقع کیلئے کہا تھا کہ ـــ

ما کانَ ھلکہ ھلکَ واحدٍ ولکنہ بنیانُ قومٍ تھدّما

اس کی موت ایک شخص کی موت نہیں بلکہ ایک قوم کی عمارت ڈھ گئی ہے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر ۳۴ سے آگے) یہی لکھا کہ میری صحت ٹھیک نہیں رہتی اس لیے آنا مشکل ہے۔ وہ اس وقت ہم میں موجود نہیں ہیں آپا کے بعد ایک شفیق چچا بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ اب کون نا ہم سے اس محبت اور مہربانی سے بات کرے گا آپا کے بعد ہم نے ان کو اپنے باپ کی جگہ سمجھا لیکن افسوس ان کی محبت بھی زیادہ دن نہیں رہ سکی، وہ بھی ہم سے جدا ہو گئے زمانے کے قانون کی طرح وہ بھی بھلا دیئے جائیں گے لیکن میرے دل میں انکی محبت اور انکا خلوص ہمیشہ باقی رہے گا۔ ہمیشہ میری آنکھوں میں ان کی شکل گھومتی رہے گی اور وہی تصور باقی رہے گا جبکہ میں نے ان کو پہلی بار اسٹیشن پر دیکھا۔ ان سے جو بھی ملے ہیں ان کی شخصیت سے ضرور متاثر ہوئے ہونگے کیونکہ وہ ہر ایک سے بڑے خلوص سے باتیں کرتے تھے اور کسی غلطی کو بھی اس خلوص سے درست کرتے کوئی بھی اس کا برا نہیں مانتا افسوس کہ اردو کا ایک دوست کم ہو گیا۔ اُردو کا ایک اور پریمی دنیا سے جدا ہو گیا۔ اس کے لئے اردو دنیا جتنا بھی رنج کرے کم ہے۔ لیکن ہمارے تو وہ ایک شفیق چچا اور ہمدرد تھے جن کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ موجود رہے گی۔

فرحت ہاشمی[۱]

نجیب اشرف ندوی — میرے چچا

یوں تو دنیا میں کہیں بھی کسی کا انتقال ہو جائے تو دوسرے دن ہی خبر مل جاتی ہے۔ لیکن ندوی صاحب جو بمبئی ہی میں رہتے تھے ان کے انتقال کی خبر ۸ دن بعد مل سکی اور وہ بھی جب رسالہ سب رس آیا تو معلوم ہوا کہ ندوی چچا ہم سے بچھڑ کر بھی کافی دن ہو چکے ہیں۔

ندوی صاحب کا مقام ایک پروفیسر، ادیب، اردو کے پریمی کے لحاظ سے کچھ بھی ہو ہمارے وہ عزیز چچا تھے ابا کے دوستوں میں جس کو ہم نے سب سے قریب سے دیکھا وہ ندوی صاحب ہی تھے یوں تو ابا کے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع تھا جس میں بعض ان کے بہت ہی بے تکلف دوست بھی تھے لیکن ندوی صاحب دوست بھی تھے اور بھائی بھی اس لئے وہ ہم سے اپنی بھتیجیوں کی طرح ہی محبت کرتے تھے۔

ہمیں جب سے یاد ہے اس وقت سے ندوی صاحب کا نام ہمارے گھر میں عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ ابا جب بھی انکا خط آتا تو گھر میں ذکر کرتے کیونکہ ہر خط میں بھابی اور بچیوں کا ذکر رہتا تھا۔ اس طرح ہمارے کان بچپن ہی سے ان کے بارے میں سنتے آئے تھے۔ بھائی جب سے بمبئی گئے انکا ذکر گھر میں اور زیادہ ہونے لگا کیونکہ بھائی کا قیام چند سال ان ہی کے پاس رہا۔

شاید آج سے کوئی دس برس پہلے وہ ہمارے پاس پہلی بار آئے تھے۔ ان کے آنے کا ذکر ہم نے چند روز قبل ہی سنا تھا۔ گھر میں ان کے آنے کی تیاری کی جا رہی تھی اور ہم بچے ان کو دیکھنے کے لئے بے چین تھے وہ چونکہ حقہ بھی پیتے تھے اس لئے ان کے لئے ہمارے ایک رشتہ دار کے پاس سے حقہ لایا گیا تھا۔ حقہ بھی ہمارے لئے نئی چیز تھی اور ہم حقہ کس طرح پیتے ہیں دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔ آخر وہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور ہم ابا کے ساتھ انہیں لانے کے لئے اسٹیشن گئے۔ جس وقت میں نے انہیں فسٹ کلاس سے اترتے ہوئے دیکھا تو اسی لمحے مجھ پر ان کی بارعب شخصیت کا اثر ہو گیا۔ سوٹ پہنے ہوئے وہ ایک بڑے آفیسر لگ رہے تھے اور میں ان کی گرجدار آواز سے ڈر رہی تھی۔ لیکن انھوں نے بڑی شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا اور پوچھا یہ کونسی بیٹی ہے۔ ان کی دھیمی اور نرم آواز نے پہلی بار میرے دل میں ان کے لئے بے پناہ محبت محسوس کی۔ یہ محبت جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور گہری ہوتی گئی۔ حالانکہ وہ صرف دو یا تین دن ہی ہمارے پاس ٹھہرے لیکن اس عرصہ میں انھوں نے اپنی محبت اور

۱۔ نصیر الدین ہاشمی کی صاحبزادی

خلوص کا ایک گہرا اثر ہمارے دلوں میں پیدا کر دیا۔ ان تین دنوں میں ہم نے اُنہیں قریب سے دیکھا۔ وہ دیر تک پڑھتے رہتے اور صبح دیر سے اُٹھتے اور بڑی پینے پھر ناشتہ کے بعد وہ دن بھر باہر رہتے اور شام میں لوٹ آتے۔ اس طرح وہ ہمارے ساتھ صرف چند گھنٹے گزارتے۔ رات میں وہ پڑھتے ہوئے حقہ بھی پیتے تھے اُنھیں آگ لاکر دیتی اور حقہ سلگانے میں مدد دیتی تھی۔ اس وقت ان سے چند منٹ بات چیت ہوتی لیکن ان سے جو باتیں ہوئیں وہ ایسا نقش تھیں کہ تمام عمر یاد رہیں گی۔

دوسری بار وہ پھر آئے تھے اس وقت وہ ہمارے لیے نئے نہ تھے ان کے آنے کی خبر ہمارے خوشی کی تھی۔ اس بار وہ ہمارے لئے کئی تحفے بھی لائے تھے ۱۵ سال کے عرصے میں وہ کئی بار آئے وہ دو دن سے زیادہ نہیں ٹھہرتے تھے لیکن اسی عرصہ میں ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ہماری اُردو میں بہت دکنی الفاظ ایسے شامل تھے جو کہ اُردو میں اب مستعمل نہ تھے لیکن ہم ان الفاظ کو روانی کے ساتھ بول لیتے تھے۔ ندوی صاحب نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا۔ یہ لفظ اس طریقے سے کہا جاتا ہے اور اس طریقے سے کہو غلط ہوگا وغیرہ۔ حالانکہ ابا بھی ایک بڑے ادیب تھے لیکن انھوں نے کبھی ہماری بول چال کی زبان پر دی۔ لیکن ندوی صاحب کے چند دنوں کے ساتھ نے ہماری زبان سے بہت سارے ایسے الفاظ کم کر دیئے جو مستعمل نہ تھے۔ اس وقت سے مجھ میں یہ احساس پیدا ہوا کہ کونسے ایسے الفاظ ہماری بول چال کی زبان میں ہو جو کہ ادبی زبان میں غلط سمجھے جاتے ہیں۔

ساتھ ہی ہمیں پہلی بار کسی نئے آدمی کے ساتھ کھانا کھانے کا بھی اتفاق ہوا۔ ابا کے جو دوست ان کے ساتھ ہم کبھی کھانے میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ابا اور ندوی صاحب دونوں ہی کم خوراک تھے لیکن ان کی ادبی گفتگو سنتے ہوئے کھانا کھانے میں ہمیں بڑا لطف آتا تھا۔ نہ صرف ہم نے بہت کچھ علمی قابلیت بڑھائی بلکہ ڈر و خوف جو کہ نئے آدمی کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے محسوس ہوتا ہے ہمارے دلوں سے نکل گیا۔ وہ جتنے رہتے کئی لوگ ان سے ملنے کے لئے آتے اس طرح نئے لوگوں سے ملنے کا بھی ہمیں موقعہ ملا۔ اس وقت سے دل سے گھبراہٹ اور ڈر نکل گیا۔ دو تین دن ہی کے عرصہ میں جو گڑبڑ اور ہنگامہ رہتا وہ ہی دن میری زندگی کے بہترین دن رہتے۔

ایک بار ابا بغداد میں تھے وہ حیدر آباد آئے تو کہیں اور ٹھیرے لیکن آتے ہی ہم سے ملنے آئے تھے۔ اس سے ان کے خلوص اور محبت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد جب بھی وہ بمبئی سے آتے ہمارے پاس قیام کرتے تھے۔ اس طرح ہم ہر بار ان سے قریب تر ہو گئے۔

ابا کے انتقال کے بعد سب سے پہلے ان ہی کا تار آیا پھر ان کا خط ہمارے دکھی دل کے لئے

ین کر آیا۔ وہ بمبئی میں رہتے ہوئے ہمارے غم میں برابر کے شریک تھے وہ اپنے بھائی ہاشمی کی جدائی سے اتنے رنجیدہ تھے جتنے کہ ہم اپنے والد سے جدا ہو کر تھے۔ اس کے بعد جب وہ حیدرآباد آئے تو پہلے گھر نہیں آئے۔ بادپا کی درگاہ کو گئے اور وہاں ابا کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد گھر آئے اور جس خلوص اور محبت سے انھوں نے ہماری دل جوئی کی اس سے ان کی محبت اور رنج کا پتہ چل سکتا تھا وہ کہتے تھے کہ میرا بھائی تو مجھ کو چھوڑ کر چلا گیا لیکن جب تک میں زندہ ہوں اپنے بچوں کو نہیں چھوڑونگا۔ یہی وجہ ہے کہ پھر ابا کے انتقال کے بعد ہمارے ہی پاس ٹھیرے۔

آخری بار جب وہ آئے تو ایک ماہ ہمارے ہی پاس قیام کیا۔ اس وقت نہ صرف وہ جسمانی طور کمزور ہو گئے تھے بلکہ ذہنی طور پر بھی وہ رنجیدہ تھے بیوی کا انتقال اور بچوں کے بیرون ملک کو چلے جانے سے بڑے رنجیدہ تھے۔ شائد انھیں یقین تھا کہ وہ بھی زیادہ دن نہیں رہ سکیں گے اس لئے وہ پہلے سے زندہ دل نہیں تھے بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی اور تھے۔ والدین اپنے بچوں کے مستقبل کے بڑے سہانے سپنے دیکھتے لیکن جب بچے ان کے خوابوں کو بکھیر دیتے ہیں تو ان کو ناقابل برداشت صدمہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پریشانیوں نے انہیں اتنا کم گو بنا دیا تھا کہ وہ زیادہ باتیں بھی نہیں کرتے تھے۔ کوئی ملنے کے لئے آتا تو اس سے مل لیتے تھے پھر یا تو پڑھتے رہتے یا پھر بے حیا بچہ سے انگریزی کا مقالہ پڑھا کر سنتے اور اکثر سنتے سنتے ہی سو جاتے انسان کی فطرت کبھی بدل نہیں سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ذہنی پریشانیوں کے باوجود ہر ایک سے خلوص اور محبت سے بات کرتے کوئی پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ کے بارے میں دریافت کرتا تو اس کو ایک پروفیسر کی طرح رائے دیتے کوئی دوستانہ مشورہ دریافت کرتا تو اس کو مشورہ دیتے۔ ساتھ ہی بچوں سے بھی پیار سے باتیں کر لیتے۔ ایک ماہ کے قیام کے بعد جب وہ واپس گئے تو انھوں نے ہم سب کو اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ایک ماہ بچوں کے ساتھ رہنے کے بعد پھر بمبئی میں وہی تنہائی ہوگی اور پھر پریشان ہو جائیں گے۔ بھائی چونکہ کافی عرصہ تک ان کے ساتھ رہ چکے تھے اس لئے وہ بھائی کو بے حد چاہتے تھے۔ شائد ان کو پھر نہ آنے کا یقین تھا اس لئے وہ جاتے وقت سب سے مل کر گئے۔

انتقال سے ایک ماہ قبل میں نے ان کو خط لکھا کہ میں تو بمبئی نہیں آ سکی لیکن مصباح اور بھائی آپ سے ملنے آ رہے ہیں۔ مصباح لندن جا رہے ہیں۔ امید کہ آپ سے ملاقات ہوگی۔ جلد ہی ان کے خط کا جواب آ گیا انھوں نے مجھے لکھا کہ مصباح کے لندن تعلیم کے لئے جانے سے انہیں بڑی مسرت ہوئی۔ جب بھائی اور مصباح ان سے ملنے گئے تو انھوں نے بڑے خلوص سے شکایت کی کہ ان کے موجود ہونے کے باوجود وہ ہوٹل میں ٹھیرے ہیں۔ بھائی سے ان کی وہ آخری ملاقات تھی اس وقت وہ کافی کمزور ہو گئے تھے اور حیدرآباد آنے کے بارے میں بھی انھوں نے

(باقی صفحہ نمبر ۴۰ پر)

طیب انصاری

نجیب اشرف — ایک تاثر

شخصیت پر قلم اٹھانا کوئی معمولی بات تو نہیں ہے اور پھر ایسی شخصیت کے بارے میں لکھنا جس سے کبھی ربط ضبط رہا ہے نہ تعلق اور نہ ہی کبھی اس شخصیت کے کارناموں کے مطالعہ کا موقع ہی ملا ہو، قلم اٹھانا دانشمندی نہیں ہے، حماقت ہے۔ میں ایسی کوئی حماقت نہیں کروں گا۔

میرے ذہن میں نجیب اشرف صاحب کا ایک خاکہ ہے! خوبصورت ناک نقشہ، صاف رنگ روپ، لمبا سا چھریرا بدن، ناتواں نحیف، کمزور، اجلے بکھرے ہوئے بے ترتیب بال لیکن نظروں میں آب و تاب بھی توانائی و رعنائی بھی اور وہ خوبی جس سے آدمی مرعوب بھی ہوتا ہے اور متاثر بھی۔ بات چیت مشک و عنبر مسکراتے ہوئے بات کرتے ہیں، وہ بات کرتے ہوئے خود ہی نہیں مسکراتے اوروں کو بھی خوش کرتے ہیں۔ بزرگ تو تھے لیکن طبیعت میں اتنی انکساری کہ ہم سے بھی خندہ پیشانی سے ملتے۔ ان کے برتاؤ سے شفقت نہیں محبت کا احساس پیدا ہوتا تھا اور یہی احساس آج تک میرے قلب و ذہن میں موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں انسان اپنے بہت سے کارناموں کی وجہ سے زندہ رہتا ہے لیکن ان کے ان تمام کارناموں میں یہ کارنامہ عظیم اور برتر ہے کہ وہ یہی احساس دوسروں کے دلوں اور ذہنوں پر منقش کر جائے۔

یہ خاکہ میرے ذہن پر اس وقت مرتسم ہوا جب وہ ستمبر ۱۹۶۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی تشریف لائے تھے اس وقت میں ایم۔اے آخری کا طالب علم تھا۔ بزم کا افتتاح نہیں ہوا تھا بلکہ میری نامزدگی بحیثیت کنوینر بزم ابھی ادھر گذری ہی تھی۔ محترم مسعود حسین خاں (صدر شعبہ اردو) نے یہ طے کر لیا تھا کہ مجھے کنوینر نامزد کر دیا جائیگا لیکن باضابطہ اعلان نہیں ہوا تھا۔ غالباً پی۔ایچ۔ڈی کے مقالوں کے ممتحن ہی کی حیثیت سے یہ اور احتشام حسین صاحب یونیورسٹی تشریف لائے تھے طلبہ نے اصرار کیا کہ ان حضرات کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی ادبی محفل منعقد کی جائے میں نے مسعود صاحب سے نمائندگی کی اور مسعود صاحب نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کی، دونوں حضرات کو راضی بھی کر لیا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ میں جلسہ کے سارے انتظامات کروں۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اس ادبی اجلاس میں شرکاء کی تعداد زیادہ رہے گی۔ اول تو یہ کہ اب عثمانیہ یونیورسٹی کا وہ ماحول نہ رہا جو کبھی تھا دونوں حضرات کا تعلق تحقیق و تنقید سے تھا اس لیئے یہ موضوعات عام لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث

نہیں ہو سکتے تھے اور تیسری اہم وجہ جو میرے ذہن میں تھی وہ یہی کہ ادبی اجلاس بالکل ہی تنگ وقت میں منعقد ہو رہا تھا۔ اس لئے بھی میں خائف تھا۔ چنانچہ اس خوف و اندیشے کے تحت جلسہ میں محدود نشستوں کا انتظام بھی کیا گیا۔ مجھے ٹھیک سے تاریخ یاد نہیں لیکن یہ ستمبر کا مہینہ تھا اور ۲½ بجے دن آرٹس کالج کی وسیع عمارت کے ایک گوشہ میں اس جلسہ کو منعقد کیا گیا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں جلسہ کے آغاز تک بھی پریشاں تھا کہ آیا لوگ جمع بھی ہوں گے یا نہیں لیکن جب جلسہ اپنے وقت پر شروع ہوا تو الٹا پریشانی یہ لاحق ہوئی کہ جوق جوق آنے والے اہل ذوق حضرات کے بیٹھنے کا انتظام کس طرح کیا جائے محدود نشستیں ایم اے (اردو) سال اول و دوم کے طلبہ ہی سے پُر ہوگئیں دوسرے طلبہ اور دیگر ارباب ذوق کی کثیر تعداد کھڑی کی کھڑی رہی یہاں تک کہ جلسہ ختم ہوا۔ اس ادبی اجلاس کی صدارت محترم نجیب اشرف صاحب نے فرمائی اور جناب احتشام حسین صاحب نے اردو شاعری میں ایہام سے متعلق مضمون پڑھا۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں یہ پہلا جلسہ تھا جس کو میں نے درپردہ منعقد کیا تھا لیکن میری آئندہ کی انجمنی زندگی کیلئے نیک شگون ثابت ہوا۔ بزم کی جانب سے بعد کو جتنے بھی جلسے اور ادبی اجلاس منعقد ہوئے وہ اسی جلسہ کی طرح معجزانہ طور پر کامیاب ثابت ہوئے اور ان تمام تر کامیابیوں کو میں ان ہی تینوں بزرگوں کے خلوص اور ان کی نیک توقعات کا حاصل سمجھتا ہوں۔ میری مراد استاد گرامی ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب محترم احتشام حسین صاحبؒ اور مرحوم نجیب اشرف صاحب سے ہے۔

نجیب اشرف صاحب کی عالمانہ اور محققانہ تقریر کا مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا کیوں کہ ہم پہلے ہی سے ان کی تحقیق کی اہمیت سے واقف تھے۔ ہم کو ان سے ایسی ہی تقریر کی امید بھی تھی اور ہماری امید پوری بھی ہوئی۔ یہ واقعہ انسانی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہوتا ہے کہ انسان کی امید پوری ہو ورنہ امید بھی وعدہ معشوق ہی کسی طرح ہوتی ہے۔ غیر یقینی غیر معتبر!

جلسہ کے اختتام پر میں محترم نجیب اشرف صاحب کو چھوڑنے کے لئے نکلا جناب میر حسن صاحب کے یہاں احتشام صاحب قیام پذیر تھے چنانچہ میر حسن صاحب جو اس جلسہ میں شریک تھے اور جناب سری نواس جو بقول احتشام حسین صاحب لاہوتی بھی کہلاتے ہیں اس جلسہ میں ساتھ آئے تھے۔ ان تینوں حضرات کو میر حسن صاحب کے بنگلہ پر چھوڑ دیا گیا۔ نجیب اشرف اور میں دو رہ گئے تیسرا میرا دوست جہانگیر نواب (قطب یار خاں) جن کی کار تھی اور جن کے تعاون سے یہ جلسہ منعقد ہو سکا تھا۔ ہم تین تھے۔ تینوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے بنجارہ ہلز کے دامن سے نکل کر اسی گارڈ ز پہنچے جہاں مولوی نصیر الدین ہاشمی مرحوم کا مکان ہے۔ ہمیشہ نجیب اشرف ان ہی کے مکان میں قیام کرتے لاستہ بھر .. ہی تاثر میرے اور میرے دوست کے قلب و ذہن پر مرتسم ہوا تھا

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

ڈاکٹر رستم جی دارو والا

پروفیسر نجیب اشرف ندوی

پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم ... کو کون بھول سکتا ہے۔ آج بھی وہ مجھے بے طرح یاد
تے ہیں سنہ ۱۹۳۲ء میں اسمٰعیل یوسف کالج میں میں نے انٹر سائنس میں داخلہ لیا تھا۔ اس وقت یہ درخشاں تعلیمی ادارہ
نم محمد بدل الرحمٰن کی زیرنگرانی تھا اور یہ ان کی وسعت نظر رواداری اور پیش بینی کا نتیجہ تھا کہ اس سال چار پارسی طلبہ نے
میل یوسف کالج میں داخلہ لیا تھا۔ جن میں سے ایک نوروز مہتا تھے جنھوں نے پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی زیرنگرانی
سی زبان سے ایم اے کی ڈگری لی تھی اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انھوں نے فارسی زبان میں شہنشاہ اکبر اور اس کی
ہبی پالیسی پر ایک مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لئے کام کا آغاز بھی کر دیا تھا لیکن نوروز مہتا نے جوان عمری میں ہی
نے خاندان اور دوستوں کو داغِ مفارقت دے دیا ورنہ ممکن تھا کہ ان کا مندرجہ بالا موضوع پر لکھا ہوا مقالہ تاریخی ثابت
نا اور اس موضوع پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بہتر مواد اور سوچنے سمجھنے کے نئے زاویے فراہم کرنے کا باعث بنتا۔
ن انسان سوچتا کچھ ہے پروردگار کرتا کچھ ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ نوروز مہتا کے انتقال
ے ایک سال پہلے ہی محترم بدل الرحمٰن صاحب کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ محمد بدل الرحمٰن صاحب کے انتقال کا صدمہ ایسا
کہ ہر کسی نے دکھ اور رنج محسوس کیا لیکن ہم چار پارسی طلبہ کا گروہ شاید سب سے زیادہ غمزدہ تھا۔ کیونکہ پروفیسر
ل الرحمٰن نے ہم پارسی طلبہ کی ہر مرحلے پر اعانت اور مدد کی تھی اور وہ دیگر طلبا سے زیادہ ہمارے ساتھ شفقت سے
ں آیا کرتے تھے اور ایران سے ہم پارسیوں کی تاریخی اور معاشرتی نسبت کی بنا پر بھی وہ ہم کو بہت چاہتے تھے۔

اس سال داخلہ لینے والوں میں دوسرے پارسی طالب علم اور نوروز مہتا کے ساتھی ہومی ڈیسائی تھے جو
میں کیپٹن ہومی ڈیسائی کے نام سے مشہور ہوئے اور حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوئے اور اب جہاں تک
یاد پڑتا ہے وہ حکومت بمبئی یا مہاراشٹر کے پولیٹکل اور سروسیز ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری ہیں۔ اندھوں کے دیوتا سورداس کے
بڑے معتقد ہیں اور انھوں نے اپنے والد کی طرح اپنی ذات کو بھی اندھوں کی تکالیف اور مصائب سے پر زندگی کو
نا کے لئے آسان اور پرکشش بنانے کے لئے وقف کر دیا ہے۔ ان کے والد اندھوں کے "وکٹوریہ اسکول" کے پرنسپل تھے
عرصہ ہوا ان سے مل نہ سکا۔ لیکن ان کی ترقیوں ان کے مشاغل اور مصروفیات کے بارے میں بہت کچھ میرے
میں اخبارات اور دیگر ذرائع سے آتا رہا ہے۔ ان سے نہ مل سکنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ میں دنیا کے ایک ایسے

ا پڑا ہوا ہوں جس کو عرف عام میں چور بازار کہا جاتا ہے۔ یہاں میں تقریباً ربع صدی یعنی پچیس سال سے
پسماندہ اور دکھی طبقے میں گھرا ہوں کہ مجھے اپنے اطراف میں پھیلی ہوئی زندگی کی آسائشوں اور خوشیوں
اس تک نہیں ہوا۔ آج تک نہیں! میں نے اس خطے میں پھیلے ہوئے سماج کے بیمار افراد کا علاج کیا ہے
تر کو دم توڑتے دیکھا ہے اور آج بھی ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو ان گنت بیماریوں اور ناقابل علاج
ہیں لیکن میرے لئے یہ بات باعث فخر ہے کہ جب کسی ڈاکٹر نے یہاں دواخانہ کھولنے اور اپنے فن سے
س پسماندہ طبقے کو فائدہ پہنچانے سے گریز کیا اُس وقت میں نے یہ نازک قدم اٹھایا دراصل اس بات
ی دل گردے کی ضرورت تھی۔ کیوں کہ یہ علاقہ پسماندہ ہونے کی وجہ سے شہر کے بدنام ترین علاقوں میں سے
ں خونی، چور، گرہ کٹ اور غیر قانونی کام کرنے والے افراد کے علاوہ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے افراد کی آبادی
ں دق و سل کے مریض بھی ہیں اور دمہ اور پیچش کے بھی۔ جلدی امراض کے علاوہ کئی ایسی بیماریاں ہیں جو
ادی اور گندی آب و ہوا اور پاکی و صفائی کے عنقا یا معدوم ہونے کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں۔ اس عفریت
ے کے خاتمے کی ذمہ داری حکومت اور شہری انتظامیہ کے علاوہ شہر کے بڑے بڑے کروڑ پتیوں اور لکھ پتیوں
تی ہے اور اس سلسلے میں بڑے بڑے خیراتی اداروں کو بھی آگے بڑھ کر کام کرنے کی ضرورت ہے لیکن
خوانوں سے ان افراد اور ان اداروں کے سربراہوں کے کان پر کب جوں رینگی ہے جو اب رینگے
تا ہے کہ سب کا ضمیر مردہ اور سب کی آنکھیں اندھی ہو گئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میری تمنا ہے کہ
ر طبقہ اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھائے اور مریضوں کیلئے مفت انجکشن اور دوائیں مہیا کرنے کا انتظام
ی کا یہ معذور اور بیمار حصہ صحت مند بن کر سماج کے بہتر طور پر کام آسکتا ہے اور شہر کے مالدار ترین صنعت کاروں
روں سے میری درخواست یہ ہے کہ وہ اس حلقے کی بدنصیب آبادی کے دکھوں کا احساس کرتے ہوئے انسانی
ں اہم ترین فریضے کی ادائیگی کی طرف اگر ذرا سی بھی توجہ دیں تو بہت بڑا کام ہو سکتا ہے۔ جوش اور جذبے
طور شاید اس اُمید پر لکھی گئیں کہ کوئی تو دل ایسا ہوگا جو تڑپ اُٹھے گا۔ کوئی تو ہوگا جس کے احساس پر چوٹ
رہ جاگ جائے گا۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی ہاں تو تیسرے پارسی طالب علم مسٹر سی کے باٹلی والا تھے۔ جنھوں نے شہر کی
بڑا نام پیدا کیا اور جو حال ہی میں بھساول سے تبادلہ ہو کر تھانہ میں سپرنٹنڈنٹ آف پولیس ہیں اور چوتھا
یں تھا۔ ہم سب ایک ہی ہوسٹل میں مقیم تھے۔ یہ ہوسٹل اسمٰعیل یوسف کالج جس ٹیکری پر واقع ہے۔ اس کی
پر بنا ہوا تھا۔ یہیں مشاعروں کی محفل گرم ہوتی اور یہیں بحث و مباحثہ کی مجلسیں جمتیں۔ میں اس وقت کالج کی
نا ایرالبحر کے عہدہ پر تھا۔ حالانکہ میرے پاس نہ اس وقت کوئی بحری بیڑہ تھا اور نہ آج ہے اور نہ مجھے

کسی قسم کی بحری معلومات اور تربیت حاصل تھی لیکن اس کے باوجود میں خود کو "امیرالبحر" ہی تصور کرتا تھا اور اس تصور سے مجھے بڑی مسرت حاصل ہوتی۔ اور جب پارلیمنٹ کے مباحثہ کے دوران مجھے بڑے اعزاز کے ساتھ "امیرالبحر" کہکر مخاطب کیا جاتا تو میری اکڑ کا احساس مجھے خود ہوتا تھا۔ ایک بار پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب کی صدارت میں پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا اور وہ بڑا تاریخی اجلاس تھا۔ حزب اختلاف نے مسٹر اے یو شیخ (جواب ڈاکٹر اے یو شیخ ہیں اور بمبئی کے میونسپل کمشنر رہ چکے ہیں) کی قیادت میں حکمراں پارٹی کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کی تھی اور میں نے اپنی پارٹی کی مدافعت کرتے ہوئے بڑی زوردار اور مدلل تقریر کی اور حزب مخالف کی ہر بات کا کئی پہلوؤں سے جواب دیکر ان کی سٹی گم کر دی۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب نے میری جوابی تقریر کے زور اور تنور کے علاوہ اس میں کہی گئی باتوں کے طنز، تیزی، تندی اور برہان قاطع الفاظ اور جملوں کی ظرافت کو محسوس کیا اور بہت محظوظ ہوئے اور انھوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں میری اس تقریر کو سراہا۔ میں ان الفاظ کو اپنے لئے ایک بڑا اعزاز سمجھتا ہوں اور آج بھی ان کے کہے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔

"ہم نے اس مسحور کن تقریر کو سنا۔ ہم نے مقرر کی شیرینی گھولنے والی آواز سنی۔ پانچ منٹ کی اس تقریر میں ہم نے جو وجوہات اور دلائل سنے ہیں وہ ایک نامعقول کو بھی یہ تاثر دینے کے لئے کافی ہیں کہ حکمراں جماعت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی"!

اس کے بعد رائے دہی ہوئی اور ہماری حکومت برقرار رہی۔ اس کے نتیجے میں مجھے اسماعیل کالج کی سائنٹیفک سوسائٹی کا سکریٹری بھی منتخب کیا گیا اور میرے ساتھ ایک اور سکریٹری مسٹر روشن محمد تھے جو بعد میں مسرز ڈنکن سٹرائن لیمیٹیڈ کے ڈائرکٹر کے عہدے پر پہونچے اور جواں عمری میں موت سے ہمکنار ہوئے صرف پانچ سال قبل۔ اس کے علاوہ ایک اور بات میرے لئے باعث فخر ہے کہ میں نے کالج کے طلبا کے لئے دھرمسی مرارجی کیمیکل ورکس کا تعلیمی دورہ مقرر کیا اور اس سلسلے میں ڈاکٹر انکلیشور یا۔ ڈاکٹر ای جے ایس تاراپور والا اور سر علی محمد خاں دہلوی کو انجمن طلباء کے زیر اہتمام تقاریر کیلئے بلوایا۔ سر علی محمد خاں دہلوی اُس زمانے میں بمبئی لیجسلیٹو کونسل کے صدر تھے۔ اس موقع پر اُن کے کہے ہوئے الفاظ مجھے آج بھی یاد ہیں اور میرے حافظے میں ایک خزانے کی طرح محفوظ ہیں۔ جو انھوں نے میری استقبالیہ تقریر کے جواب میں کہے تھے "چار باتیں زندگی میں کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ مسابقت رفتار، حیرہ اور متانت اور آپ کے سکریٹری میں یہ چاروں باتیں موجود ہیں اور اس کے لئے میں اللہ تعالیٰ کا مشکور ہوں کہ اس نے آپ کے سکریٹری کی ذات میں یہ چاروں صفات یکجا کر دی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا یہ سکریٹری انشاءاللہ زندگی میں بہت کامران اور کامیاب رہے گا"۔ گریجویشن کے بعد میں نے جو ربانائز میں تقسیم ہو گیا اور وہیں ذاتی طور پر علاج و معالجہ کا پیشہ گزر اوقات کے لئے اپنا لیا۔ کیونکہ پانچ سال کے عرصہ تک میں ڈاکٹر عباسی کے مددگار

ت سے بھی کام کرتا رہا تھا۔ اس دوران مجھے اس علاقے کے لوگوں سے ایک قسم کا انس اور ان کی زندگی کے سائل سے ایک تعلق سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس علاقے کی مسلمان آبادی کی طرز معاشرت زبان اور ماحول سے بھی میں ا اور مانوس ہو چکا تھا۔ اسی عرصے میں ہر مہینے پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب میرے دواخانے پر برابر آیا کرتے اس بات پر تعجب اور حیرت کا اظہار کیا کرتے تھے کہ میں نے ملک کے اس عجیب و غریب خطے ہی کو کیوں چن لیا یاں چور اچکے، غنڈے، بدمعاش، ناجائز شراب بیچنے اور بنانے والے موجود ہیں جو اسمگلروں اور غیر قانونی کاروبار والوں کا مشہور علاقہ ہے اور انھیں اس بات پر اور بھی زیادہ حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح میں نے سماج کے راد کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے کہ ایسے رہتے ہیں گویا منہ میں زبان اور جسم میں طاقت ہی نہیں ہو۔ وہ میرے ان نفسیاتی طریقوں سے بہت دلچسپی رکھتے تھے جو ان افراد سے بات چیت اور علاج معالجے کے دوران برتتا تھا۔

ایک بار پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب نے میرے زیر علاج ایک مریض اور ان کے شاگرد کے اعزاز منعقد کی گئی ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ لندن جا رہے ہیں بیرسٹر بننے کے لئے اسی طرح میرے گردوں میں سے کئی اور بھی بیرسٹر بننے کیلئے لندن گئے ہیں۔ لیکن جب وہ واپس آئے ہیں تو اپنے ہمراہ ایک "BA" بار (میخانہ) لے کر آئے ہیں۔ ان کا اشارہ ان غیر ملکی عورتوں کی طرف تھا جو ان کے شاگرد بیرسٹری کی ڈگری بجائے لندن سے واپسی پر ساتھ لیتے آئے تھے۔ سامعین کا ہنستے ہنستے برا حال تھا۔ پھر انھوں نے پیشن گوئی کی یہ راقم اس پیشین گوئی کے سچی ہونے کا گواہ ہے کیونکہ ان کے یہ شاگرد بھی بیرسٹری کی ڈگری کے بجائے ایک جرمنا "B" ساتھ لے کر آئے تھے جو "بار" یعنی میخانہ بھی تھا اور بار یعنی بوجھ بھی اور پھر لندن میں مدرسی کا پیشہ اختیار کر لیا ں نے اپنے خاندان کو چھوڑا اپنے ملک اور وطن کو چھوڑا اور اس میخانہ میں ایسے گم ہوئے کہ لوٹ کر نہ آسکے۔

تو ایسے تھے پروفیسر نجیب اشرف ندوی دور بین احساس اور عالم آدمی بذلہ سنج خوش مزاج نیک ت اُن کی یاد بھلائے نہیں بھولتی۔ آہ۔

(انگریزی سے ترجمہ سعیدہ صدیقی)

بشکریہ "نقش کوکن"

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ

۵ ستمبر ۱۹۶۸ء وہ منحوس دن تھا جب کہ زبان اردو کے زبردست حامی اور ادبیات اردو کے مقبول استاد اس دار فنا سے دار بقا کو سدھارے یعنی پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی نے ۶۸ سال کی عمر میں آخری سانس لی اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ؂

پروفیسر ندوی کا اٹھ جانا اردو زبان و ادب کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے ان کی اچانک موت نے صوبہ مہاراشٹر میں بالعموم اور جامعہ بمبئی میں بالخصوص ایسا زبردست خلا پیدا کر دیا ہے جس کا پُر ہونا اگرچہ ناممکنات سے نہیں ہے تاہم دشوار ترین ضرور ہے۔ ندوی صاحب نے اپنی زندگی صحیح معنوں میں اردو زبان اور اردو ادب کیلئے معنون کر رکھی تھی۔ یہی لگن، یہی شیفتگی، یہی سپردگی ان کی ہر دلعزیزی کا راز ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ بمبئی ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے اکناف و اطراف کے تریب قریب علمی و ادبی حلقوں میں کافی مقبول تھے۔ ایک استاد، ایک ادیب، ایک نقاد، ایک مبصر، ایک خطیب سے بڑھکر ندوی صاحب ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ بالفاظ دیگر ندوی صاحب کی باغ و بہار شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ وہ اپنی ذات سے ایک فرد نہیں بلکہ ایک انجمن تھے۔ انھوں نے اگلی پچھلی صحبتیں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں اور قدیم و جدید ادب کا اچھا مطالعہ کیا تھا اور اسی کی آمیزش سے اپنے لئے ایک مخصوص طرز انشا اختراع کی تھی جو خود انہی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ ندوی صاحب جیسے ہمدرد اور وضعدار علمی و ادبی شخصیت کے ساتھ ایک پورے دور کی داستان ختم ہوگئی ؎ داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

پروفیسر ندوی کی سب سے بڑی علمی اور ادبی، تاریخی و تحقیقی یادگار ان کی تصنیف "مقدمہ رقعات عالمگیر" ہے جس میں وہ موضوع، فکر اور اسلوب کے اعتبار سے اپنے استاد شبلی نعمانی کے نقش قدم پر چلتے نظر آتے ہیں جن سے ان کو والہانہ محبت تھی اور جن کی تقلید و پیروی کو اپنے لئے باعث افتخار و سعادت تصور کرتے تھے۔ ان کی دوسری تالیف کلیمنٹ ہارٹ کی عربی ادب کی تاریخ کی ترتیب و تدوین ہے جو ان کی دقت نظر اور ناقدانہ تجزیہ کی بنا پر ان کی اپنی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ لغات گجری ندوی صاحب کے آخری دور کا ایک قابل قدر ادبی تحفہ ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو کی پہلی لغت ہے۔ اگرچہ یہ لغت ہیئت کے

اعتبار سے ظاہر انصاب نامہ کا کام دیتی ہے تو دوسری طرف اس کو اُردو لغت نویسی کی پہلی کوشش بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ لغت نثر میں ہے اور اس کی ترتیب سے اردو ادب میں لسانی حیثیت سے زبردست اضافہ ہوگیا ہے۔

علاوہ ازیں ہندوستان کے مشہور و معروف تحقیقی جریدہ معارف (اعظم گڑھ) میں ان کے ادبی تبصرے ان کی تحقیق و تنقید کے مقالات اتصال کا بین ثبوت ہیں۔ ان کی تحقیقی اور علمی مساعی بصورت مضامین خاصے کی چیزیں ہیں اور کوکن کے عناصر اربعہ اور بمبئی سے متعلق دو قدیم مثنویاں اس لئے قابل ذکر ہیں کہ ان ہی کی اساس پر بمبئی میں اردو جیسے تحقیقی مقالہ پہ جامعہ بمبئی کے ایک طالب علم کو ڈاکٹریٹ بھی ملی ہے۔

انجمن اسلام (بمبئی) تعلیمی اور سماجی حیثیت سے مسلمانان ہند کا سب سے بڑا قدیم ادارہ ہے جس کے زیر اہتمام کئی ایک ثانوی اردو مدارس قائم کئے گئے ہیں جن میں بالخصوص علوم و فنون کی تعلیم و تدریس کا انتظام کیا گیا ہے اور اس کے کچھ مدارس میں کمرشیل اور ٹکنیکل تعلیم کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ خداوندان انجمن نے اردو کی اہمیت و عظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۹۴۷ء میں بمبئی سرکار کی مدد سے ایک تحقیقی ادارہ کے قیام میں کامیابی حاصل کی اور یہ ادارہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے موسوم ہے جہاں تحقیقاتی کام کرنے والوں کی نہ صرف رہنمائی کی جاتی ہے بلکہ بمبئی یونیورسٹی کی پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے بھی طلبہ کو تیار کیا جاتا ہے اگرچہ سینٹ زیویرس کالج اور اسمٰعیل یوسف کالج میں بھی اس قسم کا اہتمام موجود ہے۔ بہرکیف اس ادارہ کی نگرانی میں مختلف کتب خانوں کی مطبوعات کی فہرست اور نایاب مخطوطوں کی اشاعت کا انتظام کرنا مِن مقاصد میں سے ہے۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا ابتدا میں اعزازی ناظم کی حیثیت سے تقرر کیا گیا کیونکہ وہ اس وقت اسمٰعیل یوسف کالج (جوگیشوری۔ بمبئی) کے شعبہ اُردو کے صدر تھے اور بمبئی سرکار نے انہیں اعزازی طور پر نظامت سنبھالنے کی اجازت دیدی تھی لیکن ۱۹۵۵ء میں جب وہ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو انجمن نے پنشن یافتہ ہونے کی وجہ سے انہیں ایک مستقل ناظم کی حیثیت سے تعین کیا اور وہ اس عہدے پر تادم زیست قائم رہے۔ اگرچہ ندوی صاحب نے اپنے ڈائرکٹری کے زمانہ میں تصنیف و تالیف کا بہت کم کام کیا ہے لیکن تحقیقی اور علمی لحاظ سے قابل قدر ادبی سرمایہ مطبوعات کی صورت میں جمع کیا ہے۔ ندوی صاحب نے انجمن کے رفیق عبدالرزاق قریشی صاحب سے مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام اور دیوان غزلیات جیسے قدیم مخطوطوں کو مرتب کروایا ہے۔ ندوی صاحب اگر اپنے نقد اور بصیرت کو صحیح طور پر استعمال کرتے اور ذاتی دلچسپی لیتے تو یقینی طور پر ان تالیفات کا حسن اور نکھرتا۔ بہرکیف یہ انجمن کی تالیفات ہیں اور یہ کیا کم ہے۔

اسکے علاوہ انجمن کا ایک سہ ماہی تحقیقاتی جریدہ ہے جس کا اجرا ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کے زمانہ میں ہوا جب وہ انسٹی ٹیوٹ کے نائب ناظم مقرر کئے گئے تھے اس مجلہ میں بالخصوص گجرات و بمبئی کے غیر مطبوعہ

(...)

زاہد

محمد اکبرالدین صدیقی

ندوی صاحب

ندوی صاحب سے دس بارہ سال پہلے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد وہ جب بھی حیدرآباد آتے تو میں ان سے ضرور ملتا۔ ویسے میں بہت کم آمیز ہوں لیکن ندوی صاحب میں کچھ ایسی کشش تھی کہ میں ملے بغیر نہ رہ سکتا تھا ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا وہ بہت پڑھتے اور کم لکھنے پر عمل کرتے تھے اور کام لینے کے گر سے خوب واقف تھے میرا خیال ہے کہ اگر بمبئی میں ندوی صاحب کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو بمبئی یونیورسٹی میں اردو پڑھنے والے طلبا کی اتنی زیادہ تعداد نہ ہوتی اور کالجوں میں اردو پڑھانے والوں کا کال ہوتا لیکن آج مہاراشٹرا اور مدھیا پردیش کے کالجوں میں اکثریت ان کے طلبا کی ہے جو اُردو کی توسیع واشاعت کے کام میں معروف ہیں۔ ان میں بعض حضرات ایسے بھی ہیں جن میں کام کرنے کی لگن ہے اور ہر طرح سے اُردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ذوق انھوں نے ندوی صاحب ہی سے پایا ہے وہ ایک بڑے محقق تھے اور وسیع مطالعہ کی وجہ سے محققین کی جماعت میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت میں انھوں نے ریسرچ کے معیار کو بلند کیا اور بڑی اہم کتابیں شائع کیں بمبئی، احمدآباد اور دوسرے مقامات سے انھوں نے قلمی کتابیں جمع کیں اور انسٹی ٹیوٹ کے کتب خانہ کو بہت گراں قدر بنایا۔ ان میں بعض مخطوطات ایسے بھی ہیں جن کا کوئی دوسرا نسخہ ابھی تک دریافت نہ ہو سکا دو سال پہلے وہ حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ پروفیسر سید محمد صاحب اور میں ملاقات کیلئے پہنچے تو فرمایا کہ کبھی بمبئی آیئے۔ ہم نے آنے کا خیال ظاہر کیا تو فرمانے لگے کہ آپ لوگ یونہی کہتے ہیں لیکن آتے نہیں شاید میرے بعد آئیں گے۔ اس جملے نے ہمیں بہت متردد کیا اور ہم پیوستہ ڈسمبر اطلاع دے کر بمبئی پہنچے اور انجمن کے دفتر میں ان سے ملاقات کی انجمن کا کتب خانہ مطبوعات کا فی شاندار ہے مخطوطات کی تعداد زیادہ نہیں لیکن ندوی صاحب نے ہمیں تمام مخطوطات کو دیکھنے اور انھیں پڑھنے کا حکم دیا اور ایک مخطوطہ کی بطور خاص نشان دہی کی اور کہا اس کو پڑھیئے۔ امین گجراتی کی "یوسف زلیخا" کا ذکر تاریخ ادب میں موجود ہے لیکن اس کے "تولدنامہ" کا کہیں ذکر نہیں یہ مخطوطہ تولدنامہ تھا جو کافی ضخیم بھی تھا اور دلچسپ بھی میں نے اس کی ورق گردانی کی اور سوچنے لگا کہ یہ مواد کچھ عجیب سا ہے۔ ندوی صاحب تاڑ گئے اور فرمانے لگے کہ امین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا بیان گجراتی انداز میں کیا ہے۔ گجرات میں اسلامی تعلیمات کو ہندو عقائد کے ساتھ ضم کرکے بتلانے کی کوشش کی گئی ہے اس کے بعد انھوں نے ہندو صنمیات (مائیتھالوجی) کے بہت سے واقعات سنائے اور امین نے تولدنامہ میں جو مطابقت پیدا کی ہے اس کا اظہار فرمایا۔ ممکن ہے کہ امین نے اسلام کو پیش کرنے کیلئے یہ خاص انداز اختیار کیا ہو انھوں نے

خواہش کی کہ میں اس پر کام کروں میں نے کہا کہ اس کے لئے میرا آپ کے حضور میں رہنا ضروری ہوگا ورنہ ممکن ہے کہ کام آپ کے منشا کے مطابق نہ ہو اور میرا بمبئی میں قیام مشکل ہے۔ پھر انھوں نے اس پر ایک تعارفی مضمون کی خواہش کی اور میں نے حامی بھرلی لیکن تکمیل نہ ہوسکی اور اب سوچتا ہوں کہ اب میری رہنمائی کون کرے گا اور اب یہ بمبئی جاؤں تو ایسی ہمدرد علم دوست اور ادب نواز شخصیت کہاں مل سکے گی۔

ندوی صاحب سے شاید ہی کوئی کانفرنس کمیٹی میٹنگ یا جلسہ چھوٹتا ہو۔ وہ کئی یونیورسٹیوں میں ممتحن یا بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر ہوتے ہر مہینہ بلکہ مہینہ میں دو دو تین تین دفعہ بمبئی سے باہر نکلنا ہوتا۔ وہ گویا بمبئی میں اردو کے سفیر تھے ایک پیر گھر میں ہوتا اور ایک ٹرین میں۔ آج یہاں کل وہاں۔ اس عمر میں بھی وہ سفر سے نہ گھبراتے

ندوی صاحب کی زبان سے میں نے کبھی کسی کی شکایت نہ سنی کسی میں ناحق دیکھتے تو سکوت اختیار کرلیتے اور کسی کی خوبیوں کو اچھالنے کی بھی عادت نہ تھی۔ میں نے انھیں صوبہ واری عصبیت سے بھی بالکل بے نیاز پایا ہے ورنہ عام طور پر ہر جگہ اس کا چرچا سنا اس کا سبب یہ ہے کہ وہ سیاسی گٹھ جوڑ کے قایل نہ تھے وہ اُردو کی خاطر کام کرتے تھے اور اُردو کیلئے جہاں اور جس طرح کام بنتا نکالنے کی کوشش کرتے۔ مہاراشٹر میں انھوں نے بابائے اردو کی حیثیت حاصل کرلی تھی

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے انھوں نے ایک تحقیقی رسالہ نوائے ادب جاری کیا۔ جس میں صرف تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس رسالے کے ذریعہ بھی انھوں نے معیار تحقیق کو بلند کیا اور اس میں رسایل کے اشارے شایع کرکے اس کو ایک روایت کی شکل دے دی۔ آج اکثر رسایل ان کی تقلید کرکے اہل علم و ادب کو فیض پہنچا رہے ہیں۔

ایم اے اور پی ایچ ڈی کے مقالوں کے متعلق وہ اپنی بے لاگ رائے ظاہر کرتے اور اپنے مفید مشوروں سے اہل غرض کو ممنون کرتے۔

انجمن کے توسط سے انھوں نے کل ہند تحریری مقابلے منعقد کئے۔ اور اس عمل سے انجمن کے نام اور کام سے کالج کے طلبا بھی واقف ہوئے اُردو کی توسیع کا ایک ذریعہ اس طرح بھی پیدا کیا۔

بمبئی میں اردو کیلئے اس لگن سے کام کرنے والے مشکل سے ملیں گے۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ان کے مضامین کو یکجا کرکے شائع کردے تو یہ ایک اہم خدمت ہوگی۔ ہمیں ان کے عزیز شاگرد۔ عبدالرزاق قریشی صاحب سے توقع ہے کہ وہ اس کام کو باحسن الوجوہ پورا کریں گے۔

عبدالرحیم

ایک خط ۔ پروفیسر سیّد محمدؒ کے نام

محترم من۔

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۲۳ ماہ رواں موصول ہوا۔ پروفیسر نجیب اشرف کی وفات حسرت آیات ہم لوگوں کے لئے ایک بڑا حادثہ ہے۔ موصوف سے میرے مراسم تقریباً اسی وقت سے قائم ہیں جب سے آپ نے بمبئی میں قیام اختیار فرمایا ۴۰ سال تک میں ان کی خدمت میں حاضر رہا ہوں۔ ان کی ناگہانی موت نے بمبئی کی علمی دنیا میں جو خلا پیدا کیا ہے اس کی تلافی آسان نہیں۔ کئی سال سے ان کی صحت برابر گر رہی تھی۔ اس پر مزید گھریلو معاملات نے بھی کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ ذہنی کرب نے ان کی رہی سہی طاقت بھی نچوڑ لی تھی۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ بہت ہی پریشان رہے۔ مرحوم کئی امراض کا شکار تھے بواسیر PROSTRETED GLANDS اور اختلاج کی شکایت تھی ان سب کے باوجود یہ نہیں معلوم تھا کہ آخری وقت اس قدر قریب ہے۔ انجکشن کی وجہ سے کولھے پر آماس آکر مواد بھر گیا تھا۔ ڈاکٹر ملک کے مشورہ سے ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہوئے معمولی سا آپریشن تھا اور اسی روز وہ گھر واپس جا سکتے تھے مگر مزید آرام اور زخم کی ڈریسنگ کیلئے انھوں نے کچھ روز مزید نرسنگ ہوم میں رہنا پسند کیا۔ گھر میں ان کی بڑی لڑکی اور داماد آیا جایا کرتے تھے نرسنگ ہوم میں بھی ان کی صاحبزادی روز آجایا کرتی تھیں وفات کے روز طبیعت بہت ہی بشاش تھی صبح دس بجے شہاب الدین دسنوی صاحب انکو دیکھ آئے تھے اور خیال تھا کہ دوسرے روز وہ گھر چلے جائینگے بارہ بجے کے قریب انھوں نے نرس سے شکایت کی کہ اُن کو قبض ہو رہا ہے۔ اس نے اینیما دینے کی تیاری کی ان کی لڑکی اور ایک دوسرے عزیز جو پٹنہ سے آئے ہوئے تھے وہاں موجود تھے ان کو کمرے سے باہر جانے کے لئے کہا گیا۔ اینیما دیتے ہی ان کے منہ سے ایک چیخ نکلی کمزور قلب اینیما کو برداشت نہ کر سکا اور دیکھتے دیکھتے ہی ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ موقعہ پر ایک ڈاکٹر موجود تھا اس نے فوراً ہی قلب کا مساج شروع کر دیا۔ نرس آکسیجن کیلئے دوڑی مگر سب بیسود وقت موعود پہنچ چکا تھا اور جمعرات ۱۲ ستمبر کو ۱۲ بجے دوپہر کو جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ پسماندگان میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں بڑے صاحبزادے آصف۔ مرکزی حکومت جیولوجیکل سروے میں ملازم تھے وہ مزید ٹریننگ کے لئے حکومت کی جانب سے ہی امریکہ گئے تھے اب انھوں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دیدیا ہے اور امریکن شہریت اختیار کر لی ہے چھوٹے صاحبزادے امریکہ سے اپنی تعلیم ختم کر کے اسی مہینہ ۲۳ کو بمبئی واپس لوٹے ہیں۔

نتائج امتحانات ادارۂ ادبیات اُردو منعقدہ ڈسمبر ۱۹۶۸ء

اورنگ آباد - اُردو دانی

(رول نمبر)
شیخ چاند ۱ امتیاز
سید نفیض الدین ۲ "
مظہر اللہ ۳ "
مظہر محی الدین ۴ "
رضوانہ بیگم ۵ "
وسیمہ خاتون ۶ "

سرپور کاغذ نگر - اُردو دانی

نثار احمد فاروقی ۱۰ امتیاز
محمد غوث ۱۱ "
شیخ لطیف ۱۲ "
عبداللہ بن محمد ۱۳ "
واحد علی ۱۴ "
سید یونس ۱۵ "
رفیعہ بیگم ۱۶ "

بھینسہ - اُردو دانی

محمد ہارون ۱۷ امتیاز
محمد عبدالحلیم ۱۸ "
محمد رفیق الدین ۱۹ "
محمد اسمٰعیل ۲۰ "
سید یوسف علی ۲۱ "
محمد سراج حسین ۲۲ "

(رول نمبر)
محمد الباقی ۲۳ امتیاز
محمد اقبال محی الدین ۲۴ "

آرمور - اُردو زباندانی

محمد عبدالمتین ۳ درجہ سوم
سید احمد حسین ۶ "
مہرالنساء بیگم ۹ "

اورنگ آباد - اُردو زباندانی

رفیعہ بیگم ۱۱ درجہ دوم
منہاج النساء بیگم ۱۲ " سوم
ریحانہ بیگم ۱۳ " "
صبیحہ بیگم ۱۴ " "
ناظمہ خاتون ۱۵ " "
صبیہ خاتون ۱۶ " "

بلدہ ذکور - زباندانی

محمد عبداللہ شریف ۱۷ درجہ دوم
ارحم اویس یوسف " سوم

بلدہ - اناث

فوزیہ ۲۳ درجہ اول
قدسیہ ۲۴ " "
صابرہ بیگم ۲۵ " سوم
یمین النساء ۲۶ " "
" " "

سرپور ذکور - زباندانی

(رول نمبر)
علی بن دوقیل ۲۷ درجہ سوم
عبدالمسعود ۲۹ " "

کوہیر ذکور - زباندانی

احمد حسین ۳۱ درجہ سوم

نرمل - زباندانی

بشیر علی ۳۲ درجہ دوم
توفیق احمد ۳۳ " "
سید مجیب الدین ۳۴ " "

آرمور ذکور - اُردو عالم

محمد فاروق احمد ۴ درجہ دوم
ظہور خاں ۶ " "
محمد عبدالستار ۱۰ " "
حکیم محمد عبدالرب کوثر ۱۱ - " سوم

آرمور اناث - اُردو عالم

ساجدہ سلطانہ ۱۴ درجہ دوم
نورجہاں بیگم ۱۲ " سوم

اورنگ آباد ذکور - اردو عالم

عشیر احمد غازی ۱۵ درجہ دوم
مقصود خاں ۱۹ " "
عتیق احمد غازی ۱۶ سوم
محمد عبدالوارث ۱۷ " "

محمد غلام عابد ہاشمی ۱۸ درجہ سوم

اورنگ آباد اناث - اُردو عالم

وحیدہ خاتون ۲۱ درجہ دوم
شمیم فاطمہ بیگم ۲۲ " "

بلدہ ذکور - اُردو عالم

(انوار العلوم کالج)
مراد خاں ۲۶ درجہ دوم
سید جعفر علی ۳۰ " "
محمد عثمان ۳۱ " "
محمد عبدالقیوم ۳۲ " "
سید حامد محی الدین قادری ۳۵ " "
محمد حبیب احمد خاں ۳۹ " "
یوسف شریف ۴۰ " "
محمد ابراہیم ۴۱ " "
سید افضال احمد ۴۲ " "
صابر کمال ۴۳ " "
سید عبدالحفیظ قادری شرفی ۴۶ " "
گردھاری پرشاد بھٹناگر ۴۷ " "
محمد ولی اللہ ۴۸ " "
محمد عبدالرافع صدیقی ۵۰ " "
سید رحمت اللہ ۵۲ " "
محمد حسن ۵۳ " "
سید حمایت علی ۲۱۲ " "

سید اکبر الدین ۱۰۶ درجہ دوم	سرپور کاغذ نگر ذکور - اردو عالم	ایم رضا احمد ۱۳۸ درجہ دوم	سید جہانگیر علی ۱۸۰ درجہ دوم
محمد عثمان ۲۸ ״ سوم	محمد ہاشم ۹۴ درجہ دوم	سید حسن میاں ۱۰۸ ״ سوم	بابر ۱۹۶ ״ ״
حامد علی خاں ۳۳ ״ ״	عبدالہادی ۹۶ ״ ״	عطار عباس علی ۱۲۱ ״ ״	محمد صادق علی ۱۷۶ ״ سوم
بلدہ اناث - اردو عالم	عتیق پاشاہ ۱۰۲ ״ ״	محمد عبدالرشید ۱۳۰ ״ ״	محمد محمود علی ۱۷۷ ״ ״
صادق النساء بیگم ۷۵ درجہ دوم	محمد حامد ۱۰۳ ״ ״	سید محمد حسینی ۱۳۲ ״ ״	محمد غوث ۱۷۸ ״ ״
عظمت جہاں ۵۸ ״ ״	محمد سمیع ۱۰۵ ״ ״	حکیم شرف الدین ۱۳۵ ״ ״	عبدالمجیب ۱۸۱ ״ ״
سعیدہ بانو ۶۴ ״ ״	سرپور کاغذ نگر اناث اردو عالم	حافظ محمد محبوب شریف ۱۳۷ ״	محبوب نگر اناث اردو عالم
رضیہ مصطفیٰ ۶۵ ״ ״	سیدہ تنویر آرا بیگم ۹۷ درجہ دوم	کرنول اناث اردو عالم	شاہدہ بیگم جلیلی ۱۸۲ درجہ دوم
زبیدہ سلطانہ بیگ ۶۶ ״ ״	شمیم آرا بیگم ۹۸ ״ ״	امت السلیم ۱۳۹ درجہ دوم	وزیر النساء بیگم ۱۸۳ ״ سوم
مسعود جہاں ۶۹ ״ ״	فلادیز بیگم ۱۰۱ ״ ״	ایم بی زاہدہ بیگم ۱۴۰ ״ ״	بھینسہ ذکور واناث اردو عالم
خیر النساء ۷۲ ״ ״	فہمیدہ پروین ۹۹ ״ سوم	امت العظیم ۱۴۱ ״ ״	محمد انوار احمد ۱۹۸ درجہ دوم
اشرف النساء بیگم ۲۱۱ ״ ״	عاقلہ الیاس ۱۰۰ ״ سوم	کوہیر - ذکور - اردو عالم	محمد ظہیر الدین ۱۹۹ ״ ״
امت الرزاق ارجمند بانو ۲۱۵ ״ سوم	کرنول ذکور - اردو عالم	محمد عبداللطیف آرزو ۱۵۷ دوم	محمد ظہیر الحق ۲۰۰ ״ ״
مہر بانو ۵۹ ״ ״	اعجاز احمد ۱۰۷ درجہ دوم	محمد رفیق احمد ۱۴۷ درجہ سوم	بی راجندر راؤ نائیڈو ۲۰۱ ״ ״
حسن بانو ۶۳ ״ ״	سی عبدالغنی ۱۱۴ ״ ״	محمد اسمٰعیل ۱۵۳ ״ ״	سرور شہزادی ۲۰۷ ״ ״
انیس فاطمہ ۶۸ ״ ״	قاضی محمد عبدالحی ۱۱۵ ״ ״	کوہیر - اناث - اردو عالم	محمد صبغۃ اللہ خاں ۲۰۹ ״ ״
صفیہ سلطانہ ۷۱ ״ ״	سردار عبدالرب ۱۱۲ ״ ״	منور سلطانہ ۱۵۹ درجہ سوم	محمد عبدالصمد ۲۰۲ ״ سوم
طیبہ بیگم بہادر ۲۱۰ ״ ״	بی شیخ صاحب ۱۱۷ ״ ״	انور ساجدہ ۱۶۰ ״ ״	محمد عبدالجلیل صدیقی ۲۰۸ ״ ״
بنگلور ذکور - اردو عالم	سی محمد علی ۱۲۲ ״ ״	نسیم النساء ۱۶۴ ״ ״	محمد عبدالرحیم ۲۰۵
سید کرار حسین ۷۹ درجہ دوم	سید شمس الدین قادری ۱۲۳ ״	محبوب نگر ذکور - اردو عالم	نرمل - ذکور واناث اردو عالم
محمود خاں ۸۱ ״ ״	بی عبدالشکور ۱۲۷ ״ ״	محمد عبدالعزیز ۱۶۵ درجہ دوم	علیم زبیدہ صوفی ۲۱۷ ״ دوم
سید شاہ ابوالحسن ۸۲ ״ ״	سید ظہیر الدین قادری ۱۲۰ ״ ״	محمد شرف الدین ۱۶۷ ״ ״	محمد عبدالمجیب ۲۱۶ ״ سوم
میر علی رضا ۸۳ ״ ״	ایس ایم عبداللطیف ۱۲۹ ״ ״	محمد عبدالمجید ۱۶۸ ״ ״	محمد عبدالجلیل صدیقی ۲۱۸ ״ ״
آر عبدالجبار ۸۵ ״ سوم	محمد عبدالحکیم فاروقی ۱۳۳ ״ ״	غلام جیلانی ۱۶۹ ״ ״	بنگلور اردو فاضل
سید محبوب علی خاں ۲۲۴ ״ ״	سید شاہ رحمت اللہ حسینی ۱۳۴ ״ ״	کے شنکریا ۱۷۰ ״ ״	صفیہ بیگم ۲ درجہ دوم
محمد بیگ ۲۲۵ ״ ״	سردار نعیم الدین ۱۳۶ ״ ״	محمد عبدالعزیز ۱۷۹ ״ ״	کوہیر - اردو فاضل افضل النساء بیگم ۳ درجہ دوم

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد (۳۲) شمارہ (۵)

مئی ۱۹۶۹ء

ماہنامہ

سب رس

سالانہ چھ روپے — غیر ممالک سے دس روپے

ششماہی تین روپے — فی پرچہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

اپریل کا شمارہ نجیب اشرف ندوی نمبر تھا۔ آئندہ ایک شمارہ غالب نمبر ہوگا لیکن ابھی قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس مہینے کا شمارہ ہوگا۔ ہم اپنے معاونین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے رشحات جون کی ۱۵ تاریخ تک عنایت فرمائیں۔ برصغیر ہند و پاکستان سے تقریباً تمام رسایل نے خاص شمارے شائع کئے بلکہ بعض دوسرے حصوں کی اشاعت کا اعلان کیا ہے۔ غالب ایسے شاعر ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور عام خیال یہ تھا کہ اب کیا لکھا جائے گا۔ لیکن فاضل محققین اور نقاد نئی نئی باتیں پیش کر کے دادِ تحسین حاصل کر رہے ہیں اور کرتے جائیں گے۔ اب تک رسایل کے جو غالب نمبر سامنے آئے ہیں ان میں نئی باتیں بھی ہیں اور پرانی بھی۔ کسی نے دادِ تحقیق دی ہے اور کسی نے پرانی تحقیق کو نیا روپ دیا ہے۔ پرانے ادیبوں نے بھی لکھا اور نئے ادیب بھی ابھرے۔ اس طرح یہ غالب ہی کی تشہیر نہیں ہوئی بلکہ ادب کی بھی ایک خدمت ہوئی۔ ادب کی یہ خدمت موقتی تو نہیں بلکہ اثر کسی نہ کسی شکل میں دوام اختیار کرے گا۔ ہم بھی اپنی بے بضاعتی کے باوجود غالب کی بارگاہ میں نذرِ عقیدت پیش کریں گے۔

ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم اور اردو فاضل تمام مراکز پر ایک ساتھ ۵، ۶، ۱۰ اور ۷ جون کو منعقد ہوں گے۔ ۱۵ مئی فیس داخل کرنے کی آخری تاریخ ۲۲ مئی تک دیر انہ کے ساتھ فیس لی جا سکے گی۔

ڈاکٹر محمد عبدالمنان
ریڈر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ

عہد بہمنیہ کی حیاتِ اجتماعی کا ایک جائزہ

سلاطین عہد وسطیٰ کے دورِ حکومت کے ماخذ معاصر فارسی تاریخیں ہیں یا ایسی متاخر تاریخیں ہیں جنھوں نے ان قدیم تاریخوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان تواریخ میں بادشاہوں کی درباری زندگی کی شان و شوکت اور لڑائیوں کی تفصیلات نہایت شرح و بسط کے ساتھ ملتی ہیں لیکن اس زمانے کی معاشرتی زندگی اور معاشی حالات کا پہلو تشنہ رہتا ہے۔ ایسی صورت میں عہد وسطیٰ کے تعلق سے ہمارے معلومات کا ماخذ بیرونی سیاحوں کے بیانات ہیں۔ جنھوں نے وقتاً فوقتاً ہندوستان کی سیاحت کی اور سفرناموں کی صورت میں بیش قیمت مشاہدات اور تاثرات کو پیش کیا۔ بہمنی سلطنت کی ہمسایہ حکومت وجیانگر اس معاملے میں بڑی خوش قسمت ہے کہ دو سیاحوں[1] نے تفصیل سے وہاں کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ بہمنیہ سلطنت کے تعلق سے صرف ایک روسی[2] سیاح کے مشاہدات سے ہم استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کے بیانات بہت مختصر ہیں لیکن اس نے جو کچھ کہا ہے وہ ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر ہے۔ اس میں بادشاہ کو خوش کرنے یا انعام حاصل کرنے کا عنصر کارفرما نہیں ہے۔ اسی بنا پر اس کا سفرنامہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض متاخر تاریخوں میں بھی بادشاہوں کے حالات سیاسی کے علاوہ اجتماعی اور معاشی زندگی کے مرقع مختصر اور دھندلے ملتے ہیں۔ چنانچہ حیات اجتماعی کا خاکہ مرتب کرنے میں برہان مآثر۔ تاریخ فرشتہ۔ طبقاتِ اکبری۔ منتخب التواریخ اور محبوب الوطن سے استفادہ کیا گیا ہے۔ تذکرۃ الملوک اس نقطۂ نظر سے غیر مفید کتاب ہے۔ ملک کے سیاسی حالات اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے بہمنیوں کی تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو پہلی نظر میں یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سلاطین میں امن و امان کا زمانہ مختصر رہا۔

علاء الدین حسن اور محمد شاہ اول دونوں بڑے طاقتور بادشاہ تھے۔ ان کی سخت گیری ... حکمرانی کی بنا پر رعایا امن و چین سے زندگی بسر کرتی تھی ... سلطنت کا زمانہ تو فانی ... خونریزی ... میں گزرا۔ اس بنا پر رعایا کی ظلم و ستم کی حد نہ رہی ...

---

۱ NICOLO DI CON[TI] اور عبدالرزاق سمرقندی　　　۲ ATHANASIUS NIKITIN

سلطنت کے کاموں سے دلچسپی تھی۔ بستر مرگ پر بھی اس نے داد خواہوں کے ساتھ انصاف کرنے میں کوتاہی نہیں کی اپنی چھ مہینے کی علالت کے زمانے میں بھی وہ دادخواہوں کو دن میں تین مرتبہ بار دیتا اور مظلوموں کے ساتھ انصاف کرتا تھا۔ اس نے اپنے انتقال سے قبل غیر مشروط طور پر تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔ محمد شاہ اول کا زمانہ ملک کی سیاسی تنظیم کے علاوہ ملک کی خوشحالی اور آسودگی کا تھا۔ محمد شاہ دوم فیاض، رعایا پرور اور ستودہ صفات کا مالک تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں ادنیٰ و اعلیٰ کا مال اس وجہ سے کام ما نہ پایا۔ محمود گاواں کا دورِ وزارت بھی عام طور پر رعایا کی خوشحالی اور فارغ البالی کا دور تھا۔ اس مختصر دور خوشحالی اور آسودگی کے ماسوا سلطنت بہمنیہ کا بیشتر زمانہ پرسکون نہیں تھا جس کے حسب ذیل وجوہ تھے :-

(۱) جانشینی تخت و تاج کا مستقل اور باضابطہ قانون نہیں تھا۔ چنانچہ ۱۹-۲۰ سال کے مختصر عرصے میں چار بادشاہوں یعنی مجاہد شاہ، داؤد شاہ، غیاث الدین اور شمس الدین کے قتل یا معزولی نے ریاست کے امن و امان کو متاثر کیا۔ اس انتشار اور خون خرابے سے سلطنت کے وقار اور طاقت کو سخت دھکا پہونچا۔ خاندان شاہی کا ہر فرد بادشاہت کا خواب دیکھنے لگا جس سے بدنظمی اور انتشار کی کیفیت پیدا ہوگئی۔

(۲) تخت حکومت پر اکثر کم عمر شاہزادوں کی جلوہ افروزی نے اندرون اور بیرون ملک حکومت کے وقار اور رعب کو متاثر کیا جس کی وجہ سے آئے دن نت نئے فتنے و فساد سر اٹھاتے تھے۔

(۳) اندرون ملک طبقہ واری کشمکش اور سیاسی رقابت نے لوگوں کے جان و مال کو غیر محفوظ کر دیا جس کی وجہ سے مملکت ایک کاردان اور مخلص وزیر محمود گاواں کی خدمات سے محروم ہوگئی۔

(۴) ہمسایہ ممالک اور خصوصیت سے وجیا نگر سے پیہم لڑائیوں نے بادشاہ کی توجہ کو فوجی تنظیم دفاعی استحکامات کی طرف مبذول رکھا۔ بادشاہ کو رعایا کی فلاح و بہبود کے کاموں کیلئے وقت نہیں ملتا تھا

مذکورہ بالا سیاسی وجوہ کے باوجود ان کے زمانے میں بحیثیت مجموعی رعایا کی عام زندگی پرامن رہی اور رعایا بادشاہوں کی فیاضی اور حسن سلوک سے متمتع ہوتی رہی۔ ذیل میں اس دور کی اجتماعی زندگی کے چند نمایاں خدوخال پیش کئے جاتے ہیں۔

درباری زندگی

بہمنی دربار میں دستار کے ساتھ جانا لازمی تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ منصبداری دستار کے موجد سلاطین تیموریہ ہیں۔ درآں حالیکہ منصبداری[1] دستار کا رواج سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ کے دور کی یادگار ہے۔ جس کو بادشاہ نے گانگو پنڈت کی تحریک سے ایجاد کیا[2] تھا

ملہ تاریخ فرشتہ جلد اول مقالہ سوم صفحہ (۲۸۰)

ملہ محبوب الوطن صفحہ (۲۱۲)

ترتیب

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سنہ اجرا: ۱۹۳۸ء   ستمبر ۱۹۶۸ء

جلد: (۳۱)
شمارہ: (۹)

ماہنامہ

سب رس

(ادارہ نمبر)

نگران

پروفیسر سید علی اکبر

مجلس مشاورت

میر حسن • ڈاکٹر گوپی چند نارنگ • ڈاکٹر راج سکسینہ • ڈاکٹر غلام عمر خاں • محمد منظور احمد

مہتمم

محمد اکبر الدین صدیقی

منتظم

وقار خلیل

زر سالانہ: چھ روپئے   ادارہ نمبر: ایک روپیہ   غیر ممالک سے: دس روپئے
(نمونہ کا پرچہ: ۷۵ پیسے)   فی پرچہ: ۵۰ پیسے

ادارہ ادبیات اردو، ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن

بہمنیؒ نے اس کے بجائے دستار نما تاج تیار کرکے اختیار کیا۔ امراء اور وزراء کا درباری لباس یکساں ہوتا تھا دربارِ عام میں استغاثہ اور غیر استغاثہ بے شمار جمع ہوتے تھے۔ بادشاہ ہر ایک کی فریاد سنتا اور اکثر کا تصفیہ دربار ہی میں کر دیتا تھا اور باقی درخواستوں کا تصفیہ دوسرے یا تیسرے دن ہو جاتا تھا۔ دربار میں سُرخ لباس مظلوم کی علامت سمجھی جاتی تھی اور ان کی دادرسی فی الفور ہو جاتی تھی۔ سلاطین بہمنیہ میں فیروز شاہ صاحب ذوق بادشاہ تھا۔ اس کے شائستہ مذاق کی بدولت حیاتِ عامہ کے تمام شعبوں میں نئی لہریں دوڑ گئیں۔ اس نے ملک کے لباس وضع قطع اور کھانے پینے کے طریقوں میں دلکشی پیدا کی اور نت نئے پوشاک بنائے۔

(۴) شاہی اصلاحات و قوانین کا اثر اجتماعی زندگی پر:

محمد شاہ اولؒ نے حضرت شیخ زین الدینؒ کی ہدایت پر شراب نوشی سے توبہ کر لی اور پایۂ تخت سے تمام شراب خانوں اور نشہ بازی کے اڈوں کو اٹھا دینے کا حکم صادر کر دیا۔ شراب کی خرید و فروخت بند کر دی گئی۔ چوروں اور قزاقوں کو جو مسافروں اور راہ گیروں پر عرصۂ حیات تنگ کر رہے تھے ان کی بیخ کنی کے احکام نافذ کیے۔ بادشاہ کے حکم کے مطابق ہر طرف دارنے قزاقوں کے اڈوں پر حملہ کر کے چھ سات مہینے کے عرصے میں ان کی جماعت کو نیست و نابود کر دیا۔ ان کارروائیوں سے راستے پر امن ہو گئے اور رعایا کی جان و مال ان ظالموں سے محفوظ ہو گئی۔

علاء الدین احمد شاہ ثانیؒ نے اپنے دورِ حکومت میں عام حکم جاری کر دیا تھا کہ مملکت کا ہر شخص شراب و قمار بازی سے پرہیز کرے۔ شہروں اور قصبوں میں ایماندار محتسب مقرر کیے گئے تھے۔ ان دو معاشرتی برائیوں کے انسداد کا ایسا سخت انتظام تھا کہ لوگ نہ تو شراب اور دوسری نشہ آور چیزیں علانیہ خرید سکتے تھے اور نہ جوا کھیل سکتے تھے۔ حکومت کی سخت تاکید کے باوجود شراب پینے والوں کے حلق میں سیسہ گرم کرکے ڈالا جاتا تھا۔ اسی طرح طوائف و رسوا عورتوں پر بھی سخت پابندی تھی۔ بادشاہ ان اخلاقی جرائم کے انسداد میں اس قدر سخت تھا کہ وہ اپنے بیٹے، رنگ اور متعلقین کسی کی بھی رو رعایت نہیں کرتا تھا۔ سب سے زیادہ تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ خود بادشاہ [illegible] عادی اور عیش و عشرت کا دلدادہ تھا لیکن رعایا کو ان اخلاقی برائیوں میں مبتلا [illegible] [illegible] کہ اگر کوئی بھیک مانگنے کی اجازت نہیں تھی۔ جو لوگ سوال کرتے دیکھے جاتے وہ [illegible] [illegible] [illegible] طوق ڈالا جاتا اور ان کو سزائیں [illegible] [illegible]

تاریخ دکن حصہ اول مقالہ سوم صفحہ [illegible]

[illegible] صفحہ ۳۳۳

لگا دیا جاتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ سخت محنت کی وجہ سے گداگری سے باز آجائیں اور باعزت طریقے سے محنت کرکے روزی کمائیں۔

(۳) نذرِ عیدین و جشنِ نوروز عید و جشنِ نوروز[1] رعایا اور سپاہ کے تالیف قلوب اور دلداری کے بہترین موقعے تھے۔ شاہانِ بہمنیہ جن کو رعایا سے محبت اور لگاؤ تھا باقاعدگی سے ملوک عجم کی طرح ان کو قومی اور سرکاری عیدوں کی طرح مناتے تھے۔ سپاہی، عہدہ دار، اعیان سلطنت اور مشائخ نہایت ادب سے نذر گزرانتے تھے۔ بادشاہ بھی ان موقعوں پر سپاہیوں اور امیروں کی کارگذاری اور خدمات کو بنظرِ اہمیت دیکھتے ہوئے، صلات و خطابات سے سرفراز کرتا تھا۔ سلطان علاء الدین حسن بڑے پیمانہ پر سالانہ عید اور نوروز جشن منعقد کرتا تھا۔ ان موقعوں پر دربار ریشمین فرش، رنگین قالین، مخمل اور زر لبفت کے مسندوں اور تکیوں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ دیواروں کی آرائش نقش و نگار سے ہوتی تھی۔ دروازوں پر مخمل کاشانی اور اطلس خراسانی پردے ڈالے جاتے تھے۔ دربار کے تینوں طرف دروازوں پر چوبداروں اور نقیبوں کا مجمع رہتا تھا۔ سوار اور پیادے عمدہ لباس پہنے ہوئے دو طرفہ کھڑے رہتے تھے۔ امرار اور درباری آتے اور تین مرتبہ تسلیم و کورنش بجالاتے اور ہر ایک ڈیوڑھی سے گذر کر دربار میں باریاب ہوتا تھا۔ رقم نذرانہ پانچ ہون یا گیارہ ہون یا اس سے زیادہ ہوتی تھی۔ نذر دینے والا باربک کے ذریعے بادشاہ کے سامنے نذر پیش کرتا تھا۔ بادشاہ اس پر ہاتھ رکھتا تھا اور یہ قبولیت نذر کی علامت تھی نذر کی ادائیگی کے بعد تمام حاضرین دربار کی شاہی ضیافت ہوتی تھی۔ دعوت سے فراغت پانے کے بعد محفل طرب منعقد ہوتی تھی۔ رخصت کے وقت بادشاہی خدمتگار ہر ایک پر گلاب پاشی کرتا تھا اور عطر و پان سے تواضع کی جاتی تھی۔

(۴) میت کے مراسم عبدالجبار ملکاپوری نے لمحقات طبقات ناصری کے حوالے سے لکھا ہے کہ بہمنیوں کے زمانے میں میت کی فاتحہ سوم مقبرے میں کرنے کا عام رواج تھا۔ علماء، مشائخ، حفاظ اور متعلقین مرحوم مقبرے میں جمع ہوتے تھے۔ فجر سے ۱۰ بجے تک قرآن خوانی ہوتی تھی۔ اہل مجلس پر گلاب پاشی ہوتی تھی۔ گلاب اور کیوڑہ کا شربت پلایا جاتا تھا۔ ختم کے بعد فاتحہ خوانی ہوتی تھی۔ حاضرین کو ایک ایک گلوری پان اور شیرینی کی تقسیم کا طریقہ تھا جو اب بھی باقی ہے۔

(۵) قیام امن کیلئے تدابیر اندرون ملک امن و امان برقرار رکھنے کیلئے پولیس کا ایک مستقل محکمہ قائم تھا۔ اس محکمے کے افسر اعلیٰ کو کوتوال کہتے تھے جس کے ماتحت کئی عہدہ دار اور

---

[1] محبوب الوطن صفحہ (۱۲۳)   [2] محبوب الوطن صفحہ (۲۹)

صدہا جوان ہوتے تھے۔ ملک میں جھگڑے اور فساد کی روک تھام، واردات ہو جانے کی صورت میں اس کی تفتیش اور تحقیق، ملزم کا پتہ لگانا اور اس کو سزا دلوانا بھی اسی کے فرائض میں داخل تھا۔ معمولی مقدمات کی سماعت اور بہ حیثیت مجسٹریٹ سزا دینے کا اختیار بھی کوتوال کو حاصل تھا۔ اس کے علاوہ قیدیوں کی نگرانی اور قید خانے کے انتظامات بھی ان کے سپرد تھے۔

(۶) بین قومی اتحاد اور یکجہتی

فیروز شاہ سلاطین بہمنیہ میں بڑا بیدار مغز بادشاہ گذرا ہے۔ اس کا مطمح نگاہ سلطنت کے تمام طبقات کو اخوت اور محبت کے رشتے میں منسلک کرنا تھا۔ سلطنت میں تین جغرافیہ اور تین قومیتیں پائی جاتی تھیں۔ ان تینوں قومیتوں یعنی تلنگی، کنڑی اور مرہٹی بولنے والوں میں آپس میں بے حد تفاوت تھا۔ اس کے علاوہ جب ترک یہاں آئے تو وہ اپنے رسم و رواج اور شعار ملی کی بنا پر مقامی باشندوں سے الگ معلوم ہوتے تھے۔ ان تمام مختلف طبقات کی اجتماعی شیرازہ بندی ضروری تھی۔ اس مقصد کی خاطر فیروز شاہ نے دکن کی تمام زبانیں سیکھیں اور ان کی معاشرت اور تہذیب سے واقفیت حاصل کی۔ وہ اہل دکن سے نہایت فصاحت اور روانی کے ساتھ ان کی زبانوں میں گفتگو کرتا تھا گویا یہ زبانیں اس کی مادری زبانیں تھیں۔ چنانچہ جب وہ بیجانگر کے راجہ بکا دوم سے ملنے گیا تو اس سے کنڑی زبان میں گفتگو کی۔ اس کی وجہ سے دکن کی مقامی زبانوں کو فروغ حاصل ہوا بلکہ ان قومیتوں کو تقویت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ ملک کے نظم و نسق میں مقامی ہندو باشندے بھی شریک کئے گئے۔ ان کے تفویض مال اور محاسبی کے محکمے بطور خاص کئے گئے۔ چنانچہ ستیش[1] راناڈے کہتا ہے۔

> مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندوؤں کو بہت کچھ آزادی حاصل تھی۔ مسلم سلاطین نے صیغہ فوج و مال کے اختیارات ہندوؤں کے سپرد کر رکھے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کو بھی کئی جاگیریں دے رکھی تھیں۔ ہندوؤں کو سرکاری دفاتر کا انچارج بنایا گیا۔ ایک برہمن خاندان کو نسلاً بعد نسل [illegible] جاگیریں دی گئی تھیں۔

لالہ لاجپت[2] رائے کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

> بہمنی خاندان نے عموماً ہندوؤں کے ساتھ [illegible] مال کی انتظام قریباً سارا ہندوؤں کے ہاتھ میں [illegible] علاوہ فیروز شاہ نے ہندو [illegible] نتیجے میں [illegible]

۱۔ [illegible] صفحہ ۴۴ ۲۔ [illegible] ۱۱

دونوں میں بہت کم فرق معلوم ہوتا تھا۔ مقامی ہندو آبادی بہمنی سلطنت کو اپنی سلطنت اور فیروز شاہ کو دکن کا قومی بادشاہ سمجھنے لگی۔ یہ وصف شمال کی افغان سلطنت کو نصیب نہیں تھا اور وہاں کے مقامی ہندو سلطنت سے خوش نہیں تھے اور سرکاری ملازمت سے گریز کرتے تھے۔ دکن میں سب سے پہلے بہمنیوں نے ہندو اور مسلمان دونوں کو آپس شیر و شکر کر دیا جب مغل ہندوستان آئے تو انھوں نے اس مثال سے فائدہ اٹھایا اور بہمنیوں کے مسلک کی پیروی

(۷) ضیافت و مجالس مہمانی

سلطان علاء الدین حسن نے ولی عہد سلطنت شہزادہ محمدؔ کی شادی ملک سیف غوری کی لڑکی سے طے کی۔ اس تقریب کا انتظام بڑے شاندار پیمانہ کیا گیا۔ مساجد اور خانقاہوں میں روزانہ محتاجوں اور مسکینوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ منجنیقوں یا مشینوں ذریعے سے جو راستے پر نصب تھے شیرینی اور میوے روزانہ لٹائے جاتے تھے اس کے علاوہ زربفت[1] مخمل کی دس ہزار قبائیں ایک ہزار عربی گھوڑے اور دو سو جڑاؤ خنجر اور شمشیر اہل دربار میں تقسیم کئے گئے۔ اس شا امیران صدہ اور راجگان ہند کی بڑی تعداد، جو تھی کولاس شکر کھڑا، کرناٹک اور رمدگل کے راجہ اس تقریب شریک تھے بادشاہ نے تمام کو خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا۔ وہ ان تمام حلیف راجاؤں سے دوستانہ طریقے ملتا تھا اور تمام راجہ بھی نہایت ادب سے کورنش اور تسلیم بجا لاتے تھے۔ بادشاہ نے ان کی مہمانداری اور حسن میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ شہر گلبرگہ کو آرائش اور زیبائش سے رشک فردوس بنا دیا گیا تھا۔ ہر کوچہ بازار گلزار کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ ہر محلے میں باورچی خانے قائم تھے۔ امیر و فقیر بغیر روک ٹوک اس خوانِ نعمت فیض پاتے تھے۔ ہنود کیلئے ہر مقام پر انبار خانے قائم کر دیئے گئے تھے جہاں ہر ایک کو خشک طعام مع تمام لو تقسیم کیا جاتا تھا۔ ان انتظامات کے صدر نگران کار ملک سیف الدین غوری اور ان کا مددگار گانگوی پنڈ تھا۔ اہل اسلام کا انتظام ملک موصوف کے سپرد تھا اور اہل ہنود کی تقسیم و مدارات پنڈت سے متعلق تھی۔ رنگ اور رقص و سرود سے شہر گونج اٹھا تھا۔ محمد شاہ اول نے شاہزادہ مجاہد کی شادی اور احمد شاہ اول شہزادہ محمد کی شادی کا انتظام اسی طرح شاہانہ پیمانہ پر کیا۔ ان تقاریب میں مہمانوں کی تواضع کن کھانوں سے جاتی تھی ان کی تفصیل کسی تاریخ میں دستیاب نہیں ہوتی ہے۔ البتہ عصامی[2] نے ایک شاہی ضیافت کے کھانوں تفصیل یوں بیان کی ہے:۔

سلطان علاؤالدین حسن دولت آباد سے سگر کی بغاوت فرو کرنے کے بعد گلبرگہ پہونچے اعظم ہمایوں خواجہ جہاں وزیر ممالک اور طرفدار گلبرگہ سے قلعوں کی تسخیر کی تفصیل دریافت کی۔ وزیر نے بادشا

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول مقالہ سوم صفحہ ۲۷۸ [2] فتوح السلاطین صفحہ ۵۸۰ — ۵۸۲

تمام تفصیلات سے واقف کرایا۔ جب دن کا بڑا حصہ گذر گیا تو بادشاہ نے ملک سندیک کو وزیر کے اعزاز میں شاہی ضیافت ترتیب دینے کا حکم دیا۔ نقیبوں کی ڈنکل نوازی سے ضیافت کے انتظامات کا آغاز ہوا۔ دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے چنے گئے۔ تمام دعوت کا ہر شخص کو اجازت تھی۔ قسم قسم کے کھانوں سے [illegible] کی بو کی طرح مہک رہا تھا۔ ریشمی دسترخوان بچھائے گئے جن پر گیہوں کی خمیری اور روغنی روٹیاں رکھی گئیں۔ اس کے بعد تلا ہوا گوشت رکھا گیا۔ جن کے ساتھ سبزے اور پکی ہوئی ترکاریوں کے ساتھ مولی اور سلاد وغیرہ کی کچی ترکاریاں بھی رکھی گئیں۔ ان تمام لوازمات کی مہک سے دسترخوان بوستان کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ایک ایک شفاف اور بڑے برتن میں مرغ، کبوتر اور بکرے کے تلے ہوئے کباب دسترخوان پر سید ھے اور بائیں جانب رکھے گئے جن کی مقدار ایک سپاہی کے لیے کافی ہو جاتی تھی۔ کھانے کے اختتام پر نانواز [illegible] اور [illegible] اور میووں کی گئی۔ اس کے بعد مشروبات پر اس شاہی ضیافت کا اختتام ہوا۔ یہ ضیافت امرائے شاہی اور اعیان سلطنت تک محدود نہیں تھی بلکہ گلبرگہ کے تمام شہریوں کو اس میں [illegible] کے بعد بادشاہ کا امراء اور سرداران [illegible] کیا گیا۔

(باقی آئندہ)

سید یوسف کمال بخاری

داستانِ مخطوطاتِ ہند

قلمی کتاب کو انگریزی میں MANUSCRIPT کہتے ہیں یہ انگریزی لفظ مرکب ہے اور دو لاطینی الفاظ سے مل کر بنا ہے MANU اور SCRIPT لفظ MANU کے معنی ہیں "ہاتھ" اور SCRIPT مشتق ہے SCRiBCRE سے جس کے لغوی معنی ہیں "لکھنا" لہٰذا اس لفظ کے معنی ہوئے "ہاتھ سے لکھا ہوا" جو دوسری مطبوعہ کتابوں سے ممیّز ہو۔ یوں ہر وہ چیز جو ہاتھ سے لکھی گئی ہو خواہ وہ کسی قسم کے کاغذ، پتھر، نباتات، جمادات، ہڈی، چمڑے پر ہو وہ قلمی تحریر کے ضمن میں آجاتی ہے۔ لیکن فی الحال اس لفظ کے عمومی معنی کا اطلاق اُس کتاب پر ہوتا ہے جو ہاتھ سے کاغذ پر لکھی گئی ہو۔

مختصر تاریخ مخطوطات نویسی

مخطوطات نویسی کی تاریخ کی ابتداء اس وقت سے ہوتی ہے۔ جب نسل انسانی کو اس امر کا احساس پیدا ہوا کہ منہ سے نکلے ہوئے الفاظ تحریر میں تبدیل کرنے چاہئیں تاکہ انسانی خیالات، افکار و احساسات جو وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہیں ان کی ایک مستقل دستاویز وجود میں آجائے اور اس مقصد کے حصول کیلئے فن تحریر ایجاد کیا گیا۔

جید مورخ ابن ندیم کے بقول فن تحریر کے موجد بابائے نسل انسانی حضرت آدم تھے۔ جنھوں نے اپنی تحریروں کو اینٹوں پر لکھا اور آفتاب کی روشنی میں تپا کر پختہ بنا لیا لیکن بدقسمتی سے اینٹوں کا یہ کتب خانہ حضرت نوحؑ کے زمانہ میں غرقِ سیلاب ہو گیا۔

ابن ندیم کا یہ بیان بعض محققین کے ہاں پر مستند قرار نہ پائے اگرچہ خود ابن ندیم کے بقول وہ کتب خانہ آج موجود نہیں ہے لیکن اینٹوں پر تحریر شدہ مکمل قلمی نسخوں کی دریافت جن کا تعلق ۸۶۶ ق۔م۔ آشور نذر پال ثانی کے زمانہ سے ہے۔ اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ اینٹوں پر یہ طریقۂ تحریر عرصۂ ماسبق سے چلا آرہا تھا جسے بعد کی نسلوں نے مزید خدوخال درست کر کے ترقی دی۔

بعد مدت مدید، تاریخیات کے قدیم ترین تہذیب اہل مصر سے تقریباً پانچ ہزار سال ق۔م۔ دور جو اہل مصر نے ایک خط ایجاد کیا جسے وہ اپنی تحریروں میں آزادانہ طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ خط ہیروغلیفی کے نام سے موسوم ہوا۔ بعدہٗ سامری تہذیب، مصری تہذیب کی بابل میں جانشین بنی۔ سامریوں نے دریائے دجلہ و فرات سے

ویرانوں اور مشرق قریب کی نشیبی وادیوں میں ایک عظیم تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ ان لوگوں نے ایک طرز تحریر ایجاد کیا جو خط سامری کے نام سے ہوا۔ اہل سامری سامی عرب تھے۔ ان کے ملک پر اہل آشور نے قبضہ جما لیا اور بعد میں اس علاقہ میں پھیل گئے جو آج شام کے نام سے معروف ہے۔ ان لوگوں نے ایک خط ایجاد کیا جو خط "میخی" کے نام سے موسوم ہوا۔ اس خط کے حروف نوک دار شکل کے تھے۔ اس لئے عرف عام میں اس خط کو خط میخی کہا گیا۔ اس دور کے کتبات اس خط تحریر کی تصدیق کرتے ہیں یہ خط تحریر ایرانیوں نے اہل آشور سے سیکھا۔ یہ بائیں سے دائیں جانب متوازی طور پر لکھا جاتا ہے یہ آریوں کا قدیم ترین خط تھا۔ ایران میں متعدد مقامات پر اس خط میں تحریر شدہ کتبات ملتے ہیں جیسے بسیقون ونقش رستم وغیرہ۔

اس زمانہ میں دوسرا خط موسوم بہ تصویری رسم الخط بھی مروج و مستعمل تھا۔ یہ چینی خط تھا جو آج بھی رائج ہے۔ یہ خط بجائے حروف کے چھوٹی چھوٹی تصویروں سے مرکب ہے۔ ہر لفظ کے لئے ایک تصویری خاکہ IDEOGRAM ہے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ کچھ مزید حرف شامل کرلئے گئے۔ ہر حرف ہماری موجودہ حروف تہجی کی طرح کسی نہ کسی آواز (صوت) کیلئے مخصوص ہوگیا۔ ان صوتی حروف کی تصویری رسم الخط کے ساتھ آمیزش ہوگئی۔ قدرتی طور پر چینی حروف کی مجموعی تعداد بہت بڑی گویا پینتالیس ۴۵ ہزار حروف پر مشتمل ہے۔ ان حروف کو سیکھنے کیلئے ایک عمر درکار ہے اور پھر بھی صرف آدھے الفاظ ہی بمشکل تمام سیکھے جاسکتے ہیں جو وقت دوسری چیزوں کے سیکھنے میں استعمال کیا جاسکتا تھا۔

تہذیب ہند بھی تہذیب مصر کی طرح قدیم ہے۔ تہذیب وادیٔ ہند پانچ ہزار سال قبل کے تمدن و ثقافت کی غمازی کرتی ہے۔ قدیم ترین تحریروں کے نمونے آج بھی ۵۵۰ مہروں کی شکل میں موجود ہیں یہ مہریں جن پر ایک سینگ والے بیل کی شکل بنی ہے ہنجودارو کی کھدائی میں دستیاب ہوئی تھیں۔ اگرچہ ابھی تک ان تحریروں کی عبارت اور مفہوم کسی کی سمجھ میں نہیں آیا ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ ہم مستقبل میں ایک نہ ایک روز اس کی عبارت پڑھنے اور سمجھنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ یہ بھی عمودی شکل میں تصویری رسم الخط سے مشابہ ہیں۔

زبانیں ہندوستان ایک بہت وسیع ملک ہے جو برصغیر کے نام سے موسوم ہے۔ ہر صوبہ کی اپنی ایک علیحدہ زبان ہے اور یوں علاوہ ان سولہ زبانوں کے جو دستور اساسی ہند میں تسلیم کی گئی ہیں ہندوستان کے طول و عرض میں زبانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مخطوطات تمام ہندوستانی زبانوں اور حکمراں اقوام کی زبانوں میں ملک کے طول و عرض میں بے شمار تعداد میں ملتے ہیں مخطوطات تین مخصوص زبانوں میں

۱؎ لعنت کا نگ شی (از ۱۶۶۲ء تا ۱۷۲۲ء)

آج تک موجود ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں (۱) سنسکرت۔ پالی۔ پراکرت۔ اپابھرنش۔ اودھی۔ برج بھاشا۔ ہندی' یہ شمالی ہند کی زبانیں ہیں۔ تامل تلنگی۔ ملیالم کنڑی (یہ چار زبانیں جنوبی ہند کی ہیں) اور پھر عربی' فارسی' پشتو' ترکی اور اردو میں بھی مخطوطات لکھے گئے یہ کتابیں مخطوطات ہند کے مسلم دور میں تیار ہوئے جن کی تخلیق میں مسلمانوں کے حکمراں طبقہ' عمائدین ملک' فنکار اور ہندوؤں کے اس طبقہ نے جو ان زبانوں سے واقف تھا حصہ لیا۔

سنسکرت نے قدیم ہندوستان کی مستند آریائی اور اہم زبان ہونے کی بناء پر قلمی تحریروں اور کتابوں کے میدان میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سنسکرت زبان آریائی حکومت کی ابتداء سے ہی مذہبی' دیوبانی اور عدالتی زبان رہی ہے اور آج بھی مذہبی زبان تصور کی جاتی ہے۔ مخطوطات لکھنے کا ذریعہ سنسکرت زبان کو بنایا گیا جو ہندوستان کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس زبان کے قدیم ترین مخطوطات آج بھی دستیاب ہیں۔

تامل بھی ہندوستان کی بہت ہی اہم اور قدیم زبان ہے جو ملک کے جنوب میں صوبہ مدراس میں بولی جاتی ہے۔ اہل تامل کے بقول تامل زبان سنسکرت سے بھی زیادہ قدیم زبان ہے۔ مختلف موضوعات پر علم کے قیمتی خزانے مخطوطات کی شکل میں تاڑ کے پتوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ تاڑ پتر پر لاکھوں کی تعداد میں مخطوطات جنوبی ہند خصوصاً مدراس میں تامل بولنے والے برہمنوں کے گھروں میں بکھرے پڑے ہیں۔

عربی و فارسی زبانوں میں بھی بے شمار قلمی کتابیں معرض وجود میں آئیں' ہندوستان میں مسلم حکمراں طبقہ نے ان زبانوں کو درباری زبان کی حیثیت سے استعمال کیا۔ علاوہ ازیں آبادی کا ایک معتد بہ حصہ ان زبانوں کو اپنی مادری زبان کی حیثیت سے بھی بولتا تھا۔ خصوصاً فارسی۔ تاریخ ہند کو قلمبند کرنے کیلئے کتابیات و مخطوطات کی شکل میں فارسی زبان نے ایک عظیم و اہم کردار ادا کیا ہے۔ تاریخ ہند کے عہد وسطیٰ کو سمجھنے' حکمراں طبقہ کے کارہائے نمایاں کو جاننے' عوام کے کردار' اسلامی فن' آثار قدیمہ' تمدن و ثقافت۔ طرز تعمیر کو براہ راست ذرائع سے معلوم کرنے کیلئے فارسی زبان کا جاننا نہایت ضروری و لازمی ہے۔ تاریخ ہند کا یہ دور طول طویل زمانہ تک پھیلا ہوا ہے۔ جس کا آغاز عربوں کے دور حکومت آٹھویں صدی عیسوی سے لیکر مغلیہ حکومت کے زوال یعنی انیسویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔

اردو ہندوستان کی دیسی (VERNACULAR) زبان ہے جس کی شاخیں سنسکرت و ہندی زبانوں سے پھوٹ کر نکلی ہیں۔ یہ زبان ہندوستان کے طول و عرض میں بولی جاتی ہے جو کسی علاقہ میں دوسری زبانوں کی مانند محدود نہیں ہے۔ اس زبان میں بکثرت لسانی ہاتھ سے لکھے گئے جو مخطوطات کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

انگریزی بھی ایک زبان ہے جس پر قیمتی دستاویزات ملک کے طول و عرض میں دستاویزات (REECORDS OFFICES) کے دفاتر میں بھرے پڑے ہیں۔ انگریزی ہندوستان میں برطانوی دور حکومت

سرکاری زبان تھی اور آج بھی ہنوز زیرِ استعمال ہے۔ ہندوستانی راجوں اور نوابوں کے ساتھ برطانوی حکمران طبقہ کی خط و کتابت، فرامین، احکامات اور مکتوبات مندرجہ بالا ذخیروں میں محفوظ ہیں۔

مقامات ملک کے سب ہی حصوں میں قلمی کتابیں بڑی تعداد میں لکھی گئیں۔ لاکھوں قلمی نسخے [illegible] مقدس مقامات مثلاً مندر، مٹھ، درگاہ، مدرسے، کتب خانے [illegible] اور دیگر مقامات پر موجود ہیں۔ ہندوستانی زبانوں میں لکھے جانے والے قلمی کتابوں کے مخصوص مرکزوں میں [illegible] شمالی ہندوستان، بنگال، جنوبی ہند اور کشمیر تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کی قلمی کتابوں کیلئے دہلی، آگرہ، لاہور، لکھنؤ [illegible] پایہ تخت گولکنڈہ، بیجاپور، احمدنگر، خاندیش، حیدرآباد، بھوپال، جونپور اور احمدآباد وغیرہ [illegible] تمدنی مراکز تھے۔ متذکرہ بالا تمام مقامات ہندوستان میں اسلامی دورِ حکومت کے زمانے میں تہذیب کے مراکز تھے جن کا اکثر ذکر عربی، فارسی اور اردو کے قلمی نسخوں کے خاتمہ کتاب میں ملتا ہے یعنی جس شہر میں یہ کتاب تحریر ہوئی تھی اس شہر کا نام خاتمہ کتاب میں درج کر دیا جاتا تھا اور ان ہی حوالوں سے ہم نے یہ معلومات فراہم کی ہیں کہ کون کون مقامات پر قلمی کتابیں قلمبند کی گئیں۔

مخطوطات کے ذخیروں میں نہ صرف ہندوستانی بلکہ غیر ملکی کتب بھی [illegible] موجود ہیں۔ [illegible] قلمی کتابوں کی ایک بڑی تعداد [illegible] نیپال اور برما سے [illegible] ہوئے نسخوں پر مشتمل ہے جو دورِ قدیم کی عکاسی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں عرب ممالک، ایران، افغانستان، ترکی سے آئی ہوئی کتابیں عہد وسطیٰ کی ترجمانی [illegible] یہ ہندوستانی ذخائر میں موجود ہیں۔ مسلم فرمانروا بالراست یا تو عربی النسل تھے یا ترکی النسل یا ایرانی النسل اور ان کے درباروں میں درباری زبان کی حیثیت سے مستعمل تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ عوام بھی روزمرہ کے کاموں میں اس زبان کا استعمال کرتے تھے۔ ایرانیوں کی ایک خاصی تعداد مسلم فرمانرواؤں کی ملازمت پر مامور رہی۔

رسم الخطوط جن زبانوں اور جن مقامات پر مخطوطات لکھے گئے اس کا اوپر میں ذکر [illegible] ان مختلف خطوں کا ذکر کروں گا جن میں یہ کتابیں احاطہ تحریر میں [illegible] نسخ، تعلیق، خطِ شکستہ، خطِ کوفی، [illegible] و غلیفی، خطِ میخی اور خطِ تصویری کا ذکر کیا ہے۔ ہندوستانی خطوط بھی یقیناً ان ہی مخطوطات [illegible] جو بعد ہمارے سامنے موجودہ شکل میں آگئے ہیں۔ ہندوستانی زبانوں میں قلمی نسخے لکھنے کیلئے متعدد [illegible] استعمال ہوئیں لیکن میں ان میں اہم ترین کا ذکر ذیل میں کرتا ہوں۔

(۱) برہمی (۲) کھروشٹی (۳) شاردا (۴) ناگری (۵) نواڑی (۶) [illegible]

برہمی قدیم ترین تاریخی طرزِ تحریر ہے جس میں لکھے ہوئے ہمیں [illegible] کندہ کئے ہوئے ستوپ کے سنگی کتبے ملتے ہیں۔ اس خط کی وجہ تسمیہ [illegible] دیوتا برہما کی [illegible] برہمی [illegible]

دُنیا" تصور کیا جاتا ہے۔ یہ خط بائیں سے دائیں جانب لکھا جاتا تھا۔

اسی دور میں ہمیں ایک دوسرا طرز خط ملتا ہے جو کھروشٹی کے نام سے موسوم ہے اور اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ دائیں سے بائیں جانب لکھا جاتا تھا جو کہ ہندوستان شمال مغربی علاقہ میں مستعمل تھا۔ اشوک کے کتبے اس رسم الخط میں بھی بدھ مذہب کی تعلیمات اور اس کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں ملتے ہیں۔ کشمیر میں ایک اور رسم الخط استعمال ہوتا تھا جو شاردا رسم الخط کے نام سے مشہور ہے۔

اب ہم شمالی ہند کے قلمی نسخوں کی تحریر پر روشنی ڈالیں گے۔ دیوناگری رسم الخط مغربی ہند کی کتابوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ مخصوص طور سے جینیوں کی کتابیں "کلپ سوتر" ہمیں دیوناگری میں ملتی ہیں۔ دراصل دیوناگری کے لفظی معنی ہیں 'مہذب خط' یا شہری رسم الخط یہ بہت دیدہ زیب اور خوبصورت خط ہے جو بکثرت کتابوں میں شمالی ہند میں استعمال کیا گیا ہے اور اب بھی ایک ترقی یافتہ شکل میں زیر استعمال ہے۔ نواڑی بھی ایک رسم الخط کا نام ہے جو نیپالی اور تبتی کتابوں میں بدھ مذہب سے متعلق موضوعات پر استعمال ہوا ہے۔

جنوبی ہند میں تامل، تلیگو، ملیالیم اور کنڑی بہت معروف و اہم طرز خط ہیں جو ان ہی زبانوں کی کتابوں میں تحریر ہیں۔

عربی، فارسی، ترکی، پشتو زبانوں میں لکھے ہوئے قلمی نسخوں میں جو رسم ہائے خطوط استعمال ہوئے ہیں ان کی تعداد بہت بڑی ہے۔ دوسو بیس مختلف قسم کے خطوط ہندوستان میں تیار کردہ قلمی نسخوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ چونکہ اسلام میں جاندار اشیاء کی تصویر کشی فنون لطیفہ کے میدان میں ممنوع قرار دی گئی ہے اس لئے اہل اسلام نے اپنے کمال فن اور جولانئ طبع کا اظہار خوبصورت و دیدہ زیب رسم الخط کی ایک کثیر تعداد کی شکل میں کیا حتیٰ کہ اسلامی و شرعی ممانعت سے احتراز کی غرض سے تحریر میں پرندوں اور حیوانوں کی ایسی شکلیں صفحۂ قرطاس پر بنائیں کہ وہ بظاہر تو تصویر نظر آتی ہیں لیکن فی الحقیقت تحریر ہوتی ہے۔ اس طرز خط کا نام طغریٰ رکھا گیا جسے بسا اوقات ایک معمہ کی طرح حل کرنا پڑتا ہے۔

یہاں میں چند اہم ترین خطوط کا ہی ذکر کروں گا جو تمام دوسرے خطوط کا سرچشمہ ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں:-

(۱) خط کوفی (۲) خط نسخ (۳) خط ثلث (۴) خط محقق (۵) خط ریحان (۶) خط توقیع (۷) خط رقاع۔ (۸) خط نستعلیق (۹) خط شکستہ۔

خط کوفی تقریباً قدیم ترین خط ہے جو زاویہ قائمہ (۹۰ ڈگری) بناتا ہوا لکھا جاتا ہے۔ نیشنل میوزیم نئی دہلی اور دیگر مقامات پر بھی مثلاً جامع مسجد دہلی، سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں خط کوفی میں تحریر شدہ قرآن مجید اور

اس کے جداگانہ اوراق ملتے ہیں۔ اس کے بعد خط نسخ ایجاد ہوا جس کے معنی مٹا دینا یا ترک کر دینے کے ہیں چونکہ خط کوفی کو ترک کر دیا تھا اس لئے اس کے جانشین خط کا نام خط نسخ پڑا۔ یہ نصف دائرہ بناتا ہوا منحنی اشکال میں لکھا جاتا ہے۔ اس رسم الخط کے بعد خط ثلث ایجاد ہوا گویا نسخ کا جانشین ثلث قرار پایا۔ دراصل ثلث کے معنی تین کے ہیں چنانچہ اس خط کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے حروف مثلث نما تین جانبوں سے گھرے ہوتے ہیں پھر بعد کے زمانے میں بہت سے خطوط ابھرتے گئے . . . . . شکستہ خط عدالتی و دفتری کارروائی میں کام آیا۔ اس کے حروف ٹوٹے ٹوٹے سے نظر آتے ہیں سب سے آخر میں خط نستعلیق ایجاد ہوا جو بہت خوبصورت، دیدہ زیب اور ترقی یافتہ خط سمجھا جاتا ہے اور آج ہندوستان و پاکستان میں اسی خط میں تمام کاروبار خط و کتابت طباعت و اشاعت ہوتی ہے۔ اس خط میں حروف کے پورے دائرے عمودی، افقی کشش شوشے و منحنی سطریں خوبصورتی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں علاوہ ازیں ایک اور بھی اہم طرز خط ہے جس کا اوپر حوالہ گذر چکا ہے اور وہ خط طغریٰ کے نام سے موسوم ہے یہ خط تزئینی مقصد کیلئے ایجاد کیا گیا جس میں پرندوں اور حیوانوں کی شکلیں یا اور اقلیدسی کمالات کا خاکہ اُتارا جاتا ہے جسے معمہ کی طرح بعض اوقات حل کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً بسم اللہ الرحمن الرحیم سیدھی اور الٹی دونوں جانب سے لکھا جاتا ہے جیسا کسی فوٹو کا NEGATIVE اور پھر POSITIUE منفی و مثبت پہلو۔

موضوعات ہندو اور اسلامی دور پر مشتمل ہندوستانی مخطوطات شعبۂ زندگی کے ہر پہلو پر بکثرت لکھے گئے جن کی ایک عظیم و کثیر تعداد آج بھی موجود ہے۔ ان قلمی کتابوں کے مصنفین بڑے بڑے جید علماء، مذہبی رہنما، محققین، سائنسداں فنکار اور مورخین تھے۔

ہندو دور کے مخطوطات میں جن موضوعات پر قلمی نسخے لکھے گئے ان کا بیشتر حصہ مذہب، فلسفہ، ادب، تان ترک اور سائنس کے موضوعات پر مشتمل تھا۔ مذہب کے شعبے میں ہیں ویدک دھرم کی کتابوں مثلاً اپنشد، پران، گیتا، رامائن، جین مذہب کی کتابوں میں کلپ سوتر لکھے گئے جن میں تیرتھنکروں کی سوانح حیات اور ان کی زندگیوں سے متعلق قصے کہانیاں تحریر میں آئے۔ اسی طرح بودھ دھرم کے رہنماؤں پر تری بودھی ستوا کے نام سے موسوم ہیں اور وہ قصے کہانیاں جو گوتم بدھ کی زندگی سے متعلق لکھی گئیں وہ جاتک کے نام سے موسوم ہیں تان ترک فلسفے پر کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئیں یہ فلسفہ دراصل علم نجوم سے متعلق ہے سائنس کے میدان میں بھی کتابیں لکھی گئیں خصوصاً ویدک طرز علاج پر انجینیرنگ فنون اور حرفت پر

جہاں تک مسلم دور کے مخطوطات کا تعلق ہے تو ان کے موضوعات میں مذہب اور اس کی جزئیات یعنی نقل قرآن مقدس، تفاسیر، حدیث، فقہ، ادب اور اس کی جزئیات میں عربی، فارسی اور اردو نثر و نظم جس میں نثر میں فلسفہ خصوصاً تصوف پر جن کی تعداد خاصی بڑی ہے کتابیں لکھی گئیں۔ علاوہ ازیں تاریخ پر بھی کتابوں کا

نامہ وغیرہ تحریر میں آیا۔ کیونکہ علم تاریخ کے موجد مسلمان ہی ہیں اور اسی موضوع پر صحیح معنوں میں مسلمانوں نے ہی کتابیں لکھیں۔ تقریباً حکمراں طبقہ کے ہر دور میں اس فرمانروا کے دور کی تاریخ قلمبند کی گئی بلکہ بسا اوقات بڑی مبسوط تاریخیں معرض وجود میں آئیں مثلاً کتاب الہند جو محمود غزنوی کے دور کے ہندوستان پر روشنی ڈالتی ہے۔ تاج المآثر، طبقات ناصری، تاریخ فیروز شاہی، اکبر نامہ اور بادشاہ نامہ وغیرہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی اسلامی دور کی معروف تاریخی کتابیں ہیں اور ان کتابوں کے قلمی نسخے جا بجا کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ ان تاریخی کتابوں کے علاوہ تاریخی مخطوطات کا ایک بہت بڑا حصہ فرامین شاہی منشور، پروانوں اور نشان کی شکل میں ملتا ہے یہ فرامین احکامات ہیں جنھیں بادشاہوں، ملکاؤں اور شہزادوں، جاگیرداروں نے وقتاً فوقتاً جاری کئے۔ اس قسم کے ہزاروں مخطوطات کتب خانوں اور نجی الماریوں میں بھرے پڑے ہیں جو تاریخی تحقیقات اور تاریخ نویسی کیلئے ہمیں مواد فراہم کرتے ہیں قطع نظر اس سے مسلمانوں نے سائنس کے موضوعات پر بھی قلمی کتابیں لکھیں۔ علم طب پر کافی تعداد میں کتابیں لکھی گئیں جو طب یونانی کے نام سے موسوم ہے، فنون لطیفہ، فن تعمیر، انجنیرنگ، خطاطی، جلد سازی وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی گئی۔

نقش و نگار و تصاویر

ہم قلمی کتابوں کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں (۱) سادہ کتابیں (۲) مصور و مزین کتابیں۔ اول الذکر کو کافی تفصیل سے اوپر بیان کیا جا چکا ہے ثانی الذکر مصور کتابوں میں سب سے پہلے ہمیں کلپ سوتر کی کتابیں ملتی ہیں جن میں مغربی طرز مصوری نظر آتی ہے۔ یہ کتابیں جین مذہب کے مختلف موضوعات پر مصوروں کی سوانح حیات خصوصاً مہاویر اور ان کے حواریوں کے حالات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اس کے بعد ہمیں دبستان کشمیر، بنگال، اڑیسہ، جنوبی ہند کی خطی کتابیں اپنی اپنی مقامی خصوصیات کے ساتھ نظر آتی ہیں یہ مخطوطات ہندو دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جہاں تک عربی و فارسی مخطوطات کا تزئینی و تصویری نقطۂ نگاہ سے تعلق ہے۔ ان میں سب سے پہلے ہمیں قرآن شریف کے ایسے بے مثال زریں آرائش و زیبائش سے پُر نسخے ملتے ہیں کہ گذشتہ تمام نقوش و آرائش ماند پڑ جاتے ہیں۔ چونکہ قرآن کے نسخوں میں نقاش کسی جاندار شے کی شکل بنانے سے قاصر تھا اس لئے ان سے اپنا جوہر کمال کتاب مقدس کے صفحات کو بالخصوص پہلے دو صفحوں کو اقلیدسی نقوش گل ہائے رنگارنگ برگ ہائے گوناگوں سے مزین کر کے ظاہر کیا۔

چھوٹے پیمانہ پر کتابی تصاویر کے مختلف دبستان قائم ہوئے جن میں دبستان ہائے ایران، دکن اور مغل مشہور ہیں۔ دبستان ایران ہندی نژاد نہیں تھا لیکن دکنی اسکول اور مغلیہ دبستان تصاویر یہیں کی پیداوار ہیں البتہ ان پر ایرانی خصوصیات کا عکس ملتا ہے۔ علاوہ ازیں اوسط درجہ کے دبستان ہائے تصاویر

(باقی صفحہ نمبر ۴۲ پر)

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

ادبی تنقید میں فن برائے فن کا نظریہ

ادب برائے ادب کا نظریہ بنیادی طور پر انیسویں صدی میں یورپ کے [illegible] نقادوں کے خیالات میں ابھر کر سامنے آیا۔ بلا شبہ ارسطو نے مسرت و انبساط کو شاعری کی غایت قرار دیا تھا [illegible] میں [illegible] مفکروں نے اس نظریہ کو مستحکم کیا۔ شیلر (SCHILLER) اور اس کے شاگرد رابنسن (ROBINSON) کا عقیدہ تھا کہ ادب خود ایک مقصود ہے علیحدہ سے اس کا کوئی مقصد نہیں۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ غالباً یورپی ناقدوں [illegible] ان مبالغہ آمیز نظریات کا رد عمل تھا جس میں وہ اشعار کو تعلیمی مقاصد کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ ارسطو سے قبل اہل یونان بھی شاعری کا مقصد تعلیم ہی تصور کرتے تھے۔

جتنا قد اس نظریہ کے حامل ہیں وہ [illegible] کرتے ہیں کہ ادب کا سوا [illegible] کے کوئی دوسرا مقصد نہیں۔ اسی وجہ سے وہ اس کو فن خالص یا فن محض سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر ان ناقدوں کو کوئی ادبی کتاب دکھا کر ان سے دریافت کیا جائے کہ اس کتاب کا مقصد کیا ہے؟ اس میں کس [illegible] کی ترجمانی کی گئی ہے تو وہ فوراً بول اٹھیں گے کہ ادب کا سوا حسن و جمال کے کوئی دوسرا مقصد نہیں۔ وہ ادب کا [illegible] رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ادب حسن پر مبنی ہے اور بس۔ وہ ان اخلاقی اور سماجی اقدار سے مطلق [illegible] نہیں [illegible] ادب برائے ادب مستعمل ہوتا ہے۔ ادب برائے ادب کے حامل ناقد ابو [illegible] الفاظ استعمال کرتے ہیں مثلاً جمالی احساس جمال آزادی فن [illegible] موسیقی اور اس انداز کے دوسرے الفاظ جن کا تعلق عموماً ظاہر سے ہے باطن سے نہیں۔

حقیقی مسرت [illegible] کے حسن نہیں بلکہ حسین چیز کا خیال انسان کو مسرت [illegible] ناقدوں [illegible] لذت کا وہ سرمایہ جو شعر پڑھ کر قاری کو حاصل [illegible] جمالیاتی کیفیت کے اظہار کا نام تنقید رکھتے ہیں [illegible] جیسے اہم موضوعات کو خارج [illegible]

وہ کلام حسن و جمال پیدا کرنا انسان کا [illegible] پیدا ہوتی ہے اگر کوئی [illegible] پاس [illegible]

اور نمایاں ہو کر سامنے آئے گا اور اس کے مطالعہ سے روح انسانی کو جو مسرت حاصل ہوگی وہ بذاتِ خود فن کا حا
پائے گی۔ یہ احساس جمال جس میں تعلیمی مقاصد مفقود ہوں اور جذبات کا غیر معمولی غلبہ بھی نہ ہو فن برائے فن
نمونہ ہے۔ ہر وہ شئے جو روح کو مجلی کرے اور دل کو اہتزاز و نشاط کی دولت بخشے اور اس میں حسن موجود ہو و
برائے فن کا مواد بن سکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن یہ معاملہ جذبہ سے مختلف ہے اس لئے کہ جذبہ قلب کو مسحور کر
اور حقیقت سے آدمی کو دور بھی کر سکتا ہے۔

فن برائے فن کی تحریک انیسویں صدی میں فرانس میں پیدا ہوئی مگر انگلستان پہونچ کر وہ پروا
اور اس مرحلہ میں پہونچ کر فن و جمال دونوں ادب کا مقصد بن گئے۔ وائلڈ (WILDE) کہتا ہے کہ "جمال ایک ا
اور علامتوں کی علامت ہے۔ وہ ہر شئے کے چہرے سے نقاب کشائی کرتا ہے اس لئے کہ کسی شئے کا اظہار نہیں کرتا یہ
فلسفیانہ تخیل ہے وسٹر (WHISTLER) واضح طور پر کہتا ہے کہ "فن تکمیل کا خواہاں ہوتا ہے وہ تعلیمی افادہ کی جا
چنداں توجہ نہیں کرتا۔ وہ ہر حال اور ہر کیفیت میں جمال کا متلاشی رہتا ہے۔"

یہاں یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ فن برائے فن کے حامی بھی ایک بات پر متفق نظر آتے ہیں یعنی وہ جم
غایت فن قرار دیتے ہیں اس لئے یہ دعوی مبنی بر حقیقت نہیں کہ فن کا کوئی مقصد نہیں۔

بعض ناقدوں کا تصور ہے کہ فن کے مقصد کے تعین میں جذبہ کو غیر معمولی دخل ہے اگر فن کسی اچھے
جذبے کو ابھارتا ہے تو وہ فن کی مقصد برآری کرتا ہے۔

بعضوں کا خیال ہے کہ تجربہ کو فن کی غایت قرار دینا چاہئے! وائلڈ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ
پیدا کرنا چاہیئے۔ جذبہ کیلئے اس لئے کہ بغیر جذبہ کے عمل ممکن نہیں۔

بہر حال فن برائے فن میں جمالیات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ بعض ناقدوں کا خیال ہے
اشیاء کے ظاہر میں رنگ مرکز جمال نظر آتے ہیں اسی طرح اگر زبان میں عمدہ الفاظ حسین ترکیب اور متوازن عبارت اس
تو جمالیاتی احساس کو ابھارا جا سکتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ تخیل بھی جاندار ہو تو جذبات زیادہ آسانی سے ابھارے جا
وزن و قافیہ کی قوت تو انسانی کلام میں روحانی و الہی کیفیت و قوت کے جلوے دکھا سکتی ہے۔ اس کی وجہ کفر
وزن و قافیہ محض مجرد شکل میں نہیں رہ جاتے بلکہ وہ جذبات و خیالات کے حسین پیکر میں سراپا حسن بن کر نمو
ہیں اور دل میں خود اپنا اثر پیدا کر لیتے ہیں یہ دراصل فن کا کرشمہ ہے وائلڈ کہتا ہے کہ جو ادب خوشی، سرور، غم،
یا کسی طور سے ہماری کسی ضرورت کو پورا کرے وہ ادب فن کے دائرہ سے خارج ہے۔

میر محمود حسین

عابد میسوری اور نقشِ مراد

مرزا زین العابدین عابدؔ جو عرفِ عام میں منشی عابد کہلاتے ہیں شہر میسور کے پہلے اردو شاعر تھے اور آپ کی تصنیف مثنوی نقشِ مراد اردو کی پہلی کتاب ہے جو اس شہر میں لکھی گئی۔ آپ کے اور آپ کے آباء و اجداد کے کچھ حالات "خلاصۂ فصاحت" نامی مخطوطے سے ملتے ہیں جو آپ کے ایک صاحب زادے مرزا مہدی کے فارسی مکاتیب کا مجموعہ ہے اور جو ان کے خاندان میں موجود ہے۔ یہ اس مجموعے کا تاریخی نام ہے اور اس سے اس کی تاریخ تکمیل ۱۳۰۵ھ نکلتی ہے۔ خود عابدؔ نے اپنی مثنوی نقشِ مراد میں اپنا شجرہ نسب یہ بتایا ہے۔

عابد ابن العسکری ابن السمیع　بن تقی یادگار ابن البدیع

مرزا مہدی نے لکھا ہے کہ آپ کے جدِ اعلیٰ مرزا بدیع اپنے فرزند یادگار علی کے ساتھ ایران سے نکلے، حج و زیارت سے فارغ ہو کر دہلی پہنچے، بادشاہ وقت کی قدر شناسی اور کرم فرمائی سے متاثر ہوئے تو بال بچوں کو ایران سے بلایا اور دہلی میں مقیم ہو گئے۔

یہ خاندان ایک مدت تک دہلی میں آباد رہا۔ پھر جب دہلی میں بدامنی اور تباہی کا دور دورہ ہوا تو عابدؔ کے والد مرزا عسکری اپنے اہل و عیال کے ساتھ دکن ہجرت کر آئے، اور ٹیپو سلطان کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ سلطان نے آپ کو ڈھاڑواڑ ضلع کے میر صدور یعنی قلعوں کی مہتممی کے منصب پر مامور کیا اور ظفر پیکر کے خطاب سے بھی نوازا۔ اس وقت عابدؔ کا سن تیرہ سال کا تھا۔ مرزا عسکری اپنی وفات تک اس منصب پر بحال رہے۔ عابدؔ نے اپنے والد سے دینیات اور ادبیات کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی وفات کے بعد سلطان نے آپ کو سری رنگ پٹن میں غنی کچہری کا بخشی مامور کر دیا۔ یہ فوج کا ایک دفتر تھا اور آپ گویا اس کے سکریٹری تھے۔ آپ چھ سال تک یہ خدمت بحسن و خوبی انجام دیتے رہے ... یہاں تک کہ ۱۷۹۹ء میں سلطان نے شہادت پائی اور سلطنت خداداد کا تختہ الٹ گیا۔ پٹن کے دوران قیام میں آپ نے فاضل مدرس میر فیاض عسکری سے بھی شرفِ تلمذ حاصل کیا، جو قادر باری اور انشائے عسکری کے مصنف گزرے ہیں۔ قادر باری آپ نے خالق باری کی طرز پر ۱۲۱۰ھ میں کہی تھی اور انشا بھی اسی زمانے میں مرتب کی۔ ان دونوں کے نسخے میسور، حیدرآباد وغیرہ کی مخطوطہ لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

زوالِ سلطنت خداداد کے بعد تین سال عابدؔ [illegible] عالی [illegible] میں [illegible] قتل عام [illegible] سے جو علماء فضلا اور معززین بچ رہے پٹن سے نکلے اور [illegible] مقامات میں [illegible]

ایک منشی اور منجم غلام حسین میسور آئے ہوئے تھے اور راج دربار میں ملازم ہو گئے، آپ کی تصانیف کے مخطوطے بھی اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ میسور اور سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں محفوظ ہیں، میر فیاض عسکری بھی میسور آ گئے، ان کے ساتھ عابد بھی میسور آکر بس گئے۔ زوال سلطنت خداداد کے بعد بھی ایک مدت تک دربار اور سرکار کی زبان فارسی رہی، غلام حسین منجم راج دربار منشی مامور ہوئے تو برطانوی ریذیڈنٹ ولکس نے عابد کو ریذیڈنسی کے دفتر کا میر منشی بنا لیا، اس نے تاریخ میسور مرتب کی تو منشی عابد سے بھی کام لیا، اس نے لکھا ہے کہ سلطان التواریخ کا نسخہ اسے عابد کے گھر سے ملا، اسے انھوں نے بڑی عزت اور حفاظت سے مقفل رکھا تھا، یہ تاریخ غیر مکمل ہے لیکن اس کی اہمیت اس بنیاد پر قائم ہے کہ سلطان کے حکم سے انہیں کے زیر نگرانی اسے دربار میں لکھا گیا تھا، اس کا ایک قلمی نسخہ مدراس کی اورینٹل لائبریری میں موجود ہے۔

منشی عابد چند سال ریذیڈنسی میں مامور رہے پھر اس کے بعد راج دربار سے متعلق ہو گئے، کہا جاتا ہے کہ آپ نے مہاراجا کرشن راج وڈیر سوم کو اردو اور فارسی پڑھائی جو ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد تخت نشین ہوئے تھے یہ مہاراجا برطانوی گورنروں، ریذیڈنٹوں اور افسروں سے اردو میں گفتگو کرتے تھے، کیوں کہ آپ انگریزی سے ناواقف تھے اور انگریز کنڑا سے نابلد دربار اور دیوان ریاست کی خط و کتابت برطانوی ریذیڈنٹ اور مدراس اور کلکتے کے گورنروں فارسی میں ہوتی تھی، اس کے کچھ مسودے سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہیں جو منشی غلام حسین منشی میر حسین وغیرہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ حصول ملازمت کے بعد منشی عابد نے میسور میں لگ بھگ پچاس سال بڑی فارغ البالی اور شان و شوکت سے گزارے، مہاراجہ نے ایک وسیع خطہ زمین آپ کو مل گیا جہاں آج ایک محلہ ہی آباد ہے اسے آج بھی منشی محلہ کہتے ہیں آپ نے اپنے رہائشی مکان سے متصل ایک عاشور خانہ بھی بنا لیا جس کا تاریخی نام خود آپ نے رشک بہشت رکھا، اس سے سال بنا سنہ ۱۲۲۷ھ نکلتا ہے۔

میسور کے دوران قیام میں آپ نے فارسی اور اردو دونوں میں کافی تعداد میں مناقب، مراثی اور نوحے وغیرہ لکھے جو یہاں کی مجلسوں میں ہمیشہ پڑھے جاتے تھے، ان کے علاوہ نقش مراد اردو میں آپ کی ایک مثنوی ہے، اس میں آپ نے طالب کے عشق اور سلطان مغرب کی دختر کے حسن کی داستان بڑے دلکش اور دلآویز انداز میں نظم کی ہے لیکن اس کے باوجود ساری مثنوی پر حضرت سیدنا علی مرتضیٰؓ کی مدح و عقیدت کا رنگ چھایا ہوا ہے، اس مثنوی میں شاعرانہ جوہر کھلے ہیں، زبان کی شیرینی، بیان کی رنگینی، روانی، منظر نگاری، کردار نگاری، پر لطف تشبیہیں اور استعارے، صنائع بدائع وغیرہ ساری خوبیاں اس میں موجود ہیں، قصہ واقعی ہو یا فرضی اسے آپ نے اصلیت اور حقیقت کا رنگ بخشا ہے، پڑھنے والا یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہتا کہ داستان گوئی آپ کا مقصد نہیں بلکہ حضرت شیر خداؓ کی مدح و ثنا مطمح نظر ہے، زبان نہ خالص دکھنی ہے نہ ٹھیٹ اردو، دونوں کا امتزاج اس میں ملتا ہے، یہ مثنوی میسوری اردو کے اس دور کی یادگار ہے جب دکھنی اور اردو یعنی قدیم و جدید کی کشمکش سی تھی آپ کے معاصر لطیف ارکاٹی اور جنوبی ہند کے دوسرے

ہم عصر شعراء کے کلام سے بھی اس کا پتا چلتا ہے۔ مثنوی میں ابیات کی تعداد جملہ پانسو سترہ ہے۔ اس مثنوی کو چند ابواب یا فصول پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر فصل کا عنوان فارسی نثر میں لکھا ہے۔ حمد و نعت کے بعد عشق کا بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔۔

بہترین ذکر ذکر عشق ہے
خوشترین نام ذکر عشق ہے

سبب تصنیف یہ بتایا ہے کہ یہ نقل تو تواتر سے سنی تھی چنانچہ اسے مدرس شیدا کے رنگ میں نظم کر دیا اور اس کا نام نقش بامراد رکھا۔ قصہ یہ ہے کہ کشور مغرب میں طالب نامی ایک خوبرو سادہ دل اور شریف نوجوان سلطان مغرب کی دختر پر عاشق ہو گیا۔ اس کا یہ حال ہو گیا کہ:۔

عشق سے ایسا ہوا بے اختیار   حال اوس کا جگ میں پایا اشتہار
تذکرہ ہوتا تھا اس کا گھر بہ گھر   تاکہ سلطان تک یہ جا پہنچی خبر
ناصحوں کی نا نصیحت کارگر   نا طبیبوں کی تھی حکمت کارگر

اس کی دیوانگی کا حال سلطان مغرب نے سنا تو اہل دربار سے مشورہ کیا۔ کسی نے اسے گردن زدنی قرار دیا۔ کسی نے جلا وطن کرنے کی رائے دی۔ آخر یہ طے ہوا کہ وہ اگر مدینے جائے اور حیدر کرار کا سر لے آئے تو شہزادی اس کے [illegible] دی جائے۔

شیدا کی شجاعت تھوڑی یقین تھا کہ وہ [illegible] کے ہاتھوں مارا جائے گا اور یوں اس سے نجات مل جائے گی [illegible]

مارتا ہوں [illegible]   راہ میں معشوق [illegible]
[illegible]

واعجب [illegible]   [illegible]
[illegible]   [illegible]
[illegible]   [illegible]
[illegible]   چل ادھر [illegible]

طالب کو [illegible] کا خیال آتا تھا۔

حیدر کرار [illegible]   [illegible]
[illegible]

[illegible]   [illegible]
[illegible]   [illegible]

الغرض روتا دھوتا آہ وزاری کرتا دعائیں مانگتا مدینے پہنچا۔

کے ہزاراں آفتاں سے ہو کے پار　　　یارے آ پہنچا مدینے کے دیار

حضرت علی سے ملاقات ہوئی، آپ نے فرمایا۔

حیدر کرار ہے میرا ہی نام !!!　　　کہہ دے کیا ہیگا ترے تئیں مجھ سے کام

طالب نے جرات کر کے آپ سے مبارزت طلب کی' آپ نے اسے بہت کچھ سمجھایا مگر وہ کسی طرح باز نہ آیا تو آپ نے داؤ میں اسے زیر کرلیا اور حلق پر خنجر چلانا چاہا تو وہ زار زار رونے لگا۔

گر حسرت دل ستی دھونے لگا　　　آنکھ سے آنسو بہا رونے لگا

اور کہنے لگا کہ مجھے جلد ذبح کر دیجیے' مجھے نجات مل جائے گی اور آپ کا بڑا احسان ہوگا حضرت علیؓ کو بڑا اچنبھا ہوا' اس کی دل جاری کرنے لگے اور حال پوچھا تو اس نے رو رو کر بتایا۔

دل مرا اٹکا ہے اک دلبر کے سات　　　ہیگا وعدہ اوس کا تیرے سر کے سات

سر سے تیرے وعدۂ دیدار ہے　　　سر سے تیرے مجھ کو وصل یار ہے

سر ترا ہے وعدہ میرے یار کا　　　سر ترا ہے مہر اوس دلدار کا

سو تو تیرا سر کہاں اور میں کہاں　　　اب وصال یار میرے تئیں کہاں

حضرت نے یہ سن کر فرمایا۔

مدعا تیرا کیا میں نے قبول　　　سر بجا مرا نہ کر خاطر ملول

بہت اچھا ہوگا' میں بند ننگ و نام سے رہا ہو جاؤں گا' مجھے لذات نفسانی اور شہوات جسمانی سے کام نہیں میں جنگ اللہ کے حکم اور رسول اللہ کے دین کی خاطر کرتا ہوں۔

نامرادی سے سجا یہاں آکے تو　　　پھر نہ ایسا وقت پاویگا کبھو

طالب دریائے حیرت میں غرق ہوگیا' عرض کیا۔

اور کہا اے قبلہ عرش بریں　　　آفریں صد آفریں صد آفریں

آفریں تجھ پر ترے آئین پر　　　مرحبا ہے تجھ پہ تیرے دین پر

میں سراسر نادم اور بہت شرمندہ ہوں' مجھ گنہگار سے اپنا دل صاف فرمائیے' مجھے معاف فرما دیجیے' اپنی غلامی میں لے لیجیے اور اپنے دین کی تلقین کیجیے' چنانچہ طالب کو آپ نے مسلمان بنادیا' پھر اسے لے کر بحر میں ملک مغرب پہنچے' فرمایا' مجھے اسیر اور قیدی کی طرح سلطان مغرب کے دربار میں لے چل اور اپنا مدعا حاصل کر لے' وہ یہ جرات کرنے کو تیار نہ ہوا' لیکن حضرت کے اصرار پر مجبوراً آمادہ ہوگیا' حضرت کو دربار سلطان میں لے گیا اور شاہ مغرب سے کہا۔

تو کہا تھا لاوے اوس کے سر کتیں — دیکھیں لایا ہوں خود حیدر کتیں

بادشاہ بہت حیران ہوا، سوال جواب کے بعد سارا حال سن کر اتنا متاثر ہو گیا کہ اس نے بھی مع سارے اہل دربار کے حضرت کی غلامی بطیب خاطر قبول کرلی اور سب دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے، اس طرح طالب عشق مجازی کی راہ سے عشق حقیقی کی منزل پر پہنچا، یہاں عابد کہتے ہیں ؎

حُبِ حیدر دولت جاوید ہے — حبِ حیدر حاصل اُمید ہے

اور یہی گویا ساری مثنوی کا ماحصل ہے، آپ نے حکم دیا تو سلطان مغرب نے اپنی دختر کو طالب کے نکاح میں دے دیا، اس شادی کا منظر عابد نے بہت خوب پیش کیا ہے اور پر لطف سماں باندھا ہے ؎

جب کیا یہ بیز شادی شروع — شاہزادی کی ہوئی شادی شروع
دیکھ کر گلزار عشرت پہ بہار — لے کھڑا خورشید جام زرنگار
آسمان کے سر پہ تھے طبقات نور — تھے زمین پر انجمن ہائے سرور
مجلس انجم پہ ہر دم خندہ زن — شاہدان بزم و شوخان چمن !!
آئنہ خانے میں عکس ہر پری — اصل پر اپنی کرے جادوگری
پرورش میں خواب فرش مخملی — پائے معشوقاں میں لاوے گدگلی
خوبرویان ستم افزائے شوق — گلعذاران چمن پیرائے ذوق
لے بہا پوشاک شاہانی کے سات — نو بنو رخت عروسانی کے سات
سب نے مل اوس رشک خوبانی کیتیں — صدر شاہی پر گئے کرسی نشیں
قصہ کوتہ وہ ہنر پیراستہ — شاہزادی کو کئے آراستہ
کر کے اوس نازک بدن کو نازنیں — بعدہٗ خلوت میں کی خلوت نشیں
کیا وہ خلوت خلوتِ اسرار دوست — کیا وہ خلوت خلوت دیدار دوست
خوابگہ تھا عین بیداری کے سات — میکدہ تھا عین ہشیاری کے سات

حضرت علیؓ نے سب کو سلطان بنایا، طالب کا عقد نکاح باندھا اور دعائیں دیتے ہوئے مدینہ منورہ لوٹ گئے۔

مثنوی کا قصہ بڑا دلکش اور پر لطف ہے اور عابد کے زبان و بیان نے اسے رنگین بنا دیا ہے۔

آخر میں بارگاہ الٰہی میں مناجات کی ہے اور قطعہ تاریخ اسی بحر میں لکھا ہے، مثنوی ۱۲۱۸ھ میں تکمیل کو پہنچی تھی یعنی زوال سلطنت خداداد کے تین سال بعد، اس مثنوی کے دو مخطوطہ نسخے موجود ہیں، ایک اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ جامعہ میسور میں اور دوسرا جامعہ عثمانیہ کی مخطوطہ لائبریری میں، دونوں خود مصنف کے دست خاص سے لکھے ہوئے ہیں

اور ترقیمے میں سال نقل ۱۲۴۷ھ بتایا گیا ہے۔ دونوں نسخے اس قدر بوسیدہ اور کرم خوردہ ہو چکے ہیں کہ اب ان کی صحیح نقل بمشکل ہی لی جا سکے گی۔

مسودہ، حیدر آباد دونوں مقامات کے نسخوں پر ایک شخص علی سلطان طالب نے اپنے ہاتھ سے فارسی میں مثنوی کا دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ آپ ماہ جمادی الاول سنہ ۱۲۲۳ھ میں مدراس سے یا مدراس کی راہ سے میسور آئے اور کچھ مدت تک یہاں قیام کیا۔ واپسی پر اپنے ساتھ عابد کا کچھ کلام بطور ارمغان لے گئے۔ یہاں کے دوران قیام میں مثنوی نقش مراد نظر سے گزری تو اسے بہت پسند کیا اور موشح قطعہ اردو میں اس کی تعریف و توصیف میں کہا جس سے آپ کا تخلص، شاعر کا نام، مثنوی کی تاریخ اور دیباچے کی تاریخ سب نکلتے ہیں۔ مخطوطے کا یہ حصہ بہت کرم خوردہ ہے اور بمشکل سے چند شعر پڑھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ؎

طمع کب کیسۂ گردوں سے ہم رکھتے ہیں — ایک ہمت ہے تو سو لاکھ درم رکھتے ہیں

لرزہ آفاق میں ہوتا ہے یہ خوبان زہور — بزم میں شوخی سے جب اپنا قدم رکھتے ہیں

حال دل اپنا کہیں کس سے بہر شام و صباح — کہ غم یار جو رکھتے ہیں الم رکھتے ہیں

مبدع شعر کی توشیح مجنح کا عشق !!! — ردف سے تا بروی اہل عجم رکھتے ہیں

اپنی یہ رباعی بھی درج کی ہے ؎

گر مطلب وصل یار جوئیم مشکل — ور کہ چہ ہجر او بپوئیم مشکل

طالب دل را عجب مصیبت پیش است — گوئیم مشکل و گر نہ گوئیم مشکل

دیباچے میں عابد اور سان کے کلام کی مبالغہ آمیز تعریف لکھی ہے جس طرح قدیم تذکرہ نگار لکھتے ہیں مثلاً :-

"از خدمت فیض درجت آں وہ ارباب تحقیق سالک مسلک تصدیق جویائے آثار طریق ربانی راہ رو جادہ دل ال حانی مجمع الفضائل منبع الشمائل پیرو آئین یقین مرزا زین العابدین المتخلص بعابد کہ دام از آواز طبع بلند و شکفتہ فکر مشکل پسند ساغر کش تمنا بود مستفیض و مستفید شدہ غنچہ پر درد دل را از نسیم بالطف منیش شگفتگی داد و بر زخم ہائے جگر پارہ خویش از طراوت بخشی سخن تنیش مرہم نہاد۔

مرزائے موصوف ہم آں قدر حلاوت بخشید کہ عذب البیانش تحریر نمی آید و رطب اللسانش تقریر نمی گنجد عجب معنی سنج زماں و سخنور دوران است کہ زبان در توصیف رنگینی سخن لال و قوت سامعہ را از استماع حرف و حکایتش در استقبال ہمای

فکرش کہ بر آسمان سخن دانی بلند پرواز است اگر مرغ روحش خوانم بجا است وشہباز بحنش کہ در بلند پروازی ہوای معانی ممتاز است اگر ازطائر ان (و پرندہ شمارم ارزد ا۔

روزی نبود کہ گل خاطر احباب استنشام گلدستہ سخن نوبہارش معطر نمی شد و شبی نبود کہ غنچہ دل ارادت منزل بہ نسیم عنبر شمیم سواد سطور مشک بارش معنبر نبے

طالب نے مثنوی کی ایک نقل بھی لے لی۔

"سبحان اللہ عجیب مثنوی کہ بعول وقت از دست خولیش نقل رسالہ مذکور گرفت"

لکھا ہے کہ اسے میں اپنے اساتذہ سعدا مرزا علی لطف اور حسن علی خاں کی خدمت میں پیش کروں گا اس سے نسل نبی عابد کا کلام ان اساتذہ کے پاس پہنچا اور خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔

میسور کے مخطوطے میں مثنوی کے علاوہ عابد کے چند اردو اور فارسی قصیدے بھی رقم ہیں جو حضرت مشکل کشا کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ ایک اردو مخمس بھی ہے جو [illegible] کی ایک غزل کی تضمین کی گئی ہے چند رباعیاں بھی ہیں اور آپ کے بھتیجے مرزا عسکر حسین کا قطعہ تاریخ بھی درج ہے جو آپ کی وفات پر لکھا گیا تھا اس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔۔۔

جناب مقدس [illegible] — [illegible]
فصیح اللسان شاعر [illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
اگرچہ [illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
لعز مود ناگاہ ہاتف حبیب — [illegible] علی

۱۱۶۷ھ

مرزا زین العابدین عابد اپنی وضع داری وقار علم وفضل اور فارغ البالی کے لئے آج بھی مشہور ہیں۔ [illegible] سے ہجرت کر آنے کے بعد پچاس سال میسور میں شاہی شان و شوکت سے زندگی بسر کی سرکار دربار میں آپ کو بڑی رسائی اور عزت حاصل تھی کہتے ہیں کہ عابد کے [illegible] صاحب میسور آپ کی عیادت کو

آتے تھے، دربارِ میسور میں آپ کی اولاد و احفاد کی بھی ہمیشہ ایسی ہی قدر و منزلت رہی۔

نقشِ مراد کے علاوہ ایک اور مثنوی جوش و خروش بھی آپ کی کہی ہوئی سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے۔ یہ آپ نے نقشِ مراد کے اٹھائیس سال بعد سنہ ۱۲۱۵ھ میں لکھی تھی۔ آپ کا ایک مختصر سا دیوان بھی اسی میوزیم کی مخطوطہ لائبریری میں موجود ہے جس میں مدحیہ کلام کے علاوہ کچھ غزلیں بھی موجود ہیں، لیکن غزل میں آپ کا رنگ جمتا دکھائی نہیں دیتا البتہ مدحیہ قصائد اردو اور فارسی دونوں میں اچھے کہے ہیں، فارسی اور اردو قصیدوں سے نمونے کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے عابد کے رنگِ سخن اور معیارِ کلام کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے ؎

خوشی ہے عیش ہے عشرت ہے شادمانی ہے
کہ آج بزم میں ساقی کی کامرانی ہے

زباں نہ کھولئے اس باغ میں کبھو سوسن
جو سو زباں بیاں ہے تو بے زبانی ہے

ہمارے یار کا مت پوچھ وجہ استغنا
غرورِ حسن ہے ہنگامِ نوجوانی ہے

نہ پوچھ ہم سے جو رکھتا ہے وہ کنارہ کشی
پنٹ خیال ہے سر تا بپا گرانی ہے

مری خرابی و دیوانگی و رسوائی
تجھے ہنسی ہے تفنن ہے شادمانی ہے

بساں خامہ تری رہ میں سر کیا ہوں قدم
ہے نقش پا ترا جس جا مری پیشانی ہے

قسم ہے بادِ صبا کی تری گلی میں سدا
ہماری خاک کو معراجِ لا مکانی ہے

سیاہ کار ہوں پر بوئے مشک رکھتا ہوں
ہے چہرہ زرد دلے عرق زعفرانی ہے

ہمارا دل ہے کبھو سیرِ مجلسِ وحشت
کبھو حریفِ حریفاں کا رد دانی ہے

علی ولی کو نمین دادرِ دارین
خدا سے جس کو عطا سیف دوزبانی ہے

شہنشہ سرِ سر کردگانِ سرو علن
زمیں سے عرش تلک جن کی حکمرانی ہے

ترے غلام کو ہے معز خواجگی دو کون
ترے گدا کو دماغ شہنشہانی ہے

نظر ہو عابدِ کمتر پہ کام بخشی سے
تری جناب سے امید دو جہانی ہے

قصیدۂ فارسی

گلُ گرد چمن بکف حنا کن
ایں باغ دگر زخود بنا کن

بکشا سرِ زلف عنبر آگیں
منت بہ نسیم جاں فزا کن

برچیں زنتارِ عشق دکاں
تا ذرہ و مہر یک بہا کن

از مطلع دردر آچہ خورشید
سلطانی ملک چشم ما کن

تاچند بگو میت چہا کن
یک جلوہ نما وکارہا کن

تا چند پے حجاب باشی — بردار نقاب چشم وا کن
صد بزم جہاں بخود بیارا — یک گوشۂ نظر بسوی ما کن
صد پارہ جگر تمام اُمید — بر ہمت عشق مرحبا کن
تا ہر چہ بگو ہمیست ہمین است — دل را بہ محبت آشنا کن
صد بار بشو زباں بہ کوثر — مداحی آل مصطفےٰ کن
سلطانی شاہ غائب ما — بر عالم ارض بر ملا کن
یا مہدی دیں پناہ برخیز — رایات محمدی بپا کن
برکش ز نیام ذو الفقار را — سر از تن ناکساں جدا کن
شیراں دلیر در کمند اند — بندی بکتا نہ ہم رہا کن
پر شور شدہ جہاں ز سگہا — تنبیہ سگان ناسزا کن
ہر چند ز ما بجز خطا نیست — عفوی کن و پوشش خطا کن
ہموار مخالفاں دیں را — در رنج الیم مبتلا کن
عابد مخروش ولیس نگہدار — لب بند و نظر بہ پشت پا کن

بر مقطع ختم ایں قصیدہ
صلوات بختم او صبا کن

ابو علی

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ
کی
بارگاہِ علم و دانش میں

یوں تو اس نے مولانا سید سلیمان ندوی [illegible] کو بارہا دیکھا تھا جلسوں میں اون کی تقریریں بھی [illegible] اور ایک جلسہ میں جو [illegible] مشہور [illegible] ایڈیٹنگ [illegible] اسلام غازی محمود دھرم پال کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا اون کی [illegible] قابلیت [illegible] دلکشی اور موثر تقریر پر ان الفاظ میں داد دیتے ہوئے بھی سنا کہ [illegible] اور اردو کی [illegible] تقریر میں نے آج تک نہیں سنی اس حسن تقریر اور حسنِ بیان میں فاضل مقرر کی خدمت میں اپنی اور اہل شہر کی طرف سے خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ایک مرتبہ اون کی تقریر [illegible] جامع مسجد اعظم گڑھ میں ہوئی تھی مجھ پر وجد طاری ہو گیا تھا اور [illegible] ایسا [illegible] جیسے [illegible] شان سے بولتا اور بات چیت کرتا تھا [illegible] زمانہ میں [illegible] قریب ہی کے ایک گاؤں جس پور سے جلسہ کا دعوت نامہ آیا وقت پر کسی مقرر کے [illegible] ہمارے نام نکلا میں وہاں پہنچکر اسی اثر کے ماتحت ایسی پرزور اور [illegible] تقریر کی کہ [illegible] کے ساتھی تک جو شریک جلسہ تھے عش عش کر گئے

سید صاحب کے بھتیجے [illegible] سید ابو عاصم ایل ایل بی ایڈووکیٹ کراچی کے بڑے بھائی سید ابو سالم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر [illegible] بہت خوبصورت اور حسین و جمیل تھے چھٹیوں میں شبلی منزل آئے تو سوء اتفاق سے بیمار پڑ گئے اور چند روز کی بیماری میں اون کا انتقال ہو گیا۔ میں نے ان کے انتقال کی خبر سنی اور شبلی منزل پہنچا تو اون کو ایک بند کمرے میں غسل دیا جا رہا [illegible] تو مجھے اجنبی سمجھ کر ہٹا دیا گیا۔ میں نے سید صاحب کو دیکھا کہ کتب خانہ کے ساتھ ایک درخت [illegible] ابو سالم مرحوم کے غم میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے

ایک مرتبہ [illegible] اعظم گڑھ آنے والی گاڑی چھوٹ گئی اور دوسری گاڑی کے آنے میں [illegible] گھنٹے کی دیر تھی ان کو سخت [illegible] دوسری گاڑی کے آنے تک کیسے کٹے گا۔

انھوں نے سارے میرٹھ کا ایک گیا اور ان پر [illegible] اس وقت ان کی عمر [illegible] کے درمیان ہی ہوگی
بہت تندرست اور خوش اندام تھے۔ ٹانگوں میں [illegible] سفید [illegible] اور گلے میں نہایت
نفیس سیاہ سرج کی شیروانی اور سر پر صافہ تھا [illegible] وہ مولویت اور مولانائیت کے
تمام تصورات کے خلاف ایک شاندار [illegible] میں آدمی [illegible] بڑی تیزی سے گذرتا چلا
جارہا تھا۔ کھانا کھاتے اور ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد مولانا [illegible] گیلانی ندوی [illegible] چار لڑکوں کو جن میں
ایک میں بھی تھا۔ امتحان کے لئے ان کے سامنے پیش کیا۔ ان میں سے [illegible]
ہر ایک کا مولانا گیلانی نے سید صاحب سے تعارف کرایا۔ [illegible] طالب علم [illegible] بہار کے رہنے والے
تھا۔ سید صاحب نے فرمایا تو یہ میرے عزیز ہیں [illegible] صاحب نے فرمایا کہ اچھا تو ان سے
کیا پوچھا جائے۔ گیلانی صاحب نے کہا کہ [illegible] چند جملے [illegible]
دیر میں عربی میں ترجمہ کرکے ان کے سامنے پیش کردیا [illegible]
اور دوسرا وہ تھا جس کو سید صاحب نے [illegible]
میں بھی انہی خوش قسمتوں میں ہوں جن کے ترجمے [illegible] ایک [illegible] اسی مدرسے کے
کامیاب ترین صدر مدرس اور مہتمم ہوئے۔ یعنی مولانا [illegible] صاحب [illegible] اور دوسرے وہ تھے جو مولانا
حمیدالدین فراہی کی عربی تفسیر نظام القرآن کے [illegible] قرآن کے بہت [illegible]
یعنی سابق نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان — مولانا امین احسن اصلاحی جن کی تفسیر تدبر قرآن ابھی حال میں نہایت
اہتمام سے پاکستان سے شائع ہوئی ہے جس کے متعلق [illegible] قرآن کی بہترین
تفسیر ہے یہاں تک کہ جماعت اسلامی کے لوگ بھی [illegible] اصلاحی صاحب [illegible] ہیں۔

میں ابھی تعلیم حاصل ہی کررہا تھا [illegible] حدیث میں مسلم شریف [illegible] اصول فقہ میں
میں نورالانوار ادب میں ابو تمام کا حماسہ کلام وعقائد میں شیخ عبدہٗ مصری کی کتاب التوحید وغیرہ میرے [illegible]
میرے والد کا جن کو میرے مولانا بننے کی بڑی تمنا تھی انفلوئنزا کے [illegible] ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو جس دن
پنج سالہ جنگ کے ختم ہونے کا جشن منایا جارہا تھا [illegible] شہر میں [illegible] انتقال ہوگیا اور میری عربی تعلیم
جو بڑے ولولے سے شروع کرائی گئی تھی ختم ہوگئی۔ [illegible] کلکتہ [illegible] سال کے بعد نامراد واپس آیا
تو اس وقت تحریک ترک موالات کا شباب تھا اور ہر جگہ [illegible] قومی اسکول قائم ہورہے تھے۔ اعظم گڈھ میں بھی ایک
قومی اسکول قائم ہوگیا تھا اسی میں [illegible]
[illegible] ۱۶–۱۷ برس کی رہی ہوگی جو [illegible]

قدو قامت میں مجھ سے بڑے تھے۔ میں درجہ میں بیٹھتا تھا تو کھو جاتا تھا جس کو مدرسہ کے ارباب انتظام شدت سے محسوس کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ مجھ میں خواہ کتنی ہی استعداد ہو اور پڑھانے کی کتنی ہی صلاحیت ہو لیکن لڑکوں پر کنٹرول پانا میرے لئے مشکل ہے۔ اسکول کا سشن ختم ہوا تو مجھے جواب دیدیا گیا اور میں بیکار ہوگیا مجھ پر ایک چھوٹے بھائی اور ماں کی کفالت کا بار تھا۔ میں اسی فکر میں تھا کہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جن کو میں نے اب تک دور سے دیکھا تھا پہنچنے کی حسن اتفاق سے سعادت حاصل کی، جس کی تفصیل یہ ہے۔

دار المصنفین کے کتب خانہ میں عربی و انگریزی و اردو کے ماہوار رسالوں کا بڑا انبار لگ گیا تھا جن میں ماڈرن ریویو انڈین ریویو کلکتہ عربی میں المنار، المقتطف المقتبس اور مصر کے مشہور عیسائی صحافی، انشاپرداز مصنف اور مورخ جرجی زیدان کا مصور الہلال جس کی اس وقت عربی دنیا میں بڑی دھوم تھی اور لوگ ذوق و شوق سے پڑھتے تھے مولانا شبلی کا عربی میں رسالہ انتقاد اسی دشمن اسلام کی بعض تاریخی کتابوں کے جواب میں ہے جس میں اوسی تدلیس و تلبیس کا پردہ خوب فاش کیا گیا ہے، اردو میں اس دور کے تمام بلند پایہ ماہنامے مثلاً صبح امید لکھنؤ، زمانہ کانپور، اردو معلی علی گڈھ اور الناظر لکھنو وغیرہ تھے۔ الناظر مولانا ظفر الملک علوی کی ادارت میں لکھنو سے نکلتا تھا اوس کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں مولانا عبد الماجد دریابادی جیسے صاحب طرز انشا پرداز فلسفی اور اہل قلم بھی تھے جو چلپی کے فرضی نام سے فیہ ما فیہ کے عنوان سے اوس میں ہر مہینہ نہایت دلچسپ شذرات لکھتے تھے اور معارف کے شذرات ہی کی طرح ارباب ذوق بڑے لطف و لذت کے ساتھ پڑھتے تھے، ان تمام رسالوں کو الگ الگ زبانوں میں تقسیم کرنے پھر ان کو سنہ کے اعتبار سے مرتب کرنے کے لئے مولانا سید سلیمان ندوی کو ایک معمولی پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت تھی، جس کا تذکرہ انھوں نے میرے بزرگ دوست اور مخلص حکیم محمد اسحاق صاحب سے کیا، جن سے دار المصنفین کے تمام بزرگوں کے غیر معمولی تعلقات تھے، انھوں نے ازراہ ہمدردی مجھ سے دار المصنفین کے کتب خانہ کی اس ضرورت کا ذکر کیا۔۔ میں رسالوں اور اخباروں کا عاشق تو تھا ہی اور کلکتہ کے یک سالہ زمانہ قیام میں اپنے ایک عزیز کی پرائیویٹ لائبریری میں ان میں سے بعض اردو رسائل کی فائلیں میری نظر سے گذر چکی تھیں۔ اور ان سے لطف اندوز ہو چکا تھا اس لیئے میں اس کام کے لیئے جو میرے ذوق کے مناسب تھا۔ تیار ہوگیا۔ حکیم صاحب قبلہ مجھ کو لے کر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، سید صاحب نے مجھکو سر سے پانوں تک بہت غور سے دیکھا، اور حکیم صاحب کے اعتماد پر بغیر کسی قسم کی پوچھ گچھ کے پندرہ روپیہ ماہوار پر میرا تقرر کر لیا، میں نے جب یہ کام انجام دے دیا اور سارے پرچوں کی جلدیں بندھ گئیں۔ تو سید صاحب نے کتابوں کی تصحیح اور پروف ریڈری جیسا نازک اور محنت طلب کام میرے سپرد کرنا چاہا۔ پہلے انھوں نے میرا امتحان لیا کہ اردو کے ساتھ عربی کی استعداد مجھ میں کتنی ہے، انھوں نے مجھ ہی سے کتب خانہ سے الف لیلہ منگوائی اور ایک لمبی عبارت پڑھوا کر اوس کا ترجمہ کروایا۔ اب میں نہیں کہہ سکتا

کہ ان کے معیار پر کہاں تک اترا بہر حال انھوں نے تصحیح کا کام میرے سپرد کر دیا، شروع میں کچھ دنوں تک تو مجھے اس میں بڑی دقت محسوس ہوئی، لیکن بتدریج میں اس پر قابو پا گیا، کبھی کبھی وہ اس میں میری مدد بھی فرماتے تھے، لیکن خود ان کے نزدیک تصحیح کا کام حد درجہ خشک، بدمزہ اور بے کیف تھا جس میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور ان کو سخت انقباض ہوتا تھا۔ تاہم وہ روزانہ عصر کے بعد جب دفتر بند ہو جاتا تھا اور وہ اپنے پڑھنے لکھنے کے تمام کاموں اور فرائض سے فارغ ہو جاتے مجھے روک کر تصحیح کا کام کرتے تھے، اسی درمیان میں جب کبھی مولانا عبدالسلام ندوی گھومتے پھرتے آ جاتے تھے تو فرماتے کہ آپ کو میرے اس خشک کام کرنے پر بڑا لطف آتا ہوگا رفتہ رفتہ مجھکو اس کام سے آشنا لگاؤ ہو گیا کہ ان کی امداد کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی۔ کاپی اور پروف دونوں تنہا پڑھنے لگا میرے اس کام سے دلچسپی کی انھوں نے صدر نشین دارالمصنفین مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم سے بھی تعریف کی بلکہ ایک مرتبہ یہ کہہ کر اون کی خدمت میں پیش بھی کیا کہ یہی ہیں جو تصحیح کا کام کرتے ہیں، اور پروف پڑھتے پڑھتے ان کو بڑے معلومات ہو گئے ہیں، اس کے بعد جب بھی شیروانی صاحب دارالمصنفین آتے تھے، تو میں خاص طور سے ان سے ملتا تھا اور اون کی دعائیں لیتا تھا، میں ان کو مولانا شبلی کا متنبی سمجھتا تھا، اور بڑی عقیدت ومحبت کی نظروں سے ان کو دیکھتا تھا۔

ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ شروانی صاحب آئے اور کئی دن ٹھہر گئے، لیکن کسی تقریب سے ان کی خدمت میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن سید صاحب قبلہ چونکہ بار بار میرا ذکر کر چکے تھے، جس کی یاد ان کے گوشۂ دل میں باقی تھی۔ ایک دن وہ سید صاحب کے ساتھ کتب خانہ میں آئے اور کتابوں اور الماریوں کی سیر میں معروف ہو گئے، اس دوران میں، میں ان کو کہیں نظر نہیں آیا، تو آدمی بھیج کر مجھے اپنے کمرے سے بلوایا میں حاضر ہوا تو بڑی مسرت کا اظہار کیا فرمایا کہ اور سب لوگوں سے تو ملاقات ہو چکی تھی۔ لیکن آپ سے نہیں ملا تھا۔ جی چاہا کہ آپ سے بھی مل لوں۔ بہت تپاک سے مصافحہ کیا اور دیر تک بہ نگاہ محبت مجھ کو دیکھتے رہے مجھ پر اس بزرگ کی عنایت اور لطف وکرم کا اثر اتنا ہے کہ جب کبھی اس کی یاد آتی ہے، تو بے اختیار میری زبان سے مرحوم کے لئے دعائے مغفرت نکل جاتی ہے، ورنہ میں کہاں اور شروانی صاحب کہاں، ذرہ کہاں آفتاب کہاں، پشتیر کہاں اور گہر کہاں ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

یہ میری زندگی کا ایسا واقعہ ہے جس کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ میں مولانا شبلی کی تحریروں کی طرح ان کے قلم کی تحریروں کو بھی پسند کرتا ہوں اور لطف ولذت کے ساتھ پڑھتا ہوں، علمائے سلف اور سیرۃ الصدیق ان کی مشہور کتابیں ہیں، مقالات شروانی کے نام سے ان کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے جس میں وہ تمام مضامین آگئے ہیں جو اسدو کے رسائل اور خصوصاً معارف میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

سید صاحب کو میری کم تنخواہ کا ہمیشہ احساس رہا، لیکن اضافہ تنہا دارالمصنفین کے نظم و ضوابط کے مطابق ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس کی تلافی انھوں نے اس طرح کی کہ مجھ سے اپنی کتابوں کے مسودے صاف کرانے شروع کر دیئے۔ جس سے ہر مہینہ اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی اور اس سے میری زندگی کی اہم ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔ اور ان کی جن کتابوں کے مسودوں کی تبییض کی سعادت مجھے حاصل ہوئی، اُن میں بعض یہ ہیں۔ سیرۃ النبی جلد چہارم: یہ منصب نبوت پر ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منصب سے متعلق فرائض اور ذمہ داریوں اور اُن سے آپ جس طرح عہدہ برآ ہوئے، اس پر بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس جلد کا ایک ایک حرف سید صاحب کے قلم سے ہے، حوالوں تک میں کسی اور سے مدد نہیں لی ہے۔ عرب و ہند کے تعلقات: یہ اس موضوع پر سید صاحب کے چند خطبات ہیں جو انھوں نے ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد میں دیئے تھے۔ اور خیام: جو سید صاحب نے محمود شیرانی، پروفیسر اقبال اور پروفیسر محمد شفیع وغیرہ کے جواب میں لکھی ہے، اور اس میں خیام سے متعلق تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ خیام پر اتنی مفصل اور محققانہ کتاب شاید ہی کسی مشرقی و مغربی زبان میں ہو۔ اس میں سید صاحب نے خیام کو ایک رباعی گو سے زیادہ جس میں اس کو ساری دنیا میں شہرت ہے، ایک فلسفی، حکیم، نجم و ہیئت داں کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اور لکھا ہے کہ شاعری و سخن گوئی سے کہیں زیادہ اس کو علم و حکمت سے دلچسپی تھی اور ان فنون میں اس کی بڑی بڑی تصنیفات ہیں۔

مجھے حسن اتفاق سے سید صاحب سے شرف تلمذ بھی حاصل ہو گیا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سابق رفقائے دارالمصنفین میں سید صاحب کے بہت ہی قریبی عزیز اور ہم وطن مولانا سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم۔ اے گولڈ میڈلسٹ کلکتہ یونیورسٹی تھے، جو اس وقت سید صاحب اور اپنے استاد سر جادو ناتھ سرکار وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی کی رہنمائی میں رقعات عالمگیری کی ترتیب و تدوین کر رہے تھے۔ وہ اگرچہ ندوہ کی نسبت سے مشہور ہیں اور ندوی ان کے نام کا جزو لاینفک بھی ہو گیا ہے، لیکن ندوہ سے انھوں نے باقاعدہ فراغت حاصل نہیں کی تھی، اسلئے تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں اپنے موضوع سے متعلق عربی کتابوں سے مراجعت میں ان کو بڑی دقت پیش آتی تھی۔ اس ضرورت کے تحت انھوں نے سید صاحب سے عربی پڑھنی چاہی، سید صاحب نے ان کو حماسہ پڑھنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے پڑھنا شروع کیا تو از راہ ہمدردی میرے شوق کو دیکھ کر مجھے بھی شریک درس کر لیا، لیکن کتب خانہ میں حماسہ کا صرف ایک نسخہ ایک ہی تھا جو نہایت دبیز سفید کاغذ پر مصر کا چھپا ہوا تھا، اور پڑھنے والے دو تھے، میں نے ادھر ادھر بہت تلاش کرایا لیکن مجھے اس وقت کہیں سے دستیاب نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہ حماسہ پڑھنے کا اور وہ بھی سید صاحب جیسے عربی کے فاضل ادیب اور اہل قلم سے اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا۔ اگر کہیں سے اس کا دوسرا نسخہ نہیں مل رہا ہے تو اس نعمت سے محروم نہیں رہ جانا چاہیئے۔ میں نے ہمت کر کے کتب خانہ کے اسی مصری نسخہ سے نقل کرنا شروع کر دیا، جتنا پڑھتا تھا

[illegible]زانہ نقل کر لیتا تھا، لیکن افسوس درس و تدریس اور سید صاحب سے استفادہ و استفاضہ کا سلسلہ سید صاحب کی گوناگوں مصروفیتوں، علمی مشغلوں اور سفروں کی وجہ سے جو اکثر پیش آیا کرتے تھے اور جو ان کی زندگی کا لازمہ بن گئے تھے تھوڑے دنوں جاری رہ کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اس دور کی یادگار حماسہ کا یہ مخطوطہ نسخہ اب تک میرے پاس محفوظ ہے اور جب اس پر نظر پڑتی ہے تو بے اختیار میری چشم تصور کے سامنے وہ منظر آ جاتا ہے جب میں اور مرتب رقعات عالمگیر سید نجیب اشرف صاحب ندوی سن و سال، عقل و شعور، فہم و بصیرت اور عہدہ و منصب کے تفاوت کے باوجود دوش بدوش سید صاحب کے سامنے بیٹھتے تھے اور حماسہ کا درس لیتے تھے جسکو وہ خوب ذوق و شوق سے پڑھاتے تھے۔

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ اس زمانہ میں دار المصنفین بہت آتے تھے اور مدرسۃ الاصلاح کے تعلق سے اس وقت تک مجھے پہچانتے تھے کسی دن سید صاحب [illegible] کی [illegible] کتاب [illegible] دیکھ کر پوچھتے ہوئے [illegible] فرمایا کیا یہ عربی پڑھتے ہیں۔ سید صاحب نے کہا جی ہاں مجھ سے حماسہ پڑھتے ہیں فرمایا [illegible] ان کے متعلق جو کام ہے اس کے لیے کچھ عربی دانی کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن اس موقع پر نہایت افسوس کے ساتھ یہ اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مولانا فراہی اس کے بعد بھی بہت زمانہ تک آتے رہے لیکن رفتہ رفتہ وہ مجھے بھول گئے پھر کبھی میری طرف مخاطب نہیں ہوئے لیکن ان کی عظمت کا جو نقش میرے دل پر بیٹھ چکا تھا وہ ان کی [illegible] عدم التفاتی کے باوجود بھی بحمد اللہ قائم ہے اور میں ان کو عربی کا فاضل [illegible] اور قرآن کا بہت بڑا مفسر سمجھتا ہوں میں نے ان کی تفسیر سورۂ [illegible] ایک ادبی کتاب کے طور پر [illegible] سیف المقام [illegible] اعظم گڈھ سے ایک ہفتہ وار اخبار سہیل کے نام سے [illegible] کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ ان کی طرف سے ہر ہفتہ اداریہ [illegible] لکھتا تھا [illegible] کو چل کیا اور [illegible] شدہ اس کی خبر سید صاحب علیہ الرحمۃ کے گوش اقدس تک بھی پہنچ گئی [illegible] ذوق دار المصنفین آتا اور اس مقامی اخبار کا ذکر آتا تو سید صاحب فرماتے تھے کہ [illegible] اس میں بھی کبھی مولانا سہیل کی نظمیں بھی چھپتی تھیں۔ ایک مرتبہ مسلم [illegible] جن کو جمعیۃ علمائے ہند کے اکابر مثلاً مولانا حسین احمد مدنی [illegible] کی حمایت حاصل تھی وہ الکشن میں کامیاب ہو گئے۔ [illegible] یہ اخبار کچھ دنوں کے بعد بند ہو گیا تو میرا قلم بھی رک گیا [illegible] کے ایک [illegible] قلم میں پھر حرکت پیدا ہوئی اور میں [illegible] مولانا [illegible] کے سہ روزہ اخبار الامان دہلی روزنامہ [illegible] پاکستان کی [illegible]

طرز و انداز سے سمجھ گئے کہ ان کا لکھنے والا میں ہی ہوں اور اس کا ذکر انھوں نے سید صاحب سے بھی کر دیا۔ منشور آتا اور اس میں میرے مضمون ہوتے تو سید صاحب ضرور پڑھتے، ان کو اس کی بڑی خوشی تھی کہ ۔ اون کی اور دارالمصنفین کی کتابوں کے پروف پڑھتے پڑھتے مجھے قلم پکڑنا آگیا اور میں مضمون نگار ہوگیا۔

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی جو یوپی کی خفیہ پولیس کے کسی بڑے اور ذمہ دار عہدہ پر تھے، اور کہا جاتا ہے کہ انہی کی رعایت سے مولانا خلافت اور کانگریس کی سیاسی تحریکوں کے بڑے مخالف اور انگریزوں کی طرف میلان رکھتے تھے، اس عہدہ سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد یکسر مذہبی ہو گئے تھے، ایک مرتبہ وہ سید صاحب سے ملنے کے لئے دارالمصنفین آئے۔ سید صاحب ان کو کتب خانہ دکھانے کے لئے لائے تو گھومتے پھرتے میرے کمرے میں بھی آئے۔ اور ان سے فرمایا کہ یہ منشور وغیرہ میں فرضی نام سے تحریک پاکستان کی تائید میں مضمون لکھتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ فرضی نام کے بجائے اپنے اصلی نام سے مضمون کیوں نہیں لکھتے۔ کیا اس میں کوئی امر مانع ہے -

مولانا تھانوی تحریک پاکستان کے حامی تھے، اور ان کی حمایت کی وجہ سے دیوبندی حلقہ کا ایک گروپ جو مولانا تھانوی کے زیر اثر تھا اس تحریک میں شامل ہوگیا تھا اور مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی جیسے دیوبند کے اجلہ علماء اور صاحب قلم اس کے مبلغ بلکہ قائد اعظم محمد علی جناح کے دست و بازو ہو گئے تھے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ابتدائی تعلیم دارالعلوم ندوہ میں تو ضرور حاصل کی تھی لیکن اوس کے فارغ التحصیل نہیں تھے اور نہ انھوں نے کبھی ندوہ سے اپنا انتساب پسند کیا، وہ بجائے اپنے نام کے ساتھ ندوی لکھنے کے اپنے وطن کی نسبت سے ملیح آبادی لکھتے تھے مگر سید صاحب اور پوری ندوی برادری ان کو اپنا ہی آدمی سمجھتی اور ان پر فخر کرتی تھی اور سید صاحب تو ان سے بڑا قلبی تعلق رکھتے تھے اور ان کی اخبار نویسی اور جدید عربی زبان و ادب کے ذوق کی وجہ سے ان کے بڑے قدر داں تھے، بلکہ ان کی فرمائش ہی سے ان کے ایک عربی ہفتہ وار اخبار الجامعہ میں کئی مضمون بھی لکھے لیکن وہ خود سید صاحب سے بہت زیادہ اخلاص نہیں رکھتے تھے ایک مرتبہ وہ دارالمصنفین آئے تو سید صاحب کی باچھیں کھل گئیں اور جب تک ان کا یہاں قیام رہا ان کی بے حد خاطر و مدارات کی اور دارالمصنفین کا ایک ایک شعبہ بڑی تفصیل سے ان کو دکھایا۔ حسب معمول ان کو بھی میرے کمرے میں لائے۔ میرا ان سے تعارف کرایا تو فرمایا کہ یہ آپ کے ہم مسلک بھی ہیں، یہ سن کر انھوں نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا، وہ سید رشید رضا صاحب المنار کے شاگرد اور سلفی العقیدہ تھے اور علامہ ابن تیمیہ کی متعدد کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

میرے ایک چچا منشی عبدالغفور صاحب کلکتہ میں چمڑے کی ایک مشہور فرم کے جس کی شاخیں سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں انچارج اور بڑی حیثیت کے مالک اور کلکتہ میں بڑی امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، اس کے ساتھ بہت علم دوست اور اصحاب علم و فضل کے قدرداں تھے، معارف اور دارالمصنفین کی کتابوں کے مستقل خریدار تھے

اس تقریب سے ان کے سید صاحب سے بھی بڑے تعلقات ہو گئے تھے، سید صاحب کلکتہ جاتے تھے تو انھیں کے مہمان ہوتے تھے، سید صاحب کو کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہوا کہ میں ان کا بھتیجا ہوتا ہوں تو اُن کو بڑی خوشی ہوئی اعظم گڈھ میں ایک چھوٹی سی ہندو ریاست عظمت گڈھ تھی، جس کا فرماں روا بڑا روشن خیال اور علم و فن کا شائق تھا، اس نے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے بہت سے کام کئے تھے، ان میں ایک ہائی اسکول اور ایک وسیع لائبریری بھی تھی، ایک زمانہ میں اس کے منیجر یا ریاستوں کی زبان میں چاٹل الہ آباد کے ایک مسلمان منشی عبدالقدیر صاحب تھے جو بڑے مجلسی، یار باش اور باذوق تھے، ان کے میرے چچا سے بھی تعلقات تھے، وہ سید صاحب سے ملنے آئے تھے اور دارالمصنفین کے تمام شعبوں کو ایک ایک کرکے دکھاتے ہوئے کتب خانہ میں آئے تو مجھ بھیج میز کا یہ کہکر اُن موصوف سے تعارف کرایا کہ یہ آپ کے دوست منشی عبدالغفور صاحب کلکتہ کے بھتیجے ہیں اور یہاں کام کرتے ہیں، یہ سن کر انھوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بڑی محبت اور تعلق کا اظہار کیا۔

ایک مرتبہ سید صاحب بہت سخت بیمار پڑے جس کا سلسلہ مہینوں تک قائم رہا، یوں تو ان کی خدمت کیلئے خود ان کا پورا کنبہ تھا، مولانا مسعود علی کا خاندان تھا، دارالمصنفین کے رفقا اور مصنفین تھے، جو بڑی دلسوزی سے ان کی تیمارداری کا فرض ادا کر رہے تھے، لیکن علالت تھی کہ ہر طرح کے علاج کے باوجود طول کھینچتی چلی جاتی تھی، یہاں تک کہ مرض کی شدت اور تکلیف سے راتوں کی نیند غائب ہو گئی، مولانا مسعود علی نے سید صاحب کے ساتھ راتوں کو جاگنے اور ان کی دیکھ بھال کے لئے دو دو آدمی کی باری مقرر کر دی ایک رات میری اور جناب یحییٰ اعظمی کی بھی باری آئی اور ہم دونوں نے ان کی چارپائی کے پاس فرش پر بیٹھ کر ساری رات جاگ کر کاٹ دی، اس طرح سے مجھ جیسے عقیدت کیش کو بھی تیمارداری اور خدمت کی سعادت حاصل ہوئی جو میرے لئے ہمیشہ باعث فخر رہیگی حسب میرے استاد مولانا حکیم الٰہی بخش صاحب کی تدابیر سے سید صاحب کو صحت کلی حاصل ہوگئی تو مولانا مسعود علی ندوی کے زیر اہتمام جشن صحت منایا گیا، کانفرنس وسیع پیمانہ پر ہوئی جس میں شہر کے تمام عمائد شریک تھے اور مولانا اقبال سہیل اور یحییٰ اعظمی صاحب اور دوسرے مقامی شعراء نے قصائد تہنیت پیش کئے۔

لیکن اس طویل اور تکلیف دہ علالت سے نجات پا جانے کے بعد بھی وہ دورہ اُن کی صحت خراب ہو جاتی تھی لیکن سفروں کا سلسلہ جو لازمۂ زندگی تھا، صحت کی خرابی کے باوجود بھی قائم رہا، ... طویل سفر سے ایک مرتبہ واپس آئے تو حوالی قلب میں ریاحی درد کا سخت دورہ پڑا اور حالت بہت ... تشویشناک ہو گئی، اس سے شفا ہوئی تو اطباء نے دماغی اور علمی سارے کام ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے ... تصنیف تالیف اور مضمون نگاری کا ذوق فطری تھا، اس لئے اسکی تسکین کے لئے ... ہلکے پھلکے مضامین پھر بھی برابر لکھتے رہے، اور مسلمانوں کو دینی و ملی احیار کی تعمیر ... کے بعد ہند کا جو فتنہ سارے ملک میں پھیلتا چلا جارہا تھا، اور جو نتیجہ کے اعتبار سے تاریخ ... ...

تباہ کن تھا۔ اور اس سے معارف کے ذریعہ ان خطرات کے ذریعہ مسلمانوں کو آگاہ کیا اور اس سے بچنے کی تلقین کی۔

اسی اثنا میں مولانا شبلی اور ان کے بعد دار المصنفین سے بھوپال کے دیرینہ تعلقات کی بنا پر جیسا میں نے اپنے کسی مضمون میں لکھا ہے نواب حمید اللہ خاں نے بھوپال میں علمی احیاء و تجدید کے لیے سید صاحب کی خدمات مستعار لے لیں اور وہ وہاں کے ناظم تعلیمات اور قاضی القضاۃ ہو کر چلے گئے۔ ابھی وہ بھوپال ہی میں تھے اور وہاں کے عربی مدارس کے نصاب کی اصلاح میں مصروف تھے کہ انقلاب نے ہندوستان کے دروازہ پر دستک دینا شروع کر دیا اور ہندوستان انگریزوں کی ڈیڑھ سو سالہ غلامی سے آزاد ہو گیا اور کچھ ہی دنوں کے بعد ہندوستان کی تمام ریاستیں جن کی تعداد کشمیر و حیدرآباد جیسی وسیع و عریض ریاستوں کو لے کر پانچ سو تھی جن کا آئین الگ الگ تھا ٹوٹ کر اپنے قریب کے صوبوں میں ضم ہو گئیں اور ان کا وجود صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹ گیا خود ریاست بھوپال مدھیہ پردیش میں ضم کر دی گئی۔ اس طرح سے ریاست کی علمی ترقی کا جو خواب والیٔ بھوپال نے دیکھا تھا وہ پریشان ہو گیا اور سید صاحب وہاں سے واپس چلے آئے اور کچھ دنوں کے بعد اپنی ... کے بلاوے پر جو سید صاحب کے بھتیجے سید ابو عاصم صاحب ایم اے ایل ایل بی ... بیاہی گئی تھیں اور کراچی میں رہتی تھیں عارضی طور پر کچھ دنوں کے لیے پاکستان چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر عارضی طور پر حکومت کے ... ذمہ دار ارکان نے جو سید صاحب کے پہلے سے عقیدت کیش، قدر دان اور منزلت شناس تھے اور پبلک نے ایسا پرجوش خیر مقدم کیا اور ایسی پذیرائی کی کہ جواہر لال کی حکومت کو بلا وجہ ان سے بدگمانی ہو گئی اور جب انھوں نے وہاں سے واپس آنا چاہا تو ہندوستان کے سفارت خانہ کراچی نے ان کو ویزا نہیں دیا اور بادل ناخواستہ مجبوراً ان کو دار المصنفین جیسے معبد علمی کو جس کے وہ معمار تھے اور اپنے وطن دیسنہ کی وسیع جائداد جس کو بڑی محنتوں سے پیدا کیا اور بڑھایا تھا اور آم کے پھول کے باغ کو جس میں سینکڑوں قسم کے آموں کی قلمیں لگائی گئی تھیں چھوڑ کر کراچی میں رہ جانا پڑا بعد میں انھوں نے اپنے بال بچوں کو بھی کراچی بلا لیا۔ اس طرح سے گو وطن اور اعظم گڈھ کا ماتوں پیدا تو ضرور ہو گیا لیکن آخر آخر تک ان کا دل وہاں نہیں لگا اور ہمیشہ دیسنا اور اعظم گڈھ کی یاد میں تڑپتے رہے۔ تا آنکہ ایک مختصر بیماری میں نومبر ۱۹۵۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا اس طرح سے میں ان کی بے اندازہ شفقتوں عنایتوں اور مہربانیوں سے جن کا میں ۱۲ برس کی عمر سے اس وقت تک مورد رہا ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا مجھے جب وہ عہد سعادت یاد آتا ہے تو تڑپ جاتا ہوں اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر نور السعید اختر

مُلّا وجہی کی فارسی شاعری

قطب شاہی سلطنت کے بانی ایرانی النسل تھے۔ فارسی اُن کی مادری زبان تھی اور مغلیہ حکومت کی طرح دکن میں بھی فارسی کا دور دورہ تھا۔ قطب شاہی بادشاہوں نے [illegible] فارسی شعراء کی قدردانی میں دل کھول کر حصہ لیا۔ وجہی بھی اس قدردانی سے مستفید ہوئے۔ اگرچہ [illegible] وجہی کی مادری زبان فارسی نہ تھی تاہم انہوں نے فارسی شعر و ادب پر کافی عبور حاصل کر لیا۔ ان کی [illegible] طبع کے [illegible] [illegible] وجہی [illegible] رہے ہونگے گو یہ صحیح طور پر معلوم نہیں کہ وجہی کب سے شعر کہنے لگے تھے۔ ابتداً ان کے فارسی دیوان میں ایسی داخلی شہادتیں ملتی ہیں جن سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ فارسی شعر گوئی میں وجہی کے استاد میر محمد امین عرف [illegible] المتخلص روح الامین تھے جو اپنے زمانے کے جید عالم سیاست [illegible] اور نامور کلام شاعر تھے۔ ابو طالب کلیم ہمدانی اور صائب تبریزی جیسے فارسی شعراء نے ان کی مدح سرائی کی ہے۔ روح الامین کے فارسی دیوان کے [illegible] نسخے آج بھی ایران انگلستان اور ہندوستان میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ روح الامین کی [illegible] نظامی کی طرز پر ان کی پانچ مثنویاں بھی ملتی ہیں۔ وجہی کا روح الامین سے دو طرح کا تعلق تھا۔ ایک ادبی حیثیت [illegible] سیاسی اعتبار سے۔ ادبی لحاظ سے وجہی اپنے آپ کو روح الامین کا شاگرد تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

سخن را به [illegible] رسانیده ام ۔۔۔ که روح الامین است استاد من[1]

سیاسی اعتبار سے وجہی کا تعلق روح الامین سے اس لئے تھا کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں روح الامین اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور وجہی شاہی دربار سے وابستہ ہو گئے تھے۔ [illegible] وجہی اور روح الامین کے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے حتیٰ کہ روح الامین کی علمی و فنی استعداد سے [illegible] ان کے تلامذہ میں شامل ہوئے جس کا اشارہ ہمیں اس شعر سے ملتا ہے ؎

عالمے را [illegible] کنم شاگردی ات اعجاز [illegible] ۔۔۔ [illegible]

وجہی کی شاعرانہ صلاحیتوں کے پیش نظر [illegible]

---

[1] دیوان فارسی: وجہی مملوکہ سالار جنگ لائبریری [illegible]

ورثہ میں ملا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غزل گوئی میں وہ اپنی انفرادیت کا سکہ بٹھا سکے۔ وجہی نے چونکہ نہایت حساس طبیعت پائی تھی۔ لہٰذا ان کی زندگی میں جو واقعات رونما ہوئے وہ شعر کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کی بیشتر مثالیں ان کے فارسی دیوان میں ملتی ہیں۔

وجہی کی زندگی کی طرح ان کی شاعری کا ابتدائی دور نہایت خوشگوار ہے۔ لہٰذا اُن کے اشعار میں رنگینی اور سرخوشی، بانکپن اور تڑپ، جدائی اور ملاپ، زلف اور رخسار، شگفتگی اور شادابی جیسے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ابتدا ہی سے وجہی اپنے ہمعصر فارسی گو شعرا میں منفرد رہیں۔ وجہی کی اس انفرادیت کو اُن کے وسیع مطالعہ پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ رومی، حافظ، خاقانی، کمال اور سعدی کے مطالعہ نے وجہی کو ایسے میلانات عطا کر دیئے جو کلاسیکی اور روایتی ضرور تھے لیکن اُن کی کسک اور تشنگی کے تیز نشتر ہر لحاظ سے جُدا تھے۔ شاید۔ یہی وجہ ہے کہ وجہی اپنی غزل کے "گل خوشرنگ" کو "بزم دانش" کا سزاوار سمجھتے ہیں ؎

گل خوشرنگ نظم خود بہ بزم دانش آوردم ۔۔۔ کہ گردد چوں رُخِ خوباں .... قبول خاطرِ دلہا

وجہی کے ابتدائی کلام کے نفسیاتی تجزیے سے چند نکات واضح ہو جاتے ہیں اول یہ کہ وہ نفسیاتی طور پر نہایت باشعور ہیں۔ اپنے شعروں میں زندگی کے حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں اور "تصور جاناں" سے زیادہ "مادی پیکر حسن" کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی لئے وجہی کو حقیقت پسند (IDEALIST) کہہ سکتے ہیں۔ روایتی شعرا کی طرح وجہی شاعری برائے شاعری کے قائل نہیں ہیں بلکہ شاعری میں وہ مقصدیت کے روادار ہیں۔ اُن کی شاعری مرزا غالب کی طرح "وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے" کی حامل ہے اور اُن کے آبگینے غالب کے الفاظ میں "تندیٔ صہبا" سے پگھلے جاتے ہیں۔ وجہی اُس بزم طرب کے خواہاں ہیں جہاں "قلقلِ مینا" کے ساتھ "صدائے چنگ و رباب" ہو اور بقول غالب جہاں "ندیم دوست سے بوئے دوست" آتی ہو۔ دوسرے یہ کہ وجہی بچپن سے مذہبی عقاید سے متاثر ہیں اور اُن کے رگ و پے میں تصوف کی جلوہ سامانیاں جاری و ساری ہیں۔ وجہی "مشاہدہ حق کی گفتگو" بادہ و ساغر کے پس پردہ کرنا جانتے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے وجہی کے اِن تاثرات کا دھندلا سا نقشہ نظر آتا ہے ؎

غزل گاہے ز شوقِ خوبیٔ آن ماہ می گویم ۔۔۔ قصیدہ بر نمی گویم گدائی خوش نمی آید

وجہی کی غزل گوئی میں جمالیاتی پہلو زیادہ نمایاں ہے کیونکہ وہ محبوب کے حسن اور خوبی کے پرستار ہیں۔ کلاسیکی شاعری میں سیکس (SEX) کا عنصر نمایاں رہا ہے اور وجہی بھی سیکس کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں بلکہ ڈھول ڈھاپا اور بوس و کنار کی جگہ حقیقتِ منتظر کو لباسِ مجاز میں دیکھنا چاہتے ہیں ؎

جانان ببین بچشم خود امروز سوئے ما — کز روئے تو چہ رنگ گرفتست روئے ما
مستِ عشقم شراب را چہ کنم — من کہ ہشیار می شوم ز شراب
امروز گفتۂ کہ بیایم بخواب شب — در دیدہ خواب نیست کہ آئی بخواب
حدیث خواہش دل بر زبان ہرگز نمی آید — سیہ گشتست روئے عجز از رنگ تمنا ہا

جس طرح وجہی اپنی نثر کو وحی یا الہام کا درجہ دیتے ہیں اسی طرح وہ شاعری میں خود کو پیغمبرِ وقت تصور کرتے ہیں اور اپنے "شعر" کو "معجزہ" قرار دیتے ہیں اُن کے دعوٰی سے اُن کی شدتِ احساس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے ؎

معجزہ شعر است و ما پیغمبرِ وقتِ خودیم — کافر است آنکس کہ تاکس آرد بریں اعجاز ما

وجہی عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا ایک واسطہ قیاس کرتے ہیں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کا درمیانی فاصلہ مصیبتوں رنجشوں اور تکلیفوں سے بھرا رہتا ہے۔ جہاں سے باہوش و حواس گذرنا ممکن نہیں۔ وجہی اس پُرخطر راستے کو کبھی رندی و مستی اور کبھی کیف و سرور کے عالم میں عبور کرنا چاہتے ہیں مستیِ عشق میں اس دشوار گذار راہ کا طے کرنا بھی پسند کرتے ہیں ؎

شدم ملول و نہ ساقی پیالہ می طلبم — کہ صحت است بہ بیماریِ خمارِ شراب
شرابِ عاشقان بیہوشیِ ما است — جوابِ ابلہان خاموشیِ ما است

وجہی شکستِ آرزو کو تکمیلِ آرزو سمجھتے ہیں اور ناکمل اور ناتمام شے میں دائمی لذت تلاش کرتے ہیں ؎

عاشقان را تمام حیران کرد — قصۂ عشقِ ناتمام وجیہہ

وجہی کی زندگی کا دور ادور ایک بڑا المیہ ہے اس دور میں اُن کی خودداری و ... کی اور قابلیت و اہلیت کے پرخچے اڑ جاتے ہیں کیونکہ اُن کے رقیب حاکمِ وقت کے کان بھر کر انہیں شاہی سرپرستی سے محروم کر دیتے ہیں ؎

عبث از من جدا کرد است دشمن بادشاہم را — گنہ از او ست کہ ناحق ... لذت این ... باہم را
بگوشِ شہ رسانیدہ است جرمی را کہ لائق نیست — پناہ ... ماندہ این ... را

محمد قطب شاہ زاہد و متقی تھا اور نغمہ و سرود اور بادہ و ساغر سے اسے نفرت تھی برخلاف وجہی ایک رند بلانوش تھے اور ان کی خانہ مستی کی وجہ سے آرائش ... رنگین مزاجی اور عشق و عاشقی ... (۱۰۲۰ھ) ونامرادی کے بادل چھائے متصوفانہ مزاج کے لیے اس قسم کا ماحول نہایت ناسازگار رہا ... ست او ...

---

(۱) سب رس۔ وجہی مرتبہ عبدالحق صہ۹۔

یادوں میں عشقِ حقیقی کی گھن گرج پوشیدہ ہوتی ہے۔ وجہی حاکم وقت کی تاب نہ لاکر "کنج خانقاہ" میں بت پرستی شروع کر دیتے ہیں۔ اُن کی بت پرستی میں وہ معیاری "وفاداری بشرطِ استواری" ہے جو "برہمن" کو کعبہ میں تکفیر کا حق پہنچاتی ہے[1]۔ اُن کی بت پرستی ملاحظہ ہو ؎

کنج خانقاہ بت می پرستم شکستِ دین زخرقہ پوشی ما است

آہ و زاری، نالہ و شیون کے ساتھ حاکم وقت کی چشم پوشی وجہی کی المناک حیات کا جزو بن گئے تھے۔ اس یاس انگیز دورِ حیات کی پوری تصویر وجہی کے ذیل کے اشعار میں پائی جاتی ہے ؎

آتشِ دوزخ فزاید آہِ آتش بارِ ما راحتِ فردوس بخشد سایہ دیوارِ ما

خورشید را بگو کہ بدریا بپیر بگیر کامروز بس بلند شد آتش ز آہ ما

وجہی ز سوز و گداز است کار ما شب و روز کہ سوخت اختر بختم ز آفتاب زوال

وجہی کو خوشدلی کے مواقع ہمیشہ ہی نا ہم نہ ہوتے تھے۔ وہ اس قابل بھی نہ تھے کہ دختِ رز مل سکے۔ تاہم انھوں نے اپنے چین و آرام کے لمحات میں یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کیا ؎

باش خوشدل محنت بسیار زآنکہ آسودگی کم است اینجا

اور جب کبھی انہیں شراب کی بجائے "کوکنار" یا "بھنگ" ملی تو انھوں نے سجدہ شکر بجا لایا ؎

ز خوف شاہ درین شہر بادہ پیدا نیست بہ بنگ میل کنم یا بہ کوکنار کدام

چیست قدرت شحنہ را مانع از بادہ کند برگدایانِ طریقت حکم شہنشاہ نیست

وجہی "کنج خانقاہ" میں "بت پرستی" کے عوض جامِ معرفت سے سرفراز ہوئے کیونکہ ان کی نظروں میں دولتِ دنیا اور کیفیت بادہ کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ فرماتے ہیں ؎

گر نہ دولت در گدائی آمدی غمگیں مباش کار دنیا این چنین است گاہ ہست وگاہ نیست

وجہی عشقِ حقیقی کے رازہائے اندرون کے احاطہ کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں اور "دولتِ دنیا" کی بجائے "دولتِ دین" کے طالب بن جاتے ہیں ؎

در دولتِ دین کوش کہ این دولتِ دنیا چوں کیفیت بادہ چوں ظلِ سحاب است

عشقِ الٰہی اور یادِ خداوندی اُن کی زندگی کا خاصہ بن جاتے ہیں ؎

در یادِ خدا باش بہر حال کہ باشی کین یک سخنم حاصل صد جلدِ کتاب است

---

[1] غالب: — وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

معرفت و حقیقت کے مقام پہ وجہی کی بانگ نمازِ عشق بن کر ... بیان کردہ ہے۔ شعر

بانگِ نمازِ عشق بود ہائے و ہوئے ما

وجہی کی زندگی اور شاعری کا تعلق دورِ عبداللہ قطب شاہ کی حکومت کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ ان کے اشعار میں پختگی اور صوفیانہ رنگ نئی آب و تاب کے ساتھ جھلکنے لگتے ہیں۔ وجہی کو دوبارہ پرسکون لمحات فراہم ہوتے ہیں لیکن بقول وجہی ؎ گفتہ ام معنیٔ ہمہ قرآں حرفِ اسرارِ ہزار کتاب

وجہی صوفی منش ہونے کے باوجود عبداللہ قطب شاہ کی قدردانی کا ذکر کرتے نہیں۔ اگرچہ ان کے فقیرانہ مزاج میں شاعرانہ تعلی اور خود ستائی کے جذبے موجزن ہوتے ہیں تاہم ان کا کلام سلاست، روانی، لطافت، کشش، سادگی اور دیگر شعری محاسن کی نشاندہی کرتا ہے۔

وجہی کو ستائش کے خواستگار نہیں ہیں لیکن بزمِ تو دروغ ... کے تقاضے ادا دیتے ہیں اور شاعر کو سخنہائے دروغ خیال کرتے ہیں ؎

سخنہائے دروغ چند ار عرش چہ خواہد وجہی شاہی بگذار و فکرِ کارِ دیگر کن

وجہی کا شاعرانہ زعم مندرجہ بالا خیال کے پیشِ نظر بے معنی سا ہو جاتا ہے ؎

پختگی ہائے شعرِ خاقانی در سخنہائے نیم خام مرا

وجہی غزل میں حافظ، نظیری اور خسرو کی پیروی کرتے ہیں۔ حکایت دل اور ستم ظریفی ... کے علاوہ مسائلِ تصوف جیسے مضامین وجہی کے شعروں میں ندرتِ فکر، جدتِ ادا اور اعلیٰ تخیل کے ساتھ ملتے ہیں۔ ... دریوزہ گری کو شیوۂ شاعری کے خلاف تصور کرتے ہیں اسی لئے وہ قصیدہ گوئی سے احتراز کرتے ہیں۔ بقول وجہی ؎

قصیدہ بر نمی گویم گدائی خوش نمی آید

وجہی کے کلام میں متضاد مضامین اور خیالات بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ قصیدہ گوئی کو گدائی سمجھتے ہیں لیکن دیوانِ فارسی کے آخری چند صفحات امتدادِ زمانہ کی نذر ہو جانے کے باوجود بھی ان کا ایک نامکمل قصیدہ ملتا ہے جس میں وجہی کے سمندِ تخیل کی جولانیاں ملاحظہ کیجیے ؎

بادشاہِ جہاں جہاں پرور ظلِ سبحان ذاتِ پیغمبر

تو سراپا تمام آئینہ خوش تماشا شدی بخود بنگر

ہمت و حلم و علم و دانش و جود داب آدابِ شاہان و شوکت و فر

بادشاہے چو تو نہ شد پیدا خسروے چوں تو کس نہ شنید دگر

اس مختصر اور نامکمل قصیدے سے وجہی کی قصیدہ گوئی پر اظہارِ خیال نہیں کیا جا سکتا البتہ وجہی اپنے نیم خام

شعر میں پختگیہائے خاقانی کے عناصر موجود پاتے ہیں۔

دیوان فارسی کے آخری صفحہ ۳۰ میں وجہی کے دو قطعات بھی موجود ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وجہی قطعہ گوئی کے میدان میں بھی پیش پیش تھے ملاحظہ ہو؎

طوطیا نم ما شکر بخشا! چند گردیم گرد مردارے
خونِ من صرف گردن ما و شست زیر چرم است استخوان بارے
خواستم حق خود جواب نداد چہ بگوید کسے بہ دیوارے
آطبیبی ز تو عجب نہ بود گر شفائے دہی بہ بیچارے

تاریخ گوئی میں وجہی یکتائے زمانہ تھے۔ حدیقۃ السلاطین میں ملا نظام الدین احمد وجہی کی تاریخ گوئی کی خصوصیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"وجہی از شعرائے تاریخہائے کہ یافتہ بودند بہ سامع جاہ و جلال خسرو یوسف جمال رسانیدند از آن جملہ ایں سہ تاریخ مرقوم گردید اول تاریخ کہ ملا وجہی شاعرہ کنی یافتہ است۔ ع

"آفتاب از آفتاب آمد پدید"

سنہ ۱۰۳۱ھ و ملا غواصی کہ در شعر دانی از مثالِ خود ممتاز است ایں حکم را مادہ تاریخ ساختہ است "محفوظ باد" (سنہ ۱۰۳۱ھ)[2]۔ بحیثیت مجموعی وجہی اپنے ہمعصر فارسی گو شعراء میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے ان کا ہمعصر غواصی جو ایک بلند پایہ شاعر تھا وجہی کی تعریف و توصیف ان الفاظ میں کرتا ہے؎

اس دکن کے شاعراں میں تجہ شہنشاہ کے نزدیک ہے غواصی و وجیہی شاعر حاضر جواب[3]

(بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر ۱۶ سے آگے) کشمیر اسکول، لکھنؤ اسکول اور مالوہ اسکول شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان کے عربی و فارسی کے قلمی نسخوں میں بہترین معتوب کتابوں میں نیشنل میوزیم کا بابر نامہ بوستان سعدی اور دول رانی خضر خاں، خدا بخش لائبریری پٹنہ کی کتاب ظفر نامہ، اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد کا یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن اور رامپور لائبریری کا دیوان حافظ تصور کئے جا سکتے ہیں۔

---

[1] [illegible] ایک سال تک وجہی کو وظیفہ نہ دیا اور ہر وقت یہی کہتا رہا [illegible]
[illegible]
[3] کلیات غواصی [illegible]

مولانا حالیؔ کے مرثیہ سے متعلق ایک خط

مکرمی۔ تسلیم!

دسمبر ۱۹۶۸ء کے سب رس میں بھی ڈاکٹر سید یحییٰ احمد ہاشمی صاحب کا مضمون "مولانا حالی کا ایک کمیاب شخصی مرثیہ" (صفحہ ۱۱ تا ۱۶) بڑی کاوش سے لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس کا ذکر حالیؔ کی یا حالیؔ کے متعلق کسی کتاب میں نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱ فٹ نوٹ) خود میری کتاب "حالی بحیثیت شاعر" میں اس مرثیہ کا ذکر بھی ہے اور اس کا آخری بند بھی موجود ہے عبارت یہ ہے:۔

اس زمانہ میں انھوں (حالی) نے مختار الملک سر سالار جنگ کی وفات پر فارسی میں ایک نہایت دردانگیز مرثیہ لکھا جس کا ایک ایک حرف تصویرِ غم ہے:۔

کیست در ہند کزیں غم لبِ حسرت نہ گزید ٭ کیست از قوم کزیں غصہ گریباں نہ درید
تا بجائے کہ چنیں ایں نالۂ جانکاہ رسید ٭ حالیؔ گوشہ نشین ہم ز جگر آہ کشید

اے اجل گر تنِ بے جاں تہ خاکش سپری
نتوانی کہ نکو نامیش از یاد بری

(حالیؔ بحیثیت شاعر صفحہ ۹۳ مطبوعہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۰ء)

یہ مرثیہ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے علاوہ ریاض الاخبار گورکھپور میں جلد ۲ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۸۸۳ء صفحہ ۴ پر شائع ہوا۔

غالباً ڈاکٹر صاحب موصوف نے حالی بحیثیت شاعر میں تصانیف حالیؔ میں حالیؔ کی شاعری ہی کو ملاحظہ فرمایا وہاں اس مرثیہ کا ذکر ضرور نہیں ہے کیونکہ کتاب حالیؔ کی اردو شاعری تک محدود ہے۔

مخلص۔ شجاعت علی سندیلوی

پرنس نواب سعادت جاہ بہادر سعادتؔ

کرم فرمائی دوراں ندارد
محبت کیشیٔ انساں ندارد

سوالِ غمزۂ خونریز یعنی
جوابِ دشنہ و پیکاں ندارد

نظر تیری غلط انداز کیسی
وفا پیرائی پیماں ندارد

کلیدِ جاں بدستِ ظلمِ صیّاد
بجز قفلِ درِ زنداں ندارد

مرا حالِ دگرگوں سُن کے بولے
یہ کیسی داستاں عنواں ندارد

ہٹا دو اک طرف کوہ و بیاباں
جنوں بردوش ہوں ساماں ندارد

مری آواز پہ آئی یہ آواز
بنائے عالمِ امکاں ندارد

کہاں تک اہتمامِ سوگِ آناں
کہ شادی مقدمِ ایناں ندارد

سعادتؔ کی یہی ہے وضعِ آزاد
گریباں دارد و داماں ندارد

پرنس نواب سیادت علی خاں صاحب

زندگی دشتِ بے کراں ہے ابھی
ساری دنیا دھواں دھواں ہے ابھی
میرے خوابوں کا چاند روشن ہے
رات تیری طرح جواں ہے ابھی
کبھی حالات کے اندھیروں میں
روشنیوں سے بدگماں ہے ابھی
کارواں کا پتہ نہیں لیکن
سامنے گردِ کارواں ہے ابھی
پیچھے ٹوٹتی ہوئی لکیر کوئی
اس قدر رابطِ جسم و جاں ہے ابھی
شب کے زینے پہ شمع جل اٹھی
کون اس درجہ مہرباں ہے ابھی
دل اندھیروں کے شہر میں صاحب
ماہ پاروں کا راز داں ہے ابھی

کالبداس گپتا رضا (کینیا، افریقہ)

بہت تم نے جفائیں کیں بہت ہم سے ستم اٹھے
خبردار اے ستمگارو نہ اب آگے قدم اٹھے
بہت اٹھے وطن کی سرزمیں سے نیک و دانشور
مگر حسن وفا و صدق کے دیوانے کم اٹھے
کبھی اے خواہش دنیا مجھے بھی سرخروی دے
کہیں دل سے مرے تفریق ہستی و عدم اٹھے
خدایا تیرے در سے ہم اگر مانگیں تو کیا مانگیں
نہ ہم سے لطف و عیش اٹھے نہ ہم سے حزن و غم اٹھے
ہمیں ہر فکرِ نو کی رو میں بہہ جانا نہیں آتا
جہاں بھی اک دفعہ بیٹھے وہاں سے کچھ نہ ہم اٹھے
ملی اُن کو نہ منزل زندگی بھر تو بھی کیا غم ہے
رہِ ہستی میں جو بھی تھک کے سوئے تازہ دم اٹھے
کمالِ بے گناہی نے ضرورت ہی نہ رہنے دی
گنہ کا داغ دھونے کو نہ اب ابرِ کرم اٹھے
جنونِ خود پرستی نے کیا یہ حال ایماں کا
مساجد سے کتاب اٹھی معابد سے صنم اٹھے
رضا آئے کہاں سے اپنا اٹھنا بیٹھنا کیسا
یہ سب نظروں کا دھوکا ہے نہ ہم بیٹھے نہ ہم اٹھے

نقد و نظر

رشید احمد صدیقی شخصیت اور فن

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید۔ لکچرار شعبۂ اردو سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی (اے۔ پی) سائز [illegible] صفحات ۴۰۰ [illegible] قیمت [illegible]

یہ سلیمان اطہر جاوید صاحب کا مقالہ ہے جس پر انھیں جامعہ عثمانیہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے [illegible] صاحب نے یہ مقالہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کی نگرانی میں لکھا اور صاحب موصوف [illegible] انھیں ہر قسم کی سہولتیں [illegible] ہیں۔ موصوف نے کتاب کا تعارف بھی لکھا ہے اور مقالے کی اہمیت واضح کی ہے۔

آغاز میں پیش لفظ، عکس تحریر رشید صاحب اور [illegible] ہے [illegible] جو ۲۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ دوسرے عنوان کے تحت رشید صاحب کی زندگی کے [illegible] ہیں۔ تیسرا عنوان "رشید احمد صدیقی اور علی گڈھ" ہے۔ طالب علمی کے دور سے لے کر استادی اور پھر [illegible] حالات، بہت اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد تنقیدی حصہ شروع ہوتا ہے [illegible] کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) طنز و مزاح (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] ہر ایک [illegible] بیان کرنے کے بعد رشید صاحب کا مقام بھی [illegible] سے متعین کیا گیا ہے۔ مرقع نگاری کی صلاحیتوں کا اظہار کرتے [illegible] کہتے ہیں "انھوں نے (رشید صاحب) نے ذاکر صاحب کی شخصیت کو اپنی مرقع نگاری سے زندۂ جاوید بنا دیا ہے [illegible] ہندوستان کی علمی و ادبی زندگی میں اتنی قد آور شخصیت [illegible] کہا جائے [illegible] رشید احمد صدیقی اردو کے [illegible] ساتھ ہی تنقید کرتے ہوئے سلیمان صاحب لکھتے ہیں [illegible] رشید صاحب کی تحریر [illegible] ذاکر صاحب میں اسی کی جھلک نہ پائیں یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے [illegible] جمہوریہ ہند کی حیثیت میں مرقع میں نہ دیکھ پائے۔ تیسرا جز تنقید پر ہے۔ رشید صاحب نے [illegible] سلیمان صاحب نے بجا کہا ہے کہ رشید صاحب نے خیال خاطر احباب کیا ہے اور [illegible] اسی طرح ترقی پسندی کے تعلق سے رشید صاحب کے متضاد خیالات کا اظہار بھی ہے۔ "ترقی پسندوں کے کارنامے [illegible] احسان گذاری کے ساتھ یاد رکھے جائیں گے لیکن یہ وہ کارنامے ہیں جو فسادات کے بعد انسانیت کا [illegible] مصنفین نے انجام دئیے اور اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن اس سے [illegible] ترقی [illegible] میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس کو اصلاحی یا ادبی [illegible] کہا جا سکے اور اس [illegible]

اپنی ہر دو آرا کے اظہار میں حق بجانب نظر آتے ہیں اور ان پر متعصبانہ رویہ رکھنے کا الزام (صفحہ ۲۶۵) زیادتی معلوم ہوتا ہے۔ سلیمان صاحب نے اپنے مقالے میں رشید صاحب کے کارناموں کو ترازو میں تولنے کی کوشش کی ہے جہاں انھوں نے مزاح اور مرقع نگاری میں ان کی خوبیاں بتلائی ہیں وہیں تنقید میں ان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کا بھی اظہار کر دیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ:۔

"وہ ایک ادیب یا شاعر پر اظہار خیال کرتے ہوئے دوسرے کے بارے میں بھی اپنے خیالات ظاہر کرتے جاتے ہیں۔ اس طرح کی بے راہ روی رشید صدیقی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کی خصوصیت ہے اور تنقیدی مضامین کی بھی۔ رشید صدیقی کا یہ طریق تنقید ان کی خوبی نہیں خامی ہے"۔ اس کے ثبوت میں سلیمان صاحب نے مثالیں پیش کی ہیں اور اپنے دعوی کو ثابت کیا ہے۔

آخری حصہ اسلوب پر ہے۔ اسلوب کی تعریف اور تشریح و توضیح کے بعد سلیمان صاحب کہتے ہیں کہ "نثر پر ہم غالب اور سرسید کو اردو کے اولین صاحب اسلوب قرار دے سکتے ہیں.... مکاتیب غالب کی حقیقی خوبی یہ ہے کہ ان سے غالب کی شخصیت کے تمام خارجی اور داخلی پہلو اپنے مصائب اور محاسن کے ساتھ منظر عام پر آجاتے ہیں اور بیک نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو غالب کی تحریر ہے"۔

اگر بیک نظر کہنے کی بات ہو تو کیا میر امن اور رجب علی بیگ سرور کے اسلوب کے تعلق سے یہی بات نہیں کہی جا سکتی یا ابو الفضل اور ظہوری کی عبارت کے ٹکڑے ابو الفضل یا ظہوری کے اسلوب کی غمازی نہیں کرتے اس لحاظ سے اولیت اور تقدم بھی محل نظر ہو جاتا ہے۔ سلیمان صاحب آخر میں اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "رشید صدیقی ایک اچھے نقاد سے زیادہ ایک اچھے طنز و مزاح نگار ہیں ایک اچھے طنز و مزاح نگار سے زیادہ ایک اچھے مرقع نگار ہیں اور ایک اچھے مرقع نگار سے زیادہ ایک اچھے انشاپرداز ہیں" رشید صاحب کے مضامین کا پڑھنے والا سلیمان صاحب کا یقیناً ہم نوا ہوگا۔

یہ کتاب ہمارے تنقیدی ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ ہم ڈاکٹر سلیمان اطہر صاحب اور ان کے نگران ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ اس لئے بھی کہ رشید صاحب کے کچھ خطوط جو سات پردوں میں بہ تعمیل حکم چھپے ہوئے تھے۔ جسارت کر کے منظر عام پر لائے گئے۔

حیات طیبہ حصہ اوّل (رسول اکرم کی مکی زندگی) ناشر مکتبہ اردو، مدرسۂ اسلامیہ منڈیکا، یڈی حیدرآباد۔ اے پی
صفحات ۳۲۔

یہ ایک مختصر سا کتابچہ ہے جس میں رسول اکرم صلعم کی مکی زندگی کے مختصر مگر جامع حالات بیان کئے گئے ہیں۔ آج جب کہ لوگوں کو دنیاوی کاروبار سے فرصت نہیں ملتی اور دینی کتابوں کی طرف راغب نہیں ہوسکتے یہ

مختصر کتابچے نہایت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہی کتابچے آگے چل کر تفصیلی مطالعے کا شوق پیدا کریں اور قاری اور مولف دونوں خدمت دین کے صلے سے بہرہ ور ہوں۔ زبان کی سلاست کا لحاظ کرتے۔ یہ بچوں کے ادب میں بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔

اسوۂ اکابر

محمد بہاء الحق قاسمی۔ خطیب ماڈل ٹاؤن لاہور۔ قیمت کچھ نہیں محصول ڈاک بھیج کر طلب کر سکتے ہیں
ملنے کا پتہ۔ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری۔ بانہ ار آرام گلی لاہور۔

فرقہ بندی اور ذاتیں برصغیر ہندوستان و پاکستان کا مقدر بنی ہوئی ہیں۔ ہندو ہوں یا مسلمان ذات پات اور فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہیں۔ مسلمان ایک خدا ایک رسول اور ایک قرآن یا ایک شریعت کو رکھتے ہوئے بھی اگر گروہوں میں بٹ جائیں تو یہ ان کی بدقسمتی ہی کے مترادف ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقے ایک دوسرے کو برا ٹھہراتے ہیں۔ حنفی اہل حدیث، دیوبندی، مودودیت، سنی، شیعہ غرض اختلافات کا یہ جہان ہے کہ غیر مذاہب کیلئے تمسخر کے سامان فراہم کرتا ہے۔ ان اختلافات کی خلیج کو پاٹنے کیلئے قاسمی صاحب نے "اسوۂ اکابر" کے عنوان سے مضمون لکھا اور پھر اس کو رسالہ کی شکل دیدی اس میں مولانا اسمٰعیل شہید، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا محمد قاسم، مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی غلام رسول، مولانا محمد انور شاہ اور دیگر بزرگوں کے ایسے اقوال اور اعمال کو ایک جگہ جمع کیا ہے جو اس افتراق کو مٹانے میں معاونت کر سکیں گے۔ جزاکم اللہ خیرا۔

اسلام کا تعارف

وحید الدین خاں۔ مکتبہ معاویہ۔ پی ون ایریا لیاقت آباد کراچی ۱۹

اس مختصر ۲۴ صفحے کے کتابچے میں اسلام کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں خدا کے وجود اور اس سے ہمارا تعلق، معرفت کا حصول اور سلسلہ وحی سے بحث کی گئی ہے۔ بحث کا اختصار تشنگی پیدا کرتا ہے لیکن مختصر کتابچے میں اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

رواداری ہندوستانی سماج میں

ابوالفہیم وحید علی خاں حیدرآبادی۔ ناشر ادارہ انیس اردو الٰہ آباد ۳
سائز $\frac{1}{16}$ کراؤن صفحے ۱۷۶ مجلد معہ گردپوش قیمت تین روپے۔

ابوالفہیم صاحب نے ہندوستانی سماج میں رواداری کے موضوع پر بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اور نتیجتاً وہ تمام باتیں ایک جگہ جمع کر دی ہیں جن سے رواداری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے لئے انہیں تاریخ اور تذکرے کی کتابوں کے علاوہ اخبارات سے بھی مدد لینی پڑی انھوں نے قدیم کتابوں کا بھی جائزہ لیا اور جدید اخبارات کا بھی اور اس طرح اپنا مطالعہ پیش کیا۔ یہ کتاب قومی یک جہتی کے تصور کو فروغ دے سکتی ہے اس لئے اس کا مطالعہ فائدہ مند ثابت ہوگا۔

(محمد اکبر الدین صدیقی)

سیاہ سرخ سفید (ناول)

از آمنہ ابوالحسن

"سیاہ سرخ سفید" اردو کی ممتاز افسانہ نگار آمنہ ابوالحسن کا پہلا ناول ہے۔

اس سے قبل ان کے افسانوں کا مجموعہ "کہانی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس ٹریجڈی ناول میں مصنفہ نے عورت اور مرد کے باہمی رشتوں اور محبت کا ایک اعلیٰ اور ارفع تصور پیش کیا ہے۔ جو پاکیٔ داماں، قربانیٔ نفس، بے لوث روشن خیالی سے عبارت ہے۔ جنسی آزادی کے اس دور میں جبکہ ساری اخلاقی قدریں پامال ہو چکی ہیں، عورت اور مرد کے درمیان ایسے غیر جنسی رشتوں کا تصور ایک افسانہ سا لگتا ہے لیکن مصنفہ کو اصرار ہے کہ نشاط، فرخ اور الطاف کے ثلاثہ کی یہ داستان صرف حقیقی نہیں بلکہ آفاقی ہے۔

نشاط غم زدہ سی ایک لڑکی ہے جو بچپن ہی سے بجھی بجھی سی رہتی ہے۔ شادی سے قبل ماں کے چہرے پر سے گذرے تنہائی کے احساس سے دبی ہوئی فرخ سے شادی کے بعد شوہر سے بے حد لگاؤ ہونے کے باوجود محبت کے مفہوم سے بے خبر احساس اور ایسی پھر الطاف کے ساتھ ذہنی وابستگی الفت اور خود سپردگی کی خواہش ہے لیکن بوس و کنار کی سرحد سے آگے نہ جا سکی۔ معتاد ہو جانے والی پھر دنیا بھر کی آسائشیں مہیا ہونے اور دو دو مرد دل چاہنے کے باوجود ساری زندگی ویسی ہی بے قرار و ناکام رہی۔ اس کو قرار اسی وقت ملتا ہے جب وہ آخرت کی راہ لیتی ہے۔

فرخ جو اس داستان میں نشاط کا ناکام شوہر ہے۔ ٹوٹ کر محبت کرنے والا، ہر قسم کی دنیوی آسائش مہیا کرنے والا اور ہر قسم کے ناز اٹھانے والا شوہر لیکن بیوی کے ذہنی اور جسمانی مطالبوں سے نا آشنا۔ ناز برداری کی انتہا یہ ہے کہ بیوی اور دوست کو ساتھ حالت میں دیکھنے کے باوجود دوست کا گھر آنا جانا صرف اس لئے گوارا رکھتا ہے کہ بیوی کی خوشی اسی میں ہے۔

الطاف، فرخ کا نہایت ہی عزیز دوست ہے۔ ایک عدد بیوی کا شوہر اور کئی بچوں کا باپ۔ عاشق مزاج ۔ لیکن نشاط اور حسن عالم کی نشاط کو مصوری سکھاتے ہوئے ان میں باہمی ذہنی مطابقت کا پتہ چلتا ہے اور نوبت سیر و تفریح تنہائی کی ملاقاتوں اور ہمدردیوں سے آگے بڑھ کر بوس و کنار تک آجاتی ہے۔ اس سے آگے اپنے عزیز دوست کے ساتھ خیانت کا احساس روڑا بن جاتا ہے۔ ان تینوں کرداروں کے محور پر جو کہانی گھومتی ہے اس کے موضوع اور غیر فطری انجام سے قاری اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن اس بات سے تو بہر حال اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ ناول میں شروع سے آخر تک جو طرز بیان ملتا ہے وہ انتہائی دلکش، حسین، جاندار، انداز سجل اور تنوع لئے ہوئے ہے جو مصنفہ کے قادرالکلام اور معجز بیان ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ آمنہ ابوالحسن نے بیتہ صفحات پر لمبی لمبی بحث کی باتیں ایسے اچھوتے دلنشین انداز میں لکھی ہیں جن سے ان کے پختہ شعور، بالغ نظر، ادیب ہیں اور زبان پر حاوی ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ آمنہ ابوالحسن نے کبھی بھی اپنی ادبی حیثیت منوانے کیلئے مصنوعی ذرائع اختیار نہیں کئے ہیں وہ اپنے منفرد طرز نگارش، لطافت بیان اور جاندار کردار نگاری کے باعث ادبی دنیا میں ایک خاص مقام بنا چکی ہیں۔ زیر نظر ناول بلاشبہ ان کے مرتبہ و مقام کو اور بلندی عطا کرتا ہے اور انہیں انکا طور پر ہندوستان کی کامیاب ترین افسانہ و ناول نگار کی حیثیت بخشتا ہے۔ اس تازہ تخلیق کی بنا پر ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ان کا سیال اور بے باک قلم اردو زبان کو ادب عالیہ سے مالا مال کرتا رہیگا۔ سادہ اور دلکش ٹائٹل۔

..... مصنف کے شوہر کے ایک کا بنا ہوا ہے، سو دو سو صفحات کے اس ناول کو نیشنل بکڈپو حیدرآباد نے شائع کیا ہے جو تین روپے میں ماڈرن بک ہاؤس، ادبی ٹرسٹ، ہالیڈیو کتابوں... عابد روڈ حیدرآباد سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(بشیر انور)

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سنہ اجراء	جلد	شمارہ
۱۹۳۸ء	۳۲	۶

جون ۱۹۶۹ء

ماہنامہ

سب رس

نگران

پروفیسر سید علی اکبر ایم اے (کینٹب)

مجلس مشاورت

میرحسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکسینہ
ڈاکٹر غلام عمر خاں، محمد منظور احمد

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم
محمد جمال الدین

منتظم
وقار خلیل

زر سالانہ چھ روپے غیر ممالک سے دس روپے
ششماہی تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے

نمونے کے پرچہ کیلئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد ۴ سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

مئی کا پرچہ پریس کو جا چکا تھا کہ اچانک ذاکر صاحب کے انتقال کی خبر نشر ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ یہ خبر نہیں بلکہ ایک زلزلہ ایک بھونچال ہے جس نے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا ہے۔ اس وحشت اثر خبر نے کچھ دیر کیلئے دماغوں کو ماؤف کر دیا اور سکتہ سا پیدا کر دیا۔ اس کا یہ سبب نہیں تھا کہ وہ ہندوستان جیسی عظیم جمہوریہ کے صدر تھے یا ہندوستان کے پہلے شہری کا انھیں اعزاز حاصل تھا بلکہ وہ اسباب اور وجوہ تھے جنھوں نے ان کو اس بلند مقام پر فائز کیا۔ وہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم ریزیڈنسی مڈل اسکول میں پائی۔ والد کے انتقال کے بعد دس سال کی عمر میں وہ اپنی والدہ کے ساتھ اٹاوہ چلے گئے اور وہیں ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ بلقان میں جب لڑائی شروع ہوئی تو مساجد میں جا کر زخمیوں کی امداد کیلئے چندہ جمع کرتے۔ یہ ان کے قومی کام کا آغاز تھا۔ اس کام کی رفتار دن بدن بڑھتی گئی۔ ہائی اسکول کی تعلیم ختم کر کے وہ علی گڈھ ایم اے او کالج میں شریک ہوئے اور یہیں سے ان کے جوہر کھلنے شروع ہوئے۔ وہ یونین کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ یہی زمانہ تھا جبکہ ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی اور انھوں نے کالج چھوڑ دیا اور جامعہ ملیہ میں داخل ہو گئے اور پھر دوسرے کاموں کے ساتھ زندگی بھر کیلئے جامعہ کے ہو گئے اور جامعہ جو ایک وقت برگ خزاں دیدہ کی طرح مرجھا چکی تھی حیات نو بخشی اور اس کو ایک نہایت بلند و بالا مقام عطا کر دیا تفصیل کیلئے مولانا عبدالغفار مدھولی کی "جامعہ کی کہانی" کے مطالعہ کی سفارش کریں گے۔ جامعہ میں انھوں نے نہایت مفید اور منفعت بخش کام انجام دیئے۔ نمونہ کا بچوں کا اسکول۔ استادوں کا اسکول۔ جامعہ کا مکتبہ۔ جامعہ کا پریس۔ جامعہ کا رسالہ غرض ہر شعبہ میں وہ دخیل تھے اور اپنے عزیز ساتھیوں پروفیسر محمد عاقل مرحوم۔ پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر عابد حسین اور دوسرے ہمدردان قوم کے ساتھ جامعہ کی فلاح کیلئے کام کرتے رہے۔ یہیں سے وہ جرمنی گئے اور دیوان غالب مطبع کاویانی سے ٹائپ میں شائع کیا۔ وہ دہلی میں رہ کر بھی علی گڈھ پر نظر رکھتے۔ کانگریس کے سبھی نیتاؤں کے ساتھ انھوں نے کام کیا خصوصاً علمی اور تعلیمی معاملات میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ آزادی کے بعد وہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے وائس چانسلر ہوئے اور اپنی حکمت عملی سے اس کے معیار کو گرنے سے بچایا۔ یہاں سے وہ گورنر پھر نائب صدر جمہوریہ اور دو سال قبل صدر جمہوریہ منتخب ہوئے تھے۔ وہ ادارۂ ادبیات اردو کو اس وقت بھی تشریف لائے تھے جبکہ ادارہ کی کوئی عمارت نہ تھی اور وہ خود بھی کوئی سرکاری عہدہ دار نہ تھے۔ ادارہ کے سربراہ ڈاکٹر زورؔ نے ادارہ کے کاموں سے انھیں واقف کرایا تھا۔ جمہوریۂ ہند کی کرسیٔ صدارت پر فائز ہونے کے بعد بھی ایوان اردو میں قدم رنجہ فرمایا

(باقی صفحہ نمبر ۴۶ پر)

ڈاکٹر محمد عبدالمنان

(بسلسلہ گذشتہ)

عہد بہمنیہ کی حیاتِ اجتماعی کا

ایک جائزہ

(۸) حیات اجتماعی کا نظارہ بیرونی سیاحوں کے سفرناموں کے آئینہ میں:-

بہمنیوں کے زمانے کی اجتماعی زندگی پر شمال یا جنوب کی فارسی تاریخوں سے زیادہ روشنی نہیں پڑتی ہے۔ اس دور کی عام زندگی کے متعلق نا تمام مگر بلیغ اشارے بیرونی سیاحوں کے ارتسامات اور مشاہدات سے دستیاب ہوتے ہیں۔

ان سیاحوں میں سب سے قدیم نکولو کونٹی[۱] اطالوی سیاح ہے جو ۱۴۱۹ء میں دمشق سے اپنی بیوی کے ساتھ مشرق کی ۲۵ سالہ سیاحت کے لیئے روانہ ہوا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے اخلاق سے جو گہرے اور محتاط مشاہدات پیش کئے ہیں ان کی نظیر دوسرے سفرناموں میں بہت کم ملتی ہے[۲]۔ وہ بہمیوں کی کشتیوں کی جو ساحل پر لنگر انداز رہتی تھیں بڑی تعریف کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کشتیاں اطالوی کشتیوں کے مقابلے میں وسعت میں بڑی ہیں۔ ہر ایک میں ۵ بادبان اور متعدد مستول پائے جاتے ہیں۔ یہ کشتیاں اس قدر مضبوط بنائی جاتی تھیں کہ طوفان کی شدت سے کشتی کا کچھ حصہ متاثر بھی ہو جائے تو باقی حصے سے مسافروں کو بہ حفاظت تمام انکی منزل تک پہونچا دیا جاتا تھا۔ اطالوی سیاح اس امر پر تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ یہاں یورپ کی طرح وبائیں نہیں پھوٹ پڑتی ہیں۔

کونٹی کی سیاحت کے ربع صدی بعد افق ہند پر اتھانیس نکیتن ایک روسی سیاح تجارتی اغراض کے تحت نمودار ہوتا ہے۔ اس نے خواجہ یوسف کرمانی کے فرضی نام سے ۱۴۶۸ء سے ۱۴۷۴ء تک ہندوستان کے مختلف مقاموں کی سیاحت کی۔ اس کا قیام بیدر میں ۴ سال تک رہا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں بہمنیہ دور کی حیات اجتماعی کا جو مختصر نقشہ کھینچا ہے۔ اس کی حیثیت ایک قیمتی تاریخی دستاویز کی ہے اور خاص طور پر بیدر کے تعلق سے جو اپنے ارتسامات

---

۱ NICOLO DE CONTI

۲ (A) INDIA IN THE FIFTEENTH CENTURY: MAJOR: HAKLYT SOCIETY LONDON: 1857 (8-30)

(ب) -GATEN: 1908- PAGE (41)

اور مشاہدات اپنے سفرنامے میں پیش کئے ہیں۔ ان کی بڑی اہمیت ہے جن کا خلاصہ[1] حسب ذیل ہے :-

شہر بیدر ہندوستان کا سب سے اہم شہر ہے۔ شہر پندرہ میل طویل اور اسی طرح عریض ہے جس میں بڑی آبادی رہتی ہے۔ یہاں کی تجارت گھوڑے کپڑے ریشم کالی مرچ اور دوسری چیزوں پر مشتمل ہے بیدر کے بازاروں میں تانبے اور بیرونی ملک کی مصنوعات کی فروخت پر حکومت کی جانب سے بہت زور دیا جاتا ہے۔ ملک میں ضروریات زندگی کے علاوہ امراء کے تعیشات کی چیزیں بھی تیار ہوتی ہیں شہر نہ صرف دکن بلکہ ہندوستان کے لوگوں کا اجتماع کا بڑا مرکز ہے۔ گلبرگہ[2] میں علاؤالدین حسن کے مقبرے کے پاس ایک عظیم الشان بازار ہر ہفتے میں دس دن تک لگتا ہے جہاں پر تمام ہندوستان کے لوگ خرید و فروخت کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ تقریباً ۱۰ ہزار گھوڑے فروخت کے لئے بازار میں لائے جاتے ہیں۔ بیدر اور گلبرگہ کے علاوہ دابل (مصطفیٰ آباد) بھی تجارت کا بڑا مرکز ہے جہاں میسور، عرب، خراسان اور ترکستان سے گھوڑے فروخت کے لئے آتے ہیں سمندر کے راستے سے آفریقہ کے شہروں سے بھی منفعت بخش تجارت رہتی ہے تجارت کی اس گرم بازاری سے ملک کی دولت اور ضروریات میں بے حد اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن عام دیہاتی لوگ خستہ حال اور مفلس ہیں۔ اس کے برخلاف امراء بہت مالدار اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو چاندی کی پالکی میں نکلتے ہیں۔ ان کے آگے بیس گھوڑے سنہری سازوسامان سے سجائے رہتے ہیں۔ ان کے پیچھے تین سو سوار پانچ سو پیادے اور ناچنے اور گانے والوں کی جمعیت الگ ہوتی ہے۔ بادشاہ (محمد شاہ ثانی) ایک ایسے قلعے میں رہتا ہے جس کے اطراف جنگل ہے اس کی حفاظت کے لئے ایک سو مسلح سپاہی متعین رہتے ہیں اور جہاں سو محرروں کی جمعیت بھی رہتی ہے جو شاہی احاطے میں داخل ہونے والوں کے نام درج کرتی ہے شاہی محل بہت خوبصورت اور عالی شان ہے۔ قلعہ میں ایک عدالت بھی ہے۔ شہر کی آبادی کی حفاظت کا بطور خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک ہزار مسلح سوار اپنے ہاتھ میں قندیلوں کے ساتھ شہر کی حفاظت کے لئے متعین ہیں۔ بادشاہ ۲۰ برس کا اور پست قد ہے۔ اسکو شکار کا بے حد شوق ہے۔ وہ نوازمات شاہی کے ساتھ منگل اور جمعرات کو باہر نکلتا ہے۔ عید کے دن بادشاہ گھوڑے پر سوار باہر نکلتا ہے۔ گھوڑے کی زین سونے کی ہوتی ہے۔ بادشاہ کے لباس پر جواہرات لگے رہتے ہیں اور سرپیچ میں ایک بڑا ہیرا لگا رہتا ہے۔ وہ سنہری زرہ جس میں جواہرات جڑے ہوتے ہیں زیب تن کرتا ہے۔ کبھی بادشاہ کی سواری ایسی پالکی میں نکلتی ہے جس پر ریشمی شامیانہ ہوتا ہے جس کو چار گھوڑے کھینچتے ہیں۔ ان کی فوج

---

1) INDIA IN THE FIFTEENTH CENTURY — PAGE (8-30)

2) TRAVELS IN INDIA — PAGE (41)

[2] گلبرگہ بھی اسکی سیاحت میں داخل تھا جس کو وہ PERVOTA یعنی ہندؤں کا بیت المقدس کہتا ہے۔

نظم و ضبط کے اعتبار سے ناقص ہے لیکن وجیانگر کی فوج کے مقابلے میں بہتر ہے۔ شہر میں مسافروں کے قیام کیلئے آرام دہ سرائیں ہیں جہاں مالک خود مسافر کو کھانا پکا کر دیتی ہے۔

(۹) معاشرتی زندگی کی خصوصیات کا لب لباب :- اس عہد میں سوسائٹی تین میل تھی سب سے بڑا گروہ دکن کے اصلی باشندوں کا تھا۔ اس کے بعد دکنی مسلمانوں کا گروہ تھا جو عموماً ترک، عرب، ایرانی اور حبشی نسل کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ تیسرا گروہ ان نو واردوں پر مشتمل تھا جو ایران، عرب، ترک اور حبش سے آکر دکن میں بس گئے تھے اور جنہوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنا کر یہاں شادی بیاہ کے تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ ہر شخص بالعموم اپنے ہی رسم و رواج کا پابند تھا لیکن باہمی میل جول سے مسلمانوں کے رسم و رواج پر ہندوؤں کے اثرات پڑ رہے تھے۔ شہر میں مکانات پختہ ہوتے تھے۔ صاحبِ قدرت پتھر کے مکانوں میں رہتے تھے۔ تمام شہر میں مسافروں کیلئے سرائیں تھیں۔ بازار وسیع اور دوکانوں پر ہر قسم کا اناج فروخت کیلئے موجود رہتا تھا۔ علم کا عام رواج تھا۔ عالموں کی قدر افزائی کی جاتی تھی۔ امراء لباس میں اکثر رنگ برنگ کے ریشمی کپڑے پہنتے تھے۔ موروثی امراء کا کوئی طبقہ نہ تھا۔ ہر امیر کا خطاب ذاتی اور جاگیر مشروط بہ جمعیت ہوتی تھی۔ سامان امارت مثل سیانہ، فیل، اسپ بادشاہ کی ملک سمجھی جاتی تھی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کا آدمی جو ہر ذاتی کی بناء پر درجہ کمال تک پہونچ سکتا تھا مثلاً محمود گاوان کا غلام خوش قدم المخاطب بہ کشور خاں، ملک حسن (ایک نومسلم غلام) المخاطب بہ نظام الملک، بحری فتح اللہ المخاطب بہ عماد الملک، ملک اشرف، ملک وحید دکھنی وغیرہ۔ غلامی کوئی عیب کی چیز نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ ترقی کا زینہ تھی۔ تجارت ایک شائستہ اور معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ خلف حسن بصری اور خواجہ محمود گاواں جو اپنے زمانے میں مختارِ کل تھے، تاجر تھے اور ان کو ملک التجار کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ محمود گاواں نے وزارت عظمیٰ پر فائز ہونے کے بعد بھی تجارت کے پیشہ کو جاری رکھا۔ اور اپنی گذر بسر اور داد و دہش اسی کی آمدنی سے کرتا تھا۔

(۱۰) دیہی معیشت :- عہد وسطیٰ کے مسلمان بادشاہوں کی لڑائیاں اور فتوحات تاریخ کے طالب علم کو بھٹکاتی ہیں جس کی بناء پر وہ اپنے دماغ میں اس دور کا ایک ناخوشگوار نقشہ رکھتے ہیں۔ اس زمانے کے عام لوگوں اور بالخصوص دیہات میں رہنے والوں کے حالات کا غائر نظر سے مطالعہ بہت سی غلط فہمیوں کو دفع کر دیتا ہے اور اس طرح ایک متوازن، منصفانہ اور صحیح نقطہ نظر قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

ان کی حکومت کا روشن پہلو یہ ہے کہ انھوں نے دیہات کے اندرونی انتظامات[۲] کو درہم برہم

---

۲ سیرۃ المحمود - عزیز مرزا — صفحہ (۲۴۳)

INTRNAL ADMINI STRATIVE ARRANGEMENT

ہونے نہیں دیا۔ حکومت کی طرف سے ان کے اور ان کے مقتدر لوگوں کے اختیارات میں دخل اندازی نہیں ہوتی تھی۔ موجودہ حکومت ہند کی طرح دیہات دیہی[1] نظم ونسق کے تحت رہتے تھے۔ اس کے تحت ہر گاؤں ایک اکائی ہوتا تھا جس کے ذمے امن و امان کا قیام، تمام نزاعی معاملوں کا تصفیہ، تمام قابل کاشت زمین کی تقسیم، مالگزاری جمع کرنا اور حکومت کو مقررہ شرح پر ادا کرنا ہوتا تھا۔ دیہات کے اس مقامی خود اختیاری نظام میں مسلمان بادشاہ اور حاکم دخل دینا اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے تھے۔ ایک بادشاہ کے بعد دوسرا بادشاہ، ایک خاندان کے بعد دوسرا خاندان برسر اقتدار آتا تھا، اندرون[2] اور بیرون ملک خون ریز لڑائیاں ہوتی تھیں، لیکن کاشتکار اسی طرح سال ہا سال سے اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔ مرکز کے سیاسی واقعات سے لاعلم اپنے دیہات اور خاص طور پر اپنی کھیت کی زندگی میں مست و مگن رہتا تھا اور اس کے کھیتی باڑی کا کام بغیر خلل اندازی کے جاری رہتا تھا۔ زراعت ان کی محنت سے ترقی کرتی تھی لیکن لگان کی شرح بدستور وہی رہتی تھی۔ کبھی ایسا بھی پیش آیا کہ بے وقوف بادشاہ یا حاکم کی وجہ سے اسکو اپنا گاؤں یا ہل چھوڑنا پڑا لیکن طوفان فرو ہونے کے بعد پھر وہ اپنے کھیت کو واپس ہو جاتا اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتا تھا۔ یہ دیہی نظم ونسق منو کے زمانے سے ہندوستان میں رائج تھا۔ بادشاہوں کے ظلم و تشدد کے واقعات ان کی عام روزمرہ کی زندگی کو متاثر نہیں کرتے تھے۔ ان کے ساتھ تشدد اور سختی کے بہت کم واقعات پیش آئے اسلئے کہ ایسا کرنا خود بادشاہوں کے مفاد کے منافی ہوتا تھا۔ چنانچہ سلاطین بہمنیہ نے اکثر موقعوں پر اپنے جانشینوں کو کاشتکاروں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کی ہے۔ ان کے دور حکومت کی دوسری خوبی یہ تھی کہ انھوں نے سرزمین دکن کو اپنے مادر وطن کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ اگرچہ بادشاہ اور رعایا میں مذہب کی بناء پر تفریق قائم تھی، لیکن اس سرزمین کے آسمان و زمین سے ماوراء ان کے مفادات یا دلچسپیاں نہیں تھیں۔ محمود غزنوی نے اپنے برق آسا حملے سے ہندوستان کی بے اندازہ دولت غزنی کی آرائش اور تزئین میں صرف کی۔ لیکن دکن کے ان بادشاہوں کا دکن کے سوا کوئی دوسرا وطن نہیں تھا۔ اسی بناء پر یہاں کی دولت ملک کی سرحد سے باہر نہیں گئی۔ مقامی صنعت و تجارت، بیرونی تجارت و صنعت کی حوصلہ افزائی سے متاثر نہیں ہوئی۔ ان بادشاہوں نے جہانبانی کے سخت اصولوں کے باوجود اپنے مفاد کو رعایا کے مفاد سے اور اپنی زندگی کو رعایا کی زندگی سے ہم آہنگ کر لیا تھا۔ اپنی توفیر دولت اور خوشحالی رعایا کی محنت اور جفاکشی کا نتیجہ سمجھتے تھے، فرشتہ نے اپنی تاریخ میں فیروز شاہ اور احمد شاہ کے زمانے میں فتوحات کی وجہ سے قومی دولت میں اضافہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ دولت عمارتوں کی تعمیر، آبپاشی، تالاب اور کاریز وغیرہ کی تعمیر پر

۱؎ VILLAGE COMMUNITY SYSTEM

۲؎ SURVEY OF INDIAN HISTORY - PAGE (143)

صرف ہوتی تھی۔ چنانچہ بیدر کا کٹھانہ کا تالاب اور نوبا کی آبپاشی کی اسکیم سے زراعت میں ترقی ہوئی اور اس کے نتیجے میں ملک کی عام خوشحالی میں اضافہ ہوا۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی بادشاہت کے زیر سایہ رہنے والی رعایا کی عام حالت یورپ کے سامنتی عہد کی لڑائیوں نے مغربی یورپ کے اکثر ممالک کو تباہ و تاراج اور نظام معیشت کو درہم برہم کر دیا۔ اس کے برعکس ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے بادشاہوں کی ہوس ملک گیری کی بنا پر خون آشام لڑائیاں ضرور ہوئیں لیکن عوام کی زندگی پر ان کا تباہ کن اثر نہیں ہوا۔ مسلمان حاکموں کا زراعت اور صنعت پر اس قدر تشدد نہیں تھا جس قدر یورپ کے امرا اور زمینداروں کا تھا جو محلوں میں رہتے تھے، گاؤں اور کھیتوں کو تباہ کر دیتے تھے اس کے برخلاف دکن میں صنعت و تجارت اور زراعت خوب پھلی پھولی۔ یورپ کے مقابلے میں مذہبی اور اصلاحی تحریکات جنوب میں بغیر کسی دباؤ اور تشدد کے جاری تھیں۔ ادبی تحریکات بھی مذہبی اصلاحات کے ساتھ ساتھ جاری تھیں چودھویں صدی میں دکن میں مرہٹی کے قدیم شعراء وہی تھے جو اس دور کی مذہبی تحریکات کے علمبردار تھے چنانچہ سوامی نرسماسرسوتی، جنار دھن سوامی اور ایکناتھ دتاتریہ اسکول سے بھی تعلق رکھتے تھے اور مرہٹی زبان کے نامور ادیب تھے اور جن کی ادبی تخلیقات نے مرہٹی ادب کو کلاسیکی عظمت عطا کی۔ سلاطین بہمنیہ میں علاؤالدین احمد شاہ ثانی" سوامی نرسماسرسوتی کا معتقد اور ان کے فیض روحانی کا قائل تھا۔ ان کی روحانیت نے دکن کی اجتماعی زندگی پر صحت مند اثر ڈالا۔ دکن کے اس عہد وسطیٰ کو اس امر کا بھی فخر و امتیاز حاصل ہے کہ اس نے سنسکرت کے نامور عالم اور وید کے مشہور مفسر سائنا (۱۳۸۷ء) کو جنم دیا جس کی ویدک تفسیریں سند کا درجہ رکھتی ہیں

الحاصل دکن کے اس عہد وسطیٰ کو ہم علم و عمل کا متنوع اور ہمہ گیر دور سمجھتے ہیں۔ اس دور کی زندگی کا غائر مطالعہ ہمارے آئینہ تخیل میں ایک ایسے ملک کا نقشہ پیش کرتا ہے جہاں دیہات کی زندگی پرسکون کاشتکار اپنی زراعت کے کام میں ہمہ تن مصروف، صنعت و تجارت کو روز افزوں ترقی، ملکی مصنوعات کی قدر افزائی، آرٹ اور تمدن کو فروغ اور لوگوں کو فکر و عمل کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اس طرح وہ بلا جبر و تخویف اپنے طور پر سوچ سکتے تھے اور مذہبی اصلاحات کیلئے تحریکات بھی چلا سکتے تھے۔

خلاصہ بحث:۔

ان بیرونی سیاحوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن تجارت کا اہم مرکز تھا وسطی ایشیا کے جہاز دکن کے ساحل پر لنگر انداز رہتے تھے۔ ایشیا کے اکثر ممالک کے لوگ تجارت کی غرض سے دکن آتے جاتے رہتے تھے اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ لوگ بادشاہوں کے پاس ملازمت کش ہو گئے اور سیاست کے میدان میں بھی قدم رکھا

چنانچہ خلف حسن بصری اور محمود گاواں تاجر کے بھیس میں دکن آئے، سلطنت پر چھا گئے اور یہیں پیوند زمین ہو گئے اس سے یہ چیز مترشح ہوتی ہے کہ دکن تجارت کا بڑا مرکز تھا اور جس نے اپنی تجارت کی بناء پر نامی گرامی لوگوں کو اپنی طرف کھینچا۔ اس کے علاوہ گوا، چاؤل اور دابل کی بندرگاہیں بھی تجارت کے بڑے مرکز تھے فیروز شاہ ہر سال بہمنی جہازوں کو بیرون ملک کے نوادر اور مصنوعات لانے کیلئے بھیجا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ سلطنت بہمنیہ کے اس طویل زمانے میں صرف تین مرتبہ قحط پڑا۔ بادشاہوں نے اپنی فیاضی، دریا دلی اور ہمدردی سے رعایا کی مصیبتوں کو دور کر دیا۔ ایسے موقع پر دوسرے مقامات سے غلہ بڑے داموں پر خریدا جاتا تھا اور ملک میں سستے داموں پر رعایا کو فروخت کیا جاتا تھا۔ روسی سیاح کے بیان کے بموجب زمین کی کاشت اچھی ہوتی تھی اور ملک کا غلہ مقامی آبادی کیلئے کافی ہوتا تھا۔ جب ملک کی معیشت کا دارومدار زمین کی پیداوار پر تھا اور پیداوار ضروریات ملک کیلئے کافی ہوتی تھی تو رعایا کا ہر حالت میں آسودہ اور خوشحال رہنا لازمی امر تھا۔ اگر شہروں اور گاؤں کی آبادی کی اجتماعی زندگی کا مقابلہ کیا جائے تو شہر کے لوگ نسبتاً زیادہ خوشحال معلوم ہوتے ہیں۔ اگر اس تقابلی مطالعے سے ہٹ کر رعایا کی عام زندگی پر مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں جائزہ لیں تو عوام کی زندگی کے تعلق سے ہم بہتر اور امید افزا نتائج پر پہونچتے ہیں۔ اصل میں نکیتن کی آنکھیں امراء کی شان و شوکت سے خیرہ ہو گئی تھیں جس کی بناء پر اس نے گاؤں والوں کی زندگی کو مقابلتہً پست اور سقیم پایا۔ جب ان دو طبقات کا تقابل کیا جائے تو نکیتن کا بیان درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم اس زمانے کی عام زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو حسب ذیل نتیجے پر پہونچتے ہیں:۔

"........ the rich no doubt over flowed in wealth but the common people also had sufficient to eat and live upon.

TRAVELS IN INDIA —— PAGE (41) 1

SOCIAL AND ECONOMIC CONDITION OF THE PEOPLE UNDER THE BAHMANI SULTANATE JF CHOWDHARY. 2

INDIAN HISTORICAL QUARTERLY NO-IV-1928 - PAGE (724)

محمد ایوب واقف

مقدمہ "رقعاتِ عالمگیر" پر ایک نظر

بعض لوگ زیادہ اس لئے لکھتے ہیں کہ پڑھنے والوں کے سامنے بار بار ان کا نام آئے اور اس طرح ان کی اہمیت بڑھ جائے۔ ایسے لوگ وقتی طور پر اپنے مقصد میں کامیاب تو ہو جاتے ہیں لیکن ان کی شہرت اور ان کا فن بہت جلد اپنی موت مر جاتا ہے۔ ہماری ادبی تاریخ میں ایک دو نہیں بلکہ ان گنت ایسی مثالیں ہیں اور آج کل تو شاعروں اور ادیبوں میں بیشتر ایسے ملیں گے جو نظم و نثر میں محض اس واسطے طبع آزمائی و خامہ فرسائی کرتے ہیں کہ ان کا نام زبان زدِ خاص و عام ہو جائے۔ ایسے شاعروں اور ادیبوں کے یہاں نہ تو کوئی فنی شعور ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی واضح نقطۂ نظر۔ اس کے برعکس متقدمین متوسطین اور عہد جدید میں ایسی بھی شخصیتیں ہمارے سامنے ہیں جنھوں نے انسانیت کا درس دینے حقائق کو سامنے لانے اور فن کو بالیدگی بخشنے ہی کی خاطر قلم اٹھایا ہے اور جن کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک فقرہ ادب کا جواہر پارہ بن گیا ہے۔ ان عظیم المرتبت فنکاروں میں کچھ تو ایسے ملیں گے جنھوں نے بہت زیادہ لکھا ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اگرچہ بہت کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ انھیں دوامی زندگی بخشنے کیلئے کافی ہے۔ ایسے اشخاص میں پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی مرحوم کا نام توجہ کا مستحق ہے۔ دراصل ہمارے ادب میں یہ ایک رسم سی بن گئی ہے کہ ہماری نظر ہمیشہ شاعروں کی طرف اٹھتی ہے۔ نثر نگاروں کی طرف ہم بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ نئے اور پرانے نثر نگاروں میں ایسے بہت سے فنکار ہیں جنھوں نے اردو ادب کو ایسا گراں بہا سرمایہ دیا ہے جس نے ہمارے ادب کو دنیا کے تمام ادبوں میں مثالی حیثیت دیدی ہے اور ہم ہیں کہ ان کے احسانات کو فراموش کئے بیٹھے ہیں۔ ندوی صاحب کی تحریروں میں وہ سادگی و صفائی ہوتی ہے جو اس دور کے بہت کم نثر نگاروں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کوئی مستقل کتاب تو نہیں لکھی ہاں کچھ انگریزی کتابوں کے ترجمے کئے اور کچھ کتابیں مرتب بھی کیں۔ ان کی ایسی ہی چند کتابوں میں "رقعات عالمگیر" بھی ہے "رقعاتِ عالمگیر" اورنگ زیب کے خطوط و رقعات جو علم و ادب، سیاست اور تاریخی حقائق کا سرچشمہ ہیں اور عہد عالمگیری کی پوری عکاسی کرتے ہیں' کا مجموعہ ہے۔ جسے نجیب اشرف ندوی مرحوم نے ترتیب دیا ہے۔ "رقعات عالمگیر" پر ۲۷۰ صفحات پر مشتمل ایک معلوماتی مقدمہ بھی لکھا گیا ہے۔ جو الگ سے کتابی شکل میں شائع ہوا ہے جس میں اسلامی

فنِ انشاء اور شاہی مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشاء کا حال اور انشاء کے اصول اور عالمگیر کی انشاء پر بحث اس کی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی پیدائش سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر روشنی ڈالی گئی ہے اور سچ پوچھئے تو یہی وہ تاریخی مقدمہ ہے جس کی اہمیت نے مصنف کو ابدی شہرت بخشی ہے۔ اس کتاب کا سن تصنیف ۱۹۲۹ء ہے جس وقت مصنف کی عمر کل ۲۹ سال تھی ۲۹ سال کی عمر میں ایسا عظیم کارنامہ لوگوں کو متحیر کر دیتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو انھیں قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہوگا اور جنھوں نے ان کے دیگر تحقیقی وعلمی مضامین جو اسی عمر میں لکھے گئے ہیں پڑھنے کی زحمت گوارا کی ہوگی تو ان لوگوں کو ان کے اس شاہکار پر زیادہ حیرت نہ ہوگی حیثیت کی طرف سے۔ ندوی صاحب کو جو بلا کی ذہانت و فطانت عطا ہوئی تھی اس پر ان کے گھریلو ماحول نے جو خالص علمی و ادبی تھا سونے پر سہاگہ کا کام کیا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد ان کی ادبی و تحقیقی صلاحتیں اخبارات و رسائل کے صفحات پر موتی بنکر بکھرنے لگیں

ندوی صاحب کی ایک بہت بڑی خوبی جو ان کی تحریری صلاحیت پر کافی اثر انداز ہوتی وہ انکی محنت اور ذوقِ مطالعہ تھا جو ان کے نزدیک صحتمند ادب کی تخلیق کے لئے انتہائی ضروری ہے ان کی محنت اور ذوقِ مطالعہ کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ قیام دارالمصنفین کے دوران جب "معارف" کے اڈیٹر علامہ سید سلیمان ندوی نے انھیں محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اردو" پر تبصرہ لکھنے کو کہا تو ندوی صاحب نے تقریباً دو سو کتابوں کا مطالعہ کیا جو کسی نہ کسی طرح اردو زبان کی پیدائش اور اس کے ارتقاء سے تعلق رکھتی تھیں اور جب وہ تبصرہ چھپا تو ادبی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ حافظ محمود شیرانی کو اپنی علمی تنقیدوں پر بڑا ناز تھا۔ اور اس وقت وہ علامہ شبلی نعمانی کی زندۂ جاوید تصنیف "شعرالعجم" پر تنقیدی مضمون لکھکر علمی و ادبی دنیا میں اپنی عظمت کا سکہ بٹھا چکے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی تحریروں سے اختلاف کی کوئی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن نجیب اشرف ندوی صاحب نے "پنجاب میں اردو" کی بعض خامیوں کی طرف صاحب تصنیف کے ذہن کو منتقل کیا محمود شیرانی کے بعض بیانات کو انھوں نے سراسر غلط قرار دیا اور ثبوت میں انھوں نے تاریخ کے بہت سے حوالے بھی دیئے اسطرح انھوں نے ثابت کر دیا کہ شبلی اسکول کے لوگ بھی علمی و ادبی دنیا میں اگر سب سے آگے نہیں ہیں تو کسی سے پیچھے بھی نہیں ہیں۔

"رقعاتِ عالمگیر" کی ترتیب کے سلسلے میں ایک بات اور کہدوں کہ جس زمانے میں نجیب اشرف ندوی صاحب اسی کام میں مصروف تھے اس وقت عالمگیریات کے سب سے مستند مورخ پروفیسر سرجادو ناتھ سرکار بقید حیات تھے۔ ان کی موجودگی میں اورنگ زیب کے عہد اور اسی کے کارناموں پر قلم اٹھانا ایک بہت بڑی جرأت تھی جو ۲۹ سالہ ندوی صاحب نے کی "رقعاتِ عالمگیر" کی ترتیب میں انھوں نے پروفیسر سرکار سے اور ان کے ذاتی کتبخانہ سے جو بقول ندوی صاحب مرحوم عہدِ مغلیہ پر ایک بہترین کتبخانہ ہے استفادہ کیا وہ خود اقمطراز ہیں۔

"میں اپنے سب سے بڑے محسن، کرم فرما استاد محترم سرجادو ناتھ سرکار سابق وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی کا نہایت خلوص کے ساتھ تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی ہدایت اور رہنمائی کے بغیر یہ کام انجام نہیں پا سکتا تھا جب میں نے مدد کی درخواست کی تو انھوں نے ایک سچے مصنف کی طرح فوراً مجھے اپنے پاس بلا کر اپنا پورا کتبخانہ میرے حوالے کر دیا۔ اس اثنا میں انھوں نے نہ صرف میری رہنمائی کی بلکہ ایک مشرقی میزبان کے تمام فرائض انجام دیئے۔"

یہاں ہم "رقعات عالمگیر" سے کوئی بحث نہ کر کے اس مقدمہ ہی تک اپنے ذکر کو مرکوز کریں گے جو علیحدہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسے دار المصنفین نے شائع کیا ہے میرے خیال سے اس تاریخی تصنیف کو دار المصنفین کے سلسلۂ مطبوعات کی ایک اہم کڑی سمجھنا چاہیئے اس لئے کہ عالمگیریات سے متعلق تمام تاریخی کتابوں میں یہ واحد کتاب ہے جس میں عالمگیر کی زندگی اور اس کے کارناموں سے متعلق صحیح مواد فراہم کیا گیا ہے۔ اگرچہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے بھی اورنگ زیب کی شخصی زندگی اور اس کے کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا تھا اور عالمگیر سے منسوب الزامات کے جامع جوابات دیئے تھے لیکن "مقدمہ رقعات عالمگیر" میں عالمگیر کی پوری زندگی کو جس ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس سے اس کتاب کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ کتاب پڑھتے وقت اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کی روح مصنف کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ اور شبلی کی عالمانہ شان نے ان کے قلم کو جس طرف چاہا موڑ دیا۔ کہنے کو تو انھوں نے سرجادو ناتھ سرکار سے استفادہ کیا تھا جیسا کہ انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے لیکن عملی طور پر جادو ناتھ سرکار سے ان کا دور کا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ شبلی ہی کے نقش قدم پر وہ چلتے ہوئے نظر آتے ہیں زبان و بیان میں وہی اسلامی رنگ ہے جو شبلی کا ایجاد کردہ ہے واقعات کے بیان میں وہی انصاف پسندی اور نیک نیتی کارفرما ہے جو مولانا کے قلم کا خاص وصف تھا۔ غرضیکہ شبلی کی روح ان کے ہر فقرے سے جھلکتی ہے۔

کتاب کے شروع میں مصنف نے فن انشاء کے ارتقاء کی ایک اجمالی تاریخ دی ہے اگرچہ اس سے فن انشاء کی تاریخ پر پوری روشنی نہیں پڑتی لیکن اس میں کلام نہیں کہ چند ہی صفحات میں انھوں نے انسانی تاریخ کے عہد اول سے جب سے انسان نے اس فن میں دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا بلکہ عہد مغلیہ تک فن انشاء کے ارتقاء کا بڑے حسین پیرائے میں جائزہ لیا ہے۔ اس عہد میں خطوط کی زبان، اس کا بدلتا ہوا انداز، خطوط و مراسلات کے انواع و اقسام، طریقۂ تحریر، اس فن میں ہندوؤں کی دلچسپی اور ہندوستان میں خطوط نگاری کی ترقی پر سیر حاصل طور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے اورنگ زیب کے مکاتیب و رقعات پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اور ان مکاتیب و رقعات کی روشنی میں عالمگیر کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ صاحب سوانح

عالمگیر کی شخصی زندگی اور اس کے کارناموں کو پرکھنے کیلئے دوسرے مورخین کی کتابوں اور ان کے افکار آراء سے زیادہ اورنگ زیب کے ذاتی خطوط کا سہارا لیا ہے۔ اس لئے کہ مکتوب علیہم اپنے مکتوب میں غیر شعوری طور پر اپنی فطرت کے عین مطابق اپنے کو ظاہر کر دیا کرتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ ندوی صاحب نے عالمگیر کی نفسیات کو جاننے کیلئے اس کے خطوط کی نفس تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اسی ضمن میں انھوں نے عالمگیر کے خطوط کی فہرست بھی دی ہے لیکن یہ سارے کے سارے خطوط اس وقت کے ہیں جب شہنشاہ اورنگ زیب جنگ و جدال میں مصروف ہو چکے تھے۔ یعنی عہد شاہزادگی کے بعد کا دور جس وقت ان کی عمر تیس سال کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس سے پہلے کے خطوط یا تو دستیاب نہیں ہیں یا ان خطوط کی تحقیق و تلاش کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ چنانچہ مصنف "مقدمہ رقعات عالمگیر" نے اورنگ زیب کے عہد شاہزادگی پر معلومات یکجا کرنے کے لئے یہ عالمگیر سے متعلق دوسری تصنیفات کے ماخذوں پر اکتفا کیا ہے۔ ان ماخذوں کی روشنی میں انھوں نے عالمگیر کے عہد شاہزادگی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دیگر محققین و مورخین نے اورنگ زیب کے عہد شاہزادگی کے بارہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان سے حقائق سامنے نہیں آتے بلکہ ان پر اور پردہ پڑ جاتا ہے۔ ندوی مولف رقعات عالمگیر ان سے قطعی طور پر متفق نہیں ہیں وہ کہتے ہیں۔

"اس وقت تک اورنگ زیب کے متعلق فارسی یا اردو میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اس کے عہد شاہزادگی کے واقعات کو شاہجہاں کے حالات کے سلسلے میں ضمناً بیان کر دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے اس کے اس اہم ترین زمانہ کے اصلی واقعات ہمارے سامنے نہیں آئے اور وہ یک وقت دکن سے ایک بڑی فوج لیکر اپنے معمر ضعیف و لب گور باپ اور اپنے بڑے بھائی سے لڑنے کیلئے آتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اس کے بعد اس کی تمام زندگی ایک خونی داستان بنکر رہ جاتی ہے۔ حالانکہ ہم نے متعدد بار بتایا ہے کہ اس کے پنجاہ سالہ عہد حکومت کی تاریخ تمام تر نتیجہ ہے اس کے عہد شاہزادگی کے حالات کا اور جب تک ہم اس عہد کے خانگی، سیاسی، معاشرتی اور مذہبی واقعات کو نہ جانیں ہم اس کے بعد کی طویل تاریخ کے رُخ کو نہیں پہچان سکتے۔ اس لئے ہم ابتداً اس وقت تک جب تک کہ اس کے خطوط شروع نہیں ہوتے عام تاریخوں سے اور پھر زیادہ تر خطوط اور بعض جگہ تاریخ کی مدد سے اس کے عہد شاہزادگی کے واقعات کو قلمبند کرتے ہیں ــــ"

تعجب اشرف ندوی صاحب کے اس بیان سے تشویش ہوتی ہے کہ آخر مورخین نے اورنگ زیب کے عہد شاہزادگی کو پردۂ اخفا میں کیوں رکھا۔ بہرحال یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ ندوی صاحب نے ایک اہم امر کی طرف مورخین کی توجہ مبذول کرائی ہے اور خود بھی عالمگیر کے عہد شاہزادگی کے واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان حقائق کی طرف اشارہ کرنے کے بعد انھوں نے اورنگ زیب کی ابتدائی جنگوں کو ضبط تحریر میں لیا ہے۔ جس میں بندیل کھنڈ کی جنگ اور اورنگ زیب کی نظامت دکن کو خاص طور سے بیان کیا ہے۔ چہرہ گیری، تاہل، ازدواجی زندگی، گجرات کی صوبہ داری، اورنگ زیب کی معزولی، گجرات کی نظامت، بلخ و بدخشاں کی جنگ، قندھار کا محاصرہ، ملتان کی صوبہ داری، قندھار کی پہلی مہم، گولکنڈہ اور بیجاپور کی جنگ کے وجوہ، قطب الملک کا رویہ، گولکنڈہ کا محاصرہ، صلح گفتگو، شاہجہاں کا حکم، باپ بیٹے کا اختلاف، جنگ بیجاپور، قطب الملک سے سازش، نئے قلعے کی تعمیر، عادل شاہ کی وفات اور اس کا جانشین، بیدر اور کلیانی کی فتح، برادرانہ جنگ اور تخت نشینی وغیرہ کے عنوانات کے تحت اورنگ زیب کی جنگی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ جس سے وہ وجوہ بہ آسانی سمجھ میں آجاتے ہیں جو اورنگ زیب کو جنگ کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ اس کے بوڑھے باپ اس کے بھائیوں اور تمام افراد جو سلطنت میں اعلیٰ مراتب پر فائز تھے کی کارگزاریوں کو بھی بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں شاہی خاندان کے مختلف ارکان کے طریقۂ عمل، ان کی افتاد طبیعت اور ان کی معاندانہ کارروائیوں کو خاص طور سے بیان کیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے ساتھ غیروں سے زیادہ اپنوں نے غداری کی اور اسے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن اورنگ زیب ایک اعلیٰ ہمت اور نڈر شہنشاہ تھا ہمیشہ ظلم و تشدد کے طوفان سے مقابلہ کرتا رہا وہ اپنے دشمنوں کی قابل مذمت چالوں اور باپ اور بھائی کے ناروا سلوک سے ایک لمحہ کیلئے بھی کبھی بد دل نہ ہوا اور نہ ہی اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ کبھی بے ادبی سے پیش آیا۔ اس نے شاہجہاں کی غیر پدرانہ حرکتوں اور دارا شکوہ کے جیرہ دستی کارناموں کے سامنے ہمیشہ ایک سعادت مند بیٹے کا خلوص اور برادری بھائی کا جذبہ محبت و وفا رکھا۔ ان صورتوں کو پیش نظر رکھکر اگر یہ کہا جائے کہ ایسا بلند و بالا کردار جیسا کہ اورنگ زیب نے اپنی زندگی بھر قائم رکھا۔ مغلیہ عہد کے شاید ہی کسی حکمراں نے قائم رکھا ہو۔ دراصل "مقدمہ رقعات عالمگیر" کے مصنف کا مقصد جیسا کہ کتاب کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے یہی تھا کہ اورنگ زیب کا اصل کردار دنیا کے سامنے لایا جائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے اس عظیم مقصد میں پورے طور پر کامیاب ہوئے۔

"مقدمہ رقعات عالمگیر" میں اورنگ زیب کے حالات زندگی سے متعلق بعض باتیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں جن سے اس کتاب کی افادیت میں بڑا اضافہ ہوگیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اورنگ زیب کا برتاؤ ہندوؤں کے ساتھ کس نوعیت کا رہا تھا۔ مصنف نے اس موضوع پر کافی توجہ کے ساتھ لکھا ہے اورنگ زیب

یہ الزام ہے کہ اس نے ہندوؤں کے ساتھ ہمیشہ عداوت و نفرت کی اپنے اثر و اقتدار سے ہمیشہ وہ غیر مسلموں کو پامال کرتا رہا۔ عہدِ مغلیہ سے لیکر اس عہد تک اورنگ زیبؒ کے کسی مورخ نے غیر متعصبانہ نقطۂ نگاہ سے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ آیا اورنگ زیبؒ واقعتاً ہندوکش تھا یا سب کے ساتھ مساویانہ برتاؤ رکھتا تھا۔ پروفیسر سرجادو ناتھ سرکار جو عالمگیریات کے سب سے بڑے مورخ مانے جاتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے عہدِ مغلیہ پر اور خاصکر عالمگیر پر دیگر مورخین سے کہیں زیادہ لکھا ہے لیکن کسی کتاب یا کسی مقالہ میں انھوں نے واضح طور پر یہ نہیں لکھا کہ اورنگ زیب ایک غیر متعصب سلطان تھا اور ہندوؤں کے ساتھ اس نے ناانصافی نہیں کی بلکہ اس کا رحم و کرم ان کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے سرجادوناتھ سرکار کی کم و بیش تمام کتابیں پڑھیں اور ہر کتاب کو پڑھتے وقت یہ تلاش رہتی تھی کہ کہیں تو ایک ایسا جملہ نکل آتے جو اورنگ زیبؒ کو ایک غیر متعصب بادشاہ قرار دینے میں ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکے اور جس سے جادوناتھ سرکار کو ایک غیر جانبدار مورخ کہا جاسکے لیکن افسوس کہ ایسا کوئی جملہ مجھے نہیں ملا۔ اگرچہ ان کی بعض کتابوں میں مثلاً "INDIA OF AURANGZIB, TOPOGRAPHY, STATISTIC AND ROADS" "STUDIES IN AURANG GZIB,S REIGN" "HISTORY OF AURANG GZIB"

کافی اہم ہیں اور ان میں اورنگ زیب کے حالات زندگی اور اس کے کارناموں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اصل میں اورنگ زیبؒ پر اتہام کہ وہ ہندوؤں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا سر غلط ہے۔ جن لوگوں نے اورنگ زیبؒ کے خطوط پڑھے ہوں گے۔ انھیں اچھی طرح معلوم ہوگا کہ اپنے اکثر خطوط میں اس نے ہندو راجاؤں کے لئے سفارشیں کی ہیں مثلاً نرسنگھ داس، مہیش داس راٹھور اور حیات سنگھ وغیرہ نے جب اورنگ زیب سے اعانت کی درخواست کی تو اس نے بارہا ان کی امداد کی اکثر تو ایسا ہوتا کہ اورنگ زیبؒ کی سفارشیں جو ہندوؤں کی خاطر شاہجہاں کے حضور میں پیش کی جاتیں وہ انھیں مسترد کر دیتا تھا۔ لیکن اورنگ زیبؒ ان کی مدد کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیتا تھا۔
اورنگ زیبؒ ایک حق اندیش اور انصاف پسند شہنشاہ کی حیثیت سے ہمیشہ اس بات کے لئے کوشاں رہتا تھا کہ اس سے کوئی ایسی غلطی سرزد نہ ہوجائے جو مغلیہ سلطنت کی پیشانی کا داغ بنے۔ افسوس کہ وہ اپنی ان تمام تر کوششوں کے باوجود اپنے اس عظیم مقصد میں ناکامیاب رہا لیکن اسکی ذمہ داری اورنگ زیبؒ پر نہیں بلکہ ان ناسمجھ اور تنگ نظر مورخین پر ہے جنھوں نے اورنگ زیبؒ کو اس رنگ میں پیش کیا کہ لوگ اسے ہندو قوم کا جانی دشمن سمجھنے لگے۔ یہاں ہم مقدمہ رقعاتِ عالمگیرؒ سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں نجیب اشرف ندوی صاحب نے واضح طور پر یہ کہا ہے کہ اورنگ زیب ہندوؤں کا دشمن نہیں تھا اور نہ ہی ہندوؤں کے خلاف اس نے ایسا کوئی کام کیا جس سے اسے موردِ الزام ٹھہرایا جائے۔ وہ لکھتے ہیں: --

"وہ ہندوؤں سے بھی اسی طرح مخاطب ہوتا ہے جس طرح مسلمانوں سے بلکہ اس کے خطوط کا مطالعہ ہم کو اس نتیجے تک پہنچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس نے مسلمانوں سے زیادہ اہم سفارشیں ہندوؤں کیلئے کی ہیں مگر یہ اس کی بدقسمتی اور اس کے بڑے بھائی کی عنایات خاص کا نتیجہ تھا کہ راجپوتوں کا دشمن مشہور کردیا گیا اس چال سے دارا کا جو مقصد تھا وہ بالکل عیاں اور واضح ہے اور یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کے پاس نہ راجپوت فوج رکھی گئی اور نہ راجپوت افسر ہی دو چار سے زیادہ رہے اور یہی سبب ہے کہ اس کے خطوط میں ہندوؤں کا ذکر بہت کم آتا ہے اور پھر اورنگ زیب اپنے فرض سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں رہا۔ اور جب کبھی بھی اسے موقع ملا اس نے ہندوؤں کی سفارش کی"

میرے خیال سے ندوی صاحب نے جن حقائق کا انکشاف کیا ہے اس میں کسی طرح کی غلط بیانی سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ اس کے قلم نے ایک منصف مزاج مورخ کے قلم کی طرح واقعات کی ہو بہو تصویر کھینچی ہے ورنہ ہندوستانی مورخوں نے تو ہمیشہ حقائق سے چشم پوشی کی ہے اور یہی بات تو یہ ہے کہ ابتدا سے لیکر مغلیہ عہد کے زوال تک ہندو راجاؤں نے مغل بادشاہوں کے ساتھ ہمیشہ تباہ کن رویہ اختیار کیا مسلمانوں کے لئے ان کا اندرون ہمیشہ پراگندہ رہا جب بھی موقع آیا ہندو راجاؤں نے مغل حکمرانوں کو تباہی و بربادی کے غار میں جھونکنے کی تدبیریں کیں یہ الگ بات ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے ان کے اخلاق سے گرے ہوئے ایسے اقدامات کو کامیابی سے ہمکنار نہ ہونے دیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان ہندو راجاؤں اور مہاراجاؤں نے ایک دو بار نہیں سینکڑوں بار مسلمان بادشاہوں کے ساتھ احسان فراموشی کا ثبوت دیا ہے اور مسلمان حکمرانوں نے ہمیشہ اسے درگذر کیا یہ تاریخ کے ایسے واقعات ہیں جنھیں مصلحتاً پوشیدہ رکھا گیا ہے اور اس طرف کسی مورخ نے اشارہ تک نہیں کیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مغلیہ عہد اور مسلمان بادشاہوں پر صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ غیر ممالک میں بھی تاریخی کتابیں لکھی گئی ہیں ورنہ ہندوستانی مورخوں نے تو مغل سلطنت کا پورا ڈھانچہ ہی تبدیل کردیا ہے اور آجکل تو ایسے بھی مورخ سامنے آرہے ہیں جو مغلوں کی تعمیرات کو ہندو راجاؤں اور مہاراجاؤں کی تعمیرات بتاکر فن تعمیر سے ان کی دلچسپیوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ انھیں اس کا بھی احساس نہیں ہے کہ ان کی ان صریح غلط بیانیوں کو کہاں تک جائز قرار دیا جائیگا اور ان کی مودخانہ بصیرت کو کس نگاہ سے دیکھا جائیگا۔

اورنگ زیب پر ایک دوسرا الزام یہ ہے کہ وہ مسلمان کرتا طاقت کے بل بوتے پر دوسرے مذاہب میں یقین رکھنے والوں کو اسلام کا حامی اور پیرو بناتا تھا۔ اور خود زندگی بھر اسلام کی تبلیغ کرتا رہا۔ اس کیا

کوئی شبہ نہیں کہ اورنگ زیب ایک زندہ مست اور فقیر صفت شہنشاہ تھا اسلامی اصول وضوابط پر سختی سے عامل تھا یہ بھی غلط نہیں کہ وہ اسلام کا مبلغ تھا اور اسلام کی تشکیل واشاعت کی تگ ودو میں مصروف رہتا تھا۔ اس کے اس فعل کو پیش نظر رکھکر اسے ہندو کش اور مسلمان گر گردانا بہت بڑی ناانصافی ہے۔ ہندوستان کے راجاؤں اور مہاراجاؤں میں اشوک، سمدر گپت اور چندر گپت وغیرہ کے نام بڑے احترام کے ساتھ لئے جاتے ہیں سچائی، انصاف اور انسانیت کی بات جہاں آتی ہے۔ انھیں مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے ہماری نظروں میں وہ بے شک انصاف پسند اور انسانیت نواز راجاؤں کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان راجاؤں نے بھی اپنے مذہب کی تشکیل واشاعت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اپنے مذہبی سفراء اور نمائندوں کے ذریعے انھوں نے پڑوسی ملکوں میں بھی اپنے مذہب کا پرچار کیا لیکن ان کے ان افعال سے ان کے کردار پر کوئی آنچ نہیں آتی اور جب اورنگ زیب نے یہی کام کیا تو لوگوں نے اسے مبلغ اسلام اور مسلمان گر کہکر بدنام کیا۔ پھر اورنگ زیب کے عہد میں بہت سے ہندو مسلمان ہوتے اس بات کو پیش نظر رکھکر اگر اورنگ زیب کو مسلمان گر کہا جاتا ہے تو یہ بھی مبنی بر حقیقت بات نہیں ہے۔ ہندوؤں کا اسلام قبول کرنے کا سلسلہ صرف اورنگ زیب ہی کے عہد میں جاری نہیں تھا بلکہ یہ سلسلہ تو اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب عرب کے بازار کفر والحاد میں خدا اپنے آخری پیغمبر کو قرآن اور اسلام کے ساتھ محض اس واسطے بھیجتا ہے کہ وہ لوگ جو غلط راستے پر گامزن ہیں فکر وعمل کی نئی دنیا سے روشناس ہوں۔ اپنے سچے معبود کو پہچانیں اور ایسے کام ہرگز نہ کریں جو ان کے خالق و رزاق کے درمیان خلا پیدا کرتے ہیں، اور جب کافروں اور منافقوں کے بازار میں خدا کا محبوب پیغمبر احکام خدائی کے ساتھ تن تنہا وارد ہوا اور پیار ومحبت کی زبان میں مالک کونین کا پیغام سنایا تو بڑی تعداد میں لوگ اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔ وہ کافر و فاسق جو اسلام کا نام سن کر جل بھن اٹھتے تھے ایمان لانے لگے ـــ عہد نبوی سے لیکر آج تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ اسکو صرف اورنگ زیب کے عہد سے منسوب کرنا تاریخی حقیقت سے منھ موڑ لینے کے مترادف ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات اور کہدوں کہ بعض لوگ یہ کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا۔ یہ بات بھی بعید از حقیقت ہے تعصب سے ذہن کو پاک کر کے ایک لمحہ کیلئے مسلمانوں کے ماضی پر نظر ڈالئے اور کسی بھی مذہبی پیشوا کو لے لیجئے اسکی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس نتیجے پر ضرور پہنچیں گے کہ اس کی زندگی خلوص اور جذبۂ بھائی چارگی سے تعبیر تھی۔ دراصل ہندوؤں نے جو کافی تعداد میں اسلام قبول کیا ہے وہ تیغ وشمشیر کے ڈر سے نہیں بلکہ مسلمان قوم کی اس خوبی سے مغلوب ہو کر جسے علامہ اقبالؒ نے سلیقۂ دلنوازی کہا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے اپنے اس سلیقۂ دلنوازی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا ہے۔ اگرچہ مسلمان دنیا کی وہ واحد بدقسمت قوم ہے جو ہمیشہ ظلم وتشدد کا شکار رہی زندگی کے

کسی دور میں اسے سکون نصیب نہیں ہوا۔ لیکن یہ اسکی فطرت ہے کہ ہر حالت میں وہ عالمگیر انسانی محبت اور بھائی چارگی کا علم بردار رہی ہے اور دشمنوں کے وار و خنجر و سوز خدنگ کا جواب خلوص اور محبت سے دیتی رہی ہے اور ہمیشہ دست اختلاط دراز کرتی رہی ہے۔۔۔۔

راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

مذکورہ بالا واقعات کی روشنی میں اگر ہم یہ کہیں کہ اورنگ زیبؒ پر کئے جانے والے تمام اعتراضات کھوکھلی بنیادوں پر قائم ہیں تو کسی طرح کی غلطی نہ ہوگی۔ مقدمہ رقعات عالمگیر کے مصنف نے مختلف ابواب میں اورنگ زیبؒ کے سیاسی تہذیبی اور مذہبی کارناموں کو بیان کرتے وقت اورنگ زیبؒ پر کئے جانے والے اعتراضات کا تاریخی واقعات کی مدد سے بڑی خوش اسلوبی سے جواب دیا ہے۔ ہمیں ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو اورنگ زیبؒ کے حالات و کارناموں پر غیر جانبدارانہ طور پر لکھی جائیں۔ ہم ہرگز نہیں کہتے کہ اورنگ زیبؒ کی خوبیوں ہی کا ذکر کیا جائے اگر اس سے نادر واقعی خامیاں تھیں تو انھیں بیان کرنے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن ہمیں اس امر کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ عیب جوئی انسانی فطرت کا ایک جزو ہے۔ اورنگ زیبؒ کے چھوٹے چھوٹے عیوب کو گنانا اور اس کے عظیم انسانی کارناموں کو پس پشت ڈال دینا اب تک ہمارے مورخین کا شیوہ رہا ہے اور یہ روِیہ فن تاریخ نویسی کے لئے بڑا ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اورنگ زیبؒ کے اخلاق کی عظمت اسکی نیت کا اخلاص بردباری اس کا تحمل و برداشت قابل احترام وصف ہیں جس سے کسی دانا اور غیر متعصب شخص کو انکار نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ اورنگ زیبؒ کے پنجاہ سالہ کارگذاریوں کو قلمبند کرنے کے لئے ۱۰۸ صفحات ناکافی لیکن "مقدمہ رقعات عالمگیرؒ" کے محدود صفحات میں عالمگیر کے عہد شاہزادگی سے لیکر اس کی زندگی کی آخر گھڑیوں تک کے تمام واقعات کو ندوی صاحب نے جس باقاعدگی سے سمویا ہے اس سے یہ تو سمجھ میں آ ہی جاتا ہے کہ قدرت نے انکو کس قدر مورخانہ بصیرت عطا کی تھی اور یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ دریا کو کوزے میں کس طرح بند کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ندوی صاحب کی زبان کا تعلق ہے صفائی و سادگی کی عمدہ مثال ہے انکی تقریر اور زبان میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا تھا اس معاملے میں وہ دوسرے لوگوں سے بالکل منفرد تھے وہ دوستوں اور ملاقاتیوں سے گفتگو کے دوران جو زبان استعمال کرتے تھے وہی زبان تحریر میں بھی سامنے آتی تھی۔ ان کی تحریر میں پیچیدہ اور غیر فصیح الفاظ کبھی نہیں آتے تھے وہ ایسی زبان لکھتے تھے جس میں عالمانہ رنگ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ ادبی بانکپن بھی ہوتی تھی مقدمہ رقعات عالمگیر کی زبان اس کا ثبوت ہے۔

یہ امر افسوسناک ہے کہ رقعات عالمگیر کی ترتیب و اشاعت کے بعد (تصنیفی) مصروفیات ان کی تمام تر ختم ہو گیا تھا۔ اگرچہ کبھی کبھار وہ علمی و تحقیقی مضامین لکھتے رہتے لیکن مستقل کوئی کتاب نہیں لکھی۔ [illegible] ۲۶ [illegible]

محمد بدیع الزماں

اقبال اور طنز

ہر متمدن ملک کی زبان میں طنزیہ ادب کا ایک خاصہ حصّہ ہے مگر بدقسمتی سے اردو زبان ہمیشہ اس معاملے میں تہی مایہ رہی۔ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں میں اس زبان میں طنزیہ ادب نے اپنا مقام حاصل کیا مگر پھر بھی اسے تشفی بخش نہیں کہا جا سکتا۔ شاعری میں یہ طنز اکبر الہ آبادی کے قبل صرف واعظ و ناصح کی ذات تک محدود تھی۔ سماج کی اور ناہمواریوں کی طرف کسی شاعر نے رجوع نہیں کیا شاید اس لئے بھی کہ اسوقت معاشرہ میں اتنی گتھیاں نہ تھیں جتنی کہ بیسویں صدی میں۔ اکبر نے پہلے پہل طنزیہ کلام میں کچھ ہمہ گیریت پیدا کی مگر وہ بھی مغربی طرز معاشرت اور تعلیم اور اُن کے نتائج کے طور پر مذہب سے بڑھتی ہوئی بے اعتنائی تک محدود رہی۔ اکبر نے طنز سے زیادہ ظرافت سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی کہی ہوئی باتیں فوری طور پر تو متاثر کرتی تھیں مگر اسکی چبھن دل میں باقی نہیں رہتی تھی کیونکہ ظرافت میں نشتریت تو ہوتی نہیں۔ یہ سہرا اردو شاعری میں صرف اقبال کو ہے کہ انھوں نے طنز کو اپنی مفکرانہ بصیرت سے ہمہ گیری عطا کی اور اس میں غور و فکر کے عناصر شامل کئے۔

ناقدانِ ادب نے طنز کی خصوصیات پر سیر حاصل بحث کی ہے جن کی روشنی میں اقبال کے طنزیہ کلام کا تجزیہ زیادہ مفید ہوگا۔ اس لئے بھی چونکہ ظرافت' مزاح' ہزل اور طنز میں اتنا باریک فرق ہے کہ ان کے حدود و خصوصیات متعین کر لینا کسی فنکار کے فن کے تجزیہ کیلئے از بس ضروری ہے۔ اس شعبۂ ادب کے مختلف پہلوؤں میں علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی نے بین فرق اس طرح تبلایا ہے۔ کہتے ہیں: ۔۔

> 'ظرافت میں خوش طبعی کے ساتھ ذہنی چاشنی اور جودتِ طبع بھی آتی ہے۔ اُسے سُن کر آپ کے دماغ پر یہ اثر ہوتا ہے کہ چہرے کے پٹھوں میں شگفتگی آجاتی ہے اور آپ ہنس پڑتے ہیں۔ اس کا نشانہ حاضرین میں سے کوئی نہیں ہوتا۔ جب ظرافت صرف خوش طبعی ہو تو وہ مزاح ہے۔ جب مزاح میں عوامیت اور فحش داخل ہو جائے تو وہ ہزل ہے۔ جب ظرافت میں خوش طبعی کے ساتھ جودتِ طبع اور فطانت غالب عنصر ہو تو وہ بذلہ ہے۔ بذلہ سنج کا رتبہ بہت اعلیٰ ہے۔ وہ ایک قسم کی ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ایجاز اور

لفظی رعایت سے مناسب کام لیا جاتا ہے۔ جب ظرافت کا نشانہ کوئی خاص
قباحت یا عام رجحان ہو تو وہ طنز ہے۔ ظرافت کے بغیر ہی تعریض اور
ہجو ہو جاتی ہے"۔[۱]

سماجی اور معاشرتی پس منظر میں طنز و مزاح کے عوامل و عواقب ان کی افادیت اور محل وقوع پر ڈاکٹر وزیر آغا کا کہنا ہے کہ :۔۔۔

"مزاح سکون اور عافیت کی پیداوار ہے۔ اس کی نمو آسودگی کی مرہون بھی ہے اور مظہر بھی۔ لیکن طنز ایک نمایاں آسودگی سے جنم لیتی ہے گویا مزاح کو ان ایام میں فروغ ملتا ہے۔ جب معاشرے میں خوشحالی اور فارغ البالی عام ہوتی ہے اور فرد کے ہاں تحصیل مسرت کا رجحان قوی ہو جاتا ہے تا جب معاشرہ تصادم اور آویزش میں مبتلا ہو تو انسانی قدریں پارہ پارہ ہو کر زوال آمادہ ہو جاتی ہیں اور طنز کا علمی اشیاء کی کجی اور ناہمواری کو عریاں کرنے لگتا ہے۔ مزاح نگار ناہمواریوں سے پیار کرتا ہے انھیں اپنے سینے سے لگا لیتا ہے لیکن طنز نگار ناہمواریوں کو جڑ سے اکھیڑنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ طنز توڑتی ہے۔ اور توڑنے کے دوران میں ایک فاتحانہ قہقہہ لگاتی ہے۔ جب کہ مزاح ٹوٹے ہوئے دھاگے کو جوڑتا ہے اور بڑے پیار سے اُسے سہلاتا چلا جاتا ہے۔۔۔ ۔۔۔طنز و مزاح میں بنیادی فرق یہی ہے"۔[۲]

ڈاکٹر وزیر آغا نے طنز کے عمل میں آنے کے لئے معاشرے کا جو پس منظر لازمی قرار دیا ہے۔ اقبال اپنے عہد میں اسی تصادم سے دوچار تھے جہاں ملک، قوم و ملت کا شیرازہ پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ سماجی اور معاشی قدریں پاش پاش ہو رہی ہیں۔ ایک دوسرے مشہور اہل قلم و طنز نگار جناب رشید احمد صدیقی طنز و ظرافت کے فن کی پیچیدگیوں اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے طنز کا مقصد "تلقین حقیقت" قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں :۔۔۔

"طنز و ظرافت کا فن نہایت مشکل ہے۔ نہایت خطرناک بھی۔ معمولی یا گھٹیا ظرافت ایسا حربہ ہے جس سے اُس شخص کو کم نقصان پہنچتا ہے جس پر حملہ کیا جائے۔ سب سے کاری اور سب سے مکمل وہ طنز یا ظرافت ہوتی ہے جو غیر شعوری طور پر سرکارا جائے

۱۔ کیفیہ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سلسلہ مطبوعات نمبر ۱۰۰
۲۔ اقبال کی شاعری میں ظرافت کی لہریں، ماہنامہ "تحریک" دہلی ۔۔۔

اور یہ تمیز کرنا دشوار ہو جائے کہ مقصود طنز بذلہ سنجی یا تلقین حقیقت۔ یہ بات
بہت دیر میں آئی ہے اور بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ لیکن بجائے خود یہ بات
جتنی مشکل ہے اتنی دلکش ہے اور اس فن کی شاید یہ آخری منزل ہے۔"[1]

چونکہ طنز کے پردے میں تلقین حقیقت پوشیدہ ہے اور چونکہ سچی بات ہمیشہ تلخ ہوتی ہے اس لئے ا‌ٓ طنز نگار سماج کی جن ناہمواریوں کو اپنا نشانہ بناتا ہے۔ اُن میں باوجود یہ کہ تلخی کے عناصر نہیں ہوتے بلکہ ہمدردی اور کار فرما رہتا ہے پھر بھی ردِ عمل ہونا لازمی ہے۔ اور بہت سی جبینوں پر شکنیں پڑ جاتی ہیں اس لئے اقبالؔ نے واضح طور پر طنز کے جواز میں بھی دلیلیں پیش کیں تاکہ ہوش و خرد رکھنے والے حضرات اس کی مقصدیت سے آگاہ رہیں۔ کہتے ہیں

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق		نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش		میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اِک بندۂ حق بین و حق اندیش		خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند

متذکرہ بالا اشعار میں ہمیں ایک فنکار کے حسیات و جذبات ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ اس کے خلوص اور اصلاح پسندی کا بھی پتہ لگتا ہے چنانچہ اپنے خلوص و نیک نیتی کا ثبوت یہ کہکر دیتے ہیں کہ

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر		کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

جناب کرشن چندر کے الفاظ میں ایک باشعور طنز نگار ان ہی حربوں سے اپنے اندر زندگی رہنے کی قوت محسوس کرتا ہے۔ چونکہ مقصود اصلاح ہے اس لئے طنز نگار کی چوٹ مزاح نگار سے زیادہ گہری ہوتی ہے جب رشید شاہد سے ایک انٹرویو میں وہ اس نکتہ کو اس طرح واضح کرتے ہیں:۔

"ایک طنز نگار شعوری طور پر ایک مزاح نگار سے زیادہ گہری چوٹ کرتا ہے۔
وہ اس لئے گہری چوٹ کر سکتا ہے کہ زندگی کے عوامل اور عواقب پر اس کی نظر
زیادہ گہری ہوتی ہے۔ وہ زیادہ باشعور ہوتا ہے اور بالعموم وہ کسی افادی یا
سماجی مقصد کو لے کر ہی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں
اسکا مطلب یہ ہوا کہ طنز نگار اپنے اندر زندگی بدلنے کی قوت محسوس کرتا ہے
اور ایسا باقوت آدمی زندگی کے سانچوں کو بدلنے کا شعور بھی رکھے بالعموم
یاسیت سے گریز کرتا ہے۔"[2]

---

[1] "نقوش" شوکت نمبر لاہور۔ ستمبر ۱۹۶۲ء (شمارہ ۹۹) [2] پانچ مقبول طنز و مزاح نگار" اسٹار پاکٹ بکس سیریز

طنز کا ایک اور پہلو جذبات کی گہرائی اور طنز نگار کی تاریخی، اخلاقی اور ادبی بصیرت ہے جو مل ملا کر پروفیسر وقار عظیم کے نزدیک طنزیہ کلام میں پیمبرانہ شان پیدا کرتی ہے۔ اقبال کے طنزیہ کلام کی پیمبرانہ شان کے متعلق طنز کی خصوصیات اور محرکات سے بحث کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں :- " طنز جذبات کے اظہار کا ایک ایسا طریقہ ہے جس میں جذباتی انسان جذبات کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کے سطحی محرکات سے بچتا ہوا کسی ایسی بلندی پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی آواز میں پیمبرانہ شان پیدا ہو جاتی ہے ..... طنز نگار میں وہ ساری خصوصیتیں ہوں جو طنز کی تاریخی، اخلاقی اور ادبی اہمیت کو سمجھ کر انہیں بروئے کار آنے میں مدد دے سکیں۔ ہر اچھی طنز اپنے زمانہ کی زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جذبات کی گہرائی ..... طنز کو اسی نے وہ سارے محاسن دیتی ہے جن کے بغیر طنز کو طنز نہیں کہا جا سکتا۔ اس پیچیدہ سی بات کو حالی، اکبر، اقبال اور جوش کی طنز کی کسوٹی پر کس کر دیکھئے ..... جو کچھ جذبات میں ڈوب کر کہا گیا ہے اس کی تاثیر آج کے لئے بھی ہے اور آنے والے کل کے لئے بھی۔"[1]

اقبال نے جہاں سماج اور فرد کی ناہمواریوں اور تضاد کو اپنا نشانہ بنایا وہاں فنکاروں کو بھی اُن کی کوتاہی، بے راہ روی اور بے وقت کی راگنی الاپنے پر ملامت کی۔ فنکاروں پر پڑنے والے تیر میں وہ نشتریت تھی جس نے اردو شاعری میں سوتے جگائے اور جو بعد میں ترقی پسند ادب کے نام سے موسوم ہوئی۔ نظم "شمع و شاعر" میں شاعر کو ساقی کہہ کر اس طرح تان توڑتے ہیں ؎

سوختہ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے — انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا
اور ہے تیرا شعار، آئین ملت اور ہے — زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا
کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بتخانہ ہے — کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا
قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں — تنگ ہے صحرا ترا، محمل ہے بے لیلا ترا
اے دُرِ تابندہ! اے پروردۂ آغوشِ موج — لذتِ طوفاں سے ہے نا آشنا دریا ترا

اب نوا پیرا ہے کیا، گلشن ہوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنم، نغمہ بے موسم ترا

حالی، آزاد و سرسید کو بھی یہی اضطراب تھا۔ حالی تو اُردو شعرا کی بے راہ روی سے اس درجہ مایوس تھے کہ انھوں نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں اپنی مایوسی اس طرح بیان کی ہے :-

---

[1] ماہنامہ "ساقی" دہلی (طنز و ظرافت نمبر) اپریل ۱۹۵۸ء جلد ۲۱ نمبر ۴۔

"اردو شاعری کی ترقی کا خیال پکانا گویا زمانۂ ناسازگار سے مقابلہ کرنا ہے.... لیکن چونکہ یاس اور امید دونوں حالتوں میں اخیر وقت تک ہاتھ پاؤں مارنا جاندار کا طبعی اقتضا ہے اس لئے جو کچھ ہم لکھنا چاہتے ہیں اس سے یہ جتانا مقصود نہیں ہے کہ کچھ ہوگا بلکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ کاش ایسا ہوتا"

اسی لئے اقبال نے ہنروران ہند پہ کاری ضربیں لگائیں اور انہیں اس طرح بے نقاب کیا:—

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا　　ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں　　زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند　　کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورتگر و افسانہ نویس　　آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

(نظم ہنروران ہند)

معلوم ہیں اے اہل ہنر تیرے کمالات　　صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے　　آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

(نظم "مصور")

تہذیب حاضر کا اکبر بہت کچھ مذاق اڑا چکے تھے مگر اقبال کی سنجیدہ طبع کے تیر و نشتر ملاحظہ ہوں:

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں　　بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی
حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا　　رقابت، خودکشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

تہذیب حاضر بھبوکا بن کر گرد و پیش کو تو روشن کرتی ہے مگر انسانیت کا اصل جوہر جو اس کی خودی ہے فنا کر دیتی ہے اور یہ خودی اقبال کے نزدیک ہر انسان میں خیر و شر کی پرکھ کی کسوٹی ہے۔ اس تہذیب کے مادی روحانیت کے فقدان پر نظم "افرنگ زدہ" میں طنز ملاحظہ ہو:—

ترا وجود سراپا تجلی افرنگ　　کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی خودی سے ہے خالی　　فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر
تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود　　مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے! فقط جوہر خودی کی نمود　　کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

اقبال نے تہذیب نو کا مشاہدہ صرف اس ملک ہی میں نہیں کیا تھا بلکہ اسے یورپ میں رہ کر نزدیک سے دیکھا تھا اس لئے وہ اس کے قائل تھے کہ ؎ تہذیب نو کارگہ شیشہ گراں ہے۔

وہ شیشہ بازی کے بدلے خارہ شگافی کی تلقین کرتے تھے۔ اور اسی نظریہ کے تحت وہ تہذیب نو کو جا بجا تختۂ مشق بناتے ہیں۔ کہتے ہیں:

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن — پُرکار و سخن ساز ہے، نمناک نہیں ہے
میخانۂ یورپ کے انداز نرالے ہیں — لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر
گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ کی بہار — طائرک بلند بال دانہ و دام سے گذر!
نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں — چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ — بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

کیمبرج، لندن اور میونخ (جرمنی) کا تعلیم یافتہ مغربی تعلیم پر اس طرح تان توڑتا ہے ——

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما — لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

اس طرز تعلیم سے پیدا شدہ لادینیت کو اقبال نے مختلف طریقوں سے اپنا نشانہ بنایا۔ اسی موضوع پر نظم "فردوس میں ایک مکالمہ" میں کہتے ہیں:-

جب پیر فلک نے ورق ایام کا اُلٹا — آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل — دنیا تو ملی، طائر دیں کر گیا پرواز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو — پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

یہ لادینیت اقوام مغرب کے ان نظریوں پر مبنی ہے کہ مذہب کو معاشرہ یا سیاست میں کوئی دخل نہیں ہے۔ جبکہ اقبال کا یہ عقیدہ تھا کہ —— جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس لئے اس نظریہ کی مذمت لطیف پیرائے میں نظم "مذہب" میں اس طرح کرتے ہیں۔ ——

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ !! — ناداں ہیں جن کو ہستیٔ غائب کی ہے تلاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنون خام — ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش

عورتوں میں بڑھتی ہوئی انگریزی تعلیم پر اکبر نے بہت کچھ کہا مگر اقبال ایک مفکر کی طرح اس موضوع پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ اکبر ہی کے رنگ میں کہتے ہیں:-

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدّ نظر — وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین — پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

فرنگی مدنیت کی سب سے بڑی دین ان کے مخصوص سیاسی ادارے ہیں جن کے ذریعہ وہ مغلوب قوموں کو

بہت عرصہ تک بھا دے میں رکھکر در پردہ سامراجیت کی جڑیں مضبوط کرتے جاتے ہیں۔ نظم "خضر راہ" میں سلطنت کے موضوع پر ان مکر کی چالوں کے پردے چاک کرتے ہیں۔ سامراجیوں کے تخت و تاج کی چمک دمک غلاموں کے خون پسینہ کی مرہون منت رہی، اور رہے شہنشاہ معظم کی حکومت عظمیٰ پر اقبال کی چوٹ نظم "گدائی" میں ملاحظہ ہو جس کا آخری شعر ہے ؎

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج　　　کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

اٹھارویں صدی میں یورپ کے صنعتی انقلاب کے زیر اثر مغربی ممالک میں سرمایہ و محنت کا توازن درہم ہوتا چلا گیا نتیجتاً مزدوروں کا پہلا نعرہ روس میں بلند ہوا اور اس کی گونج سارے عالم میں سنی گئی۔ اقبال نظم "لینن" میں خدائے قدوس کو بھی اپنی طنز کی لپیٹ میں لیتے ہوئے سرمایہ داری کی لعنتوں پر بھرپور وار کرتے ہیں۔

صوفی و ملا، واعظ و شیخ اردو شاعری میں ہمیشہ نشانۂ ملامت رہے ہیں۔ اُن کے قول و فعل کے تضاد کی ہمیشہ تضحیک کی گئی۔ مگر ان پر اقبال کے طنز میں ہمیں وہ جذبہ اور خلوص کارفرما نظر آتا ہے جو کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ اس میں حرف پھبتی نہیں بلکہ معاشرہ کو صحیح راستہ پر لانے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔ اس لئے اقبال پیر اپنی صفائی دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

فقیہ شہر کی تحقیر کیا مجال مری　　　مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

اقبال نے ان شخصیتوں کو آڑے ہاتھوں لیا ملاحظہ ہو صوفیوں پر طنز جن میں ایک پیمبر کی پیامبری بھی ہے اور ایک شاعر کا دردِ دل بھی: —

کرے گی داور محشر کو شرمسار اک روز　　　کتاب صوفی و ملا کی سادہ اوراقی

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے　　　خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں　　　بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست

فقیہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور　　　کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست

(نظم "شکست")

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال　　　ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق　　　افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

اقبال جب ملا کو جو معاشرہ میں نیم حکیم خطرہ جان کی حیثیت رکھتے ہیں نشانہ بناتے ہیں تو ایسا اچھوتا انداز بیان اختیار کرتے ہیں کہ قربان جائیے۔ انہیں پہچانئے یہ ہم میں سے ایک ہیں۔ (نظم ملا اور بہشت)

پیری مریدی کے جاگیردارانہ نظام اختیار کرنے اور نسلاً بعد نسلاً وراثت میں دئے جانے پر نظم "باغی مرید"

تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو:-

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی — گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
نذرانہ نہیں! سود ہے پیرانِ حرم کا — مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد — زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

واعظ کی پگڑی ہر اردو شاعر نے اچھالی ہے۔ ان گفتار کے غازیوں کی تصویر ملاحظہ ہو:-

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب — عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں — لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

”شکوہ“ اور ”جواب شکوہ“ اقبال کی دو سب سے طویل طنزیہ نظمیں ہیں۔ ان کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے چونکہ یہ ایک ہی مسئلہ کے دو رخ ہیں۔ خدا کی خدائی پر طنز جو اقبال ہی جیسے مرد قلندر کے شایانِ شان اور اُن جیسے دل گردہ والے انسان کو زیبا تھا۔ اگر مسلمان خدا پر اس طرح منہ آ سکتے ہیں۔ -

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں — ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے — بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

تو تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو۔ اشعار ہیں کہ تیر کی طرح پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی تو بدن بر ہو نہیں ؎
یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو — تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اقبال کی محفل میں حضرت ابلیس بھی موجود ہیں۔ حضرت انسان کی بدکرداریوں و بداعمالیوں پر اقبال . . . . . شیطان لعین تک سے قہقہہ لگوانے سے باز نہیں آتے۔ کیونکہ جیسا ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا طنز توڑتی ہے اور توڑنے کے دوران میں ایک فاتحانہ قہقہہ لگاتی ہے۔ خدا کے بزرگ کے دو بچھڑے مقرب فرشتے بھولی بسری باتوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ باتوں باتوں میں بات نکل آتی ہے اور جب حضرت جبرئیل اپنے ہمدمِ دیرینہ سے اس جہانِ رنگ و بو کا حال دریافت کرتے ہیں تو بد لعین کچھ ایسا نقشہ کھینچتا ہے جیسے اس عالم میں اب انسان نہیں شیطان ہی بستے ہیں ؎

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو — میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا — میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو

(نظم ”جبرئیل و ابلیس“)

الغرض اقبال نے ایک ہوشمند فلسفی اور باکمال شاعر کی طرح اپنے طنزیہ نشتروں سے معاشرہ کے ہر پہلو کی اصلاح کی کوشش کی جو طنز کا اصل مقصد ہے۔ ان کے طنزیہ کلام کی کھنک لازوال ہے۔ بقول سید ابوالخیر کشفی:—

(باقی صفحہ نمبر ۳۲ پر)

حباب ہاشمی

نیاز فتح پوری اور جذباتِ بھاشا

علامہ نیاز فتح پوری مرحوم کی ذات میں قدرت نے کمالات مختلفہ وعلوم متنوعہ کو مجتمع کر دیا تھا علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے بعد اگر کوئی شخص بیک وقت ایک ادیب، ایک شاعر، ایک ناقد، ایک مبصر، ایک عالم، ایک معلم، ایک مفکر، ایک جرنلسٹ وغیرہ ہو سکتا ہے تو وہ علامہ نیاز کی ذات تھی۔ موصوف نے مختلف حیثیتوں سے مضامین کے انبار لگا دیئے گویا میر انیس کا مندرجہ ذیل شعر ہر وقت اُن کے پیش نظر تھا ؎

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار   خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

علامہ مرحوم نے جو ادبی سرمایہ چھوڑا ہے وہ شہرت عام و بقائے دوام کے دربار میں انھیں ایک مسندِ خاص پر متمکن کرتا ہے اور اقلیم غفوری میں مرحوم کو حیات جاوید بخشتا ہے۔ موصوف نے جہاں بہت سی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں وہاں تالیف کا کام بھی بڑی اہمیت اور افادیت کا حامل ہے "جذباتِ بھاشا" بھی ایک ایسی ہی تالیف ہے جس کے ذریعہ علامہ نے ایک ایسی زبان کے لٹریچر کو ادب اردو سے روشناس کرایا ہے جس کی نسبت ملک ایک خاص شوق اپنے اندر پنہاں رکھتا تھا۔ زبان بھاشا سے متعلق اس سے قبل کوئی مستقل تصنیف شائع نہیں ہوئی تھی۔ البتہ جرائد و رسائل میں کبھی کبھی کچھ کلام شائع ہوا تھا اور اس کے متعلق ارباب ذوق نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا جس کی وجہ سے ملک کسی حد تک مانوس ہو گیا تھا اور اس قسم کی تالیف کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی۔ تالیف ہذا نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کرنے میں مدد دی ہے۔ دیگر اربابِ فکر و رائے کی طرح نیاز فتحپوری نے ہمیشہ اس امر کی کوشش کی ہے کہ زبانِ اردو میں کثرت سے تصانیف وتراجم کئے جائیں غیر زبانوں کا مواد اس میں منتقل کیا جائے اور اُن کے محاسن و نکاتِ ادبی سے دامن اردو کو مالا مال کر دیا جائے تاکہ وہ ہر تخیل کو اسی حسن وخوبی کے ساتھ ادا کر سکے جس حسن و خوبی کے ساتھ ایک وسیع اور لطیف زبان ادا کر سکتی ہے۔ اس لحاظ سے مؤلف "جذبات بھاشا" کی یہ سعیٔ جمیل بلاشبہ دنیائے ادب میں مشکور رہے اور ارباب نظر اسے عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے رہیں۔

علامہ نیاز مرحوم "جذباتِ بھاشا" کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں: —

" میرا مقصد یہ نہیں کہ میں کوئی ایسی بحث شروع کروں جیسی آجکل میر و سودا یا

امیر و داغ کی تفریق کیلئے رائج ہے اور نہ یہ ارادہ ہے کہ صرف کسی کے نقائص
ظاہر کریں گے اور محاسن چھپا کے "انتقاد فن" کہلائیں کیونکہ بری اسے میں وہ وقت
جو اسی فضول اور دور از کار بحثوں میں ضائع ہوتا ہے اس سے کہیں بہتر ہے کہ
اپنی زبان اپنے مذاق فن کے وسیع بنانے میں صرف کیا جائے"

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں علامہ نیاز کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے جو ادبی خدمات انجام دی ہیں وہ یقیناً ناقابل فراموش ہیں اور انہوں نے اردو زبان و ادب میں جو گرانقدر اضافے کئے ہیں ان کا اوقات اس کی مثال کمیاب ہے۔

ابوالمعانی خلیقی دہلوی (مرحوم) نے "جذبات بھاشا" پر تقریب پیرد قلم کرتے ہوئے علامہ نیاز مرحوم کی ادبی خدمات کا اعتراف اس طور پر کیا ہے۔

حضرت نیاز اپنی انشاء پردازی و شاعرانہ ذوق کے لحاظ سے کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں انھوں نے زبان اردو میں جس جدید طرز انشاء کی بنیاد ڈالی ہے اور اُن کو حسن لطافت و پاکیزہ جذبات سے مالامال کرنے کی کوشش کی ہے اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ ملک نے جس جوش و خروش کے ساتھ اُن کی ادبی خدمات کا خیر مقدم کیا ہے، وہ بھی میری نگاہ میں اعتراف کا ادنیٰ طریقہ ہے، مگر اس کا کیا علاج کہ تمام ادبی مذاق کا ملک میں فقدان ہے۔ اگرچہ اب وہ اگلا سا جمود تو نہیں ہے لیکن پھر بھی خیالات میں وہ بات نہیں، جو صحیح معنوں میں ان مغتنم وجود ادیبوں کی قدر کرسکے۔

مولانا نیاز فتحپوری اس بات کے متمنی تھے کہ بھاشا کی شاعری پر کچھ لکھا جائے اور نہایت ہی پاکیزہ مثالیں تلاش کرکے جمع کی جائیں حسنِ اتفاق سے مرحوم کا کچھ دنوں ریاست اپنے لدھ سے توسل ہوگیا اور وہاں اُن کو زبانِ بھاشا کا ایک عمدہ کتب خانہ مل گیا۔ کم و بیش وہ سال بھر تک وہاں رہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے وہاں بہت زیادہ اور عمدہ مواد جمع کرلیا جس کی یہ صرف ایک مختصر قسط ہے۔

بھاشا کی شاعری میں سب سے بڑی خصوصیت جو اُس کو اُردو اور فارسی سے ممیز کرتی ہے یہ ہے کہ اقتضائے فطرتِ انسانی کے مطابق اس میں تخاطب مرد کا عورت سے اور عورت کا مرد سے ہوتا ہے یہی سبب ہے کہ ہندی شاعر کے دل میں جذباتِ محبت بالکل سچے اور صحیح پیدا ہوتے ہیں۔

دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ عموماً تخاطب جنس لطیف کی طرف سے ہوتا ہے جس سے دنیا کی تمام زبانوں پر اسکو نمایاں امتیاز حاصل ہے۔

تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ زبانِ بھاشا بہت نرم واقع ہوئی ہے اور تغزل کے لئے نرم و سادہ

الفاظ بہت کارآمد ہیں۔

بھاشا کی شاعری میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہیں تشبیہات و استعارات سے کام لیا جاتا ہے جو ہمارے روزمرہ کے محسوسات سے متعلق ہیں۔

شاعری کی روح اسلوب بیان ہے اور اس لحاظ سے بھاشا کی زبان انتہائی مالامال ہے ہر ملک کی شاعری اس ملک کی اخلاقی و معاشرتی زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جس زبان میں بھی عورت اپنے جذبات کا اظہار کرے گی ظاہر ہے کہ وہ بہت لطیف ہوگی۔ اول تو عورت کا عورت ہونا ہی اس بات کیلئے کافی ہے کہ وہ معمولی سے معمولی گفتگو سے ایک عالم کو مضطرب و بیقرار کردے چہ جائیکہ ہندوستانی عورت جس کی فطرت میں خیر مہر و وفا شعاری و محبت پرستی و دلیعت کی گئی ہے۔ جو دل آویزیاں اس ملک کی عورت میں ہیں، وہ کہیں نظر نہ آئیں گی۔ ظاہر ہے کہ ایسی عورت جب اپنے دکھ درد کی کہانی اپنی بپتا اپنے فطری نرم و نازک لب و لہجہ میں سنائے گی تو کیا کچھ اثر نہ ہوگا۔

موسم برشگال میں جس کی رنگینیاں و رعنائیاں مردہ دلوں کو بھی بیتاب نشاط کردیتی ہیں وہ اگر اتفاق سے اپنے شوہر سے جدا ہو جاتی ہے تو اُڑدے اور بادلوں کے ذریعہ اپنا پیام فراق اپنے محبوب تک پہونچانا چاہتی ہے وہ تنہا سیاہ راتوں میں بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج سے دہل جاتی ہے۔ کانپ اٹھتی ہے اور اپنا پہلو خالی دیکھ کر تڑپنا چاہتی ہے کہ پپیہا اپنی پی کہاں کی آواز سے اور بیقرار کرکے اڑجاتا ہے۔ وہ انھیں جذبات و تاثرات کو بجنسہٖ الفاظ میں ادا کردیتی ہے اور یہی ہے وہ سب جس کو ہم بھاشا کہتے ہیں۔

بھاشا کے شاعر بھی عموماً مرد ہی ہیں اسلئے ممکن ہے کہ یہ شبہ کیا جائے کہ وہ نسوانی جذبات کا احاطہ نہ کرسکیں گے لیکن جس وقت آپ جذبات بھاشا کا غائر مطالعہ کریں تو آپکو معلوم ہوگا کہ اس زبان کے شعراء نے بھی فطرت نسوانی کا باریک مشاہدہ کیا ہے اور عورت کے سینے میں پیدا ہونے والا نازک ترین جذبہ بھی اشعار میں مسخر کرلیا ہے۔ چنانچہ خودداری و خودشناسی، شرم و حیا، غرور حسن و عشق، نفادگی محبت، طعن و تشنیع، بولی ٹھولی وغیرہ کوئی بات ایسی نہیں جو ضبط تحریر میں نہ لائی گئی ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ بھاشا کی شاعری جذبات و تاثرات سے مملو ہے اور جس قدر ترنم اور موسیقی اس زبان میں ہے کسی دوسری زبان کو میسر نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا عاشق اس زبان کی شاعری کو ملا وہ کسی اور زبان کو نصیب نہیں ہوا کیونکہ جنس قوی کو مجروح کرنے کیلئے اس سے زیادہ کوئی چیز نہیں کہ جنس لطیف کی طرف سے اظہار عشق ہو۔

علامہ نیاز ایک جگہ اپنے دیباچہ میں فرماتے ہیں:۔۔۔۔

"صحیفۂ قدرت کا یوں تو ہر ہر صفحہ ایک ایک لفظ معلومات سرمدی کا بیش بہا خزینہ ہے لیکن اس کا وہ زرّیں صفحہ جس میں نوعِ انسان کا ذکر ہے، اس قدرتِ کاملہ کی تصنیف کا بہترین حصّہ ہے اور اس لئے آدمی اگر مناظرِ قدرت سے دلچسپی رکھتا ہے تو سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ خود اپنا ہی مطالعہ کرے"

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر و سرو سمن درآ   تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بچمن درآ

پھر اگر ہم چاہتے ہیں کہ فطرت کے مناظر اور اس کی جلوہ آرائی کو دیکھیں اور اس کے ...... تو ہم کو ہندی ادب سے دامن بھر لینا چاہیئے۔ جس طرح اردو میں شاعروں کی کثرت ہے ... ہندی میں بھی شاعروں کی کمی نہیں ہے لیکن مستند اور مشہور شاعروں میں صرف تلسی داس، سور داس اور کالی داس کے نام آتے ہیں اور یہ لوگ واقعی ہندی زبان کے فخر ہیں۔ یہ اپنے مثل آپ ہیں۔ یہاں صرف ... رنگ کے لحاظ سے بحث کرنا ہے اور یہ دکھلانا ہے کہ بہ لحاظ انداز بیان، تشبیہات و استعارات، خیالات و جذبات ان کی زبان کس قدر دلکش ہے:

یوں تو اس رنگ میں سینکڑوں نے طبع آزمائیاں کی ہیں اگر چہ ... ہندوؤں میں بہاری لال اور مسلمانوں میں عبدالرحیم خان خاناں کا ہے وہ دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔

اب یہاں مثال کے طور پر چند دوہے پیش کئے جاتے ہیں جن سے ... ان کے ... پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ مولانا ... مرحوم نے ہر دوہے کے بعد اس کے مشکل الفاظ کے معانی و مطالب لکھ کر شاعرانہ نکات اور اس کی خوبیاں اس انداز سے بیان کی ہیں کہ اس زبان کی تمام لذتیں اپنی زبان میں لے لی ہیں علاوہ اس کے شاعری کے محاسن اور کلام کی دیگر خصوصیات سے بحث کی ہے جس نے بجائے خود ایک نہایت دلچسپ نادر مضمون کی شکل اختیار کر لی ہے۔

۱- ایک نازنین جس کا شوہر پردیس میں ہے بناؤ سنگار کر کے کوٹھے پر چاند دیکھنے چڑھی تو اس کی ہمسن لڑکیوں نے چھیڑنا شروع کیا کہ یہ بن ٹھن کس کے لئے ہے؛ وہ جواب دیتی ہے کہ:-

آج چندرماں دوج ہے جا ... جیہل اور   ہم رے اور وا مترلے تین بھئے اک ٹھور

یعنی آج چاند نکلنے والا ہے اور ساری دنیا اُسے دیکھ رہی ہے تو کیا عجیب ہے کہ میری اور اس ... کی نگاہیں اسی طرح آپس میں مل جائیں۔ دردِ جدائی اور ذوقِ شوق کو اس دوہے میں جس خوبی سے ملا دیا ہے وہ نہ صرف محبت کی انتہائی کیفیتوں کو ظاہر کرتا ہے بلکہ شاعر کی نفسیاتی ... پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

۲- سحر ہر کار جائینگے اور نین مرینگے رو -   ... ایسی ... کہ ... ہو رہے

صبح کو میرے پی جانے والے ہیں اس لئے جو حالت میری آنکھوں کی کثرتِ اشکباری سے ہو گئی ہے

ظاہر ہے سو بار خدایا (اس رات کو اس قدر طویل کر دے کہ) صبح ہی نہ ہو سادگی تمنا کے علاوہ اس "کبھو نہ ہوئے" سے جس قدر زحمت ٹپک رہی ہے اس کے اظہار کیلئے ایک دفتر بھی ناکافی ہے ۔

۳ - للت شیام نیلا للن ارسی چبک چبب ذرن　　مدھ چاکھو مدھ کر پر و گلاب پر نوں

یہ دلفریب سیاہ گودنے کا نشان اور بھی ٹھوڑی کے حسن کو دوبالا کر رہا ہے۔

یہ معلوم ہوتا ہے گویا گلاب کے پھول سے بھونرا چپٹ کر نہایت بدمستی سے رس چوس رہا ہے)

۴ -　　نین تیھو اکھنکت سو بیئے کھڑی بھیر میں جات

کبھی جو چلی بن ہینے اور نٹھن ہی میں بات

"حالانکہ وہ ایک گروہ میں سب کے ساتھ جا رہی تھی اور کوئی موقع نہ تھا کہ وہ میری جانب مخاطب ہوتی لیکن پیچھے بغیر دیکھے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں اس کا کچھ مجھ سے کہدینا اس وقت تک میرے قلب میں کھٹک رہا ہے"

۵ -　　اور چوٹ بچ جات ہے کچھک پائے کے اوٹ

پلک اور پریتم بیچ لاگت دونی چوٹ

یہ دوہا رسندھ کا ہے اور نہایت پُرلطف ہے۔

"اور چوٹیں تو ایسی ہیں کہ کسی چیز کی اوٹ میں کچھ نہ کچھ حفاظت ہو ہی جاتی ہے، لیکن ہائے : محبت کی ساری باتیں دنیا سے نرالی ہیں کہ محبوب ذرا بھی پلکوں سے اوٹ ہو جائے تو اور دونی چوٹ لگتی ہے"

۶ -　　کنچن تن کھن برن بر رہیو رنگ مل رنگ

جانی جات سو باس ہی کیسر لائی انگ

"اُس کے سنہرے اور رنگین جسم میں زعفران کا رنگ (جو اُس کے بدن کے ہم رنگ ہے) کچھ ایسا مل کے رہ گیا ہے کہ اگر زعفران کی خوشبو مابہ الامتیاز نہ ہو تو کسی طرح پتہ نہیں چل سکتا کہ اُس کے جسم پر کیسر ملی گئی ہے یا نہیں :

اس دوہے میں رنگِ بدن کی تعریف ہے اور نہایت دلکش پیرایہ میں ہے۔ شعرائے اُردو و فارسی بدن کا زعفرانی ہونا قابل ستائش نہیں سمجھتے، ہندی شاعری میں ایک عورت کے جسم کا زعفرانی ہونا اصل حسن ہے ۔

بیدھی جان ملیگر باسان　　سیس چڑھے ڈولت جھو پاسان

اس میں حلقہ ہائے زلف کے بلنے کا انداز ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ سانپ صندلی پیشانی کی خوشبو

اس قدر مست ہوگئے ہیں کہ سر پر چڑھ کر ادھر اُدھر جھوم رہے ہیں۔
پیشانی پر پڑے ہوئے حلقہ ہائے زلف کا ہوا سے ادھر اُدھر ہلنا اور پھر اس کی یہ توجیہہ پیش کرنا کہ بوئے صندل سے مست ہو کر ہل رہے ہیں نہایت لطیف ہے۔

(۸) پھپ سگندھ کرن سب آسا
مگ ہر کائے لئے ہم آسا

"تمام خوشبو دار پھول یہ آس لگائے ہوئے ہیں کہ شاید ہم کو بھی ایسے پاس آنے کی اجازت دیدے" اس سے زیادہ دل آویزی حسن اور کیا ہو سکتی ہے کہ پھول تک اس کے پاس پہونچنے کی تمنا کریں۔

(۹) جبھی جیٹھ بات رنگ لگیں کسم رنگ ٹھہرے نہ آگیں

لبوں کا حال بیان کیا گیا ہے کہ ہنگام گفتگو اس کے لبوں سے جیٹھیر کا گہرا رنگ ٹپکتا ہے اور کسم کا رنگ تو اس کے آگے کوئی چیز نہیں ہے۔ بات کرتے وقت ہونٹوں سے رنگ ٹپکنا اس سے زیادہ لطیف و نازک بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس بیان میں نہ صرف لبوں کی سرخی دکھائی گئی ہے بلکہ ان کی نرمی و نزاکت کو بھی تخیل کی انتہائی حد تک پہونچا دیا گیا ہے۔

(۱۰) نین تو ترے روپ جیتے کنول پتر پہ دھو کر بیٹھے

"ہوشیار تیز بین آنکھیں اور حسین چہرہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیلوفر کی پتی پر بھونرا بیٹھا ہوا ہے" چہرے کے حسن کو برگ نیلوفر سے تشبیہ دینا اور پتلیوں کے لحاظ سے آنکھوں کو بھونرا کہنا نہایت لطیف تشبیہ ہے۔

"جذبات بھاشا" میں مولانا نیاز فتح پوری نے لکھا ہے کہ ویسے تو بھی زبان کی تعریف میں جتنی لے دیں ان میں ابتذال و رکاکت پائی جاتی ہے مگر جس قدر عامیانہ و رکیک جذبہ درج ذیل دوہوں میں کارفرما ہے اس کی مثالیں اردو شاعری میں شاذ و نادر ہی ملیں گی

(۱) یوں دل ملیت نردئی دی کسم لگات
کردھر دیکھو دھرا دھرا اجھوں اُرگو جات

پہلی مواصلت کے بعد نائکہ (عروس) کی جو حالت اس کی ہمراہ سکھی نے دیکھی ہے اس کا گلہ نایک سے کر رہی ہے کہ: -

"اے سنگدل! تم ایسے بے رحم ہو کہ پھول جیسے نازک جسم کو کچل دیا۔ بے رحم اور بے دردی سے ملتا دلتا۔ ذرا اس کے سینہ پر ہاتھ تو رکھ کے دیکھو کہ کلیجہ کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دھڑک رہا ہے"

نیاز صاحب کی رائے ہے کہ کامرانی ہائے وصل میں یہ شکوہ جس قدر پر مزہ ہے اسی قدر معیار پسندی کی

نہایت پاکیزہ مثال ہے اور رعایت خاص کی بڑی کیف انگیز تصویر ہے۔ اس سے زیادہ نزاکت یہ ہے کہ شکایت اُس گل مجروح کی طرف سے نہیں کی گئی ہے کیونکہ "دل توا سے اس قدر ہوش کہاں؟ دوسرے نئی دلہن کی شرم و حیا اتنی بے تکلفی کب برتنے دیتی ہے"۔

(۲) ہری کنچلی کس مسی، مسکی اُس کے ہیر
بیسے بلست کلی گلاب، دی نکست، ملت گیر

"سبز نرم جو اُس کے سینہ پر تنگ و چست تھی جوشش جوانی سے مسک گئی ہے۔ اس کی تشبیہ ملاحظہ ہو۔ کہتا ہے کہ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے گلاب کی برگ پوش کلی شگفتہ ہو رہی ہو اور اُس کے پتوں کے درمیان سے سرخ لکیر نظر آتی ہو"۔

نیاز صاحب فرماتے ہیں "اگر آپ نے کبھی گلاب کی کلی کو شگفتہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور اُس سرخ دھاری کو دیکھا ہے جو پتیوں کے جدا ہوتے وقت پہلے نظر آتی ہے تو شاعر کی تلاش کی داد دیجئے"۔

بار بار درجی کہہ جھگڑت ہٹا ڈھ — چولی چولی انگنا پیوت سوئی سوئی گاڑھ

درزن کی دوکان پر بار بار کھڑی ہوئی جھگڑتی ہے کہ یہ بات کیا ہے کہ میں روز تجھے سینہ بند درست کرنے کو دیتی ہوں اور تو جب سیتی ہے ہمیشہ تنگ ہی کر دیتی ہے"۔

نیاز صاحب رقم طراز ہیں: — "جوش شباب اور پھر اُس پر بے خبری کا عالم اس سے زیادہ لطیف انداز بیان ہونا مشکل ہے۔ اُس کو یہ خبر ہی نہیں کہ غریب درزن تو روز ڈھیلا کر دیتی ہے لیکن اُس کا چست ہو جانا تو روز افزوں شباب کی وجہ سے ہے۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۵ سے آگے)

"اچھا طنز ہمارے ذہن میں ویسے ہی کھٹکتا ہے جس طرح شیطان دل یزداں میں۔ طنز نگاری فقط اللہ ہو اللہ ہو نہیں ہے بلکہ ایک بڑے ذہن کا درد و داغ اور جستجو و آرزو ہے[1]"

اقبال کے ان نشتروں پر ڈاکٹر اعجاز حسین نے کیا خوب کہا ہے: —

"اقبال نے اپنے نشتروں سے دکھتی رگ کو درست کرنے میں بڑے حسن سے کام لیا۔ لوگوں کو متوجہ پا کر پیغمبرانہ انداز میں گفتگو شروع کر دی۔ اپنے کو بھی اس عام سطح پر دکھانے کی کوشش کی ..... نہ تو اپنے کو بہت بلندی پر دکھا کر ہم کو حقیر سمجھتا ہے، نہ ناصح کی طرح سخت لہجہ ہے اور نہ بجو سے ہمارا مذاق اڑاتا ہے۔ یہ تو سوز و گداز کا پتلا ہے۔ جو کچھ کہتا ہے اپنا سمجھ کر کہتا ہے اور خوب کہتا ہے"۔

---

[1] کچھ طنز کے بارے میں ماہنامہ "خاور" ڈھاکہ، جنوری ۱۹۶۵ء از — ۲ نئے ادبی رجحانات ۱۹۴۲ء

بل احمد عاصم

حضرت حفیظ میرٹھی

حفیظ صاحب سے میری پہلی ملاقات نفیض عام انٹر کالج میرٹھ کے ایک قریبی ہوٹل میں اسوقت ہوئی تھی
یں ایم۔کام کا طالب علم تھا۔ وہ ہوٹل کے ایک گوشہ میں بچھی ہوئی کرسی پر تشریف فرما تھے۔ اُن کے ہاتھ میں چائے کی
ا تھی اور ان کے چہرہ پر تفکر کے آثار نمایاں تھے اور مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا دشواری نہ ہوئی کہ وہ یا تو
شاعر ہیں یا مصنف اور اس وقت کسی تخلیق کے سلسلہ میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہیں۔ میں اُن کے روبرو پڑی ہوئی
پر خاموشی سے جا بیٹھا اور میز پر رکھے ہوئے اخبار پر نگاہ گردانی کرتے لگا مگر میرے ذہن میں یہ سوال اُبھر رہا تھا کہ
سے کس طرح مخاطب ہوا جائے کہ تعارف کے بند دروازے کھل سکیں کچھ دیر اسی الجھن کا حل تلاش کرنے میں
طور پر مشغول ہو گیا۔ کچھ دیر کی غور و فکر کے بعد ایک ترکیب ذہن کے پردے پر اُبھری اور پھر دوسرے ہی لمحے میں
کے پہلے صفحہ پر شائع ایک خبر کا سہارا لیکر اُن سے مخاطب ہوا

"دیکھئے! حضرت آپ نے یہ خبر پڑھی۔"

"کیا ہے؛ دیکھوں!" یہ کہکر انہوں نے اخبار میرے ہاتھ سے لے لیا اور خبر پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے
رے دوسرے ہی لمحہ میں نے نہایت بے تکلفی سے اُن سے سوال کیا۔

"جناب کی تعریف"

"مجھے حفیظ میرٹھی کہتے ہیں۔ اور آپ کی تعریف"

"مجھے عاصم بریلوی کہتے ہیں۔"

اُن کا جواب سنکر میرے دل میں مسرت کا چشمہ پھوٹ پڑا اور میں نے نہایت جوش و مسرت سے ملے جلے
کہا۔ جناب سے غائبانہ تعارف تو پہلے سے ہے چونکہ آپ کی بہت سی غزلیں ہندوستان کے ممتاز اور کثیر الاشاعت
ں میں میری نگاہ سے گذری ہیں اور یقین مانیئے آج آپ سے ملاقات کر کے میں اپنے دل میں خوشی کا سمندر
ہ مارتا محسوس کر رہا ہوں۔"

"ذرہ نوازی ہے۔ آپکی محبت ہے" انھوں نے یہ الفاظ نہایت انکساری کے ساتھ ادا کیے۔

اور پھر کیا تھا ــــ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ تعلقات دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے رہے جب کبھی
بیعت میرٹھ میں گھبراتی اور اپنے وطن بریلی کی یاد آتی تو میں حفیظ صاحب کے پاس جا بیٹھتا جنکی محبت سے

یکطرف تو مجھے ادبی استفادہ کرنے کا موقع ملتا اور دوسری طرف پژمردگی شگفتگی میں بدل جاتی چونکہ حفیظ صاحب علم اور خصوصاً ادبی معلومات کا سرچشمہ ہیں اور زیورِ خلوص سے آراستہ و پیراستہ ۔ وہ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ایک عظیم انسان بھی ہیں اور اُن کی عظمت کا راز اُن کی منکسر المزاجی خوش اخلاقی اور ہمدردانہ طبیعت میں ہے مجھے خود بھی شعر و شاعری سے بے انتہا لگاؤ تھا اس لیئے میں نے اپنی ادبی تربیت کے لئے اُنھیں کو منتخب کیا۔ دو سال تک کے دورانِ قیام میں جب کبھی غزل لیکر خدمت میں پہونچا کبھی ایسا نہ ہوا کہ مجھے مایوس لوٹا دیا ہو بلکہ نہایت محبت غزل دیکھتے اور ضروری خامیوں کیطرف مجھے توجہ دلاتے ۔ اُنھیں کے فیضِ نظر سے آج میں کسی قابل ہوسکا ہوں ۔

حفیظ صاحب دورِ نو کے ایک محتاط اور صحیح الفکر شاعر ہیں اور ان کے شعر و سخن کا مخصوص رنگ حیات و کائنات کا تجزیہ کرنا ہے۔ وہ حیات و کائنات سے متعلق فلسفہ کو اس طرح سلجھا کر پیش کرتے ہیں کہ تجربات اور انکشافات نگاہوں کے سامنے رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے اشعار دیکھکر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ فلسفۂ حیات سے بے انتہا متاثر ہیں۔ یہی نہیں وہ اشعار جو انھوں نے وارداتِ حسن و عشق کے موضوع پر کہے ہیں بھی فلسفہ کی جھلک ملتی ہے۔ اس کا اندازہ قارئین مندرجہ ذیل اشعار سے خود لگا سکتے ہیں ؎

سوز نہ ہو تو سازِ حیات — صرف ایک روکھی پھیکی بات
تا محکم بنیادِ ہوس — عشق سراپا صدق و ثبات
دل ٹوٹے آواز نہ آئے — شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے

وہ زندگی میں رونما ہونے والے مشاہدات کو گہری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں حیات کا فلسفہ اتنا سلجھا نظر آتا ہے کہ وجدانی کیفیت ہو جاتی ہے۔ اُن کا نظریہ ادب برائے ادب سے اد برائے زندگی تک پھیلا ہوا ہے۔ البتہ وہ اشتراکیت سے اپنا دامن بچائے ہوئے ہیں وہ کمیونسٹ خیالات کو از تہذیب کے لئے ایک ناسور تصور کرتے ہیں۔ اسی لئے اُن کے خیالات میں پاکیزگی کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے کبھی تو طنز بھی نہایت اچھوتے انداز میں کرتے ہیں ؎

اسطرف اندھیرا ہے اس طرف اندھیرا ہے — اے جنوں کدھر جاؤں اے خرد کدھر جاؤں

دورِ نو میں جبکہ زیادہ تر شعراء یا تو اسیرِ زلفِ جاناں ہیں یا پھر گرفتارِ اشتراکیت ہیں اُن میں کسی کا الگ تھلگ رہ کر خیالات کو پاکیزہ اور فکر کو سنجیدہ رکھنا ایک کارہائے نمایاں سے کم اہمیت نہیں رکھتا چونکہ آج کی دنیا 'عیاشی' کر دیا اور فریبِ رنگ و بو کی آماجگاہ بنی ہوئی' آج انسانیت سسکتی' کراہتی اور دم توڑتی نظر آرہی ہے' جنگ کے بادل دنیا پر منڈلا رہے ہیں جس سے ہر صاحبِ دل سہما سہما ہے۔ مگر ہمارے شاعر آج بھی کبھو لب و رخسار کی تعریف میں لگے ہوئے ہیں اور وقت کے تقاضوں کو نظر انداز کیئے بیٹھے ہیں۔ بقول شفیق نتیجہ رقم ؎

مدّتیں گذریں ہمارے شاعرِ مضموں نگار
ہیں اسیرِ کاکلِ گیسوئے جاناں آج بھی

مگر اس سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میں جمالیاتی شاعری کے خلاف ہوں۔ بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنی شاعری میں موجودہ اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی مسائل کو سمو کر دعوتِ فکر و عمل دینا چاہیئے۔ یہ امر قابلِ قدر ہے کہ حفیظ صاحب کے سینہ میں انسانیت کا درد ہے اور وہ اخلاقی قدروں کی حفاظت اپنی شاعری کا نصب العین اور حیات کا مقصد تصوّر کرتے ہیں۔ وہ تعمیری ادب کے دلدادہ ہیں اور انسانیت کے اخلاقی اور اصلاحی مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں اسلامی ادب کے نادر نمونے ملتے ہیں۔ اُن کی زندگی کا سب سے پہلا شعر اُن کے عامیانہ خیالات کی عکاسی کرتا ہے ؎

کرم تیرا ہے اِن آنکھوں کو تو نے ندیاں بخشیں
الٰہی ایک آنسو حسن کے دامن کے قابل بھی

وہ انسانیت کو کراہتے دیکھکر تڑپ اُٹھتے ہیں اور اخلاقی قدروں کی دیواریں گرتے دیکھکر آبدیدہ ہو اُٹھتے ہیں۔ اُن کا اسلامی نظامِ فکر سے دلی تعلق۔ ملاحظہ فرمائیے!

کبھی ایسا بھی دن آئے گا یارب باغِ عالم میں
کہ جب جس شاخ پر چاہا ہے بسیرا کر لیا میں نے

آج کی بدحالی دنیا کے بھی دن پھر جائینگے
اے مورّخ! ہم اگر تاریخ نہ اپنے اُٹھے

وہ موجودہ نظام پر نہایت تاسف اور اچھوتے انداز میں تبصرہ اور طنز کرتے ہیں۔ اُن کی نگاہ میں آج کے صاحبِ ہوش قابلِ اعتماد نہیں، چونکہ وہ عملی نقطۂ نظر سے کھوکھلے ہیں البتہ زبانی جمع خرچ کرنے میں اپنا جواب آپ ہیں حفیظ صاحب کی نظر اُن پر پڑتی ہے اور اپنے احساسات کا اظہار نہایت تیکھے انداز میں اس طرح کرتے ہیں ؎

رنج و راحت کا وہ یوں مفہوم سمجھانے اُٹھے
راہ میں کانٹے بچھا کر پھول برسانے اُٹھے

کتنے اہلِ ہوش کس کس طرح بہکانے اُٹھے
آپ کے کوچہ سے اُٹھنے تھے نہ دیوانے اُٹھے

اب خدا حافظ متاعِ دین و دانش کا حفیظؔ
واعظانِ کج فہم بھی تقریر فرمانے اُٹھے

اب آدمی کا ٹھکانہ نہ کائنات کی خیر
سُنا ہے اہلِ خرد ہو گئے ہیں سودائی

اسی طرح کے بے شمار اشعار اُن کے یہاں ملتے ہیں جن میں زندگی بخش پیغام ہے جو اُن کے تعمیری خیالات کی کھلی ہوئی سند ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں نہایت غور و فکر کے بعد کہتے ہیں۔ اُن کی نگاہ میں سطح پسندی ادب کے لئے قاتل ہے اور تخیل کا کھوکھلا پن بادِ سموم ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

کہاں یہ سطح پسندی ادب کو لے آئی
جہاں نظر کی بلندی نہ دل کی گہرائی

جیسا میں نے مندرجہ بالا سطور میں تحریر کیا ہے کہ اُن کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اُن میں اسلامی ادب کی چھاپ ملتی ہے۔ اسی لیے اُن کے کلام میں تصوف کی جھلکیاں ملتی ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ

اقبالؔ سے بے انتہا متاثر ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اُن کے یہاں اقبالؔ کی تکرار یا تقلید ہے۔ نہیں بلکہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ اُن کی صحت مند فکر کا نتیجہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

ہزار حیف کہ ہم تیرے ہو نہ سکے ہزار شکر کہ ہمکو ہوس نہ راس آئی
الٰہی کون سی منزل ہے یہ دنیا پرستی کی کسی کا نام آیا اور سجدہ کر لیا میں نے
عوام کو یہ زمانہ خدا بناتا ہے کہاں یہ بھیڑ کہاں تیری شان یکتائی

وہ تصوف سے متعلق جو اشعار کہتے ہیں وہ اتنے منجھے ہوئے اور صاف ستھرے ہوتے ہیں کہ روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اُترتے چلے جاتے ہیں اور کوئی بھی صاحب نظر اور ذی شعور داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع تو واردات حسن و عشق کو نہ بنایا تاہم جو اشعار اس رنگ میں کہے ہیں اُن میں بھی فلسفہ رقص نظر آتا ہے۔ اُن کا عشق ہوس سے کوسوں دور ہے اور اسکی بنیادیں صدق و ثبات پر رکھی گئی ہیں اور خلوص و وفا کے اینٹ اور گارے سے اُسے اتنا مضبوط بنا دیا ہے کہ مسمار ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اُن کا عشق جذبہ پاکیزگی کا امانت دار ہے۔ میرے اس خیال کی وضاحت مندرجہ ذیل اشعار سے ہو سکتی ہے ؎

عشق نہ جب تک لہو رواں ہو دل بھی ہے بیکار نظر بھی
ہائے کیا شے ہے وہ نظر بھی وجہ سکوں بھی جان جگر بھی
حیات پوچھ رہی تھی سکون کا مفہوم تڑپ کے دل نے ترے درد کی قسم کھائی

اُن کی ادبی زندگی کا ایک پہلو صحافت بھی ہے وہ "معیار" اور "دانش" کے مدیر بھی رہے ہیں۔ ایک دور میں "معیار" نے جو بلند معیار پیش کیا تھا وہ قابل قدر ہے۔ وہ ایک خوش فکر شاعر اور عظیم صحافی ہیں مگر اُن کا مجموعہ ابھی تک تشنۂ اشاعت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شعری تخلیقات کو محفوظ نہیں رکھا سوائے اُن غزلوں کے جو اُن کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ اپنی پہلی فرصت میں "معیار" اور "دانش" میں شائع شدہ غزلوں کو فراہم کر کے اور پھر اُن غزلوں کی شمولیت کر کے جو حفیظؔ صاحب کے ذہن میں محفوظ ہیں اُن کا شعری مجموعہ ترتیب دیکر منظر عام پر لے آؤں۔ دعا کیجیے کہ میں اس ادبی فریضہ کو ادا کر سکوں۔

مجھے امید ہے کہ اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے والے دور نو کے شعراء میں حفیظؔ میرٹھی کو فراموش نہ کریں گے بلکہ ان کا جائز مقام جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں، دیکر ادب نوازی اور دوستی اور فراخدلی کا ثبوت دینگے۔

(بقیہ صفحہ ۱۷ سے آگے) دوران میں نے ان سے کہا حضور ندوۃ المصنفین ہی میں کام کرتے ہوئے آپ تک نہ جانے کتنی کتابوں کے مصنف ہوتے مسکرانے لگے اور کہا میاں واقف نہیں تو اس کا بھی شوق نہیں ہوا کہ لوگ مجھے مصنف کہیں لیکن ندوی صاحب کو شاید یہ نہیں معلوم تھا کہ رہتی دنیا تک لوگ انھیں ایک مصنف ہی کی حیثیت سے یاد کریں گے

ظفر ہمیر پوری

کلفت جان و تن بھی ہے، عیشِ دل و نظر بھی ہے
عشق میں عشرتِ دوام اور غمِ معتبر بھی ہے

ہائے خیالِ گل ہیں وہ لطف کہاں جو گل میں ہے
شوق و ہوائے گل کے ساتھ حاجت بال و پر بھی ہے

میں ہی جہاں ہوں کارواں خود ہوں غبارِ کارواں
شمس و قمر سے دور تر اک مری رہگذر بھی ہے

راہ گنہ میں صرف ایک اُس کے کرم کی ہے اُمید
راہِ ثواب میں تری شیخ خدا کا ڈر بھی ہے

ندرتِ فکر میں شریک طبعِ رواں نہ ہو اگر
باہمہ لطف و انبساط شاعری دردِ سر بھی ہے

پھونک دے دم کی دم میں جو خرمن زندگی ظفر
دل میں لہو کے ساتھ ساتھ ایک نہاں شرر بھی ہے

سید نیاز احمد شمیم فتحپوری

ساتھ رہے حیات کے چشم کرم کا سلسلہ
ختم نہ ہو خدا کرے یار کے غم کا سلسلہ

سب کا وجود بے ثبات، کچھ نہیں عالم حیات
دیکھ رہا ہوں دور تک شہر عدم کا سلسلہ

کوئے بتاں میں یوں نہ تھی آمد و رفت روز کی
دیر سے مل گیا ہے کچھ شیخ حرم کا سلسلہ

دور وہی ہے، مے وہی، بزم نشاط ہے وہی
آج بھی ہے نگاہ میں ساغر جم کا سلسلہ

دیکھ رہا ہوں بے گماں دن میں بھی رات کا سماں
صبح طرب تلک آ گیا شام الم کا سلسلہ

لوگ تری تلاش میں کتنے رواں دواں رہے
ہائے وفا کی راہ میں نقش قدم کا سلسلہ

دیکھ رہا ہوں غور سے دامن لالہ گوں شمیم
کچھ تو جگر سے ہے ضرور دیدۂ نم کا سلسلہ

طالب قریشی

اگرچہ قلب و جگر ایک ٹھوس پتھر ہے
وجود دیپ ترے لطف و کرم کا منظر ہے
غضب کا بار ہے بھیر وقت کے ستونوں پر
فصیل شب سے عجب رنگ سا اُجاگر ہے
ذرا بلائیے گا اپنے ہم نشینوں کو
ہمارے ہاتھ میں روحِ وفا کا ساغر ہے
نہاں یہ دفن ہیں پرچھائیاں میرے غم کی
یہ سطح جس پہ اُجالے کا گول چکر ہے
نہ پوچھیے گا شکستِ حواس کا عالم
ہر ایک بولتا پتھر خوشی کا رہبر ہے
لہولہان ہے اولاد فکر و فن طالب
چبھا ہوا سا ابھی دل میں ایک نشتر ہے

ریاض حسین چودھری

نہیں ہے زندگی میں زندگی کی دلکشی کوئی
کسی مجبور کی بھی ہے خدایا زندگی کوئی

نظر آتا نہیں نقشِ قدم جانِ بہاراں کا
شگوفوں کے لیے لائے کہاں سے تازگی کوئی

جفائے دوستاں کی ہم شکایت کیا کریں یارو
ہمارے ہی خلوصِ دل میں شاید تھی کمی کوئی

جلا کر دل اندھیروں میں رہے ہیں عمر بھر لوگو
کرے کیا اس طرح صحنِ چمن میں روشنی کوئی

اُجالوں میں ہے رنگینی کسی کے خونِ ناحق کی
خدا کے واسطے مجھ سے نہ چھینے تیرگی کوئی

میں اس شہرِ غزل کو کیوں نہ کہہ دوں آرزوئے دل
نہیں ایسا نگر کوئی، نہیں ایسی گلی کوئی

ریاض انساں کا پیتے رہے ہوں جو لہو برسوں
بجھا سکتا نہیں ان کی جہاں میں تشنگی کوئی

غلام مرتضیٰ راہی

کیا جائے : یہ اندازِ دگر ٹوٹ گیا
رہ اشک گرا تھا کہ گہر ٹوٹ گیا

یہ وقت کا معلوم نہیں کیا ہے مگر
بنہ میرا پسِ نقد و نظر ٹوٹ گیا

یا جرم تھا اُسے خانہ بر اندازِ چمن
خ امید کا اک اک گلِ تر ٹوٹ گیا

لمحات، اچھالے گئے صدیوں کی طرف
قدام، مرا شیشے کا گھر ٹوٹ گیا

نسوس نہ مل، دل شکنی پر میری
یا جائے جوازِ رہِ نظر ٹوٹ گیا

ائی پہ ہنگاموں نے دستک دیدی
واز پہ مائل تھی کہ پر ٹوٹ گیا

اس طرح گذرا کسی کافر کا گماں
ان، پسِ پردہ در ٹوٹ گیا

تا نہیں انجامِ تمنا راہی
ہلکی تھی کہ دامن میں شرر ٹوٹ گیا

عبدالمتین نیاز

اب دیکھے اپنے دل کا لہو چشمِ تر کو میں
سرسبز کر رہا ہوں غموں کے شجر کو میں

جب میرا آستاں ہے مری سجدہ گاہِ شوق
پھر کیوں کروں تلاش کسی سنگِ در کو میں

اک نقطہ میری فکر کا بن جائے کائنات
اب دونگا اتنی وسعتیں فکر و نظر کو میں

غم کی کڑکتی دھوپ مرے سر پہ آ گئی
خوابوں کی وادیوں سے جو نکلا سحر کو میں

دل سے تمہاری یاد کے سائے نکال کر
ویران کر رہا ہوں اک آباد گھر کو میں

ہے شیشۂ دل کا ضربِ غمِ دوستاں سے چور
یہ بات کیا بتاؤں کسی شیشہ گر کو میں

صورت بدل بدل کے ملیں گردشیں نیاز
راہوں میں زندگی کی جو نکلا سفر کو میں

ساحل مانکپوری

بدل ہی جائے گا دورِ خزاں کبھی نہ کبھی
رہے گا بن کے چمن گلفشاں کبھی نہ کبھی

اثر دکھائے گا سوزِ نہاں کبھی نہ کبھی
رہے گا ہو کے وہ بت مہرباں کبھی نہ کبھی

کرے گا کام یہ جذبِ نہاں کبھی نہ کبھی
رہے جو گرم یہ پتھر پگھل ہی جائیں گے
رہے گا مٹ کے غرورِ بتاں کبھی نہ کبھی
رہی جو کوششِ پیہم تو دیکھ لینا تم
بنا ہی لوں گا میں پھر آشیاں کبھی نہ کبھی

زمیں تنگ اگر ہے تو غم نہ کر ساحل
رہے گا چاند پہ بنکر مکاں کبھی نہ کبھی

مہدی پرتاپ گڑھی

ہر قدم پہ اس دل نے ایک بت تراشا
زندگی کی راہوں میں پھر بھی بے سہارا

ان کے ساتھ گذرے تھے زندگی کے کچھ
آج سوچتا ہوں میں جیسے ایک سپنا

میں نے یہ متاعِ غم ہر طرح سنبھالی
داغ داغ روشن ہے زخم زخم مہکا

میں تو یہ نہیں کہتا تم نے گل نہیں با
یہ تو میری قسمت تھی صرف زخم پایا

میری اس تباہی کا غم بھلا تمہیں کیا
زندگی میں خود اپنی میں نے زہر گھولا

روشنی تمدن کی دی تو عہدِ حاضر نے
قعرِ دل میں انسان کے جانے کیوں اندھیرا

یوں تو ہر نظر مہدی ہے خلوص کی حا
پھر بھی سوچتا ہوں میں کون ان میں اپنا

رؤف خیر

پھول ہے چاند ہے زما ہے کوئی
تم سے کیسے کہوں کہ کیا ہے کوئی

آج رہ رہ کے سوچتا ہے کوئی
زندگی ہے کہ بد دعا ہے کوئی

میری آواز پہ ہے یوں خاموشی
نیند میں جیسے چل رہا ہے کوئی

آرزوئے حیات بھی یارو
ایسا لگتا ہے مسئلہ ہے کوئی

یوں اکیلا ہجوم فکر میں ہے
جیسے خود سے بچھڑ گیا ہے کوئی

جب بھی جاگا شعور تنہائی
مجھ سے سرگوشیاں کیا ہے کوئی

میں بھی ہوں اپنے دور کا موسیٰ
ہے ترا ہاتھ یا عصا ہے کوئی

میں تو خود ہی وفا طلب کم تھا
کیسے کہہ دوں کہ بے وفا ہے کوئی

دوستو تم مجھے اجازت دو
اب مری راہ دیکھتا ہے کوئی

اک نظر مانگتی نگاہوں سے
خیر مڑ مڑ کے دیکھتا ہے کوئی

غزل

محمد منظور احمد منظور

نذرِ محمد قلی قطب شاہ

موقوف ہے منظور یہ ہر نے صبح پر نہ شام پر
گاؤ ترانہ عیش کا ہر دم پیا کے نام پر

اہلِ خرد کی مصلحت اندیشیوں کو کیا کہیں
جب بھی چلے ڈرتے ہوئے رکتے ہوئے ہر گام پر

محفل میں فیضِ خاص کے ہم منتظر بیٹھے رہے
کچھ سوچ کر چپ ہو گئے ساقی کے اذنِ عام پر

ہوگا علاجِ دردِ دل خود وہ سئیں گے زخمِ دل
آنے لگی ہے اب ہنسی اپنے خیالِ خام پر

اظہارِ مطلب کے لئے ان سے تکلم کے لئے
اک طرزِ خاص اپناؤ تم بیزار رسمِ عام پر

جن کو جنوں تھا کام کا دنیا میں کیا کچھ کر گئے
ان سے یہاں کیا ہو سکا مرتے رہے جو نام پر

حبابؔ ہاشمی

دل تو کیا جان پہ بن جائے تو کچھ ہوش نہیں
نشۂ عشق ہے یہ بادۂ پُرجوش نہیں

اُن کی پُرنور نگاہوں کی تجلّی توبہ !!
ذرّہ ذرّہ یہ پکارا کہ مجھے ہوش نہیں

محفلِ عیش نہ برہم ہو نہ چھیڑو مجھ کو
سازِ خاموش ہوں میں فطرت خاموش نہیں

ہوش اتنا ہے ترا نام لئے جاتا ہوں !!
بیخودی یہ ہے کہ اپنا بھی مجھے ہوش نہیں

جذب ہر تارِ نفس میں ہے ترا حُسنِ خیال
میں کسی حال میں بھی یاد فراموش نہیں

اہلِ میخانہ جسے پیار سے کہتے ہیں حبابؔ
آج محفل میں وہی رندِ بلانوش نہیں۔

محمد نصیر الدین نصیرؔ

ہماری چشم گوہر بار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
محبت باعث آزار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
وہ چہرہ شرم سے گلنار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
بھویں اسکی کھنچی تلوار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
زباں پر اُنکی یہہ تکرار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
ابھی ہاں اور ابھی انکار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
ہر اک اِس راہ پر چلنے سے گھبراتا ہے اے ہمدم
وفا کا راستہ پُر خار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
یہ سب کچھ جان کر بھی وہ ہمارا دشمنِ جاں ہے
ہمیں پھر بھی اُسی سے پیار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
بیماروں کی مسیحائی سے ہم بھی خوب واقف ہیں
گلِ نرگس ابھی بیمار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
یہ ہم بھی جانتے ہیں کیا ہوا تھا حال موسیٰ کا
ہمیں پھر حسرتِ دیدار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
اگر یہ مان لیں اب یوسفِ کنعاں نہیں کوئی
بھرا پھر مصر کا بازار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
نصیرؔ ہم نے سُنا تھا عشق ہے اک جانفزا جذبہ
محبت چشمۂ آزار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

عطا کلیانوی

رباعیات

(۱)

ہیں جلوہ گہِ شمس و قمر میں آیا
انفاسِ سحر، موجِ گہر میں آیا
دکھلا نہ سکے جب یہ مری صورت کو
حسنِ رُخِ زیبائے بشر میں آیا

(۲)

سمجھے گا نہ غیر آشنا کی باتیں
محرم ہی جانے گا دِلربا کی باتیں
اس دعویٰ پہ قرآن ہے اِک زندہ ثبوت
بندے کی زباں پہ ہیں خدا کی باتیں

(۳)

ہر گام پہ منزل کا نشاں لایا ہوں
اک راہ پہ اپنا کارواں لایا ہوں
موت آکے ندامت سے پلٹ جاتی ہے
ساتھ اپنے جو عمرِ جاوداں لایا ہوں

(۴)

ہے عقل یہاں اسیرِ دامِ اوہام
اور نکتۂ عشق ہے "ہو اللہ" کا مقام
ہے رازِ کتابِ زندگی کا اتنا
نقطۂ آغاز اور نقطۂ انجام

(۵)

افسانے کی دُنیا سے بہت دور ہوں میں
اے دوست حقیقت میں سرِ طور ہوں میں
جو خاک ہیں وہ مجھکو سمجھتے ہیں خاک
نوری کی نگاہوں میں فقط نور ہوں میں

(۶)

جو نقشِ وفا جبیں میں پنہاں ہوگا
اک سجدۂ در سے وہ نمایاں ہوگا
انوارِ ازل کا جسے پرتو ہے نصیب
وہ ذرہ بھی خورشیدِ درخشاں ہوگا

(۷)

پرواز بہت میرے پر و بال میں ہے
اک رمزِ سویدا مرے ہر خال میں ہے
جو لمحے گذرتے ہیں پلٹ آتے ہیں
ماضی مرا سب آئینہ حال میں ہے

تنقید و نظر

برگِ آوارہ برگِ آوارہ خورشید احمد جامیؔ کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے "رخسارِ سحر" کے نام سے جامیؔ نے اپنی غزلوں کا مجموعہ شائع کیا تھا جسکی اہلِ ذوق نے خاطر خواہ پذیرائی کی تھی۔

جدید تر غزل کے باب میں۔ خورشید احمد جامیؔ کا نام معتبر و محترم سمجھا جاتا ہے۔ اس اعتبار و احترام کے پیچھے جامیؔ کی تیس پینتیس سالہ فنی ریاضت شامل ہے۔ جہاں شاعری ان کے لئے عبادت بنی رہی، جامیؔ نے ہر صنفِ شاعری میں کم و بیش طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا جوہرِ قابل غزل میں ہے۔

اس مجموعے کا آغاز نظموں سے ہوتا ہے۔ ان نظموں پر رومانیت کی گہری چھاپ ہے ایسی رومانیت جسے ہم نے (ADOLESCENCE) دور سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس رومانیت کی کشش ایک فاصلہ نظر دلفریب لگتی ہے لیکن بہت جلد اس کا رنگ چھوٹنے لگتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جامیؔ کی یہ نظمیں اسی دور کی یادگار ہونگی جب ہر شخص ایک خاص عمر میں اپنے آپ کو مرکزِ کائنات سمجھنے لگتا ہے۔ جامیؔ اس دور سے بہت جلد نکل آئے اور انھوں نے اپنے لئے صحیح راستے کا انتخاب کر لیا جہاں ان کی صلاحیتیں چمک اٹھی ہیں۔ اس راستے پر چلنے والے قافلہ کے ہراول دستے میں جامیؔ کا نشانِ امتیاز دور سے پہچانا جاسکتا ہے۔

جدید تر غزل کی تشکیل و تعمیر میں جن شعراء کا نام لیا جاسکتا ہے ان میں خورشید احمد جامیؔ کئی حیثیتوں سے ممتاز ہیں۔ جدید تر غزل کے شاعر پر بڑی بھاری ذمہ داریاں عاید ہیں۔ ایک طرف ماضی کا انمول اور وافر سرمایہ ہے۔ جس کی چکا چوند کی تاب لاکر اپنا راستہ علیحدہ بنانا خود ایک ہفت خواں طے کرنے کے برابر ہے۔ غزل کی شاعری کے ساتھ دوسری بڑی مشکل یہ ہے کہ غزل کا سانچہ ایسا بنایا ہے کہ اس میں ترمیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' وہی مطلع و مقطع' وہی ردیف و قوافی مستزاد یہ کہ غزل اپنا ایک مخصوص ڈکشن بھی رکھتی ہے۔ کئی روزمرہ کے الفاظ غزل کی بارگاہ میں باریاب نہیں ہوسکتے۔ اس تحدید نے غزل کو بہت نازک مزاج بنادیا ہے۔ ان تمام آدابِ فن در و بست کو اپناتے ہوئے اگر کوئی شاعر

غزل کے باب میں کسی نئی لئے کا محرک بنتا ہے تو ہم اس کی صدا پر تحسین و آفرین کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ جامی کی غزل بلاشبہ لائق تحسین و آفرین ہے

خورشید احمد جامی کی طویل مشق سخن نے انھیں زبان کا مزاج آشنا بنا دیا ہے۔ مصرعوں کی نوک پلک جیسی ان کے پاس ملتی ہے وہ بہت کم جدید تر غزل کے شاعروں کے حصے میں آئی ہے زبان و بیان پر قدرت اکثر ترسیل و ابلاغ کے مسائل کو حل کرنے کا باعث بنتی ہے۔ جامی کی یہ قدرت اظہار انھیں مبہم اور گنجلک ہونے سے بچا لیتی ہے۔

زندگی جامی کی غزل کا خاص موضوع ہے۔ زندگی ان کے لئے دار بھی ہے اور دلدار بھی۔ زندگی کے ساتھ ان کا رویہ قابل غور ہے۔ کبھی دوستانہ تو کبھی رقیبانہ، کبھی حریفانہ تو کبھی عاشقانہ، جامی زندگی پر فریفتہ ہیں۔ انھیں زندگی کے آب و رنگ سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ لیکن اکثر ان کے خواب ٹوٹ جاتے ہیں تو ان کی دل شکستگی ہزاروں شکووں کے ساتھ نغمہ سنج نظر آتی ہے ؎

زندگی اک دھوپ ہے سایا نہیں — دور تک اس کا یقیں آیا نہیں
لوگ پھرتے ہیں یہاں حرف ملامت کی طرح — زندگانی کا یقین آئے تو کیونکر آئے
اب زندگی کے نام پہ یوں چونکتا ہوں میں — جیسے میا خیال ہے موضوع گفتگو
تیرے ہمراہ بہت غم ہیں تو اے دل تو نے — زندگانی سے بہت پیار جتایا ہوگا

جامی کی غزلوں کا ایک اہم رجحان تمثالات ہے۔ یہاں تصویریں بھی ہیں اور رنگوں کی فسوں کاری بھی آوازوں کا تال میل، پر اسراریت اور نغمہ آفرینی کے ساتھ ساتھ غیر مرئی اشیاء کو مرئی بنانے کی لگن خاص طور پر نمایاں ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

دشت خزاں میں دیکھ کے سوکھی ہی پتیاں — جامی خود اپنی یاد کے لمحے عذاب تھے
امید کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے لگ کر — سو بار جو سوچا ہے وہی سوچ رہا ہوں
زندگی رات کے پھیلے ہوئے سناٹے میں — دور ہٹتے ہوئے قدموں کا نشاں ہے ایکم
بے برگ و خزاں دیدہ درختوں کی خموشی — جیسے کسی بیتے ہوئے موسم کی صدا ہے
چمکا رہی ہے غم کے اندھیروں کو دور تک — کرنوں کی سیڑھیوں سے اترتی ہوئی صدا
یوں دل کے آس پاس ہے خوابوں کی روشنی — جیسے کسی گلی میں دریچہ ہو نیم وا
تنہا اداس چاند ہے بادل کی اوٹ میں — یا حرف آرزو ہے سرمایۂ وفا

ان اشعار میں جو شگفتگی اور تازگی ہے وہ جامی کے ذہن کی زرخیزی کا پتہ دیتا ہے۔ جامی

حسن کے شاعر ہیں ابھی ان کے حسن کے تصور میں لامحدودیت کا احساس رچا بسا نہیں ہے۔ جہاں کائنات کا ذرہ ذرہ درس جمال دیتا ہوا نظر آتا ہے، رومان شکست خوردگی اور تنہائی کے موضوعات کے اطراف انھوں نے حصارِ رنگ و بو باندھ رکھا ہے۔ جامی کی پرگوئی اور شادابی ذہن سے توقع ہے کہ وہ اپنی تخلیقات دائرہ اور وسیع کرینگے اور ساتھ ساتھ اپنے احساسِ جمال کو اور چمکائینگے۔ جدید تر غزل کے دو چار شاعر ایسے ہیں جن سے بہترین توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ بلاشبہ جامی ان میں سے ایک ہیں۔

برگِ آوارہ نہایت سلیقہ سے چھاپی گئی ہے، صوری حسن بھی قابل تعریف ہے۔

"برگِ آوارہ" از خورشید احمد جامی۔

ناشر: ۔شالیمار 87-2-5 ملک پیٹھ جدید۔ حیدرآباد 36 آندھرا پردیش۔

قیمت ۴ روپئے (مجلد)

شاذ تمکنت

(بقیہ مضمون صفحہ ۲ سے آگے)

کارکنانِ ادارہ کی عزت افزائی اور حوصلہ افزائی کی وہ آج ہم میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کی حوصلہ افزا اور ہمت آفرین باتیں اور ان کے زرین مشورے ہمارے رہنما رہیں گے۔ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ادارہ میں جو تعزیتی جلسہ ہوا اس کی روداد آخری صفحات میں ملے گی۔

ادارہ ادبیات اُردو کے امتحانات کیلئے ذیل کے دس مراکز قائم ہو چکے ہیں جہاں ۱۴ جون سے ۱۹ جون تک امتحانات ہوں گے۔ اورنگ آباد۔ بنگلور۔ چمپا پیٹھ۔ حیدرآباد۔ کاغذ نگر۔ کریم نگر۔ محبوب نگر۔ مدارس میسور اور نارائن کھیڑ۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ سب رس کا ایک شمارہ غالب نمبر ہوگا اور ۱۵ جون تک قلمی معاونین سے اپنے رشحات بھیجنے کی درخواست کی گئی ہے۔ اُمید ہے کہ ہمارے معاونین اپنے مضامین جلد ارسال فرمائیں گے۔

محمد اکبر الدین صدیقی

رپورٹ ادارہ

ایوانِ اردو میں جلسۂ تعزیت ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

حیدرآباد۔ اتوار ۴ مئی کی شام ادارہ ادبیاتِ اردو کی طرف سے ایوانِ اردو میں صدرِ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کی وفات حسرت آیات پر جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔ سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ جناب بدرالدین طیب جی نے اجلاس کی صدارت فرمائی۔ جلسہ کا آغاز مولانا خواجہ محمد احمد صاحب جنرل سکریٹری ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی قراءتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ ایوانِ اردو کے نمائندہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد صاحب سابق ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت، سوانح اور مرحوم صدر کے علمی و ادبی کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ ذاکر صاحب کے والد مولوی فدا حسین خاں سالار جنگ اول کے زمانے میں وارد حیدرآباد ہوئے اور تجارت کرنے لگے۔ سالار جنگ نے ان کی ذہانت کو تاڑ لیا تھا۔ موصوف نواب صاحب کے مشورہ کو قبول کرکے جوڈیشیل امتحان کامیاب کیا اور وکالت شروع کی۔ اور اورنگ آباد میں ان کی کامیاب وکالت کی دھوم مچ گئی۔ پھر حیدرآباد میں وکیل کی حیثیت سے نام کمایا۔ قانونی رسالہ جاری کیا۔ قانون پر کتابیں چھاپیں اور "مطبع آئینِ دکن" قائم کیا۔ کہا کہ ذاکر صاحب حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ یہیں کے محلہ بیگم بازار میں بچپن گزارا اور انھوں نے حیدرآباد کے ریذیڈنسی اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پروفیسر سید محمد نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے صدارتِ ہند کے منصبِ جلیلہ پر فائز رہنے کے باوجود اپنی مادرِ جامعہ علی گڈھ کو کبھی نہیں بھولے۔ وہ ایک صحیح محبِ وطن اور سچے اور شریف انسان کی حیثیت سے اپنے نصب العین کی تکمیل کی۔

جناب ضیاء الدین احمد شکیب (ایم اے علیگ) نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی شخصیت اور خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اُنھیں ذاکر صاحب کو اس وقت دیکھنے کا موقع ملا جب وہ علی گڈھ کے وائس چانسلر تھے۔ ذاکر صاحب مختلف اور متضاد مکتبِ خیال کے طالب علموں کو سوچنے، سمجھنے اور عمل کرنے کی پوری آزادی فراہم کرتے تھے۔ لیکن اُن کی شخصیت اُن تمام ہنگامہ پرور نوجوانوں پر ایک بڑے سائبان کی طرح چھائی رہتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے دل میں جامعہ علی گڈھ کی قدر گہری تھی اور وہ قیام علی گڈھ کے ہر زمانے کو اپنی متاعِ حیات سمجھتے تھے۔ وہ ایک قوم ساز شخصیت کے حامل اور انکی خدمات کے اثرات نسل در نسل محسوس کئے جائیں گے۔ عہدوں کی وجہ سے ان کے عظمت میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ ان کی شخصیت ایک اعلیٰ درجہ کے انسان کی حیثیت سے سب کیلئے

قابل احترام رہی ہے۔

ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر سید علی اکبر صدر ادارۂ ادبیات اردو نے ڈاکٹر صاحب کی عظیم خدمات اور جذبہ وطن دوستی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۲۷ء میں قیام برلن کے زمانہ میں ہم ہندوستانیوں نے تحریک آزادی ہند کی خاطر ایک انجمن قائم کی تھی۔ جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب قوم پرست قائد اور گاندھی جی کے پیرو ہی نہیں بہت بڑے ماہر تعلیم بھی تھے جامعہ ملیہ اسلامیہ نے محدود وسائل کے باوجود آج جو مقام بنایا ہے اس کے پس پردہ ساری کوشش اور توانائیاں ذاکر حسین صاحب کی محنت و ایثار کا نتیجہ ہیں۔ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے کہا کہ جامعہ ملیہ ہی نہیں ذاکر صاحب کے عظیم خدمات کا پورا ملک معترف ہے۔ وہ صاحب طرز ادیب کامیاب مترجم اور محترم شخصیت کی حیثیت سے ملک کے لئے روشنی کا مینار بنے رہیں گے۔ ادارہ ادبیات اردو سے مرحوم صدر کو قریبی لگاؤ رہا ہے۔ وہ ادارے کے علمی کاموں اور اسکی ترقی سے مسرور ہوا کرتے تھے۔ اپنے آخری دورۂ حیدرآباد میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ فرما کر اور اس کے کاموں پر اطمینان کا اظہار کر کے ہمارے حوصلے بلند کیے ہیں۔

ڈاکٹر مغنی تبسم، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، علی سرور اور فکری بدایونی نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو منظوم خراج عقیدت ادا کیا۔

صدر جلسہ جناب بدرالدین طیب جی نے صدارتی تقریر میں کہا کہ "ذاکر حسین صاحب تین بڑی تہذیبوں کی اعلیٰ روایات اور اقدار کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان تہذیبوں کے امتزاج سے بننے والی شخصیت کے وہ نمائندہ تھے اور اس طرح ایک مکمل ہندوستانی بھی تھے۔ اسلامی تہذیب، ویدک کلچر اور مغربی ثقافت ان تینوں کے اثرات۔ ان کی شخصیت میں اثر کر گئے تھے۔ اس پہلو کردار کی وجہ سے اُن کی موت سے ملک کو عظیم نقصان پہنچا ہے۔ جب وہ علی گڈھ کے وائس چانسلر تھے تو ان کے دور میں جامعہ علی گڈھ نے ہمہ جہتی ترقی کی سائنٹفک نقطۂ نظر کے سبب ڈاکٹر صاحب نے ساری دنیا میں اپنا ممتاز مقام بنا لیا تھا۔ جناب طیب جی نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر صاحب سے اپنے تعلقات کا ذکر کیا اور کہا کہ ان کی موت ایک عظیم تہذیب اور کلچر کی موت ہے۔

کرسیٔ صدارت سے قرارداد تعزیت پیش کی گئی جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی گرانقدر خدمات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "ذاکر حسین صاحب اردو تمدن کے شاداب پھول تھے اور اس روشن دماغ شخصیت کے اٹھ جانے پر سارے ملک میں ماتم برپا ہے۔" ادارۂ ادبیات اردو سے مرحوم کو جو تعلق خاطر تھا اس کا ذکر بھی قرارداد میں کیا گیا۔ حاضرین نے ایستادہ ہو کر دو منٹ کی خاموشی منائی اور قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔ جناب رحمن راج سکد شریک معتمد اعزازی ادارۂ ادبیات اردو کے شکریہ پر جلسہ برخواست ہوا۔

(وقار خلیل)

یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۳۲ شمارہ (۷)
جولائی ۱۹۶۹ء
ماہنامہ

سب رس

نگران
پروفیسر سید علی اکبر ایم اے (کینٹب)
مجلس مشاورت
میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکسینہ
ڈاکٹر غلام عمر خاں۔ محمد منظور احمد
معتمد
محمد اکبر الدین صدیقی
مہتمم
محمد جمال الدین
منتظم
وقار خلیل

زر سالانہ چھ روپے غیر ممالک سے دس روپے
ششماہی تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے

نمونے کے پرچے کیلئے ۷۵ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے "نیشنل فائن پرنٹنگ پریس" میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات ناموافق حالات کے سبب تا اطلاع ثانی ملتوی کر دیئے گئے۔ تاریخ سے مراکز کو فرداً فرداً اطلاع دی جائے گی۔ ستمبر کا شمارہ غالب نمبر ہوگا۔ اس میں غالب کی ان تحریروں کے عکس جو حیدرآباد میں موجود ہیں۔ غالب کے وہ قصائد ہوں گے جو امرائے حیدرآباد کی مدح میں لکھے گئے۔ غالب کے ان کا ذکر اور کچھ تصویریں ہوں گی جو حیدرآباد میں سکونت پذیر رہے۔ غالب نمبر میں اور غالب سے متعلق شائع کتابوں پر تبصرے شامل ہوں گے۔

غالب نمبر کے مضمون نگار حضرات کی مختصر سی فہرست پیش ہے

پروفیسر سید محمد۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ پروفیسر سید مبارز الدین رفعت۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل۔ ڈاکٹر [illegible] احمد حسینی [illegible] محمد تمیمی۔ ڈاکٹر سید اختر نام احمد ندوی۔ حامد اللہ ندوی۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر [illegible] شکیل [illegible]۔ [illegible] گیلانی۔ عبدالغنی فاروقی۔ یوسف ناظم۔ پروفیسر عصمت [illegible] [illegible]۔ ضیاءالدین شکیب اور دوسرے ادیب

اس کی ضخامت دو سو صفحے سے زیادہ ہوگی اور قیمت چار روپے ہوگی۔

(لیکن)

خریداروں سے زائد قیمت نہ لی جائے گی البتہ ان سے درخواست ہے کہ وہ آئندہ اپنا چندہ بھیجتے ایک روپیہ زائد بھیجیں تاکہ رجسٹری کے صرف وغیرہ کی پابجائی ہو سکے۔

محمد اکبر الدین صدیقی

سید یوسف کمال بخاری
مترجم: امین الدین خاں

(قسط دوم)

داستان مخطوطات ہند

مخطوطات کی جلدیں قدیم اور ہندو دور کی قلمی کتابوں کیلئے جلد سازی کا کوئی باقاعدہ [illegible] کے اوراق کو ایک جگہ بغیر جز بندی کے جمع کر کے رکھ دیا جاتا تھا۔ [illegible] ایک سوراخ بنا کر اس میں ڈورا پرو دیتے تھے اور [illegible] ڈور [illegible] مضبوطی سے باندھ دیتے تھے [illegible] جلد کے دو پٹھوں کے درمیان رکھ دیئے جاتے تھے۔ جلد کے [illegible] پٹھے بھی چوب کبھی [illegible] ان پٹھوں پر نقش و نگار بنے ہوتے تھے جن میں کرشن لیلا [illegible] مذہب [illegible] کے [illegible] شکل میں پیش کئے جاتے تھے۔

عربی و فارسی کی قلمی کتابوں پر عمدہ قسم کی جلدیں باقاعدہ فنی تکنیک کے ساتھ چڑھائی ہوتی تھیں۔ حقیقتاً فن جلد سازی کا تعلق اسلامی کتب سے ہی شروع ہوا۔ فنکاروں نے مختلف فن جلد سازی کے [illegible] قائم کئے اور جلد سازی میں جوہر و فن کا کمال دکھایا۔ یہ جلدیں شہنشاہوں، حاکموں، نوابوں اور بسا اوقات مذہبی پیشواؤں کو پیش کرنے کیلئے تیار کی جاتی تھیں۔

ہندوستانی مخطوطات کے ذخائر میں [illegible] جلد سازی کے نمونے [illegible] طرز جلد سازی پر مشتمل ہیں جو اپنی انفرادیت کیلئے مشہور ہیں۔ [illegible] کے علاوہ بھی دیگر شہروں میں جلد سازی کا کام ہوتا تھا [illegible] یہ جلدیں چمڑے، لاکھ، گتے اور کاغذ کے گودے سے تیار کی جاتی تھیں جن پر [illegible] کے نمونے، تراشیدہ کاری، جالی دار نمونے، معدنی نمونے، گل بوٹے [illegible] نمونے بنے ہوتے۔

اشیائے کتب نویسی [illegible] کی قلمی کتابیں تاڑ پتر، بھوج پتر [illegible] تھیں [illegible] ان کتابوں کے [illegible] کریز کیا جاتا تھا جبکہ کاغذ دستیاب [illegible] اپنے چوڑے پتے ہوتے تھے جن پر الفاظ [illegible] کی مدد سے [illegible] اسی طرح تاڑ پر بھی [illegible] بنائی جاتی تھیں۔ پتوں [illegible]

دیا جاتا تھا۔

بھوج پتر تقریباً آٹھ انچ تک چوڑا ہوتا تھا لیکن اس کا استعمال عام نہیں معلوم اس پر لکھی ہوئی قلمی کتابیں تاڑ پتر کے مقابلہ میں بہت کمیاب ہیں۔ نیشنل میوزیم کے مجموعہ میں بھوج ایک مخطوطہ ہے۔ جنوبی ہند میں شتیلا کے پتے بھی کام میں لائے جاتے تھے۔ تاڑ پتر پر لکھی ہوئی قلمی کتا لاکھوں کی تعداد میں قلمی ہیں۔ تحریر کیلئے کاغذ کا استعمال تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں ہندو مسلمانوں کی حکومت قائم ہونیکے بعد شروع ہوا جین مذہب کی مقدس کتابیں موسوم بہ "کالپ سوتر" مع تصاویر گجرات اور مغربی ہندوستان میں پائی جاتی ہیں۔

عربی اور فارسی مخطوطات ہرن اور اونٹ کی تانت پر و نیز کاغذ پر لکھے ہوئے ملتے ہیں مختلف اقسام ہیں یعنی اعلیٰ، اوسط اور معمولی۔ کاغذ سازی کے کارخانے مصر، مازندران، سمرقند اور ہندوستان کشمیر، دولت آباد، کالپی وغیرہ میں قائم تھے۔ قلمی کتابوں کی تیاری میں جن مختلف اقسام کے کاغذ استعمال ان کے نام یہ ہیں۔ خان بالیغ، مصری، مازندرانی، کشمیری، سمرقندی، دولت آبادی، کالپوری وغیرہ وغیرہ رنگ کے ہوتے تھے مثلاً سفید، لال، ہرا، نیلا اور سنہرا۔

آلاتِ مخطوطہ سازی

ایک مخطوطہ کی تیاری کیلئے متعدد قسم کے اشیاء و آلات درکار ہوتے تھے۔ مثلاً روشنائی، رنگ وغیرہ وغیرہ۔ ان اشیاء کی مختلف قسمیں ہوا کرتی تھیں۔ چاقو کی ضرورت پڑتی تھی اور چاقو تین طرح کے ہوتے تھے۔ ایک سخت قلم بنانے کیلئے، دوسرا ملائم قلم تراشنے اور تیسرا قلم پر قط لگانے کیلئے (یعنی قلم کی نوک کی چوڑائی درست کرنے کے واسطے)

قلم کی بھی بہت سی قسمیں ہوتی تھیں مثلاً واسطی، عوی، مصری، مازندرانی، جاوی مثلاً ہے کہ بہترین قلم وہ ہے جو سخت اور اوسط قد کا ہو۔ نہ بہت موٹا نہ زیادہ پتلا اس طرح کے خط سے ستھری اور شاندار ہوتی ہے۔

مختلف قسم کی روشنائی بنانے کیلئے جدا جدا طریقے ہوتے تھے اور ہر روشنائی انداز کی تحریر کے لئے استعمال ہوتی تھی۔

قلمی کتابوں میں تصویر بنانیکے لئے مختلف رنگوں کا استعمال ہوتا تھا۔ جن میں خاص لاجوردی، شنگرفی اور زنگاری قابل ذکر ہیں۔ یہ رنگ مخصوص ماہرین کی نگرانی میں تیار کئے جاتے ان کئے صدہا سال قائم رہنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ موجودہ قلمی نسخوں میں تصاویر کے بہترین نمونے انہی مرہون منت ہیں۔ یہ تصاویر عربی اور فارسی قلمی نسخوں کی خصوصیت ہیں

بھوج پتر، تاڑ پتر یا شتیلا پتر پر سنسکرت کے قلمی نسخوں کی تحریر کیلئے الفاظ کو کھرچنے کے واسطے نہرنی کا استعمال ہوتا تھا۔ بھوج پتر پر لکھنے کیلئے قلم کا استعمال بھی کیا جاتا تھا۔

فن خطاطی اور مسودہ تیار کرنیکی ترکیب

خلفائے عباسی کے دور میں کاغذ کے استعمال کی ابتدا ہو جانے پر کتابیں تیار کرنے کے فن کی اہمیت بہت بڑھ گئی نکلا ور تت مختلف شعبوں میں بٹا ہوا تھا مثلاً نسخوں کی تحریر کا ادارہ، کتابوں کی جلد سازی ان پر سنہرے کام کرنا، تصاویر بنانا اور انہیں آراستہ کرنا اور کتابوں کے فروخت کرنیکا ادارہ جو خطاط تیز رفتاری کے ساتھ حروف کی خوبصورتی اور دیدہ زیبی پر بھی قدرت رکھتے تھے انہیں وراق کہا جاتا تھا وہ سرکاری دفاتر میں منشی کے عہدہ پر فائز ہوتے تھے

ان دنوں کتاب کی اشاعت ایک اہم سماجی کام سمجھا جاتا تھا۔ مصنف کبھی کبھی مسجد کے منبر سے اپنی تصنیف کو پڑھ کر سناتے اور کبھی اپنی تحریروں کو فی البدیہہ تنقیدات کیساتھ بیان کرتے۔ خطاط اور شاگرد سامعین کے درمیان خاص تیز رفتاری کیساتھ لکھتے جاتے تھے۔ اسلئے کہ یہ سلسلہ کتاب کی ضخامت کے حساب سے ہفتوں، مہینوں بلکہ برسوں چلتا رہتا تھا۔ اس کے بعد خطاط متن کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے اور مصنف کے منظور کردہ نسخہ کے مطابق درست کر لیتے۔ اس کے بعد ان کتابوں کے کئی نسخے تیار کئے جاتے جو بازار میں فروخت ہوتے۔

مصنفین بیسیوں جلدیں تحریر کرتے تھے اور آجکل ہم قیاس بھی نہیں کر سکتے کہ وہ کیونکر اتنی ضخیم کتابیں تنہا لکھ ڈالتے تھے۔

قلمی کتابوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے

زمانۂ قدیم میں قلمی کتابوں اور دیگر قسم کی بیش بہا تحریروں کو محفوظ رکھنے کیلئے مختلف طریقے کام میں لائے جاتے تھے۔

(۱) شدت کی گرمی، غبار، نمی، بارش اور دیگر عناصر کے برے اثرات سے بچانے کیلئے تہہ خانے بنائے گئے تھے جہاں قلمی نسخوں کو بحفاظت رکھا جاتا تھا (راجستھان میں) جیسلمیر قلعہ کی چوٹی پر بنے ہوئے ایک کے تہہ خانے میں مخطوطات کا ایک مجموعہ ایک محفوظ ہے جسے "جین بھنڈار" کہتے ہیں۔

(۲) قلمی نسخوں کے ورقوں کو [illegible] سے بچانے کیلئے ان کے درمیان نیم [illegible] (نیم) ایک ہندوستانی درخت ہے جو ملک میں ہر جگہ عام طور پر ملتا ہے اور اس کی پتیاں [illegible] لتی ہیں۔

(۳) اسی غرض سے کبھی کبھی کافور کی گولیاں [illegible] کے درمیان [illegible] جاتا تھا۔

(۴) بیش بہا مخطوطات کپڑے کے جزدانوں میں رکھے جاتے تھے تاکہ غبار سے ان کی حفاظت ہوسکے اور گرمی کی شدت کا برا اثر کاغذ پر نہ پڑسکے کپڑے میں گرمی یا دھوپ بھی جذب نہیں ہوتی اور یوں جزدان کاغذ کو روشنی کے مضر اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔

(۵) قلمی کتابوں کے اندر بنی ہوئی تصویروں کی حفاظت کیلئے ورقوں کے درمیان باریک کاغذ رکھ دیتے تھے۔

(۶) قلمی نسخوں اور کاغذ کو مزید نقصان سے بچانیکے لئے کبھی کبھی عام لکڑی یا صندل کی لکڑی کے تختوں کے درمیان رکھدیتے تھے صندل بھی کیڑوں کو دور رکھتا ہے۔

(۷) مصور ورقوں کو دباؤ اور بوجھ سے بچانے کیلئے کبھی کبھی کپڑے کے ٹکڑے بھی ورقوں کے درمیان رکھ دیئے جاتے تھے۔

(۸) سانپ کی کینچلی کا استعمال بھی مخطوطات کی حفاظت کیلئے کیا جاتا تھا اسلئے کہ سانپ کی کینچلی بھی کیڑوں کو دور رکھتی ہے۔

(۹) کیڑوں سے قلمی کتابوں کی حفاظت کیلئے اجوائن کا استعمال بھی عام تھا اس کا ست آج بھی تھائی مال (THYMOL) کے نام سے اسی لئے کام میں لایا جاتا ہے۔

(۱۰) کیڑوں کو مخطوطات سے دور رکھنے کیلئے ورقوں کے درمیان ہلدی کا استعمال بھی ہوتا تھا۔

غرض کہ اپنے آبا کی کتابیں جو ہمارا بے بہا قومی خزانہ ہیں ہمارے اسلاف کی ان ہی تدابیر کے نتیجہ میں صحیح وسلامت ہم تک پہنچی ہیں۔

مخطوطات کے کتب خانے

(۱) قدیم ترین تاڑ پتر کا نسخہ دوسری صدی عیسوی کا اب تک موجود ہے جو سیلون میں ہے۔

(۲) بدھ دھرم کے دھرم شالے

(۳) انورادھاپورم کی مہاوہاری دھرم شالاؤں کے کتب خانے۔

(۴) برما کے شہر پگان کا پتا کٹا لی بگوڈا کا کتب خانہ۔

(۵) بنگال کی نالندہ اترالیتی (لائبریری) نالندا کی لائبریری کا نام دھرم گنج تھا نالندا یونیورسٹی کی بنیاد ۴۲۵ء عیسوی میں پڑی۔

(۶) سنگ مرمر کے قلمی نسخوں کی جلدیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ان میں اصل نسخے کبھی موجود تھے۔

(۷) بھاگلپور میں وکرما سہاوہار۔

نامہ سب [illegible]

[illegible]) پوربی پاکستان میں سوم پورہ مہا وہار کے کتب خانے۔
[illegible]) کشمیر میں شاہی کتب خانہ۔

۱- بیدر میں محمود گاواں کی لائبریری جس میں ۳۰۰۰ (تین سو) قلمی کتابیں تھیں [illegible]
۲- فتحپور سیکری میں شہنشاہ اکبر کا کتب خانہ۔
۳- دہلی میں ہمایوں کا کتب خانہ۔
۴- دہلی میں دارا شکوہ کا کتب خانہ۔

ہندوستان کے موجودہ قلمی کتابوں کے کتب خانے اور ان کی [illegible]

ملک میں مخطوطات کے ذخیروں اور کتب خانوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے [illegible]
[illegible] ہمارے علم میں ہی نہیں ہیں کیونکہ ان میں سے اکثر راجاؤں نوابوں [illegible] دوسروں کے [illegible] ذخیرے تھیا
[illegible] کی بے اعتنائی کی وجہ سے ان ذخیروں کو مناسب اہمیت نہیں دی جاتی یا پھر وہ لوگ ان علم کے خزانوں میں
[illegible] سروں کو شریک کرنے کیلئے تیار نہیں پھر بھی مخطوطات کے ذخیروں کی ایک خاصی تعداد قابل ذکر ہے [illegible]
[illegible] انے ہمارے اسلاف کے علوم و فنون کو ہم تک پہنچانے کا وسیلہ ہیں جن سے ہمارا تاریخی ماضی روشن نظر [illegible]
[illegible] مخطوطات اور دیگر مضامین مثلاً تعمیرات، سنگتراشی، تصویرکشی وغیرہ میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر ان ہنروں [illegible]
تفصیلات بیان کرتے ہیں جبکہ آخر الذکر صرف ان کے طرز اور تکنیک کے ذرائع ہم پہنچاتے ہیں۔ مخطوطات [illegible]
[illegible] ریہ، ٹکنالوجی، انجینیری، مذہب، ادب وغیرہ کا واضح بیان [illegible] اور اہل علم اپنی تحقیقات میں ان مخطوطات [illegible]
استفادہ کرتے ہیں۔

ہندوستان کی اہم قلمی کتابوں کے ذخیرے حسب ذیل ہیں —

سنکرت:— (۱) ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ اور بمبئی
(۲) سرسوتی بھون، وارانسی۔
(۳) بھنڈارکر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونا۔
(۴) اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ [illegible]
(۵) گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹ [illegible]
(۶) کتب خانہ [illegible]
(۷) رگھونندن لائبریری [illegible]

عربی و فارسی وغیرہ :- (۱) خدابخش لائبریری، پٹنہ۔

(۲) سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد (۳) سعیدیہ لائبریری، حیدرآباد۔

(۴) کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد (۵) کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو، حیدرآباد۔

(۶) کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (۷) رضا لائبریری، رامپور

(۸) نیشنل میوزیم، نئی دہلی۔

نیشنل میوزیم کے قلمی کتب خانے کی مختصر تاریخ

حکومت کی مقرر کردہ مجلس خرید برائے اشیاء فنون لطیفہ عام طور پر میوزیم کیلئے اشیاء نمائش ان کے مالکوں سے براہِ راست خریدتی ہے۔ چنانچہ اسی طرح مخطوطات بھی حاصل کئے جاتے ہیں قلمی کتابوں کا سیکشن (شعبہ) دو حصوں میں منقسم ہے۔ سنسکرت اور فارسی۔

سنسکرت قلمی نسخوں کی تعداد کوئی تین ہزار ہے جو مختلف مضامین پر مشتمل ہے ان قلمی نسخوں کا تمام حصہ وادیٔ کشمیر سے حاصل ہوا ہے جنکی زبان تو سنسکرت ہے مگر رسم الخط "سارداؔ" ہے یہ مجموعہ دو ہزار دو سو نسخوں پر مشتمل ہے جو ایک ہی شخص سے خریدے گئے تھے۔ ان کتابوں سے منتر یعنی علم نجوم اور علم ہیئت، ادب اور مذہب پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں کچھ نسخے مصور بھی ہیں۔

ان کے علاوہ مغربی ہند بلکہ خاصکر گجرات کے جین سوتروں کا ایک مجموعہ ساٹھ جلدوں پر مشتمل ہے ان میں تقریباً سب ہی نسخے مصور ہیں اور انکا طرز تصویر نگاری کے مغربی اسکول سے متعلق ہے۔ کوئی ۱۲۵ تالپتر پر جنوبی ہند کی تامل زبان میں لکھے ہوئے قلمی نسخے بھی ہیں ان میں اکثر مصوّر ہیں۔ تیرہ مخطوطات پنجابی زبان اور گرمکھی رسم الخط میں لکھے ہوئے موجود ہیں۔

شعبۂ فارسی میں مخطوطات کی تعداد سنسکرت کی قلمی کتابوں سے تقریباً دگنی ہے یعنی کوئی چھ ہزار ہے۔ ان میں سے چار ہزار پانچ سو فارسی میں، ایک ہزار تین سو عربی میں، ایکسو پچاس اُردو میں اور پچاس پشتو میں ہیں۔

ان چھ ہزار مخطوطات میں دو ہزار پانچ سو قلمی نسخوں کا ایک بڑا مجموعہ شامل ہے جسے ٹونک کا ذخیرہ کہتے ہیں اور جو راجستھان کی سابق ریاست ٹونک کے نواب صاحب سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس مجموعہ میں بعض نایاب نسخے خود مصنفین کے دور کے لکھے ہوئے یا قدیم ترین نسخے اور مختلف مضامین پر غیر مطبوعہ کتابیں بھی ہیں ان میں سے بعض مصوّر بھی ہیں جن پر بازجُست کے امکانات بہت وسیع ہیں۔ ہر عنوان پر کام کرنیوالا طالب علم اپنی مخصوص بازجُست پر کچھ نہ کچھ مواد حاصل ہی کر لیتا ہے اور اس کی محنت رائیگاں نہیں جاتی ان طلباء کے پرسکون ماحول میں کام کرنے کیلئے ایک علیحدہ سیکشن ہے۔

اس ذخیرہ کے علاوہ تین ہزار پانچسو نسخوں پر مشتمل دوسرے مجموعے بھی ہیں۔ ان میں مغل، ایرانی اور دکنی طرز کے مختلف ملک کے خوبصورت، دیدہ زیب اور مصور نسخے پائے جاتے ہیں۔ اس میں مختلف طرز تحریر کے مشہور خطاطوں کی وصلیاں اور قرآن شریف، حمائل شریف اور توقیعات بھی شامل ہیں۔ جنھیں علماء اور عوام دونوں ہی قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ہندوستان کے معروف مخطوطات

یوں تو ملک میں مخطوطات کے مجموعے بے شمار ہیں لیکن میں مختصراً صرف تیرہ (۱۳) مخطوطات کا ذکر کرونگا

قدیم ہندو مخطوطات

(۱) قدیم ترین تاڑپتر پر دوسری صدی عیسوی کا لکھا ہوا براہمی طرز تحریر کا قلمی نسخہ اور انڈین میوزیم کلکتہ کا ٹکشلا میں دریافت شدہ پانچویں صدی کا بھوج پتر پر لکھا ہوا نسخہ۔

(۲) نیشنل میوزیم کا سنہ ۱۴۲۹ء کا لکھا ہوا تصویروں کا ایک مجموعہ جسے مادھو بلپسوستر کہتے ہیں۔

(۳) نیشنل میوزیم کا آٹھویں صدی عیسوی کا کشمیر کی ساردا طرز تحریر میں لکھا ہوا بھوج پتر کا نسخہ۔

(۴) بارھویں صدی عیسوی کا نواڑی (نیپال کی) طرز تحریر میں لکھا ہوا شری بھوج دیوسنگرہ۔

(۵) چکیتسا سنگرہ قدیم آیورویدی طرز علاج پر بھنڈارکر اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونا کا کاغذ پر لکھا ہوا قدیم ترین تاریخی مخطوطہ

(۶) میگھ دوت۔ ودیا مندر احمد آباد سے حاصل شدہ مغل طرز کا سنسکرت گیتوں کا مجموعہ۔ میگھ دوتم کا مصور مخطوطہ صرف یہی ایک ہمارے علم میں ہے۔

(۷) ارتھ شاستر۔ اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے حاصل شدہ ارتھ شاستر کا بہترین نسخہ۔

عربی و فارسی مخطوطات

(۱) نیشنل میوزیم۔ نئی دہلی کا اونٹ کی کھال پر خط کوفی میں لکھا ہوا آٹھویں صدی کا قرآن شریف (۲) نیشنل میوزیم۔ نئی دہلی کا خود جہانگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا تزک جہانگیری کا نسخہ (۳) نیشنل میوزیم۔ نئی دہلی کا سنہ ۱۵۰۳ء کا لکھا ہوا بوستاں کا نسخہ جسمیں مالوہ اسکول کی ۴۳ تصاویر بھی ہیں۔ (۴) کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد۔ سنہ ۱۷۱۲ء کا لکھا ہوا مخطوطہ المختصر فی فنون من الصنع کا نسخہ یہ فنون اور تکنیکیات پر ایک رسالہ ہے (۵) رضا لائبریری رامپور کا دیوان حافظ کا نسخہ جسمیں اکبر اسکول کی بہترین تصاویر ہیں (۶) رضا لائبریری رامپور کا تواریخ جمشیدی کا نسخہ۔ خاندان تیموریہ کی یہ غیر مطبوعہ تاریخ بیس تصاویر سے مزین ہے۔ (۷) سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کا سنہ ۱۶۲۶ء تا ۲۷ء کا تحریر کردہ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ کا نسخہ اس میں ایرانی اسکول کی تصاویر بھی ہیں (۸) اورینٹل لائبریری پٹنہ کا تاریخ خاندان تیموریہ کا نادر نسخہ یہ بھی مصور ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سے نوادرات ملک کے طول و عرض میں پھیلے پڑے ہیں۔ ان کے بیان کی اس مختصر سے مضمون میں گنجائش نہیں۔

غلام ربانی

درسی کتابیں

ہمارے ملک میں جب سے انگریزی تعلیم کا رواج ہوا اسی وقت سے عام شکایت تھی کہ ابتدائی جماعتوں کی درسی کتابیں کیا بہ اعتبار زبان اور کیا بہ اعتبار مضامین اچھی نہیں ہیں اور یہ شکایت کچھ اُردو ریڈروں کے بارہ میں نہیں تھی ہندی کتب درسیہ میں بھی یہی نقائص موجود تھے۔ چنانچہ صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ (اترپردیش) میں کتب درسیہ کی اصلاح کیلئے ایک کمیٹی بھی مقرر ہوئی تھی[1] مگر ریڈر ان عیوب سے پاک نہ ہو سکیں۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ڈھاکہ کے اجلاس میں مدرسوں کے اردو کورس پر بھی اعتراض ہوا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جوائنٹ سکریٹری کانفرنس نے نصاب کی کتابیں دفتر انجمن ترقی اردو میں بھیج دیں۔ انجمن نے قابل اعتراض مقامات پر نشان لگا کر کتابیں کانفرنس کو واپس کر دیں۔ دوسرے سال حسب تحریک مولوی سجاد مرزا بیگ یہ تجویز ہوئی کہ انجمن[2] کی طرف سے ضروری فنون انگریزی کی ابتدائی کتابوں کا ترجمہ کر کے چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کیے جائیں۔ انگریزی کتابوں کا انتخاب پروفیسر آرنلڈ اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے مشورہ سے کیا جائے۔ یا یہ تجویز پایۂ تکمیل کو نہ پہنچی یا یہ کام ادھورا رہ گیا۔ دراصل ضرورت اس امر کی تھی کہ اردو کی جدید درسی کتابیں (ریڈریں) اس نہج سے لکھوائی جائیں کہ وہ بچوں کے مدارج اور عمر و تجربہ کے مناسب حال ہوں، ان کے دماغی اور اخلاقی قوا کی تربیت اور شریفانہ جذبات کی تحریک کا باعث ہوں۔ زبان آسان اور صاف ستھری ہو۔ اس تجویز کو سنہ ۱۹۱۱ء میں مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے شائع کیا تھا اور اس کے متعلق کچھ رائیں بھی وصول ہوئی تھیں۔ آخر کار سنہ ۱۹۳۰ء میں یہ ضروری کام پورا کیا گیا۔ یعنی انجمن نے درسیہ عثمانیہ کے نام سے اُردو کی ریڈریں شائع کیں۔ ان کی ترتیب میں ان تمام امور کا لحاظ رکھا گیا تھا جو ابھی بیان کیے گئے۔ ان ریڈروں کی خوبی کے متعلق صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ دکشنا ناگری پرچار سبھا صوبہ مدراس نے اپنے ٹریننگ اسکولوں کے نصاب کے لئے انہی ریڈروں کا انتخاب کیا۔

انگریزی عہد میں تو اہل ملک کیلئے کچھ مجبوریاں تھیں لیکن اب جبکہ ملک آزاد ہو گیا ہے خیال ۔۔۔

---

[1] انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲ اگست ۱۸۹۰ء، مارچ ۱۹۰۳ء ...   [2] رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۷ء (بحوالہ) ...

درسی کتابوں کی خرابیاں دور ہو جائیں گی اور بجائے اصلاح کے ایک اور چیز پیدا ہو گئی جس سے ملک میں مذہب پرستی کو فروغ ہونے کا اندیشہ تھا۔

مدرسے انسان ڈھالنے کے کارخانے ہیں۔ بچپن میں خیالات بہت آسانی سے دل میں بیٹھ جاتے ہیں، ان میں کسی دلیل یا بحث کی ضرورت نہیں۔ اس عمر میں بعض خیالات دل پر اسی طرح نقش ہوتے ہیں کہ پتھر کی لکیر بنا جاتے ہیں۔ اس جانب داری کے بارہ میں مسلمان حکومت ہند کی توجہ مبذول کرا رہے ہیں۔ عام طور سے یہ شکایت چلی آ رہی ہے کہ زبان اور تاریخ کی کتابیں اس نہج سے لکھوائی گئی ہیں جن سے فرقہ واریت کو فروغ ہو رہا ہے خوشی کی بات ہے کہ حکومت نے اس چیز کو محسوس کیا چنانچہ جامعہ بابت اگست ۱۹۶۱ء کے شذرات میں ایک نوٹ ہے کہ ـــــ

"یہ بات اطمینان کی ہے کہ ایک عرصہ کے بعد مرکزی حکومت کو اس خطرناک صورت حال کا احساس ہوا ہے کہ اسکولوں میں تاریخ اور زبان کی جو درسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان سے اتحاد و اتصال کی قوتوں کے بجائے افتراق و انتشار کی قوتوں کو تقویت ملتی ہے اور خاص طور پر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں، اس لئے قومی یک جہتی کونسل کے فیصلوں کو عمل میں لانے کے لئے حکومت ہند نے جو منصوبے سوچے ہیں ان میں جدید درسی کتب اور تاریخ کی کتابوں کی تیاری بھی شامل ہے قومی یک جہتی کانفرنس (سری نگر) کے موقع پر مرکزی وزارت تعلیم کی طرف سے جو نوٹ پیش کیا گیا تھا اس میں یہ بات زور دے کر کہی گئی تھی کہ تاریخ کی کتابیں ایسی ہونی چاہئیں جو خلاف واقعہ تو نہ ہوں مگر ان کو پڑھ کر منافرت کی بجائے یک جہتی کا جذبہ پیدا ہو اور زبان کی کتابیں اس انداز سے لکھوائی جائیں کہ ان میں کسی مخصوص تہذیب کے احیا کا جذبہ شامل ہو"

ہماری ریاست میں ابتدائی درجوں کی درسی کتابیں باغ و بہار ہیں۔ ان کا کاغذ معمولی ہے لکھائی چھپائی تیسرے درجہ کی ہے اکثر جگہ حروف کیا الفاظ بھی غائب ہیں۔ زبان میں ایسے مشکل الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو بچوں کی عمر اور تجربہ کے لحاظ سے ان کی سمجھ سے باہر ہیں، علمی اصطلاحیں بھی استعمال کی گئی ہیں، چوتھی جماعت کی ریڈر میں پروٹین اور وٹامن جیسے لفظ موجود ہیں، بچوں کے لئے کتابیں لکھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے، اس موقع پر محمد حسین آزاد کی بات یاد آتی ہے، انھوں نے کہا تھا کہ پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی کی فرمائش پر

میں نے جو اُردو کی پہلی کتاب" لکھی ہے۔ اس نے میرے دماغ کی چولیں ہلا دی ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے ادبی اُردو ریڈر (آٹھویں جماعت کے لئے) ہے جو محکمہ تعلیمات کی منظورہ ہے اس کتاب کے بعض مضمون نگار ایسے ہیں جو اپنے مضمون سے واقف نہیں مثلاً ایک عنوان "قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب (فن تصویر)" ہے جس میں اجنٹا کی نقاشی کا ذکر ہے' اس میں جگہ جگہ ابہام ہے مثلاً مضمون کی چوتھی سطر میں لکھا ہے کہ :۔

".......اس زمانہ کی رنگیں تصویریں وہی ہیں جو گپھاؤں کی دیواروں کو کھود کر بنائی گئیں ہیں۔ ..."

رنگین تصویریں دیواریں کھود کر نہیں بنائی جاتیں' یہ دیواروں کی سطح پر بنائی گئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر جگہ دیواروں کو کھود کر مہاتما بدھ کی جاتکائیں پیش کی گئی ہیں مگر ان کو سنگ تراشی یا بت تراشی کا اعلیٰ نمونہ کہہ سکتے ہیں' تصویر نہیں کہہ سکتے۔

آگے چل کر گپھاؤں کا ذکر اس طرح کیا ہے :۔

".... ... اجنٹا نامی موضع سے شمال مشرق کی طرف چار میل پر پہاڑوں میں کھدی ہوئی ہیں ...."

اس بیان میں دو باتیں صحیح نہیں ہیں۔ اول یہ کہ اجنٹا موضع نہیں ہے' یہ بہت پرانا قصبہ ہے اور تعلقہ کا مستقر رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ گپھائیں اجنٹا کے شمال مشرق میں نہیں ہیں بلکہ شمال مغرب میں واقع ہیں پھر لکھا ہے کہ ان میں ۲۴ (مٹھ) اور ۵ چیت (وہ شاندار عمارت جس میں مینار ہوتے ہیں) بنے ہوئے ہیں......" اس جملہ میں پہاڑ اور چیت دونوں لفظ صحیح نہیں ہیں۔ دراصل یہ وہارا اور چیتیا ہیں بدھ مت کی مقدس عمارتیں تین طرح کی تھیں اول استوپا' یہ ابتدا میں وہ گول مدفن تھے جہاں مہاتما بدھ کی ہڈیاں یا دانت یادگار کے طور پر محفوظ کئے گئے تھے اور بعد کو پرستش گاہ بن گئے۔

دوسری مقدس عمارتیں چیتیا ہیں' جو عبادت گاہیں ہیں' مضمون نگار صاحب نے اس کی تشریح بھی کی ہے کہ وہ شاندار عمارت جس میں مینار ہوتے ہیں۔ یہ بیان واقعہ کے خلاف ہے' ہندوستان میں بہت جگہ چیتیا موجود ہیں۔ ان میں مینار کہیں نہیں ہیں[1]

تیسری قسم کی عمارتیں "وہارا" ہیں یہ خانقاہیں ہیں' جن میں بھکشو رہتے اور مراقبہ کرتے تھے

---

[1] مینار اس زمانے میں یہاں نہیں تھے۔ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو مینار والی عمارتیں بنائیں۔

اس مضمون میں دو تصویروں کو بھی بیان کیا ہے۔ ایک میں ایرانی سفیر کا حال ہے جو بلوکیشن کے دربار میں آیا تھا اس میں راجا کا نام صحیح نہیں لکھا اس کا نام بلوکیشن تھا بلاکشن نہیں۔

اس مضمون میں زبان کی غلطیاں بھی ہیں مثلاً لکھا ہے "ڈاڑھی مونچھ سب کے تھے" یہ صحیح نہیں۔ داڑھی اور مونچھ دونوں مونث ہیں۔ مضمون نگار صاحب نے اس کو مذکر لکھا ہے۔

اس ریڈر میں ایک مضمون "گولکنڈہ کی تاریخی یادگاریں" ہے۔ لکھا ہے "اسے قلعہ کیا گڑھی کہنا چاہیے" اس جملہ کا مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم جانتے ہیں کہ قلعہ گولکنڈہ دنیا کے تمام قلعوں سے بڑا ہے جو چار میل کے دور میں ہے' اس میں ۸۷ برج ہیں' اس کو گڑھی کہنا اس کی توہین ہے۔

فتح دروازہ کے بیان میں لکھا ہے کہ شاہی محل اور فوج کی قیام گاہیں' مسجدیں' مادنا کا مندر' بارود کے کوٹھے' سلاح خانے' یانار وغیرہ۔ اس دروازے سے ملے ہوئے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے' شاہی محلات' مادنا کا مندر' سلاح خانے' ابراہیم قطب شاہ کی مسجد سب بالاحصار میں ہیں' فتح دروازہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

سلطان قلی قطب شاہ کے بیان میں لکھا ہے کہ :

"......... طرز تعمیر اس کا اپنا تھا۔ اس نے ہندی' ایرانی' اور پٹھان طرزِ تعمیر کو بڑی خوبی سے ایک دوسرے میں سمو دیا تھا ... "

یہ صحیح نہیں ہے' قطب شاہی طرز تعمیر جس کو گولکنڈہ اسٹائل کہتے ہیں۔ بہت بعد کی چیز ہے۔ یہ طرز تعمیر محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوا اور بعد کے فرمانرواؤں نے تکمیل کو پہنچایا۔

قطب شاہی مقبروں کا حال بھی لکھا ہے' فرماتے ہیں :—

"...... اب اس کا نام گنبد پڑ گیا ہے' جیسے دلی میں صفدر جنگ کا مزار مقبرہ کہلاتا ہے ... "

اس بیان میں ابہام ہی ابہام ہے۔ اوّل تو مقبروں کے لئے "اس" کا لفظ صحیح نہیں ہے' اس کی جگہ "ان" ہونا چاہیئے تھا۔ دوسرے دلی میں صفدر جنگ کے مقبرہ کو صفدر جنگ کا مقبرہ کہتے ہیں' صرف مقبرہ نہیں کہتے۔ دلی میں بہت سے مقبرے ہیں جن کے نام صاحبانِ مزار کے ناموں پر ہیں جیسے غالب کا مقبرہ' عیسیٰ خاں کا مقبرہ' خانخاناں کا مقبرہ وغیرہ۔

اس کتاب میں جو مضامین مستند انشا پردازوں کے ہیں' وہ اچھے ہیں نظم کا حصہ بھی اچھا ہے مگر خامیوں سے پاک نہیں۔ بعض نظموں کے آخر میں شاعر کا نام نہیں دیا' برکھا رت کے شاعر کا نام اختر شیروانی لکھدیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

یہ لفظ شیرانی ہے۔ شیروانی نہیں۔ کتابت کی غلطیاں جگہ جگہ ہیں۔ میر تقی میر کی ایک غزل ہے جس میں پانچ شعر ہیں۔ اس کے دوسرے اور تیسرے شعر کے مصرعوں میں "کہ" اور "ہے" غائب ہیں۔ جس سے دونوں مصرعے وزن سے گر گئے ہیں۔

نقشے چھاپنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ ان میں ایک لکیر ذرا ٹیڑھی ہو جائے تو بہت بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں اب تک انگلستان کے مطبوعہ اٹلسوں سے کام لیا جاتا تھا۔ حال میں ایک انگریزی اٹلس "سرسوتی اٹلس" چھپا ہے جس کے ناشر سرسوتی پرکاشم ہیں۔ اس کے ایڈیٹر "کے این ورما ایم اے بی ایچ ڈی (کلارک یو ایس اے) حمیدیہ کالج بھوپال کے پروفیسر اور صدر شعبہ جغرافیہ اور روکرم یونیورسٹی اجین کی مجلس جغرافیہ کے صدر ہیں۔ اس اٹلس پر لکھا ہے:-

MOST EXAUSTIVE AUTHENTIC FIRST

WORLD ATLAS PRINTED IN INDIA.

(یعنی ہندوستان میں چھپا ہوا پہلا جامع اور مستند اٹلس)

یہ اٹلس بڑی شان سے چھپا ہے۔ اس کی چھپائی، ٹائپ اور کاغذ سب اعلیٰ ہیں مگر صحت جیسی ہونی چاہیے تھی نہیں ہے۔ اس کے پہلے صفحہ پر نظام شمسی کے متعلق کچھ خاکے موجود ہیں جن میں دن رات، سورج گرہن، چاند گرہن، مدوجزر کو واضح کیا ہے۔ ان میں ایک نقشہ موسموں کا بھی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس میں سورج کو مدار ارضی کے عین وسط میں دکھایا گیا ہے جو درست نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مدار ارضی بیضوی شکل کا ہے اور بیضوی شکل کے دو مرکز ہوتے ہیں [illegible] کا نتیجہ ہے کہ گرمی کے موسم میں ہم سورج سے کئی لاکھ میل دور ہوتے ہیں [illegible] سورج [illegible] قریب ہوتی ہے (یہ بات بہت کم حضرات کو معلوم ہے) اس اٹلس میں مدار ارضی کے قطر کی [illegible] کے بیچ میں دکھایا گیا ہے جس سے دونوں نصف قطر مساوی ہو گئے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔ ان میں سے ایک کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا بنانا چاہئے تھا۔

افریقہ کے نقشے میں مڈگاسکر کا نام صحیح نہیں ہے۔ اس کو MALAGASY لکھا ہے۔ مڈگاسکر آزاد ہو کر سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ اس میں یہ ذوگذاشت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ آبنائیں تنگ سا ہوتی ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ یہ خشکی کے دو قطعوں کو جدا کرتی ہیں۔ اس اٹلس میں ملایا اور سماٹرا کو ملا دیا ہے۔ اسی طرح سسلی اور اٹلی کو ایک کر دیا ہے۔ کارسیکا اور سارڈینیا بحرہ روم کے مشہور جزیرے ہیں۔ ان دونوں کو بھی ملا دیا گیا ہے۔

بچے ملک کا اثاثہ ہیں۔ ان کی تعلیم پر زیادہ سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

وحیدالنساء

چند دکھنی مرثیہ گو شعرا

دکھنی مرثیوں کی ایک قدیم بیاض [illegible] کچھ عرصہ پہلے [illegible] آچکا ہے۔ جس میں گیارھویں صدی ہجری کے متعدد شعراء کے مراثی [illegible] ۔ [illegible] صاحب صدر، کے ان شعرا میں سے احمد کا انتخاب [illegible] کے مرثیوں کے نمونے پیش کیے جا چکے ہیں۔ اب اسی بیاض سے [illegible] اور شاعر [illegible] انتخاب کر کے ان کے مرثیوں کے نمونوں کو پیش کیا جا رہا ہے۔

پیش نظر بیاض میں سالک کے ۲۵ مرثیے ہیں اور تقریباً ۷۰۰ (سات سو) اشعار اس بیاض میں سالک کے مرثیوں کو ردیف وار جوڑا گیا ہے اور ہر ردیف میں کم سے کم دو یا تین مرثیے ہیں۔

سالک کا نام میر محمد ہاشم تھا اور اس کے والد کا نام سید محمد تھا۔ خود اس کا قول ہے کہ اس نے مرثیوں کا ایک مکمل دیوان مرتب کر لیا تھا۔ چنانچہ کہتا ہے۔

کیا ہے ہاشم سالک خلف سید محمد کا ۔۔۔ رجب میں ختم دیواں کوں دلا مدح فاتحہ خوانی

[illegible]

[illegible]

خلق حسن ہے جو مجھے [illegible]

بیاض میں اس کے نام کے ساتھ [illegible] ۔

یہ بیاض ارکاٹ میں لکھی گئی تھی [illegible] لیکن جنوبی ہند کے کسی بھی علاقے سے اس کا تعلق [illegible] کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کا شاعر اور ایک باکمال مرثیہ گو تھا۔ مرثیہ لکھنا اس کے لیے ایک مذہبی فریضہ تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ جو کوئی حضرت امام حسین علیہ السلام کے غم میں آنسو نہ بہائے یا آنسو بہانے سے منع کرے وہ خطا کار ہے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کا دشمن ہے۔ چنانچہ ایک مرثیہ کا شعر ہے ۔

جو کرتا منع اس غم کوں سوں ہے حسین کا دشمن ۔۔۔ کہتے ہیں غم زدے اس کوں عزا کے بات کا ہے غل

سوا اس کے اس کی زندگی کا کوئی پہلو اس کے کلام سے نمایاں نہیں ہوتا۔ اس کے مرثیوں سے

اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے دوسری اصناف نظم کے مقابلے میں مرثیئے زیادہ لکھے۔ایک جگہ لکھتا ہے۔ع

نت مرثیئے لکھتے رہو شبیر و شبر کے فقط

جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے سالک کو اپنے ہم عصر شعراء میں کئی طرح سے فضیلت حاصل ہے۔اس کے کلام میں فارسی لفظوں کی زیادہ سے زیادہ کھپت ہوئی ہے۔روانی اور سلاست اس کے کلام کی خصوصیت ہے۔اکثر اس نے فارسی ترکیبوں کے ساتھ فارسی مضامین کو بڑی ہی خوبی کے ساتھ باندھا ہے اور لطف یہ کہ اس کے یہاں مقامی رنگ اور ہندی لفظوں کی بھی کچھ کمی نہیں۔ہندی اور فارسی لفظوں کی یہ گنگا جمنی کیفیت اس کے کلام کو بہت پر کیف و پُر درد بنا دیتی ہے۔اندھکار بجائے اندھیرا کتار بجائے خدا۔انجھو بجائے آنسو، ہور بمعنی اور، توں بجائے تو نیر بمعنی پانی۔بسرا دیا بجائے بھلا دیا وغیرہ لفظوں کو بے دھڑک اس نے استعمال کیا ہے جو اس زمانے کے مروجہ لفظ تھے۔لیکن فارسی الفاظ بحر خوں۔باران اشک، مہجور۔دلگیر۔عیار شرف وغیرہ لفظ بھی بے تکلف اس کے کلام میں جگہ پا گئے ہیں غرض اس کے یہاں ہندی اور فارسی کا جو میل ہے۔وہ قابل توجہ ہے۔

میر تقی میر نے اپنے تذکرہ میں ایک شاعر سالک کا نام لیا ہے اور اس کا صرف ایک شعر دیا ہے۔حالات کچھ نہیں لکھے۔شعر یہ ہے ؎

پھروں بے ہوش ہو کہ میں برہنہ پا بہ دل تیرے ــــــ یقیں پوچھوں تمن پیارے کہ سالک کون لبھایا ہے

مولانا عبدالسلام ندوی نے شعر الہند کے حصہ اول میں زبان اُردو کی تاریخ لکھتے ہوئے صفیر بلگرامی کے حوالے سے یوں لکھا ہے۔صفیر بلگرامی نے سعدیؒ دکنی کو غزل کا بانی قرار دیا ہے اور ان کے بعد بہ ترتیب اُردو شاعری کے تین دور قایم کئے ہیں۔

اشرف۔خوشنودی۔احدی۔فضل اور احسن کو پہلے دور میں شمار کیا گیا ہے اور اس کے بعد دوسرے دور میں جعفر، سالک۔لطیفی۔محمودؔ ہاتفی اور ہاشم وغیرہ کو داخل کیا ہے۔مولانا نے مندرجہ بالا شعرا کے کلام سے ایک ایک شعر دیا ہے جس میں سالک کے اسی شعر کو پیش کیا ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ ان شعراء نے زبان میں صفائی پیدا کی اور ہندی کی بجائے فارسی زبان کے الفاظ اور فارسی شاعری کے خیالات اور طرز ادا سے اس کو آشنا کیا۔لیکن راقم الحروف کے نزدیک مندرجہ بالا شعر اس مرثیہ گو شاعر سالک کا ممکن ہے کہ نہ ہوگا۔بہ لحاظ زبان اور طرز تحریر دونوں کے کلام میں بین فرق معلوم ہوتا ہے۔ممکن ہے کہ یہ شعر کسی غزل گو شاعر سالک کا ہوگا کچھ شعر نمونتاً درج کئے جاتے ہیں ؎

ترے عزا میں کھو کے جگت چین یا حسینؓ ــــــ دکھتے ہیں اشکبار سدا نین یا حسینؓ

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر)

اندرجیت دت امرتسری

قسط ۴

یادگارِ رفتگان

حالی ایک نظر میں

اس سلسلہ کی زیر غور قسط کا مسئلہ درپیش آیا تو انتخاب کرنے والے ذہن میں مرحومین کی چھوٹے بڑے رفتگان کے اسم گرامی ابھر کر کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے مجھے تذبذب میں ڈالنے لگے۔ گزشتہ اقساط میں ایک نثر نگار، افسانہ نویس اور شاعر کو پیش کر چکنے کے بعد اب کسے چنا جائے یہ خیال بار بار ناموں کی ترتیب کو درہم برہم کرتا رہا۔ آخر میری نظرِ انتخاب ایک ایسی ہستی پر آ کر رک گئی جس نے نثر اور نظم دونوں میں بدرجہ اتم اردو ادب کی خدمت کی اور دونوں اصناف میں درجۂ کمال تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی تو لیجیے اس قسط میں مولانا حالی پانی پتی کی یاد تازہ کرنے کی سعیٔ ناکام کر رہا ہوں ؎

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر   شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

مختصر حالاتِ زندگی | خواجہ الطاف حسین نام، حالی تخلص۔ ۱۸۳۷ء میں پانی پت کے محلے انصاریاں میں ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا جو لہ بدقسمتی سے تنگ دست و نادار تھے۔ حالی کی ولادت کے تھوڑے ہی دن بعد ان کے والد کا دماغ مختل ہو گیا انھیں نو برس کی عمر میں یتیم کر گئے۔ اب حالی اپنے بڑے بھائی بہنوں کے محتاج تھے۔ اسلامی دستور کے مطابق بچپن ہی میں قرآن شریف حفظ کیا پھر امیر جعفر علی خاں سے ابتدائی فارسی کی تعلیم پائی۔ فارسی کی مناسبت نے عربی کی جانب متوجہ کیا۔ سرپرستوں کے دباؤ پر سترہ برس کی عمر میں شادی کرنی پڑی جسے تعلیم و تدریس میں سدِ راہ سمجھ کر ۱۸۵۴ء میں راہِ فرار اختیار کی اور دہلی جا پہنچے۔ وہاں مولوی نوازش علی خاں سے صرف و نحو اور منطق کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے علاوہ عربی زبان پر عبور حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ۱۸۵۶ء میں کلکٹر ضلع حصار کے دفتر میں معمولی ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے پانی پت لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ متواتر پانچ سال کی بیکاری کے بعد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بچوں کی اتالیقی منظور کی۔ چونکہ نواب موصوف اپنے وقت کے بلند پایہ شاعر اور سخن فہم تھے اس لئے ان کی آٹھ سالہ صحبت نے حالی کو بے پناہ فیض پہنچایا۔ بعد کو غالب کے حلقۂ تلمذ میں آ گئے۔ غالب کے مرنے کے بعد شیفتہ نے ان کی شاعری کا خاصہ اثر چھوڑا لیکن حالی کا عقیدہ تھا کہ شیفتہ صاحب سے زیادہ فائدہ ہوا۔

اس بات کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہوں غالب کا معتقد ہوں مقلد ہوں میر کا

باوجود اس کے حالی نے غالب کی شاگردی کا حق دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ادا کیا - ان کی وفات کے وقت دلی میں موجود تھے اور تجہیز و تکفین میں نمایاں شرکت کے علاوہ جو دلدوز مرثیہ انھوں نے لکھا دوسرے تمام مرثیوں سے کہیں زیادہ پر اثر اور مقبول تھا - بعد کو وہ رائے بہادر منشی پیارے لعل آشوب میر منشی گورنر پنجاب کی سفارش پر گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں انگریزی سے اردو مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ اس دوران میں ان کی واقفیت مغربی مصنفین اور ادبا کے خیالات اور جدید اصول تنقید سے ہوئی - جس کے زیر اثر وہ اپنی شاعری اور تنقید کی بنیاد مغربی طرز پر رکھ کر نیچرل اور قومی رنگ اختیار کر سکے ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر تعلیم پنجاب نے لاہور میں مصرع طرح کی بجائے مختلف مضامین پر شعر گوئی کے مشاعرہ کی بنیاد رکھی جو درحقیقت اردو شاعری کے دور جدید کا آغاز ثابت ہوئے - حالی نے ان مشاعروں میں چند مثنویاں پڑھیں جو اس قدر مقبول ہوئیں کہ انھوں نے قدیم عشقیہ شاعری ترک کر کے جدید رنگ اختیار کر لیا جس کو سارا عمر اپنائے رکھا -

لاہور سے ان کا تبادلہ اینگلو عربک اسکول میں بطور مدرس ہونا ان کی ادبی زندگی کے حق میں رحمت ثابت ہوا - یعنی یہاں پر ان کی ملاقات سرسید سے ہوئی جو بعد میں دوستی کی شکل اختیار کر گئی - سر آسمان جاہ وزیر حیدر آباد علی گڑھ کالج کا معائنہ کرنے آئے تو حالی کو جو کہ وہاں موجود تھے، سرسید کی سفارش پر پچھتر روپے ماہوار کا وظیفہ جاری فرمایا جو بعد میں سو روپے کر دیا گیا - حالی فطری طور پر قانع واقع ہوئے تھے اس لئے وظیفہ ملتے ہی ملازمت سے دستبردار ہو کر پانی پت چلے گئے اور تا دم مرگ تصنیف و تالیف میں لگے رہے - اس طرح انھوں نے اردو ادب کے خزانے کو لبالب بھر دیا - سرکار نے ان کی بے مثل ادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۰۴ء میں انھیں شمس العلماء کے خطاب سے نوازا - آخرکار ۳۰ر ڈسمبر ۱۹۱۴ء کو یہ ستارہ آسمان ادب سے غائب ہو گیا ؎

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

طرز تحریر مولانا کی زبان خاص دلی کی ٹکسالی زبان ہے اور سند کے طور پر پیش کی جاتی ہے - عبارت میں سلاست اور سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے - حاشیہ آرائی اور تکلف سے انھیں سخت نفرت تھی وہ سوچ سمجھ کر الفاظ جمع کرنے کے عادی نہ تھے - بلکہ بے تکلف جو لفظ سجھائی دیتے انھیں ہی سپرد قلم کر دیتے پھر بھی ان کی تحریر میں تناسب اور موزونیت اس قدر ہے کہ اگر ایک لفظ کو ہٹا کر دوسرا چسپاں کرنے کی کوشش کی جائے تو بیکار ثابت ہوگی - وہ اردو ادب میں سوانح نگاری کے موجد مانے جاتے ہیں - اسلوب بیان اور واقعات

پچان بین کی بدولت حالیؔ کو اردو کے بہترین انشا پردازوں میں سرِفہرست رکھا جاتا ہے۔ وہ زبردست نقاد بھی تھے۔ انھوں نے اردو شاعری پر مدلل اور عالمانہ تنقید کی ہے۔ زمانے کے ساتھ انھیں [illegible] کا ہم پایہ مانا جاتا ہے۔ لیکن ان کی تحریروں میں وہ شگفتگی اور دلآویزی نہیں جو شبلیؔ اور آزادؔ کے انداز بیان میں ہے۔ انھیں اپنے معاصرین میں امتیازی درجہ حاصل ہونے کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ باکمال انشا پرداز ہونے کے علاوہ ایک عدیم المثل شاعر بھی تھے۔

سُر تھے وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غُل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے [illegible] ان میں

حالیؔ کا درجہ بطور شاعر

حالیؔ کا درجہ اس صنف میں کیا ہے؟ اس کا اندازہ [illegible] ان کا شہرہ آفاق مسدس مد و جزر اسلام یا مسدس حالی جس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بیسوں ایڈیشن ملک میں شائع ہو چکے ہیں۔ اردو ادب میں حالیؔ کا مسدس [illegible] لیتے سے بہت اوپر مفکر و مصلحین قوم ہوا ہے۔ اگر شاعری میں ان کا موازنہ کیا جا سکتا ہے تو صرف سعدی سے لیکن یہاں سعدی کے کلام میں ندرت، انسانی کی واقفیت بہت [illegible] ایک عیوب بھی ہیں۔ کیونکہ وہ کامل شخص تھے اور دوسروں کو کامل بنانا چاہتے تھے۔ [illegible] ایک کامل انسان ہوتے ہوئے [illegible] کامل بنانا چاہتے تھے۔ حالیؔ کی شاعری میں چند نقائص بھی ہیں وہ کبھی کبھی قواعد و عروض کی پابندیوں سے پہلو تہی بھی کر جاتے تھے۔ ان کے کلام میں آپ کو غیر مانوس اور انگریزی الفاظ [illegible] ملیں گے۔ صحت محاورہ کا بھی کہیں کہیں کم خیال رکھا گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر کمی ان کے کلام میں شاید یہ ہے کہ وہ بے کیف، خشک اور بے مزہ ہے۔ جس کی خاص وجہ ان کی [illegible] تھی اور حتیٰ کی صحت [illegible] اکثر وہ تک بندی پر اتر آتے تھے۔

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں — پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

حالیؔ کا درجہ بطور نثار

اگرچہ ان پر سرسید کی انشا پردازی کا گہرا اثر پڑا لیکن پھر بھی انھوں نے اپنی شخصیت کو برقرار رکھا۔ [illegible] کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سرسید کے اسلوب میں جو نقائص رہ گئے تھے ان کو حالیؔ نے اپنے اسلوب میں [illegible] اور وہ اس طرح [illegible] کا [illegible] نثر کا بہترین نمونہ بن گیا۔ [illegible] عام فہم زبان میں بیان کرتے ہیں [illegible] کی لذت ہی نہیں بلکہ [illegible] تشبیہ [illegible] بجیدہ اور

متانت سے مرصع اور بازاری سوقیانہ مبتذل الفاظ سے پاک۔ طرز نگارش کی آئینہ دار ہے۔ اتنی اعلیٰ ترین خوبیوں کے باوجود اس صنف میں بھی وہ نقائص سے پاک نہیں۔ وہ اکثر ادبی شان قائم نہیں رکھ پائے اور انگریزی زبان تقلید اور الفاظ کا استعمال ضرورت سے زیادہ ہے۔

تصانیف حالی

ان کی تصانیف کی فہرست کافی لمبی ہے۔ یہاں پر چیدہ چیدہ تصانیف کا مختصر احوال پیش کیا جا سکتا ہے۔ نثر میں تریاق مسموم' مجالس النساء مجموعہ مکاتیب حالی' حیات سعدیؒ' مقدمہ شعر و شاعری' یادگار غالب اور حیات جاوید کافی مقبول ہیں۔ نظم میں تنزیات' مناجات بیوہ' چپ کی داد' شکوۂ ہند' مسدس' دیوان حالی اور رباعیات قابل ذکر ہیں۔

۱۔ تریاق مسموم: — اپنے ایک ہم وطن نو عیسائی عماد الدین کے اعتراضات کے جواب میں ۱۸۶۷ء سے قبل لکھی گئی ہے۔

۲۔ مجالس النساء: — ۱۸۷۴ء میں لاہور میں شائع ہوئی جو دو جلدوں میں ہے۔ اس میں مستورات کی زبان اور محاورے برتے گئے ہیں۔ اس لئے تعلیمی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے نہایت کارآمد ثابت ہوئی۔ اور اس کتاب پر ڈائرکٹر ایجوکیشنل دربار دہلی میں چار سو روپے کا انعام بھی ملا۔

۳۔ مجموعہ موسوم بہ حالی: — یہ متفرق' مذہبی' تنقیدی اور علمی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا۔

۴۔ حیات سعدیؒ: — ۱۸۸۶ء میں چھپی۔ اس میں شیخ سعدی شیرازی کی سوانح عمری اور ان کے متعدد سفروں کے حالات' ان کی نظم پر عالمانہ تبصرہ اور ان کی نظم و نثر کا ان کے معاصرین کے ساتھ موازنہ کیا گیا ہے۔ یہ حالی کی سب سے پہلی تصنیف اور ہر لحاظ سے مکمل سوانح عمری ہے۔

۵۔ مقدمہ شعر و شاعری: — جس طرح اردو نظم میں حالی کی مسدس کو شاہکار کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نثر میں یہ کتاب عالمانہ اور فاضلانہ تنقید کا منبع سمجھی جاتی ہے۔ (۲۰) مقدمہ میں مولانا نے وہ مدلل محققانہ اور ناقدانہ بحث کی ہے کہ اردو فن شاعری پر ایسی بلند اور فلسفیانہ تنقید عربی میں ہے نہ فارسی میں اور اب تک دور جدید کے نقادوں کیلئے خضر طریقت بنی ہوئی ہے۔

۶۔ یادگار غالب: — یہ کتاب لکھ کر حالی نے اپنے استاد پر ناقابل فراموش احسان کیا ہے۔ اس میں مرزا غالب کے حالات زندگی ان کے لطائف و ظرائف اور شعری خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اردو تنقیدی کتب میں اہم درجہ رکھتی ہے۔ اگر حالی یہ کتاب نہ لکھتے تو اوروں کی طرح مرزا بھی گوشۂ گمنامی میں پڑے رہتے۔ سچ پوچھئے تو غالب پر جو دوسری کتابیں بعد میں لکھی گئیں ان سب کا ماخذ یادگار غالب ہی ہے۔

۷۔ حیات جاوید:۔ اس میں سر سید کے تمام حالات زندگی مفصل اور مکمل درج ہیں۔ تقریباً ایک ہزار صفحوں پر مشتمل یہ کتاب سر سید کی ملکی، مذہبی، اصلاحی، ادبی اور سیاسی خدمات پر پوری پوری روشنی ڈالتی ہے۔ دراصل اس بارے میں سر سید بڑے خوش قسمت واقع ہوئے کہ ان کی سیرت حالی جیسے سیرت نگار کے ہاتھوں لکھی گئی۔ حیات جاوید میں مولانا نے فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا دیئے ہیں۔

۸۔ مثنویات:۔ یہ حالی کی ان مثنویوں کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے لاہور کے قیام کے دوران میں لکھیں، اور جن کی وجہ سے ان کے طرز کلام میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔

۹۔ مناجات بیوہ:۔ اس میں حالی نے [illegible] عورتوں کی دردناک حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔

۱۰۔ مجالس النساء:۔ یہ کتاب [illegible] عورتوں کی تعلیم کے متعلق ہے۔ جس میں عورت کی خوبیوں اور اس کے فرائض منصبی اور امور خانہ داری کا ذکر کیا ہے۔

۱۱۔ شکوۂ ہند:۔ اس نظم میں اسلام کی گزشتہ شان و شوکت اور [illegible] زوال کا بیان ہے۔

۱۲۔ مسدس۔ المعروف بہ مد و جزر اسلام:۔ حالی کی تصانیف میں سب سے [illegible] تصنیف ہے۔ مسدس [illegible] انداز بیان کی جان ہے۔ یہ قوم کے حال [illegible] کا مرثیہ ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا اور اب بھی ہے کہ تقریباً ہر مسلمان کو اس مسدس کے بیشتر بند حفظ تھے۔ حالی کی شہرت کا دار و مدار بلند پایہ مسدس پر منحصر ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور مابعد متعدد ایڈیشن شائع کئے گئے۔

۱۳۔ دیوان حالی:۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ حالی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ بجائے اس کے اس بارے میں کچھ لکھا جائے چند اشعار جو میں نے انتخاب کر کے یہاں لکھے ہیں [illegible] کی لطف اندوزی [illegible] کی کوشش کروں گا۔

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

———— (۲) ————

پیش از ظہور عشق کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حسن میزباں کوئی مہماں نہ تھا

سچ ہے کہ پاس خاطر نازک ضرور ہے
تھا دل کو جس سے فرق کوئی مہرباں نہ تھا

———— (۳) ————

اے شعر! راہ راست پہ تو جبکہ پڑ لیا
اب راستی کے نہ دیکھ سب [illegible] تو

جو قدر داں ہو اپنا اسے مغتنم سمجھ
حالی کو تجھ سے [illegible] تو

ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا — اس نے نقاب رخ سے ہٹایا نہیں ہنوز
یاں دے چکی جواب امید جواب خط — واں نامہ بر نے بار بھی پایا نہیں ہنوز
کس نشہ سے ہیں چور خدا جانے اس قدر — حالی نے جام منہ سے لگایا نہیں ہنوز

شادی کے بعد غم ہے، تغیر ہی غنا کے بعد — اب خوف کے سوا ہے دھرا کیا رجا کے بعد
ہے سامنا بلا کا پس از عافیت ضرور — ہوتی ہے عافیت کی توقع بلا کے بعد

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے — کل خزاں آ کے بتا دے گی چمن کس کا ہے
ہیں فصاحت میں شبلی واعظ و حالی دونوں — دیکھنا یہ ہے کہ ہے لاگ سخن کس کا ہے

ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی — دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں
حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب — آئے ہو وقت صبح، رہے رات بھر کہاں

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائیگا ہم سے یہ فسانا ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل — ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

اور مرثیہ غالب کے یہ شعر —

کیا کہوں حال درد پنہانی — وقت کوتاہ و قصہ طولانی

بحر ہستی بجز سراب نہیں — چشمہ زندگی میں آب نہیں

[illegible] عرفی و [illegible] طالب مرد — اسد اللہ خاں غالب مرد

بلبل ہند مر گیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات
اس کے مرنے سے مر گئی دلی!!! — خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

مظہر شانِ حسن فطرت تھا معنیٔ لفظ آدمیت تھا

تھا بساطِ سخن میں شاعر ایک ہم کو چالیں بتائے گا اب کون
شعر میں ناتمام ہے حالیؔ غزل اس کی بنائے گا اب کون

۱۴- رباعیات :- [illegible] اخلاق و حکمت اور تصوف کے سرچشمے ہیں نہ صرف ہندوستان میں مقبول ہوئیں بلکہ مسٹر وارڈ نے انگریزی میں ترجمہ کرکے یورپ میں بھی شائع کیا۔

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں شر سے بچیں اور ترک شر [illegible]
جو کہتے ہیں ہم کہ ہے یہ جنت دنیا وہ آئیں اور اس بستی کی سیر [illegible]

--- ([illegible]) ---

عالم ہے نہ شیشہ [illegible] باقی وحشت [illegible] باقی
حالیؔ اب اسی کو بزم یاراں سمجھو یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

(بقیہ مضمون صفحہ نمبر ۱۶ سے آگے)

منت فضل جود کرم ہوں تمہاری ثنا نے سالک کے دست [illegible] کو [illegible]
اے فلک غم کا چند رنگ یوں دکھایا ہائے یوں دل کی کشتی بحر خوں میں [illegible] ہائے یوں
چپ سے کے برسا اشک کا بادل کہتے سالک [illegible] [illegible]
ہے تجھ عزا کوں وہ شرف [illegible] [illegible]
سالک ہوا تیرا گدا توں آج سن اس کی صدا اپنے کرم کی [illegible]
کیا کہہ سکا [illegible] غم [illegible] غم
[illegible] کے مبارک [illegible] [illegible]
جو کرتا ہے سنیع اس غم کو سوں [illegible] [illegible]

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

ادبی تنقید کا تاثراتی نظریہ

تاثراتی ناقدوں کا خیال ہے کہ تنقید کا فن بذاتِ خود ایک مقصود ہے۔ ان کے نزدیک تنقید خود ایک طرز کی ادبی فنکاری ہے۔ سنت بوف (SAINTE-BEUVE) کا خیال ہے کہ تنقید ایک خاص انداز کی شاعری کا نام ہے جس میں دل کی چھپی ہوئی باتیں بالواسطہ کہی جاتی ہیں یعنی تنقید ایک چھپی ہوئی شاعری ہے۔ تاثراتی تنقید کے تین بنیادی اصول واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

(۱) ناقد کا سب سے بڑا سرمایہ قوتِ احساس یا حساسیت (SENSIBILITY) ہے۔ مشہور پیٹر (PATER) لکھتا ہے کہ ناقد ادب کیلئے کسی صحیح و سخت طرز کے حسن کی تعریف درکار نہیں ہے۔ بلکہ ایک مخصوص طرز کا مزاج ناقد کیلئے ضروری ہے جس میں حسین اشیاء کے ساتھ حرکت کی طاقت پوری طرح کارفرما ہو۔

وائلڈ (WILDE) نے صاف الفاظ میں بیان کیا ہے کہ طبیعت ناقد کیلئے نہایت بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ ایک ایسی طبیعت جو حسن سے متاثر ہونے والی ہو۔

عرب ناقدوں نے بھی اس جانب خاص توجہ دی ہے۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ فنکار کیلئے "الطبع" یعنی طبیعت نہایت ضروری ہے۔ مذاقِ طبع میں ادبیت ہونی ضروری ہے۔

(۲) فنکار خود بھی ایک ایسی شخصیت کا حامل ہوتا ہے جو حسن سے تاثر قبول کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی بنا پر خود فنکار کو بھی محدود انداز پر ناقد شمار کیا جاتا ہے۔ بہرحال یہ تصور صحیح نہیں کہ صرف ایک شاعر یا فنکار ہی ناقد ہو سکتا ہے۔

(۳) صحیح معنوں میں ناقد درحقیقت خود ایک فنکار ہے۔ یہ تاثراتی تنقید کا انتہا پسندانہ تاثراتی نقطۂ نظر ہے۔ [illegible] تنقید کا اعلیٰ تصور یہ ہے کہ وہ فن کار کے بارے میں اظہار دینے سے بڑھ کر تاثراتی انداز اختیار کرتی ہے۔ تنقید ذہن کو ایک مصفیٰ و پاکیزہ خیالات کا آلۂ کار بنا دیتی ہے۔ تنقید خود ایک آرٹ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ [illegible] تنقید کا دامن بہت وسیع ہے۔ عربی تنقید تو بڑی حد تک تاثراتی تنقید ہے جو [illegible] کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ عربی کے اثر سے ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کے ابتدائی ناقد [illegible] مولانا شبلی، مولانا آزاد وغیرہ اسی رنگ میں ناقدانہ بحثیں کرتے نظر آتے ہیں۔ تاثراتی

سلسلہ میں مشہور عرب ناقد ابن قتیبہ کا ایک جملہ قابل لحاظ ہے کہ بہترین شعر وہ ہے کہ جس میں تم خود ہر بات اسکو پڑھکر تم پر اتنا شدت تاثر ہو کہ تم اسی شعر کو سب سے بہتر و عمدہ شعر سمجھو ۔ اسی مقولہ کے تحت عرب ناقد محض ایک شعر کی بنا پر کسی شاعر کو "شاعر اعظم" کہہ دیتے ہیں مراد یہ ہوتی ہے کہ اس خاص شعر میں وہ شاعر اعظم ہے اس لئے کہ وہ اس میں تاثر کی عظیم و غیر معمولی کیفیت محسوس کرتے ہیں یہ تاثراتی تنقید کا اثر ہے کہ عرب ناقد تنقیدی بحثوں میں بے شمار منتخب اشعار بھر دیتے ہیں۔

تاثراتی تنقید (IMPRESSIONISM) کا اثر گذشتہ دور کے ناقدوں اور تذکرہ نگاروں کے تنقیدی خیالات پر پوری طرح پایا جاتا ہے ۔ اس نظریہ کے حاملوں کا خیال یہ ہے کہ جب کسی ادیب یا شاعر کی تخلیق پڑھنے کے بعد ناقد کے ذہن پر مختلف طرز کے اثرات مرتب ہوتے ہیں تو ان کو قارئین کے سامنے پیش کر دینے سے اس کا فرض ادا ہو جاتا ہے ۔ ناقد کا سب سے اہم فرض اپنے مطالعہ کے حاصل یعنی اپنے تاثرات کو جمہور کے سامنے پیش کرنا ہے ۔ رہ گئی اس کی زندگی اور اس کا سماج تو اس سے ناقد کو کوئی بحث نہیں ناقد فنکار کی فنی عظمتوں، زبان و بیان کی خامیوں، معانی و الفاظ کے مصائب و محاسن تراکیب و نشست اور تشبیہ و استعارہ کی خوبیوں کو کھل کر بیان کرتا ہے مگر وہ اپنی تنقید کی بنیاد نظریات و اصول پر نہیں رکھتا بلکہ اپنے ذوق جمال اور وجدان پر رکھتا ہے ۔ ایسے تاثراتی ناقدوں کی نگاہیں یا تو خود اپنے شعور پر اکتفا کرتی ہیں یا فنکار کے شعور سے تنقید کی روشنی حاصل کرتی ہیں مگر ادبی تخلیق کا اصل محرک اور عامل یعنی اجتماعی و سماجی شعور کی طرف وہ رجوع نہیں ہوتے جو دراصل فنکار کے ذہن و مزاج کو بناتا اور اس کی تشکیل کرتا ہے۔

ادبی تنقید کا آغاز اگرچہ ناقد کے تاثر اور جذبات سے ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ شخصی جذبہ اور تاثر کا پیمانہ ناقص اور محدود ہوتا ہے اگر اس میں تاریخ کی روشنی، خارجی عوامل، اجتماعی شعور اور حقائق کا عکس شامل نہ ہو ۔ صحیح تنقید کیلئے سماجی زندگی کے آئینہ میں فنکار کے کارنامے اور اسکے ذہنی محرکات کا مطالعہ لازمی ہے ۔

جس طرح فنکار اپنے ذاتی جذبات اور احساسات سے غیر متعلق ہو کر ادبی تخلیق کرنے سے قاصر ہے بالکل اسی طرح ناقد کا حال بھی ہے البتہ دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے وہ یہ کہ تخلیق کے احساسات و جذبات کا فنکارانہ اظہار اسکے فن کی عظمت ہے مگر عظیم ناقد اپنے ذاتی جذبہ اور تاثر کی منزل سے کچھ قدم اور آگے بڑھتا ہے وہ جس ادیب یا شاعر پر تنقید کرتا ہے اور جو تاثرات اپنے اندر اسکی ادبی تخلیق کے بارے میں محسوس کرتا ہے ان کی تحلیل سماجی، خارجی اور دیگر حوال کی روشنی میں کرتا ہے تاکہ وہ حقیقت تک پہنچ جائے ۔

تاثراتی ناقد فنکار کی اس ذہنی فضا کو دوبارہ اپنی تنقید میں پیش کرتا ہے جس میں شاعر نے اشعار لکھے تھے وہ نثر میں پھر سے شاعر کی ذہنی فضا کو مصور کر دیتا ہے۔ جمالیاتی قدروں کی زندگی میں بڑی اہمیت ہے اسلئے ناقد بھی ان اقدار سے اپنی تنقید میں فائدہ اٹھاتا ہے اور کبھی اس راہ سے ادراک حقیقت بھی کر لیتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمالیاتی قدریں فی نفسہٖ قائم نہیں ہوتیں۔ ان کا تعلق دوسرے امور سے بھی ہے اس لئے کہ جذبات و احساسات خارجی عوامل سے اثرات قبول کرتے ہیں۔

داخلی پہلو زندگی کے پہلوؤں میں سے صرف ایک کیفیت کا ترجمان ہوتا ہے اس لئے داخلی تاثر کو ہم کامل نہیں کہہ سکتے۔ اسی بنا پر انفرادی تاثرات تنقید کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں لیکن اگر ان تاثرات کے ساتھ تاریخی، اجتماعی، اخلاقی اور مادی حقائق کا اضافہ کر دیا جائے تب یہ مکمل شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ انفرادی تاثرات پر اصول و نظریات کی بندشیں ضروری ہیں تاکہ وہ بے راہ نہ ہونے پائیں

اگر زندگی کے بنیادی حقائق سے صرف نظر کر کے تاثراتی ناقد کی تنقیدوں کا جائزہ لیا جائے تو اس کے یہاں بڑی رنگین و دلکش زبان، حسن و رعنائی سے پر تشبیہیں اور جاذبیت و کشش سے بھرپور طرز عبارت نظر آئے گی مگر اس کی بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ زندگی اور ادب کے باہمی رشتہ کا ذکر نہیں کرتا بلکہ محض کسی ادبی تنقید کے حسن و قبح پر اکتفا کرتا ہے۔

اسپنگارن - ادبی تنقید میں تاثراتی نقطۂ نظر کا ترجمان ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی ادبی تخلیق کے مطالعہ کے بعد جو تاثرات قلب پر مرتسم ہو جاتے ہیں ان کو وضاحت سے بیان کرنا ادبی تنقید ہے۔ تاثراتی مکتب فکر کی بنیاد انیسویں صدی میں رومانی تحریک کے زیر اثر وجود میں آئی اس دور میں اس کا ترجمان والٹر پیٹر تھا۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ جذبات و احساسات ہی شعر و ادب کی قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ اسپنگارن نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ کسی ادبی تخلیق کو پڑھ کر جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ بذات خود تنقید ہے اور اس سے بہتر تنقید کا کوئی طریقہ موجود نہیں۔ اچھا شعر وہ ہے جو مسرت و نشاط کی دولت سے قاری کو ہم آہنگ کر دے۔

وہ لوگ جو شاعر کی زندگی، تاریخ، سماجی اور اجتماعی حالات کا مطالعہ کرتے ہیں وہ ان ناقدوں کے نزدیک تنقید کے بجائے دوسرے میدانوں میں جا پڑتے ہیں اور صحیح تنقید ان بوجھل پردوں کے نیچے دب جاتی ہے۔

فریدہ زین

فانیؔ ——— الم پرست شاعر

غزل نے ہر تہذیب میں ہمارا ساتھ دیا۔ جسمِ شاعری روحِ غزل کے بغیر سونا لگتا ہے۔ اُردو میں غزل کی اہمیت و معنویت دراصل میرؔ سے شروع ہوئی۔ درد، غم، ہجر کے ہر نے اپنے دیوان کو لافانی بنادیا میرؔ کے بعد غالبؔ تک پہونچ کر غزل نے اپنے لئے دو راستے اختیار کر لیے۔ ایک وہ جس پر وہ روایتی انداز میں خراماں خراماں چلتی رہی اور دوسری وہ راہ جس میں غمِ زندگی اور دردِ جنوں اس کے ہمراز ہو جاتے ہیں۔ انھیں تینوں کا عکس اپنی غزلوں میں ماتے والے بدایوں کے ایک الم پرست شاعر ہیں جو فانیؔ تخلص رکھتے ہوئے بھی فنا نہ ہوئے بلکہ مجسم غم اور پیکرِ درد بن کر غزل کی زندگی پر چھا گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یاد کیوڑے کے کانٹے کی طرح ہمیشہ کھٹکتی ہے ؎

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لئے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

حوادثِ زمانہ قدم قدم پر نت نئے انقلابات لاتا ہے۔ کسی کو غمِ روزگار نے گھیرا تو کسی کو غمِ جاناں نے لوٹ لیا۔ بعض ایسے قیدی بھی ہیں جو بیک وقت دونوں تیروں سے گھائل ہیں۔ یہی زخم جب رِسنے لگتے ہیں تو جذبات الفاظ کا جامہ پہن کر نظروں کے سامنے آتے ہیں فانیؔ نے جذبات کو شاعری اور شاعری کو جذبات بنادیا غم اور قنوطیت نے ان کو نیا انداز بخشا جس نے ان کو نہ سہی لیکن ان کی شاعری کو بڑی حد تک تابناک بنادیا۔ فانیؔ زندگی بھر زمانے سے جد وجہد کرتے رہے مگر نہ زمانہ ان کا ہو سکا اور نہ وہ زمانے کے ؎

اپنی تو ساری عمر ہی فانیؔ گذار دی
اک مرگِ ناگہاں کے غم انتظار میں

فانیؔ غم میں اور غم فانیؔ کی ذات میں سمو گیا تھا۔ فانیؔ نے اپنے دل کے گھاؤ پوشیدہ نہ رکھے مسکراہٹوں کے تلے اسکو روندنا نہ چاہا وہ اپنی شخصیت کی بے باک ترجمانی چاہتے تھے اس لئے ان کی شاعری اور ان کی ذات کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں۔۔

ہم سے فانیؔ نہ چھپ سکا غمِ دوست
آرزو بے نقاب ہو کے رہی

ان کے درد نے قدم قدم پر کروٹ بدلی اور انتہا یہ ہوئی کہ وہ نازک آبگینہ جسے دل کہا جاتا ہے

درد کے قالب میں ڈھل گیا ہے

دل سراپا درد تھا وہ ابتدائے عشق تھی　　انتہا یہ ہے کہ فانی درد اب دل ہو گیا

زندگی کی معمولی سی محرومیوں اور ناکامیوں کو فانی شدت سے محسوس کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خدا کی اس وسیع کائنات کا نایب اکیلا ہے۔ دنیا کے ہنگامے اور ہجوم کا تنہا حریف — ! وہ جس سکون کے لئے سرگرداں تھے وہ ان کو موت میں پوشیدہ نظر آئی —

تعبیر کس نے دی اس خواب پریشاں کی　　ہم مرکے تجھے سمجھے اے ہستی انسانی

یہی وجہ ہے کہ فانی نے قدم قدم پر موت کو آواز دی "موت" ان کے لئے کبھی "نامرادوں کی مراد" تو کبھی "جانِ فانی" اور کبھی "اجل" بن جاتی ہے —

تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد　　مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

فانی کی یاسیت اور قنوطیت نے ان کو وہی درجہ بخشا جو میرؔ کا ہے۔ زندگی ان کی نظر میں غم کی کتاب تھی جسے وہ خون کے آنسوؤں سے تحریر کرتے تھے۔ جس غم پسند دل کو لے کر وہ آئے تھے اس پر گہرا رنگ دنیا کے شاعروں نے بھی لگا دیا تھا "مسرت" کا لفظ ان کے نزدیک دنیا میں شرمندہ معنی نہیں تھا۔ ان کی مدہوشی ہوش کا اثر رکھتی ہے —

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم　　رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

ان کا تصور اپنے اندر تجسس رکھتا ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ فانی کے لئے ایک جنازہ ہر سانس ایک موت ہے — ! —

نامرادی حد سے گذری حال فانی کچھ نہ پوچھ　　ہر نفس ہے اک جنازہ آہ بے تاثیر کا

فانی زندگی کی پیہم مایوسیوں سے تنگ آکر سماج سے روٹھ گئے۔ اپنے محبوب سے روٹھ گئے اپنے خدا سے روٹھ گئے حتیٰ کہ خود سے بھی روٹھ گئے فانی کی الم پرستی میں خارجی حالات کا بھی خاصا دخل تھا —

غم ہائے روزگار سے ممکن نہیں گریز　　یہ بھی ترے ستم میں سموئے ہوئے سے ہیں

محرومیوں نے فانی کے دل میں موت کے سناٹے میں پناہ لینے کی خواہش پیدا کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ محبوب کا تصور موت کے تصور میں مدغم نظر آتا ہے —

ادا سے آڑ میں خنجر کا منہ چھپائے ہوئے　　مری قضا کو وہ لائے دولہن بنائے ہوئے

زندگی کے جس راز کو فانی نے سمجھنے کی کوشش کی اسی میں وہ خود الجھ کر رہ گئے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زندگی کو دیوانے کا خواب اور "نہ سمجھنے کا معمہ" کہا اور ان کے چاک کرتے کا سال دل کی تپش کا

ماجرا، خون کے آنسوؤں کی رنگینی کا بیان میر کے یہاں بھی ہے اور فانی کے یہاں بھی فرق صرف مٹھاس اور تلخی کا ہے۔ میر کے غم کی مٹھاس فانی کے یہاں تلخی سے بدل جاتی ہے۔ شاید یہ فانی کا مخصوص انداز ہو۔ ان کے یہاں جو سوز وگداز، نشتریت، سلاست پائی جاتی ہے وہ انفرادی شان رکھتی ہے ان کو گناہوں کی فرصت تو نہ مل سکی مگر ناکردہ گناہوں کی سزا ضرور ملتی رہی شاید اسی احساس نے ان کو مرگ پرست بنا دیا اور الم ان کا مسلک بن گئی ؎

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے — دھندلی سی میرے دل کی تصویر نظر آئی

ایک بات فانی کو دوسروں سے ضرور ممتاز کرتی ہے وہ یہ کہ فانی کسی شاعر سے قریب ہوں یا نہ ہوں اپنی ذات سے بے حد قریب تھے۔ اس طرز میں ان کی سادگی اور روانی لاجواب ہے ؎

مرکر ترے خیال کو ٹالے ہوئے تو ہیں — ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں
جینے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی — ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

جدید شاعروں میں جن کا رشتہ غالب سے ملتا ہے ان میں حسرت، شاد، اصغر اور فانی کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ جدت ادا میں فانی غالب سے خاص مطابقت رکھتے ہیں۔ میر کی طرح اپنے زخم کا حال سادگی سے بیان نہیں کرتے بلکہ ان کی سادگی میں بھی پرکاری پائی جاتی ہے اسی لئے لوگ ان کے دل کو میر کا دل اور ان کے دماغ کو غالب کا دماغ کہتے ہیں۔ گویا میر اور غالب کی روحیں یکجا ہو کر فانی کے قالب میں ڈھل گئیں

"غم" فانی کی زندگی ہے اس کا زہر ان کی رگ رگ میں سرایت کر گیا ہے۔ اس غم نے ان کو جو جلا بخشی ہے وہ بہت کم شعراء کے حصے میں آئی ہے۔ یاسیات کا یہ امام اپنے سینے میں حزن وملال کا بے پایاں دریا رکھتا ہے، ان کی ہستی غم کی گود میں پلی ان کی شخصیت غم کے سانچے میں نکھری وہ غم سے گھبراتے نہیں بلکہ اس سے لطف اٹھاتے ہیں اور اسی کے طلبگار ہیں ؎

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول — تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا
ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی — زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

وطن کی جدائی کا احساس فانی جیسے انسان کے لئے سخت تکلیف دہ تھا یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی غربت پر آنسو بہاتے ہوئے کہہ اٹھتے ہیں ؎

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن — غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

زندگی کے نشیب وفراز فانی کی جہاں دیدہ نظروں سے چھپ نہ سکے۔ دنیا کے ہولناک سمندر میں وہ اپنی کشتئ حیات کو طوفان کے جھکولوں سے بچاتے بغیر ناخدا کی مدد سے بے نیاز آگے بڑھتے جا رہے ہیں

کیونکہ وہ جانتے ہیں سے

ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانیؔ　　ہم نہ ہونگے وہ دن بھی دور نہیں

ذوقؔ نے موت وحیات کا راز یوں سمجھایا ؎

اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

فانیؔ نے بھی اتنا کہدیا ؎

دُنیا میں حال آمد و رفت بشر نہ پوچھ　　بے اختیار آ کے رہا بے خبر گیا

تصوف فانیؔ کے پاس تغزل کی خصوصیت نہیں بنتا مگر جو بھی اشارے ہیں وہ سطحی نہیں اپنے اندر بے پناہ تڑپ رکھتے ہیں سے

میری نظر کی آڑ میں ان کا ظہور تھا　　اللہ ان کے نور کا پردہ بھی نور تھا

فانیؔ نے غم کے ہر جذبہ کی تہہ کی اسکی تلخیوں کو ہر حال میں گوارا کر لیا انھوں نے محسوس کیا گویا وہ غم کے لئے ہی جی رہے ہوں سے

یوں نہ کسی طرح کٹی جب مری زندگی کی رات　　چھیڑ کے داستان غم دل نے مجھے سلادیا

"روداد زندگی" فانیؔ کے نزدیک "درد مسلم" ہے جس کا علاج نامعلوم ہے سے

یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانیؔ　　وجود درد مسلم، علاج نامعلوم

قید حیات و بند غم غالب کے نزدیک ایک ہے اور موت سے پہلے اسکا پیچھا چھڑانا ناممکن ہے۔ مگر فانیؔ موت کا اختتام زندگی نہیں سمجھتے بلکہ ان کا خیال ہے سے

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قید حیات　　مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

فانیؔ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا دل جس انداز سے اجڑ گیا اس کا بسنا سہل نہیں اس لئے وہ اپنا ٹھکانہ دور تلاش کرتے ہیں سے

جی ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور　　اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور

"دُنیا کو در زندان" سے تشبیہ دینا فانیؔ کے بس میں ہے۔ کتنے لطیف پیرائے میں کس قدر چبھتا ہوا طنز کرتے ہیں سے

فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں در زندان کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہونچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

بعض جگہ ان کے یہاں اُمید و بیم کا ہلکا سا پہلو بھی مل جاتا ہے سے

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی   گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

زندگی کا ہر قدم وہ تنہا اٹھاتے رہے اور جب تھک گئے تو یاد آیا کہ ؎

تنکوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم   آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ فانی کی یاسیت ان کی عصبیت کو کم کرتی ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا غم ان کا ذاتی غم نہ تھا بلکہ ماحول کا غم تھا۔ اجتماعی زندگی کی تلخیاں اور محرومیاں تھیں ا رہیں غم ان کے ذاتی غم میں سما کر اشعار کے سانچے میں ڈھل گیا۔ ان کی شاعری موت و الم کی شاعری ضرور ہے مگر فن اور زبان کا احترام انہوں نے ہمیشہ کیا۔ یہ صحیح ہے کہ میر تک پہونچنے کے لئے فانی کے راستے سے گذرنا ضروری ہے۔

فانی کو مجسم غم سمجھنے کی بات اس قدر عام ہے کہ فانی کے نام کے ساتھ ہی اس شخص کا تصور ابھرتا ہے جو زندگی بھر مایوسیوں سے اپنا دامن بھرتا رہا اور جاتے جاتے یہ کہہ گیا ؎

دو تین ہچکیاں ہی دم نزع کہہ گیا
شرحِ درازِ زندگی مختصر کو میں

(بقیہ صفحہ ۲۸ سے آگے)

اس طرح چلم بھر کر اعزاز و افتخار حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حد یہ ہے کہ چلم سے پہلے بھی ذہانت پر انعام پاتے ہیں چلم بھرنے سے گنج اہل کا کل مانے جاتے ہیں۔ اس نظم کی تان اس پہ ٹوٹتی ہے۔

مصیبت میں نہ کام آتی ہیں تقدیریں نہ تدبیریں   چلم بھرنے میں ماہر ہوں تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

باپا صاحب نے ایسے موضوع کو اپنا کر چونکایا ہے جو بظاہر عام ہے لیکن اس کو دیکھنے کیلئے بصیرت کی اور اس پر عمل کرنے کیلئے ذہانت کی ضرورت ہے۔ باپا صاحب طنز کرنے کا اچھا ملکہ ہی نہیں رکھتے بلکہ شعر گوئی پر بھی قادر ہیں۔

اطلاع

ماہ مئی ۱۹۷۹ء کے سب رس میں پرنس نواب سعادت جاہ بہادر کی جو غزل شائع ہوئی ہے اس کے آخری شعر کو قبل مقطع یوں پڑھا جائے جو نقل کی غلطی سے کچھ اور ہو گیا و ہو ہذا ؎

زبس رنج مُبدائیہائے آناں
کہ تادی مُقدم اینان ندارد

براہ کرم ناظرین تصحیح فرمالیں۔

ڈاکٹر محمد عبدالمنان

عہدِ بہمنیہ کا نظامِ تعلیم

تاریخ وسیع معنوں میں فرد اور قوم کی ہمہ جہتی زندگی سے بحث کرتی ہے۔ اس کا موضوع ہر دور کے سیاسی حالات، بادشاہوں کی فتوحات، درباری ریشہ دوانیاں اور سازشیں اور حیاتِ اجتماعی کے تمدنی، علمی اور ادبی پہلو ہوتے ہیں۔ اس طرح تاریخ اس دور کی پوری زندگی پر محیط ہوتی ہے۔ مورخ اس دور کے سیاسی حالات اور خارجی اثرات کے پس منظر میں روحِ عصر کو پیش کرتا ہے۔ تاریخ صحیح معنوں میں کسی قوم کی سیاسی، مادی، ذہنی اور تمدنی ترقی کی سرگزشت ہوتی ہے۔ قدیم فارسی تاریخیں اس معیار پر پوری نہیں اترتی ہیں۔ ان سے عہدِ وسطیٰ کی اجتماعی زندگی کے تمدنی اور علمی پہلو روشن نہیں ہوتے کیونکہ یہ تاریخیں صرف بادشاہوں کی زندگی کے حالات، ان کی فتوحات اور درباری زندگی کا مرقع پیش کرتی ہیں ان کی تاریخ نگاری کا محور اور مرکز خودمختار اور مطلق العنان بادشاہوں کی زندگی اور کارناموں (خصوصیت سے ملک گیری اور کشورکشائی) کی نقاب کشائی ہوتا ہے۔ فرد اور قوم کی حیاتِ اجتماعی کے اہم پہلو سے یکسر تشنہ ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں تحریر کی روانی اور اندازِ بیان کے جوش میں جستہ جستہ حوالے ملتے ہیں۔ ہمارے لیے مآخذ کا کام یہی مبہم اور دھندلے اشارے دیتے ہیں۔ ان ہی جزئی امور اور غیر مربوط اشاروں کو یکجا کر کے قرونِ وسطیٰ کے حیاتِ اجتماعی کے اس اہم پہلو یعنی تعلیمی حالت کا خاکہ تیار کرنا پڑتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ اقتدار کی سیاسی تاریخیں بہت لکھی گئیں لیکن علمی تاریخیں بہت کم لکھی گئیں۔ یہ اس دور کا بڑا المیہ ہے۔ اسی بنا پر ہندوستان میں مسلمانوں کے علمی کارنامے بہت ماند نظر آتے ہیں۔ آج بیرون ملک اور اندرون ملک مسلمان بادشاہ جنگجو اور خون ریز نظر آتے ہیں۔ درآنحالیکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ ان بادشاہوں کے دورِ حکومت کے سیاسی اور کشورکشائی کے کارناموں کے علاوہ تمدنی اور علمی پہلو بڑی اہمیت رکھتے ہیں ہندوستان میں مسلمانوں کے مدرسوں اور درسگاہوں کا حال کہیں کسی کتاب میں مستقل عنوان کے تحت نظر نہیں آتا۔ پرانے مورخین کیلئے بادشاہوں کی لڑائیوں اور درباریوں کے تماشوں کے سوا قوم کے تمدنی اور علمی حالات میں جاذبیت اور کشش نہیں ہوتی تھی۔ اسی بنا پر یہ تاریخیں اس قسم کے مفید معلومات سے ایک حد تک تشنہ تھیں۔ آثار اور قرائن کی بنا پر ہم اس دعویٰ میں حق بہ جانب سمجھے جا سکتے ہیں، اگر یہ کہیں کہ قدیم تاریخیں تمام پہلوؤں پر جامع لکھی

جاتیں تو عہد وسطیٰ کے علمی کارنامے وسیع اور روشن ہوتے۔ چنانچہ سلطان محمد بن تغلق کی تعلیمی سرپرستی کے متعلق ایک مصری مورخ کا بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے وہ لکھتا ہے :-

"صرف ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی میں اس وقت ایک ہزار مدرسے موجود تھے جن میں سے ایک شافعیوں کا اور باقی سب حنفیوں کے تھے"

اسی طرح فیروز تغلق کو بھی علوم و فنون کی اشاعت سے خاص شوق تھا۔ اس کی سرپرستی اور فیاضی نے پایۂ تخت کو ایک دار العلم کی حیثیت عطا کر دی تھی۔ ان تمام امور سے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ جن کثیر و متنوع اجزا پر مشتمل تھی ان میں تعلیم و تدریس کا شعبہ خاص طور پر اہمیت رکھتا تھا۔ علم کی قدر دانی اور تعلیم کی اشاعت صرف دہلی تک محدود نہیں تھی بلکہ شمالی ہند کے جس گوشے میں قدم پہونچے اور ان کی سلطنتیں قائم ہوئیں اس ملک کا ذرہ ذرہ ترقیوں کا آفتاب بن کر چمکا .... اور ان نے شمال کے سلاطین کی علم دوستی اور معارف نوازی کی روایات کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ پروان چڑھایا۔

دکن میں بہمنی سلطنت کے قیام سے علمی و تمدنی ترقیوں کا ایک باب کھل گیا۔ اس سلطنت کے سیاسی فتوحات کے علاوہ علمی اور تمدنی کارنامے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں پوری قلمرو میں درس و تدریس کا بازار گرم ہوگیا۔ ہر مقام پر چھوٹے اور بڑے مدارس قائم ہوگئے جہاں پر تشنگان علم کے لئے ہر قسم کی سہولتیں اور آسانیاں میسر تھیں۔ سلاطین کی قدر شناسی، حوصلہ افزائی اور خوب سے خوب تر کی جستجو نے دکن کو علم و فن کا مرکز بنا دیا تھا۔ دوسرے ممالک کے ارباب کمال اور صاحبان علم و فن کے فیضان نے پایۂ تخت کو دار العلم کی حیثیت عطا کر دی تھی۔ اس دور کی تعلیمی ترقی کا جائزہ حسب ذیل نقاط نظر سے لیا جا سکتا ہے :-

(۱) بادشاہوں کی سرپرستی (۲) امراء اور وزراء کی دلچسپی و قدر افزائی

(۳) صوفیہ اور بزرگان دین کی علمی اور دینی خدمات۔ مذہبی اداروں یا قائدین [illegible] کی ساعی جمیلہ

عہد وسطیٰ سے عہد حاضر تک ہندوستان میں تعلیمی کوششیں انہی تین اداروں کی [illegible] رہی ہیں اسلئے بہمنی دور کے کارناموں اور تعلیمی خدمات کو متعین کرنے کے لیے ان اداروں کی روشنی میں ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) سلاطین بہمنیہ کی سرپرستی: سلاطین دکن پر بہمنیوں [illegible] اور [illegible] تک [illegible] بادشاہ [illegible] پاتے تھے۔ [illegible] کی توانائیاں یا تو سرحدوں کی حفاظت یا ملک گیری میں صرف ہوتی تھیں یا اندرونی ملک [illegible] [illegible] بیرونی

۱؎ صبح الاعشیٰ قلقشندی .... صفحہ ۶۹

عناصر بھی زیادہ شریک تھے اور ان کی وجہ سے سیاسی رقابت اور کشمکش کا سامان پیدا ہو گیا تھا۔ سلطنت کی سیاست متوازن نہ ہونے کی بناء پر دربار ریشہ دوانیوں اور سازشوں کی جولانگاہ بن گیا تھا۔ ایسی سیاسی ابتری اور انتشار کے باوجود بہ حیثیت مجموعی علم کی اشاعت بہمنیوں کے زمانے میں خوب ہوئی۔ سلاطین بہمنیہ ذی علم، صاحب ذوق اور اہل کمال کے بڑے قدرداں تھے۔ ان میں اکثر فارسی، عربی اور ترکی زبان پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔ اسی بناء پر ان کے زمانے میں فارسی اور عربی زبان کی تعلیم کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ شاہزادوں کی تعلیم و تربیت لائق اساتذہ کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ رعایا کیلئے قلمرو میں جگہ جگہ مدارس قائم کر دیے تھے۔ اسی بناء پر ان کے سیاسی کارناموں کے علاوہ تعلیمی فتوحات کا پہلو بھی زیادہ روشن ہے۔ وہ علمی ذوق و شوق کے لحاظ سے روشن خیال اور بیدار مغز بادشاہ تھے وہ علم کی روشنی اپنی مملکت کے دور دراز گوشوں تک پہونچانا چاہتے تھے۔ ان بادشاہوں میں بعض تو ایسے تھے جو تعلیمی نظام میں خود حصہ لیتے تھے اور اپنے مبلغ علم سے دوسروں کو فائدہ پہونچاتے تھے جس کی مختصر تفصیل ذیل میں بیان کیجاتی ہے :-

علاء الدین حسن بہمن شاہ کو علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ عالموں اور فاضلوں کی بڑی قدر کرتا تھا۔ عبدالجبار ملکاپوری[1] نے بحوالہ ملحقات عین الدین گنج علم لکھا ہے کہ اس نے دکن میں عربی اور فارسی کی تعلیم کو پھیلایا۔ شاہزادوں[2] کی تعلیم کا بھی عمدہ انتظام کیا تھا جن کو فارسی کی معیاری کتابیں مثلاً گلستاں و بوستاں پڑھائی جاتی تھیں۔ نونہالان ملک کیلئے مملکت میں مدارس قائم کئے گئے۔ نادار طلباء کیلئے وظائف اور اساتذہ کے لئے مشاہرے مقرر کئے گئے۔ چنانچہ ۷۵۰ھ میں بادشاہ کے حکم[3] کی بناء پر صفدر خاں سیستانی صوبہ دار برار نے ایلچ پور میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ مدرسہ میں مولانا محمد ابراہیم سندھی اور مولانا محمد یحییٰ سندھی استاد مقرر ہوئے۔ یہ مدرسہ ایلچ پور کی جامع مسجد میں تھا۔ طلباء اور اساتذہ کی رہائش کا انتظام بارگاہ کل المعروف بہ بجر کل میں کیا گیا تھا جو مسجد کے عقب میں تھا۔ طلباء کو خوراک و پوشاک وقف سے ملتی تھی اساتذہ و متعلقین مدرسہ کی تنخواہ سرکاری خزانے سے دیجاتی تھی۔ مدرسہ میں سو طلباء رہتے تھے اور سو طلباء غیر مقیم تھے۔ بادشاہ نے سالانہ تیس ہزار ہون آمدنی کی جاگیر اس مدرسے کیلئے وقف کر دی تھی۔ اسی طرح دولت آباد، گلبرگہ اور دوسرے صوبہ جات میں بھی مدرسے قائم تھے جہاں فارسی اور عربی کی تعلیم ہوتی تھی۔

محمد شاہ اول خود بھی عالم تھا اور تعلیم سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے ملک میں تعلیم کی اشاعت کیلئے اپنے باپ سے زیادہ کوشش کی اور ولی عہد کو جید علماء سے تعلیم دلائی۔ مجاہد شاہ ترکی، عربی اور فارسی زبان کا ماہر تھا اس کا اور داؤد شاہ کا زمانہ بہت مختصر رہا۔

---

[1] محبوب الوطن (تذکرہ سلاطین دکن) حصہ اول ... صفحہ (۹۳) [2] علاء الدین حسن کو شاہزادوں کی تعلیم کا اس قدر خیال تھا کہ بستر مرگ پر ان کو بلا کر ان کی تعلیمی ترقی کے متعلق استفسار کیا اور چھوٹے لڑکے محمود خاں نے گلستاں کی ایک حکایت سنائی تو بے حد متاثر ہوا۔

[3] محبوب الوطن ... صفحہ (۹۳)

حوالہ ۱

محمد شاہ ثانی کے زمانے میں تعلیم کے شعبے کو بے حد ترقی ہوئی۔ اس کا دورِ حکومت ... گیا۔ اس نے ملک کے تمام قصبوں میں رعایا کی تعلیم کے لیے مدارس کھولدیئے تھے جہاں غریب اور نادار طالب علموں کو مفت دی جاتی تھی۔ اس کو یتیموں کی تعلیم کا خاص خیال رہتا تھا۔ ان کی مدت تعلیم ... اور خوراک کا حکومت کی طرف سے انتظام تھا۔ تمام اخراجات تعلیم کی تکمیل شاہی خزانے سے ہوتی تھی چنانچہ اس کے زمانے میں ایسے مدارس حسب ذیل مقامات پر قائم تھے۔

گلبرگہ۔ قندھار۔ بیدر۔ ایلچ پور۔ دولت آباد۔ چاؤل۔ دابل۔ جنیر۔

تعلیم و تدریس کیلئے لائق اساتذہ مقرر تھے جن کو معقول ماہانہ تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں قندھار کے مدرسۂ محمود شاہی نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس کے علاوہ اس نے ملک میں جا بجا مدرسین اور واعظین مقرر کئے تھے تاکہ وہ لوگوں میں مذہبی تعلیم کی اشاعت کریں۔ رعایا کی تعلیم کا اس کو اس قدر خیال تھا کہ مدرسین اور واعظین کے کاموں کی نگرانی کیلئے نگرانکار مقرر تھے جو وقتاً فوقتاً حکومت کو خبر دیتے تھے۔ محمد شاہ ثانی کی اشاعت تعلیم کی روایت نے فیروز شاہ کے زمانے میں ترقی کی۔ بادشاہ خود دینی علم اور تفسیر، اصول، حکمت طبعی اور ریاضی سے خاص طور پر دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے ملک میں جا بجا مدارس قائم کئے اور جدید مساجد تعمیر کر کے ان میں تعلیم کا انتظام کیا وہ خود ہفتہ میں تین دن شنبہ، دوشنبہ اور چہارشنبہ درس دیا کرتا تھا۔ زاہدی، شرح تذکرہ فن ریاضی میں، شرح مقاصد علم کلام میں، اقلیدس ہندسہ میں، مطول علم معانی و بیان میں بادشاہ کے درس کی خاص کتابیں تھیں۔ اگر اتفاق سے بادشاہ کو دن میں فرصت نہیں ملتی تھی تو رات میں طالب علموں کو بلاتا اور ان کو حسب معمول سبق دیتا اور اپنی معلومات سے مستفید کرتا تھا۔ ملک میں جو تعلیم کے قدیم ادارے قائم تھے نہ صرف انھیں حسب دستور قائم رکھا بلکہ نئے مدارس کا اضافہ کیا۔ اس کی قدر دانی کی بنا پر ایران اور مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک سے علم و فن کے کاملین جمع ہو گئے تھے جن کے فیضان سے بہرہ یاب ہونے کے لیے تشنہ کامان علم دور دراز مقامات سے کشاں کشاں چلے آتے تھے۔ فیروز شاہ کے بعد احمد شاہ اول کے زمانے میں تعلیم کی سرگرمی جاری رہی۔ احمد شاہ کو بھی علوم و فنون سے شغف اور رعایا کی تعلیم کا بے حد خیال رہتا تھا۔ پایۂ تخت میں بادشاہ کی قدر دانی کی بنا پر ملک اور بیرون ملک سے صاحبان فضیلت اور ارباب کمال جمع ہو گئے تھے چنانچہ سید السادات سید حنیف، شاہ خلیل اللہ کرمانی اور ان کے تین فرزند میر نور اللہ، میر محب اللہ، میر حبیب اللہ، قاضی احمد مقبول جیسی خیر و نظر رکھنے والی نامور ہستیاں اپنی تعلیم سے لوگوں کو بہرہ ور کر رہی تھیں جن کی روحانیت اور تقدس کی دور دراز ممالک تک شہرت تھی۔ علم و ادب سے دلچسپی کی بنا پر محمد بن ابی بکر المخزومی الدمامینی، شیخ آذری، شیخ حبیب اللہ جنیدی، میر شمس الدین قمی، خواجہ عماد الدین سمنانی، سیف اللہ حسن آبادی، سید عبد المومن بنیرۂ مخدوم جہانیاں، میاں محمود نظام الملک اور خواجہ اردستانی جیسے نامور علم و ادب

۱؎ تاریخ قندھار دکن ... صفحہ (۴۴)

پایۂ تخت میں جمع ہوگئے تھے۔ ان کی موجودگی ہی پایۂ تخت کے عام ذہنی افق کو بلند کرنے اور علمی ماحول پیدا کرنے کیلئے کافی تھی۔ ان بزرگوں کا اجتماع خود بادشاہ کے تعلیمی کارناموں اور علمی خدمات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ بحیثیت مجموعی اس کے زمانے میں تعلیم کے مختلف شعبوں میں حیرت انگیز ترقی ہوئی احمد شاہ اول کے بعد دوسرے سلاطین کے زمانے میں بھی اشاعت تعلیم کی یہ روایت بدستور باقی رہی۔

علم کی روشنی پھیلانے میں کتب خانوں کا بھی بڑا حصہ ہوتا ہے چنانچہ ان علم دوست بادشاہوں کے زمانے کے ایسے دو کتب خانوں کا حوالہ ملتا ہے۔

(۱) سلاطین بہمنیہ کا شاہی کتب خانہ　　(۲) بیجاپور کا کتب خانہ

ان میں سے شاہی کتب خانے کی تفصیل عبد الجبار ملکاپوری نے محبوب الوطن طبقات ناصری اور تحفۃ السلاطین مصنفہ ملا داؤد بیدری کے حوالے سے دی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ کتب خانہ بلحاظ تعداد کتب اہمیت نہیں رکھتا تھا لیکن ندرۃً جواہر کا خزانہ تھا۔ فیروز شاہ کے زمانے میں یہ کتب خانہ نفیس اور نادر کتابوں کی بنا پر عجائب خانہ بن گیا ایران سے نادر کتابوں کے نسخے منگوا کر شاہی کتب خانے میں داخل کئے جاتے تھے اس کے بعد جوں جوں سلطنت کو زوال ہوتا گیا کتب خانے کی کتابیں تلف ہونے لگیں۔ چنانچہ عبد الجبار ملکاپوری نے اس کتب خانے کا ایک خوش خط اور مطلا قرآن شریف کا نسخہ نواب شمس الامراء کے کتب خانے میں دیکھا تھا جس کی خاص خوبی یہ تھی کہ وہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے دست مبارک کا لکھا ہوا تھا۔

(۲) وزراء اور امراء کی تعلیمی دلچسپی کسی ملک کی [illegible] زندگی کا [illegible] اور اعیان سلطنت کی شخصیت ہوتی ہے [illegible] بہمنیہ دور کی علمی تاریخ دو نامور وزراء کے نام پیش کرتی ہے جن کی [illegible] کوششوں سے مملکت میں تعلیم کی اشاعت کا ایک [illegible] باب شروع ہوا۔ بہمنیہ سلطنت کے ابتدائی دور کی تعلیمی کوششیں میر فضل اللہ [illegible] کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھیں۔ علامہ [illegible] تفتازانی کے نامور شاگرد نے سلطنت کی [illegible] ایک عالم [illegible] کی خدمات کامیابی سے انجام دیں۔ ان کی عملی زندگی کا آغاز ایک عالم کی حیثیت سے ہوا [illegible] علوم [illegible] کی اشاعت [illegible] علمی تعلیم [illegible] کی خدمات بہمنیہ سلطنت کی سیاست [illegible] امتیازی مقام رکھتی ہیں [illegible] نامور [illegible] کے زمانے [illegible] محمد شاہ ثانی کے عہد میں خواجہ [illegible] بادشاہ [illegible] امراء [illegible] سے ظاہر ہوتا ہے کہ

[illegible] صفحہ ۳۹۳　　[illegible]

[illegible]

[illegible]

مملکت میں اشاعت تعلیم کا کام بھی اس کے پیش نظر تھا۔ محمد شاہ ثانی نے مملکت کی تعلیمی سطح بلند کرنے کے لیے اشاعت تعلیم کا جو منصوبہ
تیار کیا تھا اسکو عملی جامہ پہنانے کا کام اسکے ذمہ تھا۔ بادشاہ کی ایماء پر اس کام کیلئے موزوں اور مناسب شخص تھا۔ اس نے
صرف سلطنت کے اہم شہروں اور قصبات میں تعلیم کی اشاعت کیلئے لائق اساتذہ کو مقرر کیا بلکہ بیرون ہند سے خصوصاً ایران
اور ماوراء النہر سے عالموں کو بلایا تاکہ دکن کی علمی سطح بلند ہو۔ [illegible] انہوں نے شاہزادوں کو بھی اعلیٰ تعلیم کے زیور سے
آراستہ کیا چنانچہ اس نے فیروز شاہ اور احمد شاہ کو اعلیٰ تعلیم دی۔ یہ اسی کا فیضان تھا کہ ان دونوں نے اپنی بادشاہت
کے زمانے میں علم و فن پر بھی حکمرانی کی [illegible] خصوصیت [illegible] محمود گاوان کی ہے جو آج بھی [illegible] مکمل [illegible]
ایک درخشاں مینار کی طرح بلند ہوتی ہے۔ [illegible] اور [illegible] کوشش کی نظیر ہندوستان کی علمی تاریخ پیش [illegible]
قاصر ہے۔ مدرسہ محمود گاوان اسکے بے پایاں علمی ذوق اور [illegible] کی خیر خواہی کا [illegible] ہے۔ اسکی دلی آرزو تھی
اس درسگاہ کو [illegible] اور مقتدر کے اعتبار سے بین الاقوامی مقام عطا کرے۔ اسی بنا پر اس نے علم و فن کی [illegible]
کو دکن آنے کی دعوت دی۔ [illegible] پر معاشی [illegible] کرتے ہیں [illegible]
زمانے کے نامور عالم اور مذہبی ادب [illegible] جامی [illegible] کو اس کی صدارت کیلئے [illegible]
[illegible] بدقسمتی [illegible]
دکن تشریف [illegible] اللہ [illegible]
آپ خواجہ نے اس مرکز علوم و فنون کو [illegible] اصلی [illegible] ۸۸۶ھ میں [illegible] اس اعتبار
اسکو صرف دس سال تک مدرسہ کی خدمت کرنے [illegible] میں [illegible] کی آمدنی کی جاگیرات اور
مختلف عطیات مدرسے کیلئے وقف تھے جس کے ذریعے سے دکن کی اس بے مثال درسگاہ کے اخراجات اور طلباء کے طعام
لباس اور بود و باش کے مصارف ادا ہوتے تھے۔ ہزاروں اشرفیاں سالانہ [illegible] کے [illegible] علما کی نذر ہوتے تھے علماء اور
فضلا کی نشست کیلئے بالائی عمارت کے کمرے مقرر تھے۔ دوسری اور تیسری منزل کے وسطی کمرے طلبا کے لیے وقف تھے۔
بعض درجوں میں علوم دینیات کے درس کی نشستیں تھیں اور [illegible] میں حفاظ تجوید قرآن اور حدیث کے طالب علم رہتے تھے
اور یہاں روزانہ صحیح بخاری شریف کا درس بیان [illegible] تھا۔ [illegible] درجوں کے طلبا [illegible] باقاعدہ [illegible] درس [illegible] تھے۔
ایسے طلبا موید کہلاتے تھے۔ طلبا اور اساتذہ کے طعام و قیام کے مصارف خواجہ اپنی ذاتی آمدنی سے ادا کرتا تھا۔ [illegible]
[illegible] صرف ہوتا تھا۔ وہ خود بھی فرصت کے اوقات اسی مدرسے میں گزارتا تھا جہاں [illegible] کے ماہرین سے

تاریخ [illegible] جلد اول مقالہ سوم صفحہ ۳۰۲

PRO[illegible] [illegible] 4G [illegible] [illegible] DECCAN HISTORY CONFERENCE

استفادہ کرتا اور خود بھی طالب علموں کو اپنی معلومات سے فائدہ پہونچاتا تھا۔ اس مدرسے میں نادر کتابوں کا ایک کتب خانہ بھی تھا جہاں تین ہزار کتابیں تھیں۔ یہ سب کتابیں خواجہ ہی کی ملک تھیں اس طرح خواجہ نے مادی، مالی اور روحانی طور پر اپنی شخصیت کو مدرسہ میں ضم کر دیا تھا۔

مدرسہ کے نصاب تعلیم سے متعلق کوئی حوالہ تاریخوں میں نہیں ملتا ہے۔ البتہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ کے اسلامی دنیا کے مروجہ درس نظامی کا یہاں انتظام ہوگا۔ فارسی اور عربی زبان کی تعلیم بہرحال اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی تھی۔ چونکہ خواجہ کو ادب اور انشاء کے علاوہ ریاضی، ہیئت اور علم ہندسہ سے بھی خاص شغف تھا، اسی بناء پر ان علوم کی تعلیم کا بھی بہتر طور پر انتظام ہوگا۔ بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس درسگاہ میں صرف و نحو، منطق، ریاضی، ہندسہ، ہیئت، فقہ، حدیث، علوم معقول اور منقول، حکمت اور ادب (عربی اور فارسی) کی تعلیم کا اعلیٰ پیمانہ پر انتظام تھا۔

اس مدرسے میں تعلیم کے دو درجے تھے (۱) ملازم (۲) مدرس۔ پہلا امتحان کامیاب ہونے پر ملازم کی سند ملتی تھی، طالب علم کا نام ایک خاص رجسٹر میں جس کو روزنامچۂ ہمایوں کہتے تھے۔ درج ہوتا تھا۔ درجہ ملازم کے نصاب کے دو حصے تھے پہلے میں بلاغت اور علم کلام کی انتہائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور دوسرے میں اصول، قانون، حدیث اور عقائد کی تعلیم ہوتی تھی۔ مدرس کے درجوں کیلئے کوئی خاص مضمون یا امتحان نہ تھا بلکہ ایک مدت معینہ لازمی تھا کہ اونچی جماعتوں کو خاص مضامین پر لکچر دیا کرے۔ اس کے بعد وہ مدرسی کی سند کا مستحق سمجھا جاتا تھا جس کی بناء پر وہ سلطنت میں جلیل القدر عہدہ کیلئے موزوں قرار پاتا تھا۔ بلحاظ تعلیم مدرس کی کئی قسمیں تھیں۔ کاتب، منشی، مولوی ملا اور ملا۔ ملا منازل تعلیم کا انتہائی درجہ تھا۔ جس میں شاعری، طب اور جملہ فنون میں منتہی ہوجاتا تھا۔ وزارت، صدارت اور قاضی القضات کی خدمات انہیں دی جاتی تھیں۔ اس درسگاہ کے ملا اپنے زمانے کے بڑے عالم ادیب اور مورخ ہوتے تھے جن میں سے بعض کا شمار علماء میں ہوتا تھا۔ مثلاً ملا عزیز، ملا نظام الدین، ملا روح اللہ صدر الصدر بہمنیہ، ملا تاج اللہ قاضی القضات بہمنیہ اور ملا محمود صدر جہاں جو عرصہ دراز تک وزیر اوقاف و عطیات رہے۔ علوم و فنون کی اشاعت اس وسیع اور مستحکم پیرایے سے ہوتی تھی کہ چھوٹے چھوٹے قصبات اور مواضعات تک ملا ہی ملا نظر آتے تھے۔ اس درسگاہ کے اساتذہ کے تعلق سے تاریخوں میں کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ اس عظیم الشان درسگاہ کے استاد الاساتذہ حضرت شیخ ابراہیم ملتانی تھے جن کو عقلی اور روحانی علوم میں خاص مقام حاصل تھا۔ اکثر بہمنی شہزادے تعلیم و تربیت بھی ان کے ذمے تھی اور جن کے تفویض قاضی القضاۃ کا بھی عہدہ تھا۔ ان کے دور صدارت میں مدرسہ نے

عا اے۔ GLIMPSES OF MEDIAFVEL INDIAN CULTURE PAGE NO(172)

۵۔ تذکرۂ ... صفحہ ... نادر خان ستھی۔ قلمی ورق (۵)

علمی کمال اور شہرت کے اعلیٰ منازل طے کئے۔ خواجہ خود ریاضی کی تعلیم دیتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے نامور اساتذہ میں حافظ عبدالعزیز تاادری نبیرۂ حضرت سید السادات سید حنیفؒ سید محمد القاسمؒ جرجانی مولانا شیخ ابراہیم سرہندی مولانا شمس الدین سامیؒ سید عبدالقادر الحسنی متعاف اور ملا معین الدین سبزواری جیسی باکمال ہستیاں تھیں۔

مدرسہ سے متعلق ایک دارالاقامہ تھا جس میں آٹھ وسیع کمرے تھے اور ہر ایک کمرے میں (۴) طلباء رہتے تھے اور یہ حصہ اعلیٰ تعلیم کے طلباء کے لیے مختص تھا۔ ابتدائی تعلیم کے طلباء کی رہائش کا علیحدہ انتظام تھا۔

صوفیہ اور بزرگانِ دین کی علمی اور دینی خدمات

مذہبی اداروں یا قائدین قوم کی مساعی جمیلہ

مذہبی ادارے اور رہنمایان قوم بھی اشاعت تعلیم کے بڑے منبع فیض تھے۔ اسلامی دور حکومت میں مساجد اور خانقاہیں بھی اشاعت تعلیم کے بڑے مرکز ہوتے تھے۔ بہمنیوں کے زمانے میں بھی یہ مذہبی مقامات اشاعت تعلیم میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ ایسے مکتب اور مدرسے جو ابتدائی و ثانوی تعلیم دیتے تھے مساجد سے متعلق ہوتے تھے۔ ان مساجد کے امام ہی گاؤں کے بچوں کو مذہبی اور عام اخلاقی تعلیم دیتے تھے اس کے ساتھ ساتھ مندروں اور پاٹھ شالے سنسکرت اور مقامی زبانوں کی تعلیم دیتے تھے مندر کے پجاری کو اس نظام تعلیم میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ بادشاہ وقت کی جانب سے مالی اور دوسری امداد دی جاتی تھی۔ ایسے امام اور پجاری جن کے ذمے مذہبی فرائض کی تکمیل کے علاوہ رعایا کی تعلیم کی ذمہ داری ہوتی تھی بادشاہ سے تنخواہ پاتے تھے۔ نئے مساجد کی تعمیر اور اخراجات کی تکمیل کے لئے وقف کا انتظام سلاطین بہمنیہ کی دیرینہ روایات رہی تھیں۔ سلطنت بہمنیہ کے حدود اپنے عروج کے زمانے میں شمال میں برار اور بیجاپور تک، خلیج بنگال و بحیرۂ عرب علی الترتیب جنوب، مشرق اور مغرب تک پھیلے ہوئے تھے۔ ایسے بے شمار مساجد رکھتی تھی جہاں مذہبی و اخلاقی تعلیم کا انتظام تھا۔ درسگاہیں اور خانقاہیں بھی علم کی اشاعت میں اہم خدمات انجام دیتی تھیں جن کی تعداد مساجد کے مقابلے میں زیادہ نہیں ہوتی تھی لیکن جہاں تک اس موضوع کا تعلق ہے ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مقامات اصل میں بزرگان دین اور اولیائے کرام کے مقابر ہوتے تھے۔ جہاں لوگ عقیدت سے آتے تھے۔ بیدر میں ایسی خانقاہیں متعدد پائی جاتی تھیں جن کا شاہان وقت پر کافی اثر تھا جو مذہبی اور روحانی تعلیم کے مرکز تھے۔ ان خانقاہوں میں حضرت خواجہ ابوالفیض، حضرت شیخ نور سمنانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ حسینیؒ، حضرت مخدوم جی قادریؒ اور حضرت منتخب الدین ؒ کی خانقاہیں

۱؎ ان کا مزار بیدر میں جانب مغرب ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے۔ ۲؎ علم منطق میں کامل اور اولوالعزم تھے۔

اپنے سلسلہ روحانی اور اخلاقی کے بڑے مرکز تھے۔ یہ خانقاہیں ایک بڑے ہال پر مشتمل ہوتی تھیں جہاں اس خانقاہ کے مریدین اور معتقدین فیض روحانی کیلئے آتے تھے۔ ان خانقاہوں میں حضرت خواجہ ابوالفیض کی ہمشیرہ منت اللہ بی کی خانقاہ قابل ذکر ہے جہاں پر موصوفہ چشتیہ دبستان کی تعلیم اپنے مریدین کو دیتی تھیں اس دور میں ایسے مذہبی رہنما اور بزرگان دین بھی گذرے ہیں جن کی ذات گرامی بالواسطہ طور پر دکن کی تعلیمی زندگی پر اثر انداز ہوئی ان ہستیوں میں حضرت شیخ سراج الدین جنیدی کی ذات بابرکات تقدم زمانی[1] رکھتی ہے انھوں نے پانچ بہمنی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ ابتدا میں گلبرگہ کے ایک موضع کوٹنچی میں رہتے تھے۔ علاؤ الدین حسن بہمن شاہ کی درخواست پر گلبرگہ میں مستقل طور پر رہائش اختیار کی دکن کے دور دراز گوشوں سے جوق در جوق عقیدت مند آتے اور آپ کے فیضان روحانی سے متمتع ہوتے تھے۔ اسی طرح سلطنت کی آبادی کا بڑا حصہ آپ کی روحانی تعلیم کے زیر اثر تھا۔

بہمنی سلطنت کے درمیانی عہد میں سرزمین دکن کو علوم ظاہری اور روحانی کے ایک آفتاب نے اپنی ضیاء پاشی سے منور کیا۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز حسینی[2] دہلی سے ۸۰۳ھ میں پایۂ تخت گلبرگہ تشریف لائے فیروز شاہ اور احمد شاہ دونوں آپ کے عقیدت مند تھے۔ وہ ایک صوفی باصفا اور فارسی کے اچھے ادیب اور شاعر تھے ان کی تعلیمات اور فیوضات باطنی کا دائرہ بے حد وسیع تھا۔ آپ کے سرچشمۂ فیض سے بلا تفریق مذہب و ملت تمام مستفید ہوتے تھے۔ اس فیض عام نے رعایا کے مختلف طبقات پر گہرے تہذیبی اور اخلاقی اثرات ڈالے۔ آپ کی جامع شخصیت اور تعلیم نے سب کو ایک ہی رشتۂ اخوت و محبت میں منسلک کر دیا احمد شاہ اول نے ۱۴۲۲ء[3] میں گلبرگہ کے مضافات میں آپ کے لیئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ جہاں آپ مریدین و معتقدین کو تعلیم عقلی اور روحانی دیتے تھے علم اور روحانیت کی اس شمع کو آپ کی اولاد اور خلفاء نے سلطنت بہمنیہ کے زوال تک فروزاں رکھا۔

الحاصل سلاطین بہمنیہ نے رعایا کی تعلیم کیلئے ہر قصبہ اور ہر گاؤں کے مساجد میں مکتب اور بڑے شہروں میں درسگاہیں قائم کی تھیں جن کے اخراجات کی تکمیل کیلئے بڑے اوقاف اور بیش قرار تنخواہیں مقرر تھیں جن کے کچھ کچھ آثار آج بھی دکن میں ملتے ہیں۔

۱۔ سنہ ۶۶۱ھ تا ۱۲۶۲ء

۲۔ سنہ ۷۲۰ھ تا ۷۲۵ھ

۳۔ PRIMOTION OF LEARNING IN INDIA - PAGE (86)

حفیظ صدیقی

میرے لبوں پہ ترا نام اگر نہیں ہوتا
فغاں میں درد دعا میں اثر نہیں ہوتا
غمِ حیات کی تاریک رہگزاروں میں
جو تو نہیں تو کوئی ہم سفر نہیں ہوتا
یہ بات ذوقِ نظر کی ہے لوگ کیا سمجھیں
جمالِ یار کا پہلو کدھر نہیں ہوتا
وہاں وہاں بھی تمہارا گمان گذرا ہے
جہاں جہاں سے تمہارا گذر نہیں ہوتا
وہ اشک دل میں جو گذرے وہی گہر ہے
مگر جو آنکھ سے ٹپکے گہر نہیں ہوتا
ہم اس خیال سے تنہا رہے زمانے میں
ہر ایک راہنما، راہبر نہیں ہوتا
بہت حسین سہی خوابِ زندگی لیکن
نہالِ خواب کبھی بارور نہیں ہوتا
کسی کی چشمِ کرم کا یہ فیض ہے یارو
ہمیں حوادثِ عالم کا ڈر نہیں ہوتا
رہِ طلب میں مسلسل ہی چل رہا ہوں حفیظ
سفرِ حیات کا کیوں مختصر نہیں ہوتا

سید خضر برنی

کسی سے دل لگانا اک کسی کے کام آتا ہے
محبت میں ذرا سی بات پر الزام آتا ہے

چھلکتا ہے مسلسل ہچکیوں سے یاد کا جام
زباں پر جب کبھی بھولے سے ان کا نام آتا ہے

میں دن کی روشنی میں بھول جاتا ہوں اذیت کو
دھڑکتا ہے مرا دل جبکہ وقتِ شام آتا ہے

عزیز و آشنا کب ساتھ دیتے ہیں مصیبت میں
ہمارے کام فرقت میں دلِ ناکام آتا ہے

جب ان کا نام لیتا ہوں خوشی سے جھوم جاتا ہوں
جب ان کا ذکر کرتا ہوں بڑا آرام آتا ہے

خضر کو دیکھ کر ہنس ہنس کے یوں آواز دیتے ہیں
وہی خستہ جگر ناکام اک بدنام آتا ہے

طرب میرٹھی

جنوں کی دھوپ میں اک سایۂ شجر کی طرح
ترا خیال ہے دیرینہ ہم سفر کی طرح

تمام ڈھل گئی تاریکیٔ شبِ فرقت
نظر وہ آئے مجھے مژدۂ سحر کی طرح

ہمیں ہی عشق کی منزل نہ کس لئے ملتی
چلے ہیں ہم تو وفا شمعِ رہگذر کی طرح

دلِ تباہ کی حالت فراقِ یار میں ہے
کسی غریب کے اُجڑے ہوئے سے گھر کی طرح

کریں تو کیسے کریں فرق سادہ دل انساں
یہاں تو ملتے ہیں رہزن بھی راہبر کی طرح

یہ مانتے ہیں جلی شمع تا سحر لیکن
کہاں جلی یہ ہمارے دل و جگر کی طرح

طرب یہ جذبۂ شوق و طلب کی ہے تاثیر
دھر بھی نالے و شیون ہے آپ ادھر کی طرح

امداد ہمدانی

آرزوؤں کے جزیروں سے نکل کر دیکھ لے
بستیاں ویران ہیں آنکھوں سے چل کر دیکھ لے
تجربہ کہتے ہیں جس کو ٹھوکروں کا نام ہے
مُنہ کے بل گرنے سے پہلے ہی سنبھل کر دیکھ لے
اپنی ہی صورت نظر آئے گی سب کے روپ میں
تو کبھی سانچے کسی شیشے میں ڈھل کر دیکھ لے
آگ جو بھی ہاتھ میں لے گا جھلستا جائے گا
لطف لازم ہے تو پھر پانی میں جل کر دیکھ لے
دور تک پھیلا ہے سناٹا صدائے دل بھی ہے
ایک دن تو شہر سے باہر نکل کر دیکھ لے
کس قدر باقی ہے اے امداد جاں کا اعتبار
پھول اپنے ہاتھ میں لے اور مسل کر دیکھ لے

فوقؔ فاروقی

فقط میں نہیں سختئ جاں اور بھی ہیں
خرابِ غمِ آسماں اور بھی ہیں

ذرا جائزہ لے، ترے میکدہ میں
تہی جام! پیرِ مغاں اور بھی ہیں

پرے میری نظروں کے روشن افق سے
نئے فکر کے آسماں اور بھی ہیں

ہم اپنی تباہی کے مجرم ہیں لیکن
تری بزم میں رائیگاں اور بھی ہیں

اسیرو! قفس سے نکل کر تو دیکھو
قفس ہی نہیں آشیاں اور بھی ہیں!

سلگتی یہ راتیں، یہ تپتے ہوئے دن
ابھی مرحلے، سختیاں اور بھی ہیں

مقابل نہیں فوقؔ اک عشق کا غم
مری راہ میں سنگِ گراں اور بھی ہیں

ظفرؔ صہبائی

جاؤں پھر آنے والے دنوں کی خبر کو میں
اپنے بدن سے نکلوں اگر لمحہ بھر کو میں

منزل کہاں کہ راہ کا پایا ہے اب سراغ
کیسے سفر کا نام دوں اپنے سفر کو میں

دیوار و در اُداس اکیلے ملیں گے پھر
بازار سے جو لوٹ کے جاؤں گا گھر کو میں

اک عہد اک زمانہ ہوں خود اپنی ذات میں
دُنیا کے آگے کیسے جھکاؤں گا سر کو میں

سب چڑھتے سورجوں کا اُجالا ہے تھوڑی دیر
سمجھا رہا تھا بات یہی کل ظفرؔ کو میں

عاصمؔ بریلوی

تجھ پہ اے محبت مہربانی کر رہا ہوں میں
اُن کا غم شریکِ زندگانی کر رہا ہوں میں
ں اپنے حوصلے کی پاسبانی کر رہا ہوں میں
ار غمِ سرور و شادمانی کر رہا ہوں میں

ے اشعار میں تحلیل ہے خونِ جگر میرا
ے تم یہ نہ سمجھو نغمہ خوانی کر رہا ہوں میں
کبر و گردشِ دوراں سے میرا ظرف تو دیکھئے
دل کو بے نیازِ شادمانی کر رہا ہوں میں

ستاں کا خزاں سے اک تعلق ہے مگر پھر بھی
نائے بہارِ جاودانی کر رہا ہوں میں
نشاط و کیف سے مایوس ہو کر راہِ اُلفت میں
ضیائے غم سے روشن زندگانی کر رہا ہوں میں

سمجھا ہے نہ سمجھے گا زمانہ میری عظمت کو
ں کے دل پہ عاصمؔ حکمرانی کر رہا ہوں میں

قمرؔ صدیقی

انکو اپنے تصور میں لاتے رہے
بزمِ خلوت یونہی ہم سجاتے رہے
دل پہ تیرِ نظر وہ چلاتے رہے
زخم کھا کھا کے ہم مسکراتے رہے
کچھ تو راہِ طلب میں تھیں دشواریاں
کچھ ہمارے قدم ڈگمگاتے رہے
راہِ الفت میں روشن رہیں مشعلیں
اشکِ مژگاں پہ جو جگمگاتے رہے
کوئی اقرار سے کوئی انکار سے
تیرے در پر سبھی سر جھکاتے رہے
ان کی قربت قمرؔ کو نہ حاصل ہوئی
یوں تخیل میں وہ آتے جاتے رہے

ساجد اختر

حنا کے پیڑ سے بہتر ببول کیا کہیے
یہی ہے آج کا اندھا اصول کیا کہیے

بڑے عجیب سے حالات کی چتاؤں میں
سلگ رہے ہیں تمنا کے پھول کیا کہیے

دبے پڑے ہیں غموں کی چٹان کے نیچے
سدا بہار خوشی کے رسول کیا کہیے

بڑی ہی سخت ضرورت تھی ہمکو کرنوں کی
ہوا نہ اک بھی کرن کا نزول کیا کہیے

اختر! حسین اجالوں کے آئینے میں
جمی ہوئی ہے اندھیروں کی دھول کیا کہیے

یعقوب راہی

ہم اکیلے ہی نہیں مجبور تیرے شہر میں
اور بھی ہیں درد و غم سے چور تیرے شہر میں

اب تو سہنی ہی پڑے گی زندگی کی تیز دھوپ
آگئے ہیں اپنے گھر سے دور تیرے شہر میں

چھیڑ دوں تو وقت کی نیندوں میں پڑ جائے خلل
ساز دل ہے درد سے معمور تیرے شہر میں

کچھ تو ہے جو نسبت تجھی سے ہے غرور ناز کو
لوگ کہتے ہیں تجھے مغرور تیرے شہر میں

اپنے اپنے درد میں ڈوبے رہے ہیں اہل دل
کون [illegible] کا دستور تیرے شہر میں

نقد و نظر

الفہرس المشروح للمخطوطات العربیہ الجزء الاول

مرتبہ الدکتور محمد غوث - ایم اے - ایل ایل بی - پی ایچ ڈی
لیبس سی - کتب خانہ سعیدیہ جام باغ حیدر آباد -

جناب محمد یوسف صاحب کوکن نے "قاضی بدرالدولہ" کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی ہے جس میں انکے
اکین خاندان کے کارنامے ان کی سوانح حیات اور ان کی ادبی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ ہے ۔ محمد سعید خاں انھیں کے ایک
کے تھے جنھیں سالار جنگ اول نے حیدر آباد بلایا اور دار القضا میں مفتی کے عہدہ پر فایز کیا وہ بہت بڑے عالم، علم دوست،
طالعہ کے شیدائی اور نادر کتابوں کے شایق تھے ، یہ خصوصیت انھیں ورا ثتًا ملی تھی اور اس طرح ایک نایاب ذخیرہ انکے
ں جمع ہوتا رہا - ان کی وفات سنہ ۱۲۹۴ھ کے بعد کتابوں کی حفاظت تو ہوئی لیکن اضافہ نہ ہوسکا سنہ ۱۹۲۵ء میں یہ
ب خانہ عوام کے مطالعہ کیلئے کھول دیا گیا - اب اس کے مخطوطات کی فہرست ڈاکٹر محمد غوث صاحب نے مرتب کر کے شائع
ہے - ڈاکٹر محمد غوث صاحب عرصۂ دراز تک عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبہ مخطوطات کے نگران رہے ہیں اور فہرستیں مرتب کرنے کا
ب تجربہ رکھتے ہیں پیش نظر فہرست میں، قرآن، حدیث، سیرۃ، اصول فقہ اور فقہ پر جو مخطوطات ہیں ان کی تفصیلات
ی گئی ہیں - کتب خانہ کی اہمیت اس سے ظاہر ہوگی کہ یہاں ۱۳۱ مخطوطات ہیں ان میں کئی ایسے مخطوطات ہیں جو خود مصنفین
مسودے ہیں مثلاً ابن حجر عسقلانی، محمد الحسینی سرخسی، مولوی عبدالحق محدث دہلوی اور بحر العلوم وغیرہ یہاں دو ایسی
کتابیں بھی موجود ہیں جو چھٹی صدی ہجری میں لکھی گئیں - اس فہرست میں سات سو کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے - اور ڈیوی کے
اری نظام کے تحت اس کی تنظیم کی گئی ہے - فارسی اور عربی زبان کے مخطوطات کی وجہ سے یہ کتب خانہ عالمگیر شہرت کا
ہے - فہرست کی اشاعت سے کتب خانہ کی افادیت میں بہت بڑا اضافہ ہو گیا ہے - ہمیں یقین ہے کہ محققین کیلئے
ت نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی -

رائل سائز کاغذ نہایت عمدہ ٹائپ کی انگریزی اور عربی طباعت صفحات ۴۸ قیمت بیس روپے ۲۰ -
خانہ سعیدیہ جام باغ روڈ حیدر آباد کے پتہ سے مل سکتی ہے -

ہیل (گیا) کا بھاگلپور کا موجودہ ادبی ماحول نمبر

سہیل نے قبل ازیں جمیل مظہری نمبر دو جلدوں میں شائع کیا تھا
اور یہ زندہ ادیبوں کو منظر عام پر لانے اُن کی علمی صلاحیت کو
م سے واقف اور ان کی اہمیت کو ادب میں واضح کرنے کی ایسی ہی کوشش تھی جیسی حکیم محمد یوسف حسن نے نیرنگ خیال کا

اقبال نمبر نکال کر یا ڈاکٹر زور نے سب رس کا امجد نمبر نکال کر کی تھی۔ یہ سہیل کا ایک قابل قدر کارنامہ تھا۔ اب سہیل نے بھاگلپور کے ادب اور ادیبوں کو پیش نظر رکھا ہے اور ایک ضخیم نمبر شائع کیا ہے۔ اس میں بھاگلپور کی تاریخ بھی ہے اور ادبی تاریخ بھی۔ اور ادیبوں کی بے شمار تصویریں بھی ہیں۔ یہاں کا ادبی ارتقاء اردو ادب کے زمانہ کی طرح صوفیائے کرام کا رہین منت ہے۔ اس کے بعد شعر و شاعری کے چرچے آزادی سے پہلے اور بعد کا دور سب پر مضامین فراہم کیے گئے ہیں۔ کسی ایک موضوع کو لے کر اس پر سیر حاصل مواد فراہم کرنا آسان نہیں۔ سہیل کے ایڈیٹر ادریس سینہاروی صاحب اپنی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کی وجہ سے ایسے ادیبوں کو لکھنے پر راضی کرنے میں کامیاب ہوگئے جو شاید ان موضوعات کو غیر اہم سمجھ کر کبھی نہ لکھتے۔ ہوسکتا ہے کہ آج یہ موضوع جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں اہمیت نہ رکھیں لیکن کل کے دن یہ تاریخ بن جائیں گے اور اتنی اہمیت اختیار کر جائیں گے کہ آئندہ محققین کے لیے ماخذ کا کام دیں گے۔ ہم اس کامیاب پیش کش پر ادارہ کے تمام ارکان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

نوائے سرور

مرتبہ: ڈاکٹر حکم چند نیر ناشر: ادارہ روزنامہ ہند، سمان نارس۔

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی اور نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

سائز ڈیمی ۱۹۲ صفحات مجلد خوبصورت گرد پوش قیمت چھ روپے

درگا سہائے سرور جہان آبادی ان بدقسمت شعراء میں ہیں جو مقبول انام شاعر ہوتے ہوئے بھی مفلسی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے تو بہ تو مصائب نے بھی انھیں تنگ کیا اور آرام کی صورت دیکھنا بھی نصیب نہ ہو اور عالم شباب ہی میں چل بسے وہ قومی شاعری کے صف اول کے شعراء میں گنے جاتے تھے۔ ان کے معاصرین میں قومی درد سے بھرے ہوئے شعر کہنے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں لیکن ان میں بھی سرور کی شاعری منفرد ہے۔

سرور کے کلام کے تین مجموعے خمخانۂ سرور، جام سرور اور نمکدۂ سرور منظر عام پر آچکے تھے لیکن آج وہ نایاب ہوگئے ہیں۔ اس کے بعد ان کا کوئی مکمل مجموعہ بھی شائع نہیں ہوا وہ نظمیں بھی شائع نہ ہو سکیں جو انھوں نے ایسے دوکان کے ہاتھ فروخت کیں جو شعر کو سمجھنا تو دور کی بات ہے صحیح پڑھ نہ سکتے تھے۔ فاضل مرتب نے پہلی بار لالہ شاکر میرٹھی کے متعلق وضاحت کے ساتھ بتلایا ہے کہ کس طرح سرور کی کئی نظمیں شاکر کے نام سے چھپیں ان کے خطوط کو شائع کر کے ایک اہم خدمت انجام دی گئی ہے۔

انتخاب کے موقع پر شائع شدہ مجموعوں کے علاوہ ان کی خانگی بیاض کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے اور اس طرح ان کے پورے کلام سے انتخاب کی کوشش کی گئی ہے۔ سرور کے مجموعوں کی عدم دستیابی نے انھیں شائقین کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ ڈاکٹر نیر شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سرور کا ایک اچھا اور وافر انتخاب شائع کیا ہے۔ اس انتخاب میں سرور کی ۱۰۱ نظمیں اور ۳۲ رباعیات شریک ہیں۔ مقدمہ میں سرور کی زندگی کے حالات بھی ہیں اور کلام پر بہت وقیع اور سیر حاصل تبصرہ بھی ہے۔ تبصرہ نے سرور کی شخصیت اور انفرادیت کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے۔

غزالِ رعنا

(محمد قلی قطب شاہ کی غزلوں کا انتخاب) مرتبہ جاوید وششٹ۔ پبلشر کتاب بھون کلاں محل دہلی ۶ مجلد مع خوبصورت گردپوش۔ کاغذ کتابت طباعت نفیس قیمت چھ روپے۔

پروفیسر جاوید وششٹ صدر شعبہ اردو ڈی کالج (دہلی یونیورسٹی) دہلی عرصہ سے دکنی ادب پر کام کر رہے ہیں۔ اس سے قبل سب رس کے قصہ حسن و دل کو پیش کیا ہے۔ خود ان کے کلام کا مجموعہ "شعلۂ تشنگی" منظر عام پر آچکا ہے غزالِ رعنا محمد قلی قطب شاہ کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ کلیاتِ قلی قطب شاہ مرتبہ ڈاکٹر زور مرحوم تمام اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔ اس میں سے پروفیسر موصوف نے یہاں صرف غزلیں پیش کی ہیں دوسری کتاب "روپ رس" رومانی نظموں کا انتخاب ہے جو جلد ہی پیش ہوگی۔ انتخاب کا معاملہ پسند پر ہے لیکن فاضل مرتب نے اپنی پسند کے ساتھ ساتھ سب کی پسند کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ آخر میں دکنی الفاظ کی فرہنگ دی گئی ہے جو زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور قلی کی شاعری کو سمجھنے میں بہت معاون ہوگی اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کی غزلوں کا یہ خوبصورت انتخاب توقع ہے کہ کافی مقبولیت حاصل کرے گا۔

چلم نامہ

محمد یوسف پاپا۔ ناشر اردو سماج۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵ صفحات ۸۰ خوبصورت گٹ اپ۔ نفیس کتابت و طباعت قیمت دو روپے۔

محمد یوسف صاحب جامعہ ہائر سکنڈری اسکول میں طبیعات کے استاد ہیں۔ سنجیدہ شاعری میں یوسف اور طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں پاپا تخلص کرتے ہیں۔ کتاب کے نام سے واضح ہے کہ یہ طنزیہ ہے اور ان کے بھرپور طنز کو غلام احمد فرقت صاحب نے متعارف کرایا ہے۔ پاپا صاحب کے چونکہ داڑھی ہے فرقت صاحب نے اس کی آڑ میں طنز کا نشتر کا رکھیلا ہے۔ ہمارے سائنسداں شاعر کی یہ کتاب حمد سے شروع ہوتی ہے اس کے بعد نعت ہے اور دونوں نظموں میں چلم کا ذکر بڑی ذہانت سے کیا گیا ہے۔ اس کے بعد چلمی فلسفۂ حیات' چلم بھرنے کی خواہش ہے' چلم کس کی بھری جائے۔ چلم بھرنے سے کیا ہوگا۔ چلم کب کب بھری جائے۔ آخری ہدایت اور آخری نظم چلم کا ترانہ ہے۔ عصر حاضر ہو یا عہد سلف ہر دور میں خوشامد اور چاپلوسی نے ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا ان نظموں میں جن حقیقتوں کا اظہار کیا گیا ہے ان میں سو فیصد صداقت دکھائی دے گی۔ خوشامد پسندوں کے طریق کار عام لوگوں سے بالکل بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے عادات و اطوار اور ان کی رفتار و گفتار میں بھی کافی تضاد ہوتا ہے۔

بس خوبی سے یہ صفات نظم کی گئی ہیں اس کا ہمارے ادب میں جواب نہیں۔ مثلاً یہ چار شعر ملاحظہ ہوں ؎

جو کھٹکی اور مشتی کام سے انکار کرتے ہوں — وہ جائز مانگ پر بھی بار بار اصرار کرتے ہوں
تو ان لوگوں کو نرمی سے کبھی ہرگز نہ سمجھانا — انھیں پھٹکار کر ہر وقت ان سے کام کروانا
اگر معلوم ہو جائے کہ ان کی یونین بھی ہے — اور اسمیں کار فرمائی روسِ اہرمن بھی ہے
بلا کر ان کو خود فوراً چلم ان کی بھی بھر دو تم — دکھاؤ ہاتھ ایسا عقل کو بیکار کر دو تم

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۳۲ شمارہ ۸

اگست ۱۹۶۹ء

ماہنامہ

سب رس

زر سالانہ چھ روپے غیر ممالک سے دس روپے

ششماہی تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے

نمونے کے پرچہ کیلئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے

پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد۔ حیدرآباد ۴ سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

اگلا شمارہ غالب نمبر ہوگا اس لئے یہ شمارہ مختصر کردیا گیا ہے۔ اس شمارہ میں صرف دو مضمون ہیں اور ایک افسانہ۔ راقم الحروف کا مضمون کتبہ امین درگاہ اس سے پہلے تحریر (دہلی) اور اردو نامہ (کراچی) میں عکس کے ساتھ شائع ہوچکا ہے لیکن بعض احباب معر تھے کہ سب رس میں شائع ہونا چاہیئے تاکہ سب رس کے قارئین اس سے استفادہ کرسکیں اس لیئے اس کو شامل کیا گیا۔ دوسرا مضمون تاج الحقائق پر ہے اور ڈاکٹر نور السعید اختر نے اس کو وجہی کی تصنیف بتلا کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہ ہوسکا وہ اس نتیجہ پر کسی ثبوت کی بناء پر پہنچے۔ جناب اندرجیت دت کا افسانہ اچھوتا موضوع لئے ہوئے ہے۔ گذشتہ مہینے تلنگی کے ایک مشہور شاعر اور افسانہ نگار کے' ویکنٹ راؤ نے ۷۷ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ تلنگی ادب کو اونچا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

یہ خبر بھی افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ "کتابی دنیا" کراچی کے ایڈیٹر ضیاء الدین برنی نے کراچی میں انتقال کیا۔ وہ ۲ر فروری ۱۸۹۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۱۳ء میں گریجویٹ ہوئے اور مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" کے ادارتی عملہ سے منسلک ہوئے۔ یہاں سے کچھ دن کیلئے تعلیمات میں مدرسی کی لیکن ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۵ء تک حکومت بمبئی کے دارالترجمہ میں مترجم مقرر ہوئے۔ یہ دور بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کانگریس کی جدوجہد آزادی میں راز کی اکثر و بیشتر رپورٹیں ان تک پہنچتیں اور وہ دیانت داری سے اپنے فرائض بجا لاتے۔ انھوں نے اسی اثناء میں کئی کتابیں بھی لکھیں جن کی فہرست طویل ہے آخری کتاب جو انھوں نے تعلیمی مرکز کراچی سے شائع کی "عظمت رفتہ" ہے جس میں ان تمام بڑی شخصیتوں کے مختصر سے حالات ہیں جن سے ان کا ربط رہا ہے۔ ان شخصیتوں میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی' انگریز بھی ہیں اور پارسی بھی ان کی تصویروں نے بھی کتاب کے حسن میں اور اضافہ کردیا ہے اور ادبی اور تاریخی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔

ہمارا اگلا شمارہ غالب نمبر ہوگا۔ لکھنے والوں میں پروفیسر سید محمد۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ پروفیسر سید مبارز الدین رفعت' ڈاکٹر حفیظ قتیل۔ ڈاکٹر سید حامد حسین' ڈاکٹر محمد صفی الدین صدیقی۔ ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی۔ حامد اللہ ندوی' ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید۔ پروفیسر شکیل احمد صدیقی۔ محمد عرفان نگینوی' عبدالغنی فاروقی۔ یوسف ناظم۔ پروفیسر عصمت جاوید۔ حشم الرمضان۔ سہیل بیابانی۔ ڈاکٹر خلیل احمد۔ ضیاء الدین شکیب [illegible] ہیں۔ سید ضامن کنتوری مرحوم کا مضمون غالب اور بیدل پر اور عبدالرزاق بسمل کا مضمون حبیب اللہ ذکا پر شامل ہے۔ ان کے علاوہ اور کئی دوسرے ادیبوں کے رشحات بھی شریک رہیں گے تصویریں اور عکس تحریر بھی ہوں گے۔ اس کی ضخامت دو سو صفحے سے زاید ہوگی اور قیمت چار روپے ہوگی۔

محمد اکبر الدین صدیقی

محمد اکبر الدین صدیقی

کتبۂ امین درگاہ بیجاپور

امین الدین اعلیٰ کو امین الدین علی غیر ضدا سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ آپ کی درگاہ امین درگاہ کے نام سے شاہ پور میں بیجاپور سے ڈھائی میل کے فاصلے پر مرجع خلائق ہے امین الدین اعلیٰ حضرت میاں جی شمس العشاق کے پوتے اور حضرت برہان الدین جانم کے لڑکے تھے۔ آپ اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ پیدائش کا کوئی مستند حوالہ نہیں ملتا۔ البتہ بعض شہادتوں سے تاریخ پیدائش معلوم کی جا سکتی ہے

حضرت میاں جی شمس العشاق جب شاہ پور پہنچے اور حضرت شاہ کمال الدین مجرد بیابانی کے ہاتھ پر بیعت کی تو آپ نے اپنے مرید کو متاہل زندگی گذارنے کا حکم دیا جس پر آپ نے احمد نگر سے قریب کے ایک مقام بھنگار کے ایک خاندان میں شادی کی۔ آپ کے دو صاحبزادوں برہان الدین جانم اور خواجہ عطاء اللہ کا ذکر ملتا ہے۔ خواجہ عطاء اللہ نے نوجوانی کے عالم میں انتقال کیا اور اسی ٹیلے پر جہاں حضرت امین الدین اعلیٰ کا مزار ہے ان کے قریب ہی ایک چوکھنڈی میں دفن ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاندان میں جو بھی نوجوان غیر شادی شدہ انتقال کرتا ہے اسی احاطہ میں دفن کیا جاتا ہے۔

حضرت میراں جی جانم اور امین الدین کی مدح میں اور اس کے بعد آپ کے پوتے علی پیر کی تعلیمات پر ایک کتاب تذکرۂ غوثیہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں جانم اور اعلیٰ کی مدح میں چند اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

وصف حضرت شاہ برہان

رکن شرع مصطفیٰ برہانِ دیں　　　شاہ برہان اسم ذات بہترین
جانشین شاہ میراں آن ولی　　　در ریاضت بود یکتا منجلی
شاہ انس و جان و مولائے کرم　　　متقی مرتاض و ہم ثابت قدم
صاحبِ مشکل کشا روشن ضمیر　　　ہادیٔ ہر بندگان را دستگیر
فاخر فقر رسول کردگار　　　شرحِ وصف ذات پاکش بے شمار

وصف حضرت امین الدین علی

صاحب سجادہ بعد شہ بہ بیا　　　بہ امین الدین علی آن شمسِ دیں

بوداش یکونیتے دیں قول خدا　　از خدا ایک دم نمی بود آں جدا
ایں ہمہ تدبیر و تقدیرات ہم　　ہمچناں می بود در دست کرم
سال تاریخ وصالش منجلی　　گفت ہاتف از ندا "ختم ولی"

۱۰۸۶ھ

امین الدین اعلیٰ کے مرید معظم (شاگرد قادر لنگا کوتال) نے ایک نظم شجرۃ الاتقیا لکھی ہے۔ جس میں یہ بتلایا ہے کہ حضرت برہان الدین جانم پندرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے اور سیاحت کیلئے نکلے تین سال بعد واپس آئے اس کے بعد آپ کے والد کا وصال ہوا۔ اشعار حسب ذیل ہیں ؎

عمر جب ہوا پانزدہ سال کا　　ہوا شوق غالب پچھے حال کا
ہوے دست بیعت پدر سوں کتے　　ہوا قطب روشن پدر (سوں) کتے

اس کے بعد سفر پر جانے کا واقعہ بیان کرکے واپسی کی اطلاع ہے پھر کہتا ہے ؎

کئے جانشیں شاہ برہان کو　　خلافت دئے ظل سبحان کو .
اول حق کی سب آشنائی دے　　سو بعد از کئے شاہ رحلت کئے

اس لحاظ سے والد کے انتقال کے وقت جانم کی عمر اٹھارہ تا بیس سال کے درمیان ہوگی والد کے انتقال پر جو صدمہ ہوا اس کا اظہار آپ نے ایک مرثیہ میں کیا ہے۔ جس کی ردیف "جے کچ حکم الٰہی کا" ہے۔ اس میں وہ ایک شعر میں رشتہ کا اظہار کرتے ہیں کہتے ہیں ؎

دنیاں کا منج پدرا ہے ہور دین منج لنگرا ہے　　اس دکھ کا منج عذرا ہے جے کچ حکم الٰہی کا

دوسرے شعر میں تربیت پانے کا بھی اظہار کیا ہے ؎

دنیاں تھے منج فاضل کیا اور دین منج حاصل کیا　　باحق منج واصل کیا، جے کچ حکم الٰہی کا

والد کی عمر اور تاریخ وفات کا اس طرح ذکر کیا ہے ؎

تاریخ سال نوسو دو اس پر اگلے بھی دو　　دو دن مدت دنا شو جے کچ حکم الٰہی کا
اربع تسوں یہ سال ہے ماہے کوں شوال ہے　　رحلت کئے اس حال ہے جے کچ حکم الٰہی کا
تاریخ بست و پنج بود بسیار گریاں رنج شد　　درحال واصل گنج خود جے کچ حکم الٰہی کا
شب پنجشنبہ روشن کیا ہجرت منور پور کیا　　جیو تا قبض کران لیا جے کچ حکم الٰہی کا

کلمۃ الحقائق (برہان الدین جانم کا رسالہ نثر) کی اشاعت کے موقع پر میں نے پہلے مصرع میں "نو سو دو اس پر" دو دو ادین کے ساتھ اور دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں "اربع سوں" پڑھا تھا لیکن اس کی اشاعت کے

جب دوسرے سے تک رسائی ہوئی تو مقابلہ کرنے پر شبہ اس طرح رفع ہوا کہ پہلے مصرعہ میں "نوسو دو" اور دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں "نوسو" (تسعون) تھا اس طرح معلوم ہوا کہ آپ نے ۹۴ سال کی عمر میں ۲۵ شوال ۹۹۰ھ چہارشنبہ کا دن گذرنے کے بعد شب پنجشنبہ میں وصال فرمایا۔ اس طرح آپ کی ولادت کا سنہ ۸۹۶ھ قرار پاتا ہے اور چونکہ حضرت جانم کی عمر اس وقت اٹھارہ تا بیس سال ہو تو آپ کی پیدائش کا سنہ ۸۷۶ھ تا ۸۷۸ھ ہوگا۔ آپ نے ۹۹۰ھ میں اپنی طویل نظم ارشاد نامہ لکھی اور کلمۃ الحقائق کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ارشاد نامہ کے بعد لکھا گیا اس لئے کہ اس میں ارشاد نامہ کے اشعار موجود ہیں۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں کہ کتنے دن بعد۔ مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کے خیال کے برعکس[1] آپ نے ۹۹۰ھ کے بہت بعد انتقال کیا۔ کتب خانہ آصفیہ بیجاپور کی ایک بیاض میں کئی بزرگوں کی وفات اور اہم واقعات کی تاریخیں درج ہیں۔ اس میں حضرت جانم کی تاریخ وفات "عزیز جان چشتیاں جانم" بتلائی ہے جس سے ۱۰۰۰ھ مستخرج ہوتے ہیں۔ اگر اس کو صحیح تسلیم کیا جائے تو برہان الدین جانم کی وفات ۱۰۰۰ھ میں واقع ہوئی اور یہی سنہ حضرت امین الدین اعلیٰ کی پیدائش کا بھی ہوگا۔ چونکہ آپ اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ گویا اس وقت حضرت جانم کی عمر ایک سو بیس یا بائیس سال ہوگی۔ اس عمر میں توالد و تناسل کا سوال پیدا ہوتا ہے لیکن یہ ہماری بحث سے خارج ہے۔ صاحب "شجرۃ الاتقیا امین الدین اعلیٰ" کی پیدائش کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ حضرت جانم نے فرمایا کہ ؎

اسی روز شہ نے دیئے سب خبر — صفت سب ایں کی کہے کھول کر
خدا کا کہے شیر آتا ہے یو — برابر مجھے گنج لاتا ہے یو
نہ یک شہ بارد و ملک رہتے پلنگ — نہ یک میان میں دو سماتے فرنگ
کہے سر او پر ہے تمہارے خدا — ہیں اب تمہارے سوں ہوتیں جدا
مریداں اتھے شاہ کے بے شمار — فقیراں اتھے شاہ کے کئی ہزار
خلیفے اتھے شہ کے سب نامور — ولے ان میں سید اتھے صاحب کر
نگہ کر کے سید طرف دیکھ کر — کہے تم ایں کو سو بڑ دو خبر
کہے ان کو سب راز بولو تمیں — ایسا پر کچھی بات کھولو نکیں
امین علی پہ یو کہو تمام — ایں کو ہمارا کچھ بولو سلام
کلاہ اور شجرہ ایں کو دئے — اسی روز عالم سوں رحلت کئے

---

[1] ماخوذ از مرسومہ سخاوت مرزا اردو کے مصنفین (مولوی عبدالحق کے خطوط کا مجموعہ)

دنیا میں کیتک دن کو آیا امیں   برابر پچھے گنج لایا امیں

آپ کی تربیت حضرت جانم کی وصیت کے مطابق شیخ محمود خوش دہاں، سید داول اور سید خداوند شاہ خلفائے جانم کے ہاتھوں ہوئی۔ جس کا ذکر راقم نے "کشف الوجود" تصنیف سید داول کی ترتیب کے موقع پر کیا ہے۔
آپ مادرزاد ولی تھے۔ آپ کی کرامتوں کے کئی واقعات روضۃ الاولیائے بیجاپور، حدیقۂ رحمانی، برکات الاولیا، تذکرہ اولیائے دکن، تاریخ دکن (نجم الغنی رامپوری) واقعات مملکت بیجاپور (بشیر الدین احمد) اور بساتین السلاطین وغیرہ میں درج ہیں۔ شجرۃ الاتقیا (معظم) کی روایت ہے کہ حضرت برہان الدین جانم کے دور میں لوگ تعظیماً ان کے سامنے جھک جایا کرتے تھے اور سجدۂ تعظیمی کو آپ نے جائز قرار دیا تھا اس کے بعد یہ رواج امین الدین اعلیٰ کے دور میں بھی باقی رہا۔ دوسرے یہ کہ آپ ہمیشہ جذب کے عالم میں رہتے تھے۔ اس لئے ارکان شرعیہ کی پابندی نہ ہو سکتی تھی۔ علمائے وقت آپ سے ناراض ہی نہیں رہے بلکہ ایک عالم سید محمد بخاری نے سکندر عادل شاہ تک بات پہنچا کر نماز پڑھنے پر مجبور کیا۔ یہ واقعہ تقریباً ہر تذکرہ میں موجود ہے۔ قادری مشرب کے ایک شاعر صادق نے آپ کی ہجو میں ایک طویل مثنوی لکھی جو کتب خانہ گچی محل بیجاپور میں محفوظ ہے۔ آپ نے اپنے مریدوں کو عرفان و سلوک کی تعلیم دی آپ کے خاندان میں بڑے بڑے اولیاء اور بزرگان دین پیدا ہوئے اور ادیب، عالم اور شاعر بھی اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ چشتیہ خاندان کا سلسلہ حضرت میراں جی شمس العشاق ہی سے سارے دکن میں پھیلا چنانچہ آپ کے خلفا میں آپ کے صاحبزادے برہان الدین جانم کے علاوہ فصیح الدین بابا سجنل بھی ہیں جن کے شاعر ہونے کا ذکر بعض تذکروں میں ملتا ہے۔ حضرت جانم کے خلفا میں سید داول، حاجی محمد اسحٰق مدراسی، خداوند شاہ، شیخ خان میاں، شیخ محمود خوش دہاں، رن سنگار خاں، محمود بحری کے والد قاضی بحر الدین قاضی دریا۔ شاعر اور صاحب تصانیف ہیں۔
اسی طرح حضرت امین الدین اعلیٰ کے خلفا میں فرزند حضرت بابا شاہ اور پوتے علی پیر کے علاوہ شاہ عبدالقادر معروف بہ قادر لنگا کوتال، سید شاہ محمد قادری نور دریا، معصوم، شاہ من عرف، شاہ میراں حسینی میراں جی خدانما (کہ جن کا گنبد کاروان ساہو حیدرآباد) میراں سید حسن خداوند خدا نما (چنچولی ضلع گلبرگہ) شاہ محمدی اور معظم بیجاپوری وغیرہ ہیں۔

حضرت امین الدین اعلیٰ کی وفات ۲۴ رمضان ۱۰۸۵ھ کو واقع ہوئی نہ کہ ۱۰۶۲ھ میں جیسا کہ عبدالحق صاحب نے اپنے مضمون مطبوعہ اردو جنوری ۱۹۲۸ء میں ذکر کیا ہے۔

آپ کا ایک مرید اور معتقد افضل خاں بٹنی تھا جس نے آپ کی اجازت سے ایک مکان خا کے بالمقابل ٹیلے سے تین فرلانگ کے فاصلہ پر بنایا۔ جس کے کھنڈر آج بھی باقی ہیں۔ تعمیر کے وقت اس میں صدا بندی کی گئی ہے یعنی اگر خانقاہ کے شمالی چبوترہ پر باہر کھڑے ہو کر تالی بجائیں یا آواز دیں تو اس کی گونج لوٹ کر آ

کہا جاتا ہے کہ جب آپ افضل خاں کو یاد فرماتے ترتالی بجادی جاتی اور وہ حاضر ہو جایا کرتا۔ اسی افضل خاں جٹنی نے آپ کا گنبد بنوایا۔ گنبد کی تعمیر سے قبل آپ کی نعش کو گنبد کے چبوترہ سے قریب ہی سونپ دیا گیا تھا اور چبوترہ تیار ہونے پر [illegible] میں نعش کو چبوترہ پر دفن کیا گیا۔ وہ مزار جس میں پہلے نعش کو سونپا گیا تھا اب بھی موجود ہے۔

حضرت امین الدین اعلیٰ کے متعدد رسائل نثر اور نظم میں ملتے ہیں۔ آپ نے والد کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کی ردیف برہان بن میراں اپڑ ہے ۲۔ محب نامہ بہ شکل قصیدہ ردیف (کوں ۔ کو) ۳۔ رموز السالکین یا رموز السالکین ۴۔ رسالہ وجودیہ ۵۔ رسالہ قربیہ ۶ نازیزہ ۷ ارشادنامہ نثر۔ اس کے علاوہ غزلیں، دوہرے، ریختے (نصف مصرعہ فارسی نصف دکنی) وغیرہ ملے ہیں

کتبہ — دکنی زبان میں یہ سب سے پہلا طویل منظوم کتبہ ہے جو بحر رجز مثمن سالم میں ہے۔ اس شان و شوکت کا کتبہ شاید ہی کسی اور عمارت پر ہو۔ کاتب نے اس کو تحریر کرتے وقت اپنی خوشنویسی کا کمال دکھایا ہے۔ مصرعہ لکھے جانے والی ہر محراب کو کسی ایک حرف کی کشش سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اس میں مصرعہ کو خوبصورتی کے ساتھ بے ترتیب اور بلا تسلسل لکھ دیا ہے۔ مصرعہ میں جتنے الف یا لام یا ک آئے ہیں انہیں مساوی فاصلہ دے کر لکھا ہے خواہ انکی تعداد دو ہو یا تین ہو یا پانچ۔ دوایر کیلئے کوئی توازن قائم نہیں کیا گیا۔ یہ کہیں خط نسخ کے دائرے ہیں اور کہیں عربی رسم خط ر کی شکل کے۔ دو تین مصرعوں میں حروف استداد زمانہ سے بگڑ گئے ہیں اور ان کا پڑھنا مشکل ہے۔ خوبصورتی کو بڑھانے کیلئے اعراب اور جزم کے علاوہ جگہ بھرنے کیلئے چھوٹے چھوٹے الف یا جزم یا یکساں حروف دیدیئے گئے ہیں خط کی نزاکتیں اپنے عروج پر نظر آتی ہیں۔

عربی اور فارسی کتبے تھوڑی سی محنت کے بعد پڑھ لئے جاسکتے ہیں لیکن دکنی کتبہ کا پڑھنا خصوصاً ایسے کتبہ کا جس کی تحریر میں تسلسل بھی باقی نہ رہا ہو مشکل ہے۔ کاتب نے آخر میں اپنا نام حسین لکھا ہے اور کتبہ کی تیاری کا [illegible] دیا ہے۔ یہ پندرہ اشعار کی ایک نظم ہے جس کو شاعر غزل کہتا ہے۔ اس کو تحریر کرنے کیلئے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب الداخلہ کے سیدھی جانب چھ اشعار لکھے گئے ہیں دروازہ کے اوپر تین اور بائیں جانب چھ اشعار کے اوپر اور بازوؤں کی رکنوں کو پُر کرنے کیلئے اسمائے حسنیٰ میں سے کوئی اسم، اسمائے دوازدہ امام، حضرت خواجہ بندہ نوازؒ حضرت میراں جی اور امین الدین اعلیٰ کے القاب اور ادعیہ تحریر کئے گئے ہیں۔

دروازہ کی دائیں اور بائیں جانب ۲۰۴ سنٹی میٹر لمبا اور ۶۰ سنٹی میٹر چوڑا پتھر لیا گیا ہے۔ دونوں طرف کے کتبوں پر اوپر سے نیچے کی طرف تقریباً ۵ء۵ سم کی گنجائش لے کر اطراف حاشیہ دیا گیا ہے اور درمیان میں ایک بڑے گنبد کی تصویر بنائی ہے۔ جس کے نیچے کنول کی پتیاں ہیں اس کے نیچے ایک پٹا یا حلقہ ہے۔ اس کے نیچے کنگورے ہیں۔ کنگوروں کے دونوں سروں پر کنگوروں کی بلندی کے مساوی دو چھوٹے مینار ہیں جن پر متناسب گنبد بنے ہیں یہ ستون اور گنبدوں کی

ابتدا میں کنول کی پتیاں بنائی ہیں۔ ان کے نیچے بھی ایک حلقہ یا پٹا بنایا گیا ہے۔ بڑے اور چھوٹے سب گنبدوں پر کلس ہیں اور ان پر چاند کی شکل بنائی گئی ہے۔ گنبدوں میں تحریر موجود ہے۔ اس سے نیچے تقریباً ۴ سمر کا حاشیہ دیکر ۳۰ سمر جگہ لی گئی ہے اور اس میں مساوی لمبائی کی تین عادل شاہی وضع کی کمانیں بنائی ہیں۔ درمیانی کمان کے اوپر خالی جگہ میں آٹھ آٹھ پتیوں کے اور بازوؤں کی کمانوں پر چار چار پتیوں کے پھول ہیں اور کمان میں تحریر موجود ہے ان کمانوں کے نیچے ۱½ سمر کا حاشیہ دے کر ۲۰ سمر چوڑی آڑی محراب بنائی ہے جس کے دونوں پہلوؤں پر کنگورے دار کمانیں ہیں۔ کمانوں کے چاروں گوشوں میں چھوٹا سا دائرہ کھینچ کر مرکز پر ایک نقطہ دیا گیا ہے۔ اسی میں ایک مصرع لکھا ہے۔ اس سے نیچے ۱½ سمر کے حاشیے سے ۲۰ سمر کا فاصلہ لے کر جگہ کو تین برابر حصوں میں تین مربعے بنا کر درمیان میں دائرے کھینچے گئے ہیں اور تینوں دائروں میں تحریر ہے اس کے نیچے ۱½ سمر کا حاشیہ ہے اور پھر ۵۰ سمر کا فاصلہ لے کر اس کو تین برابر حصوں میں تقسیم کر کے اس میں اوپر نیچے عادل شاہی عہد کی وضع کی کمانیں بنا کر ان کے گوشوں میں دائرے اور درمیان میں نقطے دیئے گئے ہیں۔ پھر پہلے کی طرح تین مربعے بنا کر اس میں دائرے اور دائرے میں تحریر ہے اور اس کے نیچے آڑی کنگورے رکھنے والی محراب میں ایک مصرعہ لکھا ہے پھر اوپر کا جواب تین مربعوں کی شکل میں نیچے بھی موجود ہے۔ پھر اس کے نیچے پہلے کی طرح ۵۰ سمر کی لمبی تین کھڑی محرابیں ہیں اور اس کے نیچے حسب سابق تین مربعے مع دائرہ و تحریر ہیں اس سے نیچے ۵۰ سمر کی گنجائش میں کھڑی محرابوں میں تین مصرعے ہیں اور نیچے تین مربعے مع دائرہ و تحریر ہیں اور پھر آخر میں آڑی کمانی دار محراب ہے جو چبوترہ سے قریب ہو جاتی ہے۔ اور اس محراب میں مصرعہ کی بجائے ایک شعر تحریر ہے۔ اس ترتیب کو دروازہ کی بائیں طرف کے کتبہ پر بھی قائم رکھا گیا ہے۔ دونوں کتبوں کے درمیان باب الداخلہ پر ۸۵ سمر لمبا اور ۶۰ سمر چوڑا پتھر لے کر اس کے تین مساوی حصے کئے گئے ہیں۔ اس میں سیدھی جانب ایک حصہ میں تقریباً سابقہ ابعاد کے اندرونی دوایر کے ساتھ مربع ہیں اور درمیان میں ۵۰ سمر لمبی آڑی عادل شاہی وضع کی تین محرابیں ہیں جن کے گوشوں میں دائرے اور ان میں نقطے بنے ہیں۔ بائیں جانب اس کا جواب ہے۔ درمیانی حصہ میں یعنی دروازہ پر خوبصورت کنگوروں والی آڑی محراب بنائی گئی ہے اور اس کے گوشوں میں چار دائرے کھینچ کر ان میں عربی عبارت تحریر کی گئی ہے۔ محراب میں بھی عربی عبارت ہے۔ اس میں بہت زیادہ نقاشی کی گئی ہے اور گل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ اس طرح پورے کتبے ہیں:۔

۲ بڑے گنبد

۴ چھوٹے گنبد

۶ چھوٹی کھڑی محرابیں

۳۲ آڑی اور کھڑی محرابیں جن میں سے (۳۰) میں مصرعے اور (۲) میں اشعار لکھے ہیں۔

۲۸ مربعے جس میں دائرے ہیں اور ان میں اسما و ادعیہ تحریر ہیں۔

۱ بڑی آڑی محراب خوبصورت کنگوروں والی جس میں اللہ تعالیٰ اور کلمہ لکھا ہے یہ دروازہ کے اوپر ہے۔

۴ دائرے جو بڑی محراب کے گوشوں میں ہیں۔

گنبد اور اس کے نیچے کی کمانوں میں حسب ذیل عبارت تحریر ہے۔

دونوں بڑے گنبدوں میں:۔ انی انا اللہ (ترجمہ بے شک میں اللہ ہوں) پارہ ۲۰ سورہ القصص رکوع ۴
ﯾٰموسٰی اِنّیِ انا اللہ ربّ العالمین) ترجمہ:۔ اے موسیٰ! بے شک میں ہی اللہ ہوں سارے جہاں کا پروردگار۔

چار چھوٹے گنبدوں میں:۔ یا اللہ۔

سیدھی جانب کے کتبے کی کمانوں میں:۔ پہلے سیدھی کمان میں:۔ اللہ معافی (ترجمہ:۔ اللہ معاف کرنے والا ہے)

درمیانی کمان میں:۔ اللہ، محمد، علی۔

بائیں طرف کی کمان میں:۔ اللہ باقی (ترجمہ اللہ ہمیشہ رہنے والا ہے۔ بقا اسی کو ہے)

بائیں جانب کے کتبے کی کمانوں میں:۔ سیدھی طرف کی کمان میں:۔ اللہ کافی (ترجمہ۔ اللہ سب کے لئے بس ہے)

درمیانی کمان میں:۔ اللہ، محمد، علی۔

بائیں کمان:۔ اللہ شافی (ترجمہ۔ اللہ شفا دینے والا ہے)

کتبہ کی ابتدا بائیں جانب سے ہوتی ہے۔ اس کی سب سے نچلی سطر ۱ میں یہ ایک شعر لکھا ہے ؎

بنیاد نہاد عشق بازی   جز درد بلا نبود مقصود

۲۔ اس کے اوپر درمیانی مربع میں یا حاجت روا (اے ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے والے) اور بازوؤں کے مربعوں میں امین یا امیر مدد لکھا ہے۔ امیر سے مراد عموماً حضرت علیؓ ہیں لیکن حضرت امین الدین اعلیٰ کے دادا نام بھی امیر الدین عرفیت میاں جی اور لقب شمس العشاق تھا۔ ("یہ یا امینؓ بھی پڑھا جا سکتا ہے)

۳۔ پہلی سطر۔ پہلا مصرعہ:۔ دل بحر میں غواص ہو در صدف کے کا جیں امیں

دوسری سطر۔ دوسرا مصرعہ:۔ در بے بہا تس صدف میں جاں لوڑتوں سا جیں امیں

تیسری سطر۔ تیسرا مصرعہ:۔ گرگیان کے عرفاں یوں سنبھال سینے جیسے کر

۴۔ مربعوں میں پہلا:۔ یا صاحب الکرامات (ترجمہ:۔ اے کرامتوں والے)

دوسرا:۔ یا امیر مدد۔ (یا امین مدد)

تیسرا:۔ یا صاحب الکرامات

۵- (آڑی محراب میں) چوتھا مصرعہ: — موتی مزیں بات سے عرفان انگوں پرکار امیں

۶- (مربعوں میں) پہلا: — یاشمس العشاق (لقب حضرت میراں جی)

دوسرا: — یامعشوق ربانی (لقب حضرت امین الدین اعلیٰ)

تیسرا: — یافک المبنات (ترجمہ: اے مصائب کو دور کرنے والے) (یاآفتاب الحتاب) بھی پڑھا جاتا ہے

۷- پانچواں مصرعہ: — سو ہے منور نور توں تس حال جو ظاہر طلوع

چھٹا مصرعہ: — کرنا حضور حق او جیت ہدیہ ایس تیب توں امیں

ساتواں مصرعہ: — مقبول حق از حق ہوا ناگہ چرا کس جا دھرے (یا گہ)

۸- مربعوں میں: — پہلا - یا حاجت روا

دوسرا - یا امیر مدد - (یا امین مدد)

تیسرا - یا حاجت روا

۹- (آڑی محراب میں) آٹھواں مصرعہ: — راضی رضا حق ہو نہ تھا تھاں ذوق نادر جا امیں

۱۰ (مربعوں میں) پہلا: — یا عاشق شہباز (لقب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز۔ حضرت امین الدین اعلیٰ کو بھی اس لقب سے یاد کیا گیا ہے)

دوسرا - یا امیر مدد (یا امین مدد)

تیسرا - یا بلند پرواز (لقب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور حضرت امین الدین اعلیٰ)

۱۱- نواں مصرعہ: — اس ذوق کی تمثیل کوں کس مکھ سوں کیا کر کہوں (کر)

دسواں مصرعہ: — نا ہر کسے زہرہ تھاں نا ادکری سکیا امین

گیارھواں مصرعہ: — حق سوں وصل بھو جانت ہے تس بھا گنے تتل اللسان (حق وصل سوں)

۱۲ (مربعوں میں) پہلا: — یا نور نوری (ترجمہ اے نور، اے میرے نور)

دوسرا: — (یا امیر مدد) (یا امین مدد)

تیسرا: — یا سر سری (ترجمہ اے بھید، اے میرے بھید)

۱۳- (آڑی محراب میں) بارھواں مصرعہ: — کھن کھن منزہ روپ اپے بھوجگ اچنبہ کن امیں

(اوپر سے پہلا مصرعہ)

دوسرا کتبہ: — دروازے کے اوپر: —

سیدھی طرف - پہلی سطر - پہلا مربع - امام علی المرتضیٰ۔

تیرھواں مصرعہ :۔ ہادی ہدایت جس اپنی وصل بحرامراج ہیں۔

دوسرا مربع :۔ امام حسن المجتبیٰ صابر

دوسری سطر:۔ پہلا مربع :۔ امام محمد باقر

چودھواں مصرعہ :۔ ورنہ شفا غلب تھاں ہاریک رہ تاریک امیں

دوسرا مربع۔ امام جعفر الصادق

تیسری سطر :۔ پہلا مربع :۔ امام محمد التقی

پندرھواں مصرعہ :۔ لیکن عروج ہے سن ایتا غواص توں دل کی سمع (لیکن عروج ایتا ہے سن غواص دل کی سمع

دوسرا مربع :۔ امام علی النقی

درمیان میں عبارت بہ شکل طغرا :۔

اللہ تعالیٰ۔ لا الٰہ الا اللہ انا محمد رسول اللہ

۱۔ پہلے گوشے میں سیدھی طرف اوپر کے دائرہ میں :۔

قال رسول اللہ وبہ الشفا (ترجمہ :۔ رسول اللہ نے فرمایا "شفا اسی سے ہے۔)

۲۔ دوسرے گوشے میں بائیں طرف اوپر کے دائرہ میں :۔

رسول اللہ النبی وآلہ وصحبہ (ترجمہ :۔ نبی کریم رسول اللہ اور آپ کے آل و اصحابؓ)

۳ تیسرے گوشے میں سیدھی طرف نیچے کے دائرہ میں :۔

لَمَّا اسریٰ اِلیَ السَّمَاءِ الدُّنیا (ترجمہ :۔ جب پہلے آسمان کی طرف لیجائے گئے)

۴۔ چوتھے گوشے میں بائیں طرف نیچے کے دائرہ میں :۔

دَلَّ عَلیٰ اَثَرِ العِزِّ المَکْنُوْنَ (ترجمہ :۔ تو بارگاہ رب العزت کے راز ہائے مخفی کی طرف ہوگا

بائیں طرف۔ پہلی سطر۔ پہلا مربع۔ امام حسین الشہید کربلا۔

سولھواں مصرعہ۔ امواج نفسانی سو اللہ غیر تھیں ناڈرا میں۔ (سوغیر اللہ تھیں)

دوسرا مربع۔ امام زین العابدین

دوسری سطر۔ پہلا مربع۔ امام موسیٰ الکاظم

سترھواں مصرعہ۔ مطلوب ہے آسمان تب اشکال تا شکیل نرج

دوسرا مربع۔ امام موسیٰ الرضا۔

تیسری سطر۔ پہلا مربع۔ امام حسن العسکری۔

اٹھارواں مصرعہ۔ جا ڈوب کرا دیچار نابے چارتوں کرنا ایں۔

دوسرا ربع۔ امام محمد المہدی

تیسرا کتبہ (بائیں طرف)

۱۔ کانوں سے نیچے پہلی سطر:—

آڑی محراب میں:— انیسواں مصرعہ۔ بے چار یو دسواس سب پردا اہے تجا اس نے

۲۔ دوسری سطر:۔ پہلا ربع۔ یا مرب اللہ (ترجمہ:۔ اللہ کے حکم سے)

دوسرا ربع۔ یا امیر مدد (یا امین مدد)

تیسرا ربع۔ وکلُّ شیءٍ مِن ربّی (ترجمہ۔ ہر چیز میرے رب کے حکم سے ہے)

۳۔ تیسری سطر۔ بیسواں مصرعہ۔ مردانِ حق تن نام ہے جن ہیم اس بیٹھا ایں

اکیسواں مصرعہ۔ شاہید ہو۔ دل انگ سوں دانا دلا ورزور تر

بائیسواں مصرعہ۔ پیرے علم خاص تجے امداد دے حق سوں ایں

۴۔ چوتھی سطر۔ پہلا ربع۔ یا بندہ نواز (لقب حضرت خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودرازؒ)

دوسرا ربع۔ یا امیر مدد (یا امین مدد)

تیسرا ربع۔ یا گیسودراز

۵۔ پانچویں سطر۔ آڑی محراب میں۔ تیئیسواں مصرعہ:۔ برہان کیرے فیض سوں غوتا لیا اپ ڈھونڈنے

۶۔ چھٹی سطر۔ پہلا ربع۔ یا مفرّج العنات عنّا (ترجمہ:۔ اے ہم سے مصائب کو دور کرنے والے)

دوسرا ربع۔ یا امیر مدد (یا امین مدد)

تیسرا ربع۔ یا حدیۃ المواناح (ترجمہ:۔ اے عطایا کے سرفراز کرنے والے)

۷۔ ساتویں سطر۔ پہلی سطر۔ چوبیسواں مصرعہ۔ پایا جو تھا اب قدر تجے نہیں راہ ایں

دوسری سطر۔ پچیسواں مصرعہ۔ برہان ابن پیراں کیرے درگاہ کی سب خاک ہے

تیسری سطر۔ چھبیسواں مصرعہ:۔ تن من جان دے کرکھاں قربان ال کیتا ایں

۸۔ آٹھویں سطر:۔ پہلا ربع۔ یا فکّ المہنات۔ (ترجمہ: سائے مصائب کو دور کرنے والے) (یا نتاب المہتاب)

دوسرا ربع۔ یا معشوق ربانی۔ (لقب حضرت امین الدین اعلیٰ)

تیسرا ربع۔ یا شمس العشاق۔ (لقب حضرت میراں جی جد امین الدین اعلیٰ)

۹۔ نویں سطر۔ آڑی محراب میں:۔ ستائیسواں مصرعہ۔ خطِ غلامی سنجہ سما اسیر اس دربار کا

۱۰- دسویں سطر- پہلا ربع- یا ہادی برتر
دوسرا ربع - یا امیر مدد (یا امین مدد)
تیسرا ربع - یا ساقی کوثر

۱۱- گیارھویں سطر- پہلی سطر- اٹھائیسواں مصرعہ :- آزادگی کونین تجھ میں سنجھے پایا امیں۔
دوسری سطر- انتیسواں مصرعہ :- ابیات خالی پنج دہ تمت کیا اسے غزل میں
تیسری سطر- تیسواں مصرعہ :- مفہوم کر ستار ہو نا عیب جو ہونا امیں

۱۲- بارھویں سطر- پہلا ربع- یا امیر مدد (یا امین مدد)
دوسرا ربع - یا حاجت روا
تیسرا ربع - یا امیر مدد (یا امین مدد)

۱۳- تیرھویں سطر- آلائے علیا لبنیا د نہاد عشق بازی جز درد بلا نبود مقصود

کتبہ حسین ۱۳۰۸ھ

کتبہ کا مفہوم

شعر ۱- اے امین! صدف کی روح کیلئے دل کے سمندر میں غوطہ زنی کیجئے تو آپ جان کے نور کا بیش قیمت موتی حاصل کریں گے
مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ :- (جس نے اپنے آپ کو پہچانا گویا اس نے خدا کو پہچان لیا) کی طرف اشارہ ہے
شعر ۲- اے امین! مرشد کا تصور کر کے سیپی چیر کر مزین موتی حاصل کیجئے اور عرفان کو پیش نظر رکھئے۔
شعر ۳- آپ تو ایک منور نور ہیں۔ جب آپ عرفان پالیں تو اپنے آپ کو موزوں اور مناسب ہدیہ کے طور پر بارگاہ خداوندی میں پیش کیجئے۔
شعر ۴- آپ خدا کی بارگاہ میں مقبول ہیں۔ اب اور کہاں جاسکیں گے۔ خدا آپ سے راضی اور خدا پر آپ فدا ہیں۔ اس کے سوا آپ کا کوئی دوسرا ذوق نہیں۔
شعر ۵- میں اس ذوق کی مثال آپ کے سامنے کس منہ سے پیش کر سکتا ہوں (آپ کے جیسا دوسرا کس کو بتلا سکتا ہوں) ہر شخص کی ایسی جرأت نہیں ہوتی اور نہ ہر شخص امین بن سکتا ہے۔
شعر ۶- خدا تک رسائی حاصل کرنے کے متعدد طریقے ہیں لیکن ہم اس کے اظہار پر قادر نہیں۔ اس سے ہماری زبان گنگ ہے۔ اس کی پاکیزہ اور لطیف شکل لمحہ بہ لمحہ حیرت میں ڈالنے والی ہے۔
شعر ۷- اس طوفانی اور متلاطم سمندر میں وصل اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جس کو ہادی امرشد اکی ہدایات ارا ارہ کا

حاصل ہو۔ ورنہ یہ راستہ نہایت باریک اور تاریک ہے اس لئے بدنصیبی کا امکان ہے۔

شعر ۸۔ لیکن اے غواص! تو دل کے کانوں سے سن کہ عروج جب ہی حاصل ہوتا ہے جب کہ خواہشات نفسانی کو ترک کریں اور اے امین! سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈریں۔

شعر ۹۔ اے امین! آپ کیلئے مطلوب یا مقصود کا پانا آسان ہے۔ اس میں آپ کیلئے کوئی دشواری نہیں آپ ان اسرار و غوامض پر غور و فکر کرکے ہماری رہنمائی کیجئے۔

شعر ۱۰۔ یہ خیالات بغیر غور و فکر کے راز ہی رہیں گے (ان پر پردہ پڑا رہے گا) اے امین! مردان حق وہی کہلائے جاسکتے ہیں جن کے دل میں حق کی محبت جاگزیں ہے۔

شعر ۱۱ تو دل و جان سے گواہ بن اور اپنے خاص علم اور رشد امین سے جو دانا اور بہت زیادہ دلاور ہیں حق کو جاننے کیلئے مدد لے۔

شعر ۱۲ آپ نے برہان کے فیض سے اپنے آپ میں غوطہ لگا کر عرفان حاصل کیا ہے۔ اس لئے اب آپ کے برابر درجہ میں کوئی نہیں ہے۔

شعر ۱۳۔ امین نے برہان بن میاں کی درگاہ کی خاک پر تن من جان اور طاقت سب قربان کردی ہے۔

شعر ۱۴ مجھے اس دربار سے خط غلامی مل گیا جس نے مجھے اسیر کرلیا ہے اور اے امین! میں نے کونین سے آزادی حاصل کرکے تجھے پالیا ہے۔

شعر ۱۵ میں نے پندرہ اشعار میں یہ غزل ختم کی ہے۔ اے امین! آپ انھیں سمجھ کر میری عیب پوشی کیجئے اور میری برائیوں کی چھان بین نہ کیجئے۔

سیدھے اور ریاضی کتبوں کا آخری شعر:-

بنیاد نہاد عشق بازی   جز درد بلا نبود مقصد

عشق بازی کی بنیاد بلاؤں اور تکالیف کی اصل کے سوا کوئی مقصود نہیں رکھتی۔ بالفاظ دیگر میدان عشق میں قدم رکھنے کے بعد ہم مصائب و آلام کے سوا کچھ حاصل نہیں کرتے۔

مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) نے اپنے مضمون مطبوعہ اردو جنوری ۱۹۲۸ء میں اسی کتبے کے پانچ شعر کسی مخطوطے سے نقل کئے ہیں اور انھیں امین الدین اعلیٰ سے منسوب کیا ہے۔ پوری نظم کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کے ہی مریدنے لکھے ہیں۔ شاعر کا ابھی تک ہمیں علم نہ ہوسکا نظم میں اس کا کوئی اشارہ بھی نہیں۔ مولوی صاحب مرحوم کے منتخبہ اشعار حسب ذیل ہیں۔

دل بحر میں غواص ہو زور ح صدف کے کام میں امیں   بے باہ در تس صدف میں نور جاں تو سمجھیں امیں

گر گیان کے عرفان سوں سنبھال سینے چیر کر   موتی مزین ہات لے عرفاں انگوں پہ کار امیں

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

ڈاکٹر ظفر السعید اختر

تاج الحقائق کا فنی تجزیہ

دبستان گولکنڈہ کے ادیبوں اور شاعروں میں ملا وجہی پہلے ہیں جنہوں نے صوفیانہ ادب میں فنی گلکاریاں کی نیوڈالی قطب مشتری (۱۰۱۸ھ مطابق ۱۶۰۹ء) وجہی کی پہلی ادبی تخلیق ہے۔ اگرچہ قطب مشتری کا موضوع ایک عشقیہ داستاں ہے لیکن وجہی کے مزاج میں پوشیدہ تصوف کے شرارے اس میں بھی جا بجا جلوہ گر ہوگئے ہیں۔ فنی نقطہ نظر سے وجہی عشق حقیقی اور عشق مجازی کے عناصر کی پیوند کاری بڑی خوبی کے ساتھ کرتے ہیں جس کی مثال میں قطب مشتری کا ایک باب بعنوان "در تعریف عشق" قابل ستائش ہے۔

راقم کی رائے میں تاج الحقائق جس کا سرتاسر موضوع تصوف ہے وجہی کی دوسری تصنیف ہے[1] محققین کی نظر میں تاج الحقائق فارسی کی ایک تصنیف کا ترجمہ تصور کی جاتی ہے لیکن اس کی فنی اور لسانی خوبیاں محققین کے اس قیاس کو باطل کر دیتی ہیں۔ البتہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں کہ وجہی نے تاج الحقائق کی ترتیب میں ان فارسی تصانیف سے خوشہ چینی کی ہے جن کا موضوع سرتاپا تصوف ہے۔

تاج الحقائق ایک قابل قدر رشحہ قلم ہے۔ اگرچہ موضوع کی قید نے وجہی کی دیگر ادبی صلاحیتوں کو اس میں آشکار نہیں ہونے دیا تاہم اس کی صوفیانہ سطح نہایت ہموار اور صاف ہے۔

درحقیقت تصوف کے پیچیدہ مسائل کو عام فہم زبان کے پیش کرنے میں وجہی کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا ذیل کے اقتباسات وجہی کی وسعت نظری، فنی چابکدستی اور دنیوی مشاہدات اور تجربات کے بہترین نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں۔

عقل اور دل کے درمیان حالانکہ بعد المشرقین ہے لیکن دراصل زندگی کا سلسلہ دونوں کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتا ہے یہ ہم آہنگی اسرار الٰہی کے پردے چاک کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ سالک کیلئے عشق حقیقی مراط مستقیم ہے اور بقول وجہی: —

"اگر توں اپنا حال جان نی منگتا ہے توں دل کوں اپنا پوچھ جکیچ دل بلا اختیار بول اٹھیگا دوچ تیرا حال ہے۔ اگر عقل کے نزدیک [illegible]

[1] [illegible] یہ بات پایہ ثبوت کو نہ پہنچ سکی کہ تاج الحقائق وجہی کی تصنیف ہے [illegible]

تو کا فر ہو ویگا مردود ہو ویگا خراب ہو ویگا اگر عشق کے زور سوں دل جیوں ہے تیوں
بولیگا ہوں تو ن بھی دو ج بولیگا تو تمام صواب ہو ویگا۔[۱۱]

معرفت کی راہ میں عاشق اور معشوق کے درمیاں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ وجہی کے نظریہ کے مطابق طالب حق کو چار آزمائشی مقامات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور جب وہ کامیابی کے ساتھ ان مقامات کو عبور کرتا ہے تو وہ حقیقی معنوں میں عاشق صادق کہلاتا ہے۔

"اری طالب عاشق جو لگن عاشق ہے تو لگن لا الٰہ الا اللہ ' الا اللہ اللہ
کہتا ہے جو معشوق ہوتا ہے تو انا اللہ کتا ہے۔ جو آپیچ عشق ہوتا ہے تو ان کتا ہے
یہ چار مقام ہیں۔ یو چار مقام جو کوئی حاصل کیا وہ بہوت بڑا سبحان اللہ۔[۱۲]

ہر چند کہ تصوف کے مسائل پھیکے اور خشک ہوتے ہیں۔ ان کے ادراک کیلئے ایک خاص ذہنی اور روحانی لگاؤ کا ہونا ضروری ہے۔ وجہی نباض وقت تھے وہ فن شاعری پر پوری طرح قدرت رکھتے تھے۔ لہذا انھوں نے تاج الحقائق کے بے رنگ اور بے رس مسائل کو تشبیہوں اور تمثیلوں کا جامہ پہنا کر صاف ستھرے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ وجہی کی اس کارگزاری کو اُن کے فنی شعور پر محمول کیا جا سکتا ہے ملاحظہ ہوں ذیل کے اقتباسات۔

(الف) "خلق جاہل ہے ' خلق دنیا پر مائل ہے ' خلق کوں نہ دو انکھیاں ہیں نہ دو دل ہے '
خلق ناداں ہے ' ناداں تی ڈرنا ' دو عالم جدا ہے یو عالم جدا ہے۔ اُس عالم کی بات
اس عالم کے لوگاں کتی عاقل ہرگز نہ کرنا۔ یو حیوانا علف کھاتی میں پھول انو کی انگی
رکھے تو کیا انوں کون باس آئیگی۔[۱۳]

(ب) "اری طالب :- اگر خودی مری تو خدائی ہوئی و اگر خود مری تو خدا ہوئی ' جیوں پارا
مرا تو کلنگ ہوا جیو تسبیح مرئی بغیر کمال کون نیں انپڑیا ...... الیکوں ار[۱۴]

(ج) میں سو بندہ جیوں نور ہے ' او سو جیوں آفتاب ' خدا ہے۔ نور آفتاب تہی نکلتا '
یو نور ہور آفتاب کیا جدا ہے ..... یو دونو لازم و ملزوم ہیں۔[۱۵]

صوفیانہ حقائق کی توضیح کیلئے وجہی غیر ضروری تفصیل اور طویل بیانات سے احتراز کرتے ہیں۔ معرفت اور حقیقت کے سلسلے میں اگرچہ انھوں نے مفصل بحث کی ہے لیکن عشق ' دل اور راگ جیسے موضوعات پر جامع مگر مختصر لکھا ہے۔ ذیل میں دیئے ہوئے اقتباسات اُردو ادب کے اولیں انشائیے قرار دیئے جا سکتے ہیں ' ان انشائیوں کی

---

[۱۱] تا [۱۵] تاج الحقائق ملا وجہی۔

نکھری ہوئی شکل ہیں سب رس میں ملتی ہے ملاحظہ کیجئے :۔

(الف) دل کی حقیقت و ماہیت :۔

"اری طالب' دل عرش ہے' دل یو عرش خدا کا خلوت خانہ ہے۔ اپنی خواہش چھوڑ کیا اس خلوت خانے میں جاتا ہے۔ اس خلوت خانے میں خدا سوں مل مل اچھنا' محفوظ ہونا' خدا بغیر یو دسری فکر کی ٹھار نیں"[1]

(ب) عشق :۔

"تیغ تر سینے کا قانون عشق ہے نہ سینے کھیلنے کا قانون عشق ہے؛ رسوائی کی مجلس میں بیٹھ کر غم کی پیالی جھیلنے کے قانون عشق ہے۔ اس کی حرواکی ہیچ خوبی ہے۔ سو انسان کی عاشق ہوئی میں ہے۔ عاشق کوں جو سواد ہے سو تیغ ہور ترسی ہور سولی میں ہے"[2]

(ج) راگ :۔

"راگ سننا عاشق لوگاں کا عبادت ہے۔ عاشق نے اس عبادت میں تیں حق حاصل کرلیا۔ راگ ایک آواز ہے کہ اس آواز میں عاشق جانباز کوں محرم راز کوں ہزار نیاز ہے۔ اس آواز میں خدا سوں' ایک ایک باتاں ہوتیاں ہیں کہ او فراغ جاتا ہے' نزدیک جو کھلایا ہوں وہی بہوت دور دراز ہے او وانکا قانون' یا ن تھلاتا بلکہ کام تیری جیو پر آتا ہے' توں یونیں پایا کہ یاں کیا ہے اس آواز میں تمام عشق بھریا ہے۔ اس آواز میں تمام عشق بھریا ہے۔ اس آواز میں عشق جا گا کریا ہے۔ اس آواز میں سر خدا ہے: اس آواز میں اس کے چوں و بے چگونے کی صفت دس آتی ہے"[3]

مقفیٰ اور مسجع عبارتوں کا رواج متقدمین میں عام تھا۔ اگرچہ وجہی نے تاج الحقائق میں سب رس کے مقابلے میں مسجع اور مقفیٰ طرز پر زیادہ زور نہیں دیا ہے تاہم جہاں کہیں ایسی عبارتیں آئی ہیں وہاں ان کا اسلوب نگارش نکھر گیا ہے ملاحظہ فرمایئے ذیل کی عبارت :۔

"یو تمام کفر یو تمام دغا بازی یو تمام نالائقی یو تمام لا اعتباری یو کون اورتی یو کوں عاشقی یوں کوں محبت یو کوں یاری ایسا کام اد کری جسی خدا سوں کے کام نا اچھیا حیران اچھی کہ کام نا اچھی"[4]

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

۱۔ تاج الحقائق وجہی ۲۔ تاج الحقائق وجہی ۳۔ تاج الحقائق وجہی ۴۔ تاج الحقائق وجہی

اندرجیت دت

کمی ......!

"فرمایئے! میں کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی؟"

مدیر داستاں گو نے نووارد سے مصافحہ کے تکلفات سے نپٹتے ہوئے پوچھا۔

"آپ اور کوئی خدمت! یہ بات کم از کم میرے ذہن سے بالا ہے اسلئے تو مجھے خود حاضر ہونا پڑا۔"

"بھئی خوب! میں نہ جانتا تھا کہ آپ طنز لکھنا ہی نہیں کرنا بھی جانتے ہیں۔"

اور شاید اسی جدت کی قربان گاہ پر میرے چار افسانے ذبح کرکے آپ نے مجھے کسی بے بہا انعام سے سرفراز کرنے کی ٹھانی ہے۔"

اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے نامقبولیت کی چار چٹھیاں نکال کر اوپر کی میز پر پھینکتے ہوئے تمسخر آمیز لہجے میں جواب دیا۔

"تو جناب محض ان سرٹیفکیٹوں کو لوٹانے کی عقیدت کے زیر اثر اتنی دور سے چل کر یہاں تشریف لائے ہیں اور اس معمولی سی بات کے لیے آپ نے مجھ سے دفتر کی بجائے گھر پر ملاقات کرنے کی التجا کی تھی۔"

"آپ کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش میں یہ بتانا ضروری ہو گیا ہے کہ میں پچھلے پندرہ روز سے آپ کے شہر میں ہوں۔ آپ کے علاوہ مجھے کئی اور اصحاب سے بھی ملنا تھا۔ چونکہ آپ کے ادارے سے لوٹائے گئے مسودوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی اس لئے میں نے آپ کی خدمت میں سب سے آخر میں حاضر ہونا مناسب سمجھا اور وہ بھی آپ کے دولت خانے پر!"

آپ کے اس بیان سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ ہم آپ کی تخلیقات لوٹانے میں حق بجانب تھے کیونکہ آپ کے اقرار کے مطابق دوسروں نے بھی اُنھیں اسی عزت افزائی کے قابل سمجھا۔"

"خیر ہر جگہ ایک سا سلوک نہیں ہوا۔ آپ کے شہر سے نکلنے والے چند جریدوں نے میری تخلیقات شائع بھی کیں اور قارئین نے اُنھیں پسند بھی کیا۔ اسی لئے میں ایک عرصہ سے خواہشمند تھا کہ آپ سے مل کر اپنے عیوب سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد سدھرنے کی ایک اور سعیٔ ناکام کرسکوں۔"

"دیکھئے ناشاد صاحب! جہاں تک اسلوب بیان، تکنیک اور طرز نگارش کا سوال ہے۔ آپ کی

تحریرات ہر کسوٹی پر کھری اترتی ہیں۔ روانی بھی خوب ہوتی ہے اور کہیں کہیں الفاظ کی ... کے ذریعے آپ قاری کی دلچسپی میں مزید اضافے کے سامان پیدا کرنے میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ لیکن......

"ہاں ہاں! صاف صاف کہہ ڈالیے مجھے اصلیت جان کر خوشی ہوگی"

"لیکن ---- لیکن --- میں خود اس نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہا ہوں کہ آپ کی تخلیقات کو واقعی اس ہی کو کس نام سے منسوب کیا جائے۔ کچھ موضوعاتی بھی ہے۔ اور شاید قدرے جذباتی بھی۔"

"یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ موضوع کے انتخاب اور کرداروں کے جذبات کو سفوف قرطاس پر ڈھالتے وقت میرا قلم لڑکھڑا جاتا ہے اور یہ خامی سب صفاتِ حسنہ پر حاوی ہو کر مدیران کو میری تخلیقات لوٹانے پر مجبور کر دیتی ہے؟"

"کسی حد تک آپ میرے نکتۂ نگاہ کو پا گئے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ میری ناچیز رائے میں ایک اہم موضوع کو دل کی گہرائیوں سے نہ چھو پانا اور نگارشات میں نیاپن نہ آ سکنا بھی ہے۔ اور شاید میں ان وجوہ کے زیرِ اثر آپ کو پرچے میں جگہ دینے میں ایک اجنبی ہچکچاہٹ کا احساس کرتا رہا ہوں۔"

"کیا مسودے لوٹاتے وقت آپ کے دل میں کبھی ان کے خالق کے ناآموز یا گمنام ہونے کا خیال پیدا نہیں ہوا؟"

"ناشاد صاحب! حق بات تو یہ ہے کہ یہ خیال ہر ایک مدیر کے ذہن میں آنا ایک لازمی امر ہوتا ہے۔ شاید آپ کے پہلے دو افسانے اسی خیال کا شکار ہو گئے ہوں، لیکن تیسرے اور چوتھے پر یہ الزام دھرنا سراسر ناانصافی ہوگا۔"

"اس صاف گوئی کیلئے شکریہ دلشاد صاحب! ناچیز آئندہ کاوشوں میں آپ کے اعتراضات کو ذہن میں رکھ کر حسن حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ اچھا اب اجازت چاہوں گا۔"

"ارے میاں! ایسی خودغرضی بھی کس کام کی۔ مطلب نکلتے ہی آپ کو نو دو گیارہ ہونے کی سوجھی۔ اب اگر میرے غریب خانے پر آ ہی گئے ہوں تو تھوڑی بہت میزبانی کا بھی شرف بخشو۔"

دلشاد نے اتنا کہہ کر میز کے کونے میں لگے بٹن کو دبایا اور گھر کے اندر ٹننن ٹن! گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے بغل سے دروازے کو پاؤں سے کھولتی ہوئی ایک درمیانی عمر کی عورت ہاتھ میں کشتی تھامے اندر داخل ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ کشتی میز پر رکھ کر اس نے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اور سر کی جنبش کے ساتھ مہمان کا خیر مقدم کیا۔ پھر وہ دلشاد کی بغل والی کرسی پر بیٹھ کر چپ چاپ چائے بنانے میں مصروف ہو گئی۔

"ارے ناشاد! یہ ہیں جناب ... ... چائے ... ... کی غلطی کے ... میری ہڈی پسلی ایک کر دینے کے ارادے سے یہاں تشریف لائے تھے۔" پھر اس نے رخ ناشاد کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ہیں ہماری پرائیوٹ سکریٹری - وزیر امور خانہ داری بیگم دلشاد — !"

ناشاد نے کرسی سے اونچا اٹھ کر بیگم دلشاد کو آداب کہا اور مارتھا نے سر کو ایک اور جنبش دینے کے علاوہ ہونٹوں پر وہی پھیکی سی مسکراہٹ لاکر ناشاد کے سلام کا جواب دیا۔ عورت اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی لگتی تھی پھر بھی اس کے چہرے سے صاف پڑھا جا سکتا تھا کہ جوانی میں از حد حسین رہی ہوگی۔ چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے ناشاد کسی نامعلوم کشش کے زیر اثر اسے کنکھیوں سے گھورنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ اچانک ایک بار ایسا کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ ناشاد نے اس کی چوری پکڑ لی ہے۔ اس نے خفت مٹانے کی غرض سے نظریں سامنے دیوار پر لگی ایک پرانی تصویر پر گاڑ دیں۔ ناشاد نے واقعہ کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ناشاد صاحب! کیا آپ نے کبھی کسی عورت سے ٹوٹ کر محبت بھی کی ہے؟"

"اور میں آج تک اس قول کو حرف بہ حرف صحیح ماننے کی غلطی کرتا رہا ہوں کہ "محبت ہو سکتی ہے" کی نہیں جاتی!"

"دیکھئے آپ پھر طنز پر اتر آئے۔ چلو یوں ہی سمجھ لو کہ جناب کو کسی سے یا کسی کو جناب سے محبت ہوئی تھی کہ نہیں؟"

"کیا میں اس تصویر سے متعارف ہونے کی درخواست کر سکتا ہوں؟"

ناشاد نے کمال ہوشیاری سے سوال کا جواب نہ دے کر نیا سوال کر دیا۔ مدیر نے قدرے سر گھما کر تصویر کو دیکھا اور پھر اپنی نظریں مارتھا کے سپاٹ چہرے پر دوڑاتے ہوئے، ناشاد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"حالانکہ آپ کا سوال میرے سوال کا مکمل جواب نہیں پھر بھی قابل جواب ہے۔ اس ماڈرن طریقۂ آرائش سے لدے ہوئے کمرے میں ایک بوسیدہ تصویر دیکھ کر ہر کسی کا حیران ہونا قدرتی بات ہے۔ آپ نے بھی شاید اسی تضاد کے زیر اثر یہ سوال کیا ہے۔ میرے کان اس سوال کو سننے اور کوئی جواب نہ دینے کے عادی ہو چکے ہیں"

"کیا اس تصویر سے متعارف کروانے میں، آپ کے کسی ذاتی راز سے پردہ اٹھنے کی پہیلی نکل آتی ہے؟"

"اس سوال کا جواب "ہاں" اور "نہیں" دونوں میں دیا جا سکتا ہے۔"

"تو اس کے بارے میں مزید ایک لفظ کہنا بھی سراسر حماقت ہوگی"

"لیکن میرے بہت سے احباب کئی بار یہ حماقت کر چکے ہیں۔ پھر بھی سوائے میرے اور مارتھا کے کوئی اس تصویر سے متعارف نہ ہو سکا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ آج میں کسی انجانی کشش کے زیر اثر آپ کو اس بارے میں تفصیل سے بتانے پر مجبور ہوتا جا رہا ہوں"۔

دلشاد نے معنی خیز نظروں سے مارتھا کو دیکھا اور وہ بڑے بھی جلدی جلدی سامان بھر کر اسی دروازے سے

گھر کے اندر چلی گئی۔ جب دروازہ بند ہو گیا تو دلشاد نے ایک بار پھر تصویر کو دیکھا۔ تھوڑی دیر کیلئے آنکھیں بند کیں کچھ سوچنے کے بعد وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ناشاد سے یوں گویا ہوا۔

'تصویر میں نظر آنے والے کا نام نرلش ہے یا تھا۔ ہم ایک ہی گاؤں کے باشندے اور ہم جماعت تھے وہ انتہائی بذلہ سنج اور حاضر جواب تھا اس کے برعکس میں انتہائی کم گو اور سنجیدہ قسم کا لڑکا تھا جب کالج میں داخلے کا وقت آیا تو اس نے ڈاکٹری لی اور مجھے والدین کی مرضی کے مطابق جرنلزم لینا پڑا۔ کالج مختلف ہونے کے باوجود ہماری دوستی قائم رہی۔ گاؤں کی ایک لڑکی مرنالنی سے اُسے محبت تھی۔ ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد دونوں کی شادی بھی ہوئی لیکن دوسرے دن وہ گھر سے غائب ہو گیا۔ مرنالنی اس غم میں بستر علالت پر کچھ اس طرح دراز ہوئی کہ میری اور رشتہ داروں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اس کی لاش ہی وہاں سے اٹھائی جا سکی اس حادثے نے میرے دل و دماغ میں ہیجان پیدا کر دیا اور میں سرکاری ملازمت اختیار کر کے کلکتہ چلا گیا۔ وہاں ایک سال قیام کے بعد میرا تبادلہ جزائر انڈیمان میں ہو گیا۔

"شاید میں اتنی دور جانے سے انکار کر کے گھر لوٹ آتا۔ لیکن مرنالنی کی موت اور نرلش کی روپوشی کے واقعات ابھی تک ذہن پر سوار تھے اس لئے میں نے تبادلہ منظور کر لیا۔ ایک چھوٹے جزیرے میں مجھے نگران افسر مقرر کیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد میری تعیناتی ایک ایسے جزیرے میں ہوئی جو سب سے الگ تھلگ تھا۔ اور بحری جہاز دا اکا گزر ادھر سے شاذ و نادر ہی ہوا کرتا تھا۔ جب میں جہاز سے اتر کر ایک کشتی میں سوار وہاں پہونچا تو ساحل پر ایک ڈھلان پر واقع چھوٹی سی بنگلہ نما جھونپڑی نے پہلی نظر میں میرا دل جیت لیا۔ گائیڈ کی زبانی پتہ چلا کہ یہ بنگلہ ایک ڈاکٹر نے بنوایا تھا۔ جو ایک دن ادھر سے گزرنے والے بحری جہاز میں تحائف کے تبادلے کی غرض سے گیا اور پھر واپس نہ آیا۔"

"اس ڈاکٹر کی داستان بھی بنگلے سے کچھ کم دلچسپ اور خوبصورت نہ تھی۔ وہ ایک دن کسی بڑے جہاز سے اتر کر کشتی میں بیٹھ کر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جزیرے کی سیر کیلئے آیا تھا۔ وہاں ایک دیہاتی دوشیزہ کے ساتھ سیر کرتے کرتے وہ لڑکی اور جزیرے کی خوبصورتی میں اس قدر کھو گیا کہ کئی روز تک واپس نہ آیا۔ اس کے ساتھی ناچار واپس چلے گئے۔ اُس نے ڈھلان پر ایک خوبصورت جھونپڑی بنوا کر اس میں اس دوشیزہ کے ساتھ بود و باش اختیار کر لی جزیرے کے لوگ اس کی آمد پر بہت خوش تھے کیوں کہ وہ ایک ماہر ڈاکٹر تھا اور بیماریوں کا علاج بڑی جانفشانی سے کرتا تھا۔ دونوں کو آپس میں بے پناہ محبت تھی۔ ان کی محبت کا ثمر ایک خوبصورت لڑکے کی شکل میں رونما ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی ادھر سے گزرنے والے جہازوں سے وہ ضروری سامان، جزیرے کی پیداوار کے تبادلے میں لے آتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک جہاز ادھر سے گزرا اور وہ کشتی میں بیٹھ کر وہاں گیا۔ لیکن پھر لوٹ کر نہ آیا۔ لڑکی بچے کو چھاتی سے لگائے، ساحل پر کھڑی پہروں اس کا انتظار کرتی رہتی۔ اُسے اپنی سدھ بدھ بھی نہ رہی اور بچہ بھوک و پیاس سے بلک بلک کر مر گیا وہ لاش کو چھاتی سے لگائے ساحل پر گھومتی رہتی۔ آخر ایک دن باشندوں نے زبردستی لاش اس کی باہوں سے

چھین کر دفن کر دی۔

"میرے وہاں پہنچنے پر بھی وہ نیم بیداری کے عالم میں اِدھر اُدھر گھوما کرتی تھی۔ بنگلے پر قابض ہونے پر پہلے اُس نے بُرا مانا، لیکن آہستہ آہستہ وہ مجھ سے مانوس ہوتی گئی اور گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینے لگی۔ جلد ہی مجھے علم ہوا کہ وہ رات کی تنہائی میں ایک تصویر سامنے رکھکر زار زار رویا کرتی ہے۔ موقع پا کر وہ مسخ شدہ تصویر میں نے چھپا دی۔ لیکن اس کے بارے میں وہ کوئی حرفِ شکایت لب پہ نہ لائی۔ اس طرح کئی سال بیت گئے ایک دن ادھر سے ایک بحری جہاز کا گذر ہوا اور کشتی میں بیٹھ کر ایک ملاح جزیرے پر اترا۔ اس کے چہرے پر بحری سفر کے مصائب کے نقوش جا بجا تھے۔ الجھے ہوئے کھچڑی بال اور پرانا لباس اُس کی حالتِ غیر کی گواہی دیتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ لیکن جب اُس نے ہندوستانی زبان میں مجھ سے مصافحہ کیا تو اتنے عرصہ بعد ایک ہم وطن سے ملاقات ہونے پر وہ مجھے کسی فرشتہ سے کم نہ دکھائی دے رہا تھا۔"

"دورانِ گفتگو میں پتہ چلا کہ وہ نرلیش ہی تھا۔ اور وہ ڈاکٹر بھی جو اچانک اس جزیرے سے غائب ہو چکا تھا۔ مارتھا اور نرلیش سامنا ہوتے پر ایک دوسرے کو نہ پہچان سکے۔ بار بار کوشش کے باوجود میں اپنی اصلیت اس پر ظاہر کرنے سے قاصر رہا۔ جب وہ شام کو چلا گیا اور اس کا جہاز ہماری نظروں سے دور ہو گیا تو میں نے مارتھا کو اجنبی کے بارے میں بتایا۔ مارتھا اپنے محبوب کو اس حالت میں نہ پہچان سکنے کے غم میں کئی روز تک آہ و زاری کرتی رہی۔ لیکن ایک دن اُس نے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا۔ تب سے ہم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ میری ہزار کوشش کے باوجود وہ اس تصویر کو تلف کرنے پر رضامند نہیں ہو سکی۔ شاید اُسے یقین ہے کہ اس کا محبوب زندہ ہے اور ایک دن ضرور اُس سے ملنے آئے گا۔"

"کہیئے ناشاد صاحب! کیسا رہا اس تصویر کا تعارف؟"

"بہت دلفریب اور دلچسپ داستان سنائی ہے آپ نے دلشاد صاحب!"

"ہاں کچھ ایسی ہی ہے۔ کیا آپ ایسی ہی کوئی دلچسپ کہانی جو ہر لحاظ سے مکمل حقیقت دکھائی دے سپردِ قلم کر سکتے ہیں؟"

"یہ تو ناممکن سی فرمائش کر دی آپ نے۔ پھر بھی بھرپور کوشش کروں گا۔"

———— (∴) ————

چند دن بعد مدیرِ داستان کو ایک لفافہ موصول ہوا، جس میں یہ خط تھا۔"

محترمی دلشاد صاحب!

لیجئے آپ کی نامکمل داستان مکمل کر رہا ہوں میں ٹاپو پر مارتھا کی تلاش میں گیا تھا۔ لیکن وہاں پر اپنے دوست کو

اپنے درمیان میں پا کر اپنی محبت کو دوستی کی قربان گاہ پر چڑھانے کیلئے مجبور سا ہو گیا تھا۔ مالتی سے دور بھاگنے کی اہم وجہ بھی اس کا مجھے نہ چاہ کر رمیش کو محبت کرنا تھا۔ کوئی اور راستہ نہ پا کر یہی مناسب سمجھا کہ میرے غائب ہو جانے پر دونوں کو نئے حالات کے مطابق اقدام کرنے کا راستہ صاف ہو جائیگا۔ لیکن رمیش نے مالتی کو اپنانے کی بجائے اس کے گھٹ گھٹ کر مرجانے میں ہی اپنی بہتری سمجھی۔ میں ... ضروری اشیاء اور ادویات لینے گھوم سے گیا تھا لیکن وہاں عملے کی کمی نے کیپٹن کو مجھے زبردستی ساتھ لے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ رمیش کو شاید یہ ہی مجبوراً ... اور میرے لکھے ہوئے ناولوں اور افسانوں کے مسودے بھی ہاتھ آ گئے تھے۔ جو میں نے دلشاد کے نام سے لکھتے تھے میں اور رمیش ایک دوسرے کو پہلی نظر میں پہچان گئے تھے لیکن رمیش کی نیت میں فرق پا کر میں نے اجنبی کا سوانگ رچایا تھا البتہ مارتھا بدلے ہوئے حلیئے کی وجہ سے مجھے نہ پہچان پائی تھی اور رمیش نے اُسے مجھ سے قریب آنے کا موقع بھی نہ دیا تھا۔"

جب میں ہندوستان پہنچا تو اپنے ناولوں اور افسانوں کو دلشاد کے نام سے شائع پا کر مجھے آپ کا پتہ لگانے کی فکر ہوئی۔ آپ نے محبت کو پا لینے کے بعد میری تخلیقات سے بھی ناجائز فائدہ اٹھایا اور شہرت پائی۔ آخر آپ ایک بہت بڑے جریدے کے مالک و ایڈیٹر بھی بن گئے۔ اگر اس دن آپ میری داستانِ غم توڑ مروڑ کر بیان نہ کرتے تو شاید میں یہ غم بھی سہہ لیتا۔ اس ملاقات میں سب سے بڑھکر قابلِ مسرت بات یہ تھی کہ آپ بھی مجھے پہچاننے سے قاصر رہے۔ بس میری تخلیقات میں یہی کمی ہے جسے آپ کوئی نام دینے میں ہمیشہ قاصر رہیں گے۔ جب یہ خط آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تب میں کسی بحری جہاز میں سوار دم بدم اُس جزیرے کے قریب ہو رہا ہوں گا۔ جہاں پیری اور مارتھا کی لافانی محبت کی یادگار جھونپڑی کے در و دیوار اس شکستہ پا کے خیر مقدم میں بے قرار ہیں۔

تمہارا

نریش — عرف ناشاد

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۷ سے آگے) تاج الحقائق جو وجہی کی آخری تصنیف قرار دی جا سکتی ہے۔ اس میں ہر خاص و عام کیلئے ایک طرف روحانی کیف و سرور ملتا ہے تو دوسری جانب ڈاکٹر اسمعیل بخاری کی ذیل کی رائے جو انھوں نے سب رس کے پند و نصائح کی جاذبیت اور دلکشی کی بابت قائم کی ہے "تاج الحقائق" پر بھی کسی قدر صادق آتی ہے۔

"ان میں جوش، خلوص، صداقت اور رعنائی کی جو خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں وہ مصنف کے ادیبانہ مذاق۔ طلاقتِ لسانی اور معلومات و تجربات کے وسیع ذخیرے پر دلالت کرتی ہیں۔ وجہی ہر بات پھیلا کر اور نکتہ سمجھا کر بیان کرتا ہے۔ ہر باریکی کو مثالوں سے کھولتا اور سمجھاتا ہے یوں لگتا ہے کہ بات عامی سے عامی تک کے ذہن نشین ہو جائے پھر وہ بے تکان جملے پر جملے جوڑتا اور خیال کو یوں آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے کہ قاری کو ایک خوشگوار سی حیرت محسوس ہونے لگتی ہے"[1]

[1] اسب رس پر ایک نظر۔ سہیل بخاری ص۲

حفیظ صدیقی

اس طرح گذرتی ہے اب تو زندگی تنہا
جس طرح زمستاں میں شب کو چاندنی تنہا
تو سراپا محفل ہے، پس سراپا تنہائی
تجھ سے دور بھی تنہا، تیرے پاس بھی تنہا
جب ترے تصور میں دور کچھ نکلتا ہو
اپنے کام آتی ہے، اپنی بے خودی تنہا
خلوتوں میں سنتا ہوں جلوتوں کی گویائی
سو فریب دیتی ہے تیری خامشی تنہا
زندگی کی راہوں میں یوں نہ محوِ حیرت ہو
بے شمار ہنگامے اور آدمی تنہا
رہنماؤں کے دھوکے کم نظر ہی کھاتے ہیں
راستہ دکھاتی ہے، میری گمرہی تنہا
یوں تو ساری دنیا ہے اپنی جانی پہچانی
کل بھی میں اکیلا تھا اور آج بھی تنہا
گو حفیظ محفل میں لذتیں تھیں یاروں کی
کچھ تو تھا سبب اس کا تیری دل لگی تنہا

ثمر لبوانی

سرِ روئے حسیں زلفِ پریشاں کون دیکھے گا
پلا ہے کفر کے سائے میں ایماں کون دیکھے گا
کوئی بھی جنس ہو بازار ہی میں قدر ہوتی ہے
اگر طاؤس ہے صحرا میں رقصاں کون دیکھے گا
ہماری ہی محبت سنگدل ثابت ہوئی ورنہ
نکا ہوں سے خود اپنی خونِ ارماں کون دیکھے گا
محبت کو مجاہد فرض پہ قربان کرتا ہے
کسی کے آنسوؤں کو مردِ میداں کون دیکھے گا
دھڑکتا ہے جو سینے میں زمانے کے وہ دل ہم ہیں
اگر ہم نے نہ دیکھی نبضِ دوراں کون دیکھے گا
ثمر کے بعد ان کا روپ کیوں جادو جگائیگا
یہ جیتے جی بھلا محشر کا ساماں کون دیکھیگا

نثار عباسی

غضب کی تشنگی ہے اور ہم ہیں
عدم آسودگی ہے اور ہم ہیں
نظامِ میکدہ بدلا ہے لیکن
وہی تشنہ لبی ہے اور ہم ہیں
ادا ہر بت کی یاں ہے کافرانہ
طریقِ آذری ہے اور ہم ہیں
یہاں انساں ہے خود انساں کا دشمن
خرد کی تیرگی ہے اور ہم ہیں
چراغاں پردہ پوشِ تیرگی ہیں
فریبِ روشنی ہے اور ہم ہیں
یہاں رہبر ہے خود گم کردہ منزل
فریبِ رہبری ہے اور ہم ہیں
سرِ بازار غربت بک رہی ہے
یہ غربا پروری ہے اور ہم ہیں
یہاں خود جام و مینا تشنہ لب ہیں
یہ دورِ میکشی ہے اور ہم ہیں
غرض پوشیدہ ہے اب دوستی میں
خلوصِ ظاہری ہے اور ہم ہیں
نثار ان پر ہے مائل وہ گریزاں
یہ ربطِ باہمی ہے اور ہم ہیں

شاکر کرت پوری

جب گلستاں سے تعلق ہے نہ ویرانے سے
کیوں اُلجھتی ہے یہ دُنیا ترے دیوانے سے
میں نہ کہتا تھا نہ اُٹھ اے نگہِ ناز نہ اُٹھ
تو نے ٹکرا ہی دیا شیشے کو پیمانے سے
کتنے معصوم گل و غنچوں کی یاد آنے لگی
یادِ ایامِ بہاراں ترے آجانے سے
نور ہی نور نظر آتا ہے تا حدِ نظر
کون گذرا ہے مرے دل کے سیہ خانے سے
ہو گیا خاک محبت میں ہمیشہ کے لئے
ایسی کیا بات کہی شمع نے پروانے سے
جام و مینا کی ضرورت جسے ہو گی ہو گی
ہم تو پیتے ہیں تیری آنکھ کے پیمانے سے
غیر تو غیر ہیں اب اپنے بھی یوں ملتے ہیں !!
جیسے بیگانہ ملے راہ میں بیگانے سے
ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں نقش کفِ پا تیرا
میرا کعبہ سے تعلق ہے نہ بتخانے سے
ہم سے پوچھے کوئی رودادِ چمن اے شاکر
ہم نے دیکھے ہیں بہاروں میں بھی ویرانے

یاض حسین چودھری

نوں کا حسن شدت سرما سے جل گیا
شبنم سے پھول کا سینہ پگھل گیا
وں سے آنچ اب نہیں آتی بہاریں
وقت میرے درد کا پتھر نگل گیا
تذکرہ ہے کس کے شباب و جمال کا
ار چاندنی کے تبسم میں ڈھل گیا
اس طرح صداقتیں سینہ سپر رہیں
، رہِ حیات میں گر کر سنبھل گیا
ی نظر کی بھول تھی یا گردشِ سفر
ل قریب آئی تو رستہ بدل گیا
ں ریاضؔ کانٹوں کو دیتا رہا لہو
، ریاضؔ پھول کی پتی مسل گیا

امداد ہمدانی

سر کے نیچے رکھ کے تنہائی کا پتھر سو گیا
شب کے دامن میں سمٹ کر غم کا پیکر سو گیا
راس جب آیا نہ مجھ کو نیکیوں کا سائباں
اوڑھ کر اپنے گناہوں کی میں چادر سو گیا
صبح کی پہلی کرن کو دیکھ کر نیند آ گئی
اور کیا کرتا وہ دروازے سے لگ کر سو گیا
لٹ گئی احساس کی دولت وفا کے دشت میں
دیکھ کر میں اپنی بربادی کا منظر سو گیا
میں اکیلا، رات کی چپ، وہم کی پرچھائیاں
بند کر کے ہر کوئی یادوں کا دفتر سو گیا
چھت کی کڑیاں گنتے گنتے ہو گیا سورج طلوع
نیند کا پنچھی کسی بستی میں تھک کر سو گیا

محمد منظور احمد منظورؔ

راز دل ہم سے کہا جاتا نہیں
کچھ خیال اُس کو بھی کیوں آتا نہیں

عمر گزری زہر غم پیتے ہوئے
لیکن اب ہم سے پیا جاتا نہیں

کیسی کیسی صورتیں ہیں روبرو
صرف اک چہرہ نظر آتا نہیں

چاند کیوں ہے بادلوں کی اوٹ میں
اس کا جلوہ کیوں نظر آتا نہیں

اِس قدر راحت کے ساماں ہیں مگر
پھر بھی جینے کا مزہ آتا نہیں

اِس طرح کیونکر بھلا بیٹھے مجھے
کیا کبھی میں یاد بھی آتا نہیں

سب یقیں کریں ہماری بات کا
کیا کریں اس کو یقین آتا نہیں

جانے اب منظورؔ کا کیا حال ہے
آج کل وہ بزم میں آتا نہیں

رؤف خیرؔ

یہ سچ سہی کہ مجھ کو اندھیروں نے پالا ہے
بس جس طرف چلا ہوں ادھر تو اجالا ہے

میں یہ سمجھ رہا تھا کہ جھوٹا ہے آئینہ
تیزاب آپ نے مرے چہرے پہ ڈالا ہے

تم اپنے بعد وارث فن چھوڑتے نہیں
کیا خوب خودکشی کا یہ رستہ نکالا ہے

یوں زندگی سے اپنا تعارف کرایئے
خود زندگی کہے یہ مرا دیکھا بھالا ہے

اس دست آرزو نے ترے اشک پونچھ کر
تھاما نہ کوئی ہاتھ کہ اب تک بھی چھالا ہے

تو ہیں اگر اگل دو نگل لو تو زہر ہو
اپنا وجود اپنے ہی منہ کا نوالا ہے

خون آتا جو پیئے نہ پیئے تو خون دل
ہر کرب تشنگی بھی بڑا ہی نرالا ہے

رکھا ہے دور دور سراب نشاط نے
غم نے تمہارے یوں مرا ذمہ سنبھالا ہے

مجھ کو غم حیات یہ مغلوب مت کرو
مجھ میں رؤف خیرؔ بھی اک رہنے والا ہے

محمد اکبر الدین صدیقی

نقد و نظر

خم آبرو

رشید احمد رشید۔ کتابستان مین روڈ۔ بیدر (میسور اسٹیٹ) ۹۶ صفحے قیمت دو روپے پچاس پیسے

رشید صاحب جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ شاعری کا چسکا طالب علمی کے دور سے ہے۔ لیکن ضلع کے قیام اور ان کی خاموش طبیعت نے انھیں منظر عام پر آنے اور اپنی شاعری کا سکہ بٹھانے کا موقع نہ دیا۔ تاہم وہ برابر لکھتے رہے۔ نظمیں بھی اور غزلیں بھی۔ "خم ابرو" ان دونوں کا مجموعہ ہے۔ چالیس نظمیں ہیں اور دو غزلیں۔ نظموں میں مسدس بھی ہیں اور مثنوی کی شکل کی بھی اور سب شاعر کی قادر الکلامی پر دال ہیں۔ غزلوں میں تغزل کی فراوانی ہے۔ درد و غم کی کیفیات بھی گہرائی اور گیرائی لئے ہوئے ہیں چند شعر ہیں ؂

حوادث نے جہاں کے دل کو اب دل بھی نہیں رکھا
یہ وہ شیشہ ہے ٹکراتا ہے جو رہ رہ کے پتھر سے

بزم میں دیدۂ تر چھپا تو لیا
آج دامن بھی تر ہو تو میں کیا کروں

ہے برق تپاں یا دل پہلو میں تڑپتا ہے
دزدیدہ نگاہوں کی تاثیر خدا جانے

بدل دیا ہے زمانے نے لفظ کا مفہوم
خوشی کا نام ہے باقی مگر خوشی نہ رہی

سورج کی صلیب

ولایت علی۔ ناشر۔ نواب پبلشنگ ہاؤس ۶۱/۱ اے میور روڈ، سول لائن الہ آباد۔
صفحات ۹۲۔ خوبصورت گٹ اپ۔ قیمت ایک روپیہ پچھتر پیسے۔

افسانہ نگاری کا فن بہت نازک ہے۔ مطالعہ اور مشاہدہ کی گہرائی اس کے لئے ضروری ہے۔ احساس کی شدت بھی مصنف یا افسانہ نگار کو اونچا اٹھاتی ہے۔ بشرطیکہ وہ زبان و بیان پر قدرت تامہ رکھتا ہو۔ سورج کی صلیب۔ تیرہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جس کا تعارف پروفیسر سید احتشام حسین صاحب نے لکھا ہے ان افسانوں میں کسی کی بنیا دعشق و محبت پر نہیں بلکہ تمام افسانے سماجی نقائص کی پردہ دری کرتے ہیں۔ واقعات میں افسانہ نگار معاشرہ سے ایسے ہی واقعات کا انتخاب کرتا ہے۔ جو ہمارے لئے نئے نہیں لیکن وہ جس انداز سے پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں جدت ہے درد اور کسک ہے۔ جا بجا سماج کے نقائص ابھر کر سامنے آتے ہیں اور کرب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ مصنف ان کی تصویر کشی میں کامیاب ہے اگر وہ اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کو وسعت دیا

اور انتخاب واقعات میں احتیاط برتیں تو ایک کامیاب اور مقبول افسانہ نگار بن سکیں گے۔

نیرنگ خیال سالنامہ

ایڈیٹر۔ حکیم محمد یوسف حسن۔

یہ سالنامہ چار سو صفحات پر پھیلا ہوا ؛ ورگوناگوں خوبیوں کا حامل ہے۔ ادب اور فن کے تحت ادبی مضامین ہیں جس میں ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون اردو غزل ڈاکٹر فرمان فتحپوری غزل میں تجدد کی ایک مثال" اور گوہر نوشاہی کا مضمون مجلس ترقی ادب کا دس سالہ تحقیقی کام اور سلیم اختر کا سائنٹفک تنقید قابل مطالعہ ہیں فن اور فنکار کے عنوان کے تحت مرزا ادیب، محمد طفیل اور اختر ہوشیار پوری کے خاکے پیش کئے گئے ہیں۔ جوگندر پال نے طفیل صاحب کا خاکہ خوب کھینچا ہے۔ آخر میں بھی احمد ندیم قاسمی اور طفیل صاحب کا خاکہ ناچیز کے عنوان حفیظ احسن نے پیش کیا ہے۔ غزلوں اور نظموں کا حصہ بھی بلند معیار کا ہے۔ افسانہ نگاروں میں عبدالرحمن چغتہ رام لعل۔ خواجہ احمد عباس۔ ہاشم مرزا۔ مقصود احمد کے افسانے خوب ہیں مزاحیہ مضامین میں احسن فاروقی کا مضمون ڈوونگی بہت دلچسپ ہے اور حجاب امتیاز علی" میں پرسے کو گئی تھی" نہایت عبرت انگیز ہے اور سماج میں اخلاقی اقدار کی کمی کی ایک بین مثال۔ ڈرامے بھی ہیں اور خود جناب یوسف حسن کا ڈراما کاٹھ کی دو پتلیاں شریک ہے۔ رضیہ فصیح احمد کا ڈراما "کالا چور" دلچسپ ہے یہ سب ڈرامے ایکانکی ہیں۔ بحیثیت مجموعی سالنامہ وقیع اور رنگارنگ دلچسپیوں کا مرقع ہے۔

کلیات نسیم میسوری

بانکے نواب محمد حسین علی سلطان قریشی نسیم میسوری۔ مرتبہ میر محمود حسین لکچرار فارسی جامعہ میسور۔ ناشر۔ اردو لائبریری سنٹرل پوسٹ بکس ۵۵ - ۴۷ سٹی مارکٹ بنگلور۔ سائز $\frac{1}{16}$ کراؤن صفحے ۲۰۰ قیمت ۳/۵۰

نسیم کا تعلق سلطان شہید ٹیپو کے خاندان سے ہے یہ ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے اور بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی لیکن تعلیم پر کافی توجہ دی گئی۔ سولہ سال کی عمر سے شعر گوئی شروع کی اور چونکہ صلاحیت خداداد تھی اس لئے بہت جلد اس میدان میں بہتوں سے آگے بڑھ گئے اور خوب ناموری حاصل کی۔ حضرت میر شمس الدین فیض کے شاگرد ہوئے اور اس شاگردی پر ناز کیا۔ لیکن یہ بات کچھ عجیب سی نظر آتی ہے کہ کلام میں دبستان لکھنو کا رنگ زیادہ غالب ہے اس کا احساس خود نسیم کو بھی تھا چنانچہ کہتے ہیں ؎

آتش و رند نہیں عصر میں اپنے اے نسیمؔ　　لکھنؤ کو غزل اب جائے تو کیا ہوتا ہے

نسیم نے بہت رنگین زندگی گذاری ایک انگریز خاتون سے عقد کر لیا تھا جو بہت متمول تھی اور جس کے کافی کے باغ تھے۔ دولت نے سارے عیوب بھی ان میں جمع کر دیئے تھے۔ اسی لئے کلام میں خمریات کا وافر حصہ ہے اور

جسمانی تلذذ کی کیفیات بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ بہتر ترتیب میں تمام اصناف سخن کو ردیف وار جمع کر دیا گیا؛ اصناف کو علیحدہ کر کے غزلوں کو ترتیب وار جمع کرنا بہتر ہوتا۔ موجودہ صورت میں ایک ہی ردیف میں غزلیں سلام، نوحے، مرثیے اور سہرا بھی جمع ہو گئے ہیں۔ نسیم نے فکر رسا پائی تھی اور اچھوتی تشبیہیں اور نادر استعارے بھی استعمال کئے ہیں۔ نمونہ کیلئے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سنا تمام محرم میں روضۃ الشہدا ر — تو اپنے مرثیۂ غم کا ایک بند ہوا

جی میں آتا ہے تخلص ہی بدل دوں اے نسیم — شب کو جاتے ہی وہ کہتے ہیں اجالا ہو گیا

نسیم ہوں گرچہ کہنے میں الٰہی قدرت کے تیری قرباں — نہ کیسے جل جل مریں گے بلبل گلوں میں رہتا ہوں رنگ ہو کر

طوفان ڈوا ہے آنسو ہمارا — دریا سمٹ کر قطرہ ہوا ہے

انگور تارے، تاک فلک، مہر و ماہ جام — یا رب زمیں تمام ہو دوکان شراب کی

نسیم اب ہوا سرد چلنے لگی ہے — نہ ٹوٹے گی توبہ تو پھر کیا کرے گی

اسلام اور اس کا آئین حکومت | غلام محمد ناشر ۲۳ مسیح گڈھ ڈاکخانہ جامعہ نگر دہلی ۲۵

یہ اسلام اور اشتراکیت کے بعد دوسری کتاب ہے جس میں جمہوریت، عدل و مساوات، ایفائے عہد، اطاعت، عزل، استقرار، تاریخی جیسے موضوعات کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ قرآنی آیات کے تراجم لفظی دینے کی بجائے توضیح کے ساتھ دیئے ہیں اصل ترجمہ کے بعد توضیح زیادہ مناسب ہوتی۔ یہ اعتبار موضوع کتاب قابل مطالعہ ہے خدا مصنف کو جزائے خیر دے۔

(بقیہ مضمون صفحہ نمبر ۱۴ سے آگے)

اس ذوق کی تمثیل کروں کس سے کیا کہوں — ناہر کسی زہرا تہاں نا آوکہ سکتا ہیں

بے چارید وسواس سب پر دلہے تج اس میں — مردان حق تن نام ہے جن سیم اوس بیٹھا ہیں

تمت کیا یک غزل میں ابیات خالی پنج دہ — مفہوم کرستار ہوں ناعیب جو ہونا ہیں [1]

---

[1] اردوئے قدیم مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی صفحہ ۵۵

اسٹ ۱۹۷۶ء

سلیمان خطیب اور ان کا کلام

مرتبہ: سید مبارزالدین رفعت صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج بنگلور
ناشر: اردو لائبریری سنٹر پ ب ۵۵۷ ۲۷ سٹی مارکٹ بنگلور

1/16 کراؤن صفحات ۲۱۷ قیمت ۵۰/3

نہ سلیمان خطیب محتاج تعارف ہیں اور نہ رفعت صاحب دونوں نے اپنے اپنے میدانوں میں شہرت کے اونچے اونچے مینار بنا لیے ہیں۔ جن کی اونچائی چار مینار کے میناروں سے بھی زیادہ ہے ۲۱۶ صفحوں کی کتاب میں ۲۰ صفحے مضامین کے نکال دیجئے اور دس تئیس فرہنگ کے ۸۶ صفحوں پر دھنک پھیلی ہوئی نظر آئیگی یہ خطیب کی ۲۰ نظموں کا انتخاب ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی نظم نامکمل نہ ہوگی۔ رفعت صاحب نے تو پہلے خود ہی خطیب کا اور پھر ان کی شاعری کا تعارف کرایا ہے۔ خطیب کا کم اور شاعری کا زیادہ۔ دوسرے بزرگ ہیں عاتق شاہ۔ وہ نہ تو کہیں کے بادشاہ ہیں اور نہ ہی فقیر خانقاہ لیکن اپنی طرز تحریر میں منفرد ہیں اور خطیب سے انھوں نے بہت سی راز کی باتیں اگلوائی ہیں۔ آپ پورا مضمون پڑھ جائے تو کبھی آپ کو شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد والا فرحت اللہ بیگ کی زبان سے اپنی کہانی سناتے ہوئے یاد آئیں گے یا پھر شاعر ہونے کے ناطے احسان دانش اگر آپ روس پسند ہیں تو میکسم گورکی کا وہ چہرہ آپ کی نظروں میں پھرے گا جبکہ ابھی اس کے چہرہ پر سبزہ بھی آغاز نہ ہوا تھا۔ ان سبھوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں پاپڑ بیلے ہیں لیکن خطیب کی زندگی کے حالات پڑھنے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس نے سیویاں بھی بنائی ہیں اور تار کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ شاہ صاحب نے خطیب کی ایسی ہی تصویر پیش کی ہے۔ اگر آپ جدت پسند ہیں اور افسانوی دنیا کے متوالے ہیں تو آپ کو ایما تک یوم چند یاد آجائیں گے جو بچپن میں یسیر اور لڑکپن میں یتیم ہوئے اور اپنے افسانوں میں اپنی آپ بیتی دوسروں کی زبان سے کہلوائی۔ عاتق شاہ نے نہ صرف یہ کہ خطیب کی ابتدائی زندگی پر جو دبیز غلاف چڑھا ہوا تھا اس کو نکال پھینکا ہے بلکہ شاعری کا تجزیہ کرکے ثابت کر دیا ہے کہ خطیب نے اپنی نظموں میں اہم کرداروں کا رول خود ادا کیا ہے۔ ورنہ یہ عمیق مشاہدہ یہ گہرائی اور گیرائی حیات کا تجزیہ اور پھر ہر جز کا تفصیلی اظہار کسی دوسرے کے بس کا روگ نہیں۔ جو آگ میں جلا کندن بنا۔ عاتق شاہ کا مضمون خطیب کے جاننے والوں میں اشد ضروری اور قابل مطالعہ ہے۔ کتاب خریدو تو صفحہ ۳۰ پر لال فیتہ لگاؤ لیکن کشتی میں نہ ڈال دو۔ تیسرے مضمون نگار محمود عشقی ہیں یہ بڑے برخوردار قسم کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں جنھوں نے استاد گرامی عنوان دیا ہے لیکن ان کے قلم نے استاد سمجھنے سے ابا کیا ہے۔ اس کے بعد آپ کو صابر شاہ آبادی، محبوب برائی، سیدہ مہر، سلیم تمنائی، اللہ اختر حسن ایڈیٹر بلٹز کے مضامین ملیں گے جن میں خطیب کی شاعری کو سراہا گیا ہے۔ لیکن ہم سب کی یہ سراہنا اپنی جگہ دھری کی دھری رہ جائیگی جب پڑھنے والا "دھنک" کی قراءت شروع کر دے گا۔ محمد ایوب قریشی

خطیب سے اشعار سننا الگ بات ہے اور پڑھنا الگ۔ دوسرے لوگ جب خطیب کے اشعار پڑھتے ہیں تو مجھے اکثر ایسا محسوس ہوا ہے کہ پتھریلے راستے پر کوئی گاڑی چلا رہا ہو۔ موٹ کے پانی کے بہاؤ کی کیفیت اس میں پیدا ہی نہیں ہوتی وہ ناک بھوں چڑھاتا ہے کہ یہاں وزن گر رہا ہے یہاں قافیہ برابر نہیں یہاں ردیف ہی نہیں پیچھے بنڈی سے پہیہ الگ ہو گیا لیکن جب خطیب پڑھتا ہے یا دکنی زبان جاننے والے پڑھتے ہیں تو یہی خطیب نصرتی، غواصی اور وجہی جیسے ملک الشعراؤں کے ساتھ براجمان ہو جاتا ہے اور ہم سے آگے اتنی دور اور اتنا تیز نکل جاتا ہے جیسے نور جہاں کے ہاتھ سے کبوتر۔ حالانکہ یہ بزرگ ہم سے بہت پہلے گذرے لیکن دنیائے شعر میں آج بھی بہت آگے ہیں۔

دھنک:۔ خطیب کی نظموں کا مجموعہ ہے صرف چھبیس نظمیں۔ لیکن ان تیس نظموں میں ہمارا سماج ہمارا معاشرہ ہمارے معاشرہ کا غریب اور متوسط فرد، شہر اور گاؤں، شاہراہیں اور پگڈنڈیاں کوئلے کا دھواں اڑانے والی چمنیاں اور اپلوں کا دھواں اڑانے والے چولہے جو کبھی سرد بھی پڑے رہتے ہیں۔ جوان بیٹیاں جو ماں باپ کی چھاتی پر سل بن کر بیٹھتی ہیں اور نالائق ماں باپ کے لائق بیٹے جو اونچے گھرانوں میں شادی کر کے ایک لڑکی کی زندگی کو دوزخ بنا دیتے ہیں۔ خرقہ سادھو پنجے یتیم خانے اور ودھوا آشرم چلانے والے دھرماتما یہ سب جیتے جاگتے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مقامی رنگ کی تشبیہیں اور استعارے ہندوستان کا کوئی دوسرا شاعر پیش نہیں کر سکتا نظیر اکبرآبادی بھی نہیں۔ وہ اتنی تفصیل میں جاتا ہے کہ تشبیہ تشبیہ نہیں رہتی شباہت اور تصویر بن جاتی ہے۔ یوں تو تشبیہوں اور استعاروں سے خطیب کی کوئی نظم خالی نہیں لیکن میں صرف دو نظموں "پگڈنڈی" اور "یاد" پڑھنے کی درخواست کروں گا زبان کی حد تک وہ دکن سے مخصوص ہے لیکن باعتبار جذبات اس کی شاعری انسانی جذبات کی ترجمان ہے اور انسان کہاں نہیں۔ اسی لیے اس کی نظموں کے ترجمے مرہٹی، کنڑی، "تلنگی" تامل اور سنا کر روسی میں بھی ہو چکے ہیں۔ سلیمان خطیب اور ان کا کلام پڑھ کر آپ یقیناً میرے ہم نوا ہوں گے۔

اسلام اور اشتراکیت

غلام محمد۔ ناشر 44-B امر کالونی مارکیٹ۔ لاجپت نگر۔ نئی دہلی ۲۴

سائز ۱/۱۶ کراؤن ۸۸ صفحے قیمت ۱/۵۰

اسلام اور اشتراکیت پر ایک مقالہ ہے جو توحید ام، تکوین وجود، رسالت، عدل اور تسویہ معیشت جیسے عنوانات پر مشتمل ہے۔ اس میں کلام مجید کی آیات سے اشتراکیت کا مفہوم واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی حضرت رسول اکرم صلعم کے اسوۂ حسنہ سے مثالیں دے کر ثابت کیا گیا ہے کہ آپ اپنے خطبے میں خواہ وہ دینی ہوں یا سیاسی کیا اور عمل اختیار کرتے تھے۔ اسلامی معاشرت میں آج اگر ان اصولوں کی سختی سے پابندی کی جائے تو صحیح معنوں میں اشتراکیت پیدا ہو سکے گی۔ مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی اس کو پڑھ کر کچھ نہ کچھ حاصل ہی کر سکیں گے۔

محمد اکبر الدین صدیقی

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e- Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-4 (A. P.)

ادارہ کی اہم مطبوعات